MAHS302CCT

جدید دنیا - I

Modern World – I

ایم۔اے۔تاریخ

(تیسرا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: Modern World – I
ISBN: 978-81-974230-5-5
First Edition: June 2024

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2024
Copies	:	500
Price	:	368/- (The price of the book is included in the admission fee of distance mode students)
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, Programme Coordinator–History, DDE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Professor of Urdu (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Modern World – I
for
M.A. History 3rd Semester

On behalf of the Registrar, Published by:
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad – 500 032 (TG), Bharat
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیر اعلیٰ

(Chief Editor)

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head
Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین
سابق صدر شعبہ تاریخ و ثقافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مدیر

(Editor)

Vidya Vachaspati
Shaik Mahaboob Basha
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
MANUU, Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

لینگویج ایڈیٹر

(Language Editor)

Dr. Mohd. Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (C) /
Guest Faculty
Directorate of Distance Education
MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر، اردو (کانٹریکچول)/گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلس ادارت

(Editorial Board)

Prof. Mushtaq Ahmad Kaw
Former Head, Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر مشتاق احمد کاؤ
سابقہ صدر شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies
Department of History, Aligarh Muslim University
Aligarh

پروفیسر پرویز نظیر
سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز
شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College, Azamgarh

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

Prof. Danish Moin
Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر دانش معین
شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Mohammad Tazeem
Lecturer (S) in History (Retd.)
Jamia Senior Secondary School
Jamia Millia Islamia
New Delhi

ڈاکٹر محمد تعظیم
ریٹائرڈ لیکچرر، تاریخ
جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

Dr. Syed Meer Abul Hussain
Assistant Professor of History (C) /
Guest Faculty
DDE, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Mr. Mohd Aasim
Assistant Professor of History (C) /
Guest Faculty
DDE, MANUU, Hyderabad

محمد عاصم
اسسٹنٹ پروفیسر، تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Khursheed Ahmad Bhatt
Assistant Professor of History (C) /
Guest Faculty
Lucknow Campus, MANUU, Lucknow

ڈاکٹر خورشید احمد بٹ
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی
لکھنؤ کیمپس، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ

کورس کوآرڈی نیٹر

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	**اکائی نمبر**
• ڈاکٹر منصور احمد صدیقی	اکائی 1،4،15،16
• پروفیسر علاؤالدین خان	اکائی 2،10
• شری محمد عاصم	اکائی 3،11
• ڈاکٹر جی۔ایس۔وی۔پرساد	اکائی 5،6،7،8
• شری محمد عاصم،ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	اکائی 9
• شری سعید احمد	اکائی 12،13،14

مترجمین	**اکائی نمبر**
• آمینہ بیگم	اکائی 5،6،7،8

پروف ریڈرس

اول	:	محمد عاصم
دوم	:	سید میر ابوالحسین
فائنل	:	شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9
بلاک I	**ابتدائی جدید یورپ**	
اکائی 1	ابتدائی جدید یورپ کی تفہیم	13
اکائی 2	نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح مذہب اور تحریک رد اصلاح مذہب	32
اکائی 3	جغرافیائی دریافتیں اور ان کے نتائج	59
اکائی 4	ابتدائی نوآبادیت	81
بلاک II	**سیاسی اور تکنیکی ترقی**	
اکائی 5	قومی ریاستوں کا عروج	95
اکائی 6	یورپ میں مطلق العنانیت	113
اکائی 7	صنعتی انقلاب	132
بلاک III	**جمہوریت کا عروج**	
اکائی 8	جمہوری تصورات اور آئینی ارتقا	156
اکائی 9	امریکی انقلاب	173
اکائی 10	فرانسیسی انقلاب	197
اکائی 11	نپولین کے عہد کا فرانس	222

بلاک IV	**ابھرتی ہوئی قوم پرستی**	
اکائی 12	مسئلہ مشرق	245
اکائی 13	اٹلی کا اتحاد	261
اکائی 14	جرمنی کا اتحاد	277
اکائی 15	دانشورانہ رجحانات: حریت پسندی اور قوم پرستی	294
اکائی 16	اشتراکیت	308
نمونہ امتحانی پرچہ		326

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔ اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج و ترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند "ادبی" اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر ان شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے کلیسا ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25 ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی طریقۂ تعلیم کو پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر فاصلاتی طرز تعلیم کو متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم سے ہوا اور 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم (Regular Courses) کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔

ملک میں تعلیمی نظام کو بہتر انداز سے جاری رکھنے میں یو جی سی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم (ODL) کے تحت جاری مختلف پروگرام UGC-DEB سے منظور شدہ ہیں۔ UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ (Dual Mode University) ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق Credit Based Credit System (CBCS) نظام متعارف کرایا گیا اور خود اکتسابی مواد (Self Learning Material) از سرِ نو، جس میں یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کیا گیا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ سترہ (17) کورسز چلا رہا ہے۔ ساتھ ہی تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ متعلمین کی سہولت کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑہ میں ایک ایکسٹنشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 160 سے زیادہ متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ای میل اور وہاٹس ایپ گروپ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوئوں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال سے ریگولر کاؤنسلنگ کے علاوہ ایڈیشنل رمیڈیل آن لائن کاؤنسلنگ مہیا کی جا رہی ہے تاکہ طلبا کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جا سکے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو عصری تعلیم کے مرکزی دھارے سے جوڑنے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔ آنے والے دنوں میں تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے تحت مختلف کورسز میں تبدیلیاں کی جائیں گی اور امید ہے کہ یہ فاصلاتی نظام کو زیادہ موثر و کارگر بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عزیز طلباء! آداب ’جدید دنیا– I‘ کے عنوان سے کورس میں خوش آمدید۔ جیسا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں، پوری دنیا باہمی طور پر ایک دوسرے سے جڑی ہوئی اور ایک دوسرے پر منحصر ہے۔ دنیا کے ایک حصے میں ہونے والی تبدیلیاں جلد یا بدیر دور دراز واقع مقامات کو متاثر کرسکتی ہیں۔ اس تناظر میں عالمی تاریخ کا مطالعہ اہمیت کا حامل ہے۔ لہذا، یہ کورس آپ کو جدید دنیا میں ہونے والی مختلف پیش رفتوں کو سمجھنے کے قابل بنانے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں آپ جغرافیائی دریافتوں کے دور رس نتائج، نشاۃ ثانیہ، اصلاح، اور انسداد اصلاح کی تحریکوں، قومی ریاستوں کے عروج، صنعتی انقلاب اور دنیا پر اس کے اثرات، امریکی اور فرانسیسی انقلابات اور اٹلی اور جرمنی کے اتحاد کی تحریکوں وغیرہ کو سمجھیں گے۔ اس طرح، یہ کورس آپ کے لیے جدید دنیا میں ہونے والی مختلف تبدیلیوں کو بہتر طور پر سمجھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ جدید دنیا میں اس طرح کی پیشرفتوں کی صحیح سمجھ آپ کو جدید ہندوستانی تاریخ کی بہتر تفہیم میں بھی مدد دے گی اور آپ اس حیثیت میں ہوں گے کہ دور دراز علاقوں میں ہونے والے مختلف واقعات کے باہمی ربط کو سمجھ سکیں۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں/بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور 'تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے وہ ایک کلی کون تھے؟‘ یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: ’جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔‘ ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ ’تاریخ کا سماج سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔‘ ودیا واچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے خود اکتسابی مواد لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید۔ میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

جدید دنیا - I

Modern World – I

اکائی 1۔ابتدائی جدید یورپ کی تفہیم

(Understanding Early Modern Europe)

اکائی کے اجزاء

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 تاریخی پس منظر

1.3 کلیسائی نظام

1.4 جاگیر دارانہ نظام

1.4.1 اسباب

1.4.2 خصوصیات

1.4.3 جاگیر دارانہ نظام کے محاسن

1.4.4 جاگیر دارانہ نظام کی خامیاں

1.4.5 جاگیر دارانہ نظام کا زوال

1.5 جدید دور کا آغاز

1.6 قومی ریاستوں کا قیام

1.7 سرمایہ داری کا عروج

1.8 جدید دور کی دیگر اہم خصوصیات

1.9 عہدِ وسطیٰ اور جدید دور کا آغاز

1.10 اکتسابی نتائج

1.11 کلیدی الفاظ

1.12 نمونہ امتحانی سوالات

1.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید (Introduction)

عالمی تاریخ کے جدید دور میں براعظم یورپ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔انسانی زندگی کے مختلف میدانوں میں اس خطہ نے جتنی ترقی کی اس نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔یہی نہیں بلکہ اپنی ہمہ جہت ترقی کی بنیاد پر یہاں کے لوگوں نے دنیا کے دیگر علاقوں میں سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی سطح پر ایسے اثرات مرتب کیے جن کی بناء پر وہاں تاریخ کا دھارا ہی بدل گیا۔یورپی اقوام نے ایشیاءوافریقہ کے بیشتر حصے پر جس طرح قبضہ کیا اور جس طرح ان ممالک کے وسائل کا استعمال کر کے ان ہی کے عوام کا استحصال کیا وہ انسانی تاریخ کے عبرتناک باب ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہم جدید یورپ کی تاریخ سمجھے بغیر دنیا کے ایک بڑے حصے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور وہاں کے سیاسی و سماجی اور معاشی حالات کو نہیں سمجھ سکتے۔خاص طور سے ان ممالک کی تاریخ سمجھنے کے لیے جو یورپ کی نوآبادیات میں شامل تھے۔تاریخ یورپ کا جائزہ بے حد ضروری ہے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- یورپ میں جدید دور کا آغاز کب اور کیسے ہوا، جان سکیں گے۔
- اس براعظم میں عہدِ وسطیٰ کو اختتام پذیر کرنے والے حالات کو سمجھ سکیں گے۔
- اس دور کی سیاسی، سماجی و مذہبی خصوصیات کیا تھیں، معلوم کر سکیں گے۔
- جدید دور، عہدِ وسطیٰ سے کس طرح مختلف تھا، تجزیہ کر سکیں گے۔

1.2 تاریخی پس منظر (Historical Background)

پانچویں صدی عیسوی میں سلطنت روما کے زوال کے ساتھ ہی یورپ کے قدیم عہد کا خاتمہ ہو گیا۔رومی سلطنت کو ختم کرنے میں ہُن حملہ آوروں کا کلیدی کردار تھا۔اس سلطنت نے تقریباً ایک ہزار سال تک یورپ کو متحد رکھا۔اس کے حکمرانوں کے زیر سایہ جو تہذیب پروان چڑھی اس میں قدیم یونانی تمدن کے اثرات سب سے نمایاں تھے۔یورپ کا ایک بڑا حصہ اس کے زیر اثر تھا، جس کے نتیجے میں نہ صرف سیاسی اتحاد پیدا ہوا بلکہ ثقافت میں بھی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔مختلف طرزِ حکومت، انتظامی اکائیاں اور ان کی جداگانہ حیثیت، پارلیمانی نظام، تحریر شدہ آئین، یکساں قوانین، فوجی تنظیم اور عظیم شاہراہیں بھی سلطنت روم ہی کی مرہون منت ہیں۔یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہُن حملہ آوروں نے اس سلطنت کے صرف مغربی حصہ کو چوٹ پہنچائی تھی۔مشرقی حصہ جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا، ان حملہ آوروں سے محفوظ رہا۔اسی حصہ کو بازنطینی سلطنت کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔رومی سلطنت کے مغربی حصے کی تباہی نے یورپ کے سیاسی اداروں کو پارہ پارہ کر دیا، جس کے نتیجے میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آئیں۔لگ بھگ ایک ہزار سال تک یہی کیفیت رہی۔اس دور کو یورپ کا عہدِ وسطیٰ کہا جاتا ہے۔پندرہویں صدی میں یہ حالت تبدیل ہونا شروع ہوئی۔1453ء میں قسطنطنیہ کے ترکوں کے قبضے میں آنے اور بازنطینی سلطنت کے

خاتمے کے ساتھ اس تبدیلی کا آغاز ہوا۔ اور یہی وہ سنگ میل ہے جس نے یورپ کو عہدِ وسطیٰ سے جدید دور میں داخل کر دیا۔ یورپ میں عہدِ وسطیٰ سلطنت روما کے زوال سے قسطنطنیہ پر ترکوں کے قبضے ہونے تک کی مدت پر محیط ہے۔ اس دور کی دو بنیادی خصوصیات تھیں، ایک کلیسا کی قومیت اور دوسرے جاگیر دارانہ نظام۔ جدید یورپ کو سمجھنے کے لیے ان دونوں عناصر کا تجزیہ ضروری ہے۔

1.3 کلیسائی نظام (The Church System)

گیارہویں صدی عیسوی تک آتے آتے لگ بھگ تمام یورپ عیسائی مذہب کے زیر نگیں آچکا تھا۔ یہ تصور کیا جاتا تھا کہ انسان کی نجات کا راستہ کلیسا سے ہو کر ہی جاتا ہے۔ مذہب کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بادشاہ بھی کلیسا کا ماتحت تھا۔ کلیسا کی اپنی عدالتیں، پولیس اور قوانین تھے۔ وہ ٹیکس لگا سکتا تھا اور پادریوں کو بہت سی خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ بے اندازہ دولت اور اراضی کلیسا کی ملکیت تھے۔ نظام تعلیم بھی مذہب کے زیر اثر تھا۔ غرض کہ سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی قوتوں کا سرچشمہ پوپ ہی کی ذات تھی۔ پوپ کیتھولک عیسائیوں کا سربراہ تھا۔ وہ روم میں رہتا تھا اور اس کے ماتحت تمام یورپ میں کلیسا کا نظام قائم تھا۔ ریاستوں میں صوبائی، ضلعی اور دیہی سطح پر آرچ بشپ، بشپ اور پادریوں کی تقرری پوپ کے ذریعہ ہی کی جاتی، جس کے سبب وہ پوپ کے احکام کی اطاعت کرتے۔ بادشاہ یا دیگر افسران کا ان پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ پوپ کی طاقت حکمراں کے متوازی ہی تھی بلکہ وہ فوقیت رکھتا تھا۔ چنانچہ پوپ کسی بھی بادشاہ کو سزا دے سکتا تھا، یا اسے عہدے سے برطرف کر سکتا تھا۔ وہ کسی بھی ایسے ریاستی قانون کو رد کر سکتا تھا جو کلیسا کی پالیسیوں کے خلاف ہو۔ معاشی طور پر بھی کلیسا بہت مضبوط تھا۔ ایک اندازے کے مطابق یورپ کی سب سے اعلیٰ 20 فیصد اراضی کلیسا کے پاس تھی۔ 'ٹیتھ' ('Tithes') اور دیگر ٹیکس اس کی مالی حالت کو بہتر بنانے میں معاون تھے۔ مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ یورپ میں سب سے خوشحال ادارہ کلیسا کا تھا۔ اور پوپ ویٹیکن سٹی کے شاندار محل میں کسی شہنشاہ کی طرح ہی رہتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ حالات تبدیل ہونا شروع ہوئے۔ کلیسا اور پوپ کی بڑھتی طاقت کو حکمرانوں کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ عوامی سطح پر مذہبی اصلاحی تحریکوں نے کلیسا پر کاری ضرب لگائی۔ حکمرانوں کی پوزیشن مضبوط ہوتی گئی اور پوپ کی فوقیت کا محل منہدم ہوتا گیا۔

1.4 جاگیر دارانہ نظام (Feudal System)

عام طور سے پانچویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک کا عہد یورپ میں جاگیر دارانہ نظام کے لیے جانا جاتا ہے۔ سلطنت روما کے زوال کے بعد یورپ میں جس قوموں کو عروج حاصل ہوا، ان میں فرینک سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ 732ء میں فرینک حکمراں چارلس مارٹیل نے 'تور' نامی مقام مور (عرب) لوگوں کو شکست دی، جس سے نہ صرف یورپ میں اسلام کے قدم رک گئے بلکہ چارلس مارٹیل کی شہرت میں بی اضافہ ہوا۔ اس کا بیٹا پیپن اور پوتا شارلیمن لائق حکمراں تھے۔ شارلیمن کی وسیع سلطنت اٹلی کے وسط تک پھیلی ہوئی تھی۔ 800ء میں روم کے گرجاگھر میں پوپ کے ہاتھوں اس کی تاج پوشی ہوئی اور اسے شہنشاہ کا خطاب ملا۔ اسی سلطنت کو 'مقدس رومی سلطنت' کہا جاتا ہے۔ شارلیمن کی موت کے بعد اس کی سلطنت اس کے تین پوتوں میں تقسیم ہو کر کمزور ہو گئی۔ مزید بربر سلیو' قوم کے متواتر

حملوں نے اس میں انتشار پیدا کر دیا۔ حکمراں کمزور ہو گئے اور ایسا سیاسی نظام وجود میں آیا جسے تاریخ میں جاگیر دارانہ نظام کے طور پر جانا جاتا ہے۔ جاگیر دارانہ نظام شارلیمن کی موت کے بعد وجود میں آیا۔ اس نے اپنی فوجی مہمات میں مدد دینے والے سرداروں کو بڑے بڑے قطعات اراضی عطا کیے، جن پر یہ سردار جاگیر دار کی حیثیت سے حکمرانی کرتے تھے۔ یہ قطعات کاؤنٹی' ڈچی اور مارچ کہا جاتا تھا اور ان کے حکمراں کاؤنٹ' ڈیوک اور مارکوئیس کے نام سے جانے جاتے تھے۔ یہ اس زمین کے مالک تھے جس کے نتیجے میں کسان مالکانہ حقوق سے محروم ہو گئے تھے۔ یہ نظام شارلیمن کی موت کے بعد حکمرانوں کی طاقت کم ہونے اور بد نظمی کا نتیجہ تھا۔ جب بادشاہ عوام کی حفاظت کرنے سے قاصر تھے ایسے میں یہ جاگیر دار ہی رعیت کا واحد سہارا تھے اور اسی بنا پر انہیں قبول کر لیا گیا۔ آئینی اعتبار سے یہ جاگیر دار بادشاہ کے ماتحت تھے اور ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کرنا ان کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ مگر واقعتاً ایسا نہیں تھا۔ طاقتور جاگیر داروں کے گروپ بن گئے تھے اور کمزور بادشاہ ایسے ہی کسی گروپ کے سہارے تخت نشین رہ پاتا تھا۔ یہ جاگیر فیف (Fief) کہلاتی۔ اس کی مزید تقسیم ہوئی، یعنی جاگیر دار اپنی انتظامی سہولت کے اعتبار سے ماتحت جاگیر داروں کا تقرر کرتے۔ اس طرح اس نظام میں کئی درجات کے جاگیر دار تھے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ سب کے اوپر ایک حاکم مقرر تھا۔

1.4.1 اسباب (Causes)

جاگیر دارانہ نظام کے وجود میں آنے اور پنپنے کے پیچھے مندرجہ ذیل عوامل کارفرما تھے :

1۔ **سیاسی انتشار:** سلطنت روما کے زوال نے مختلف علاقوں میں سیاسی افراتفری اور انتشار کو جنم دیا، جس کے نتیجے میں طاقتور افراد نے کسانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ کمزور حکمراں ان کی حفاظت کرنے کے لائق نہیں تھے۔ چنانچہ کسانوں نے انہی بااثر افراد کو اپنا مالک تسلیم کر لیا اور انہیں اپنی حفاظت کے بدلے میں پیداوار کا ایک حصہ دینے پر راضی ہو گئے۔ اسی طرح چھوٹے سرداروں نے بڑے سرداروں کی بالادستی قبول کر لی۔

2۔ **مرکزی حکومت کی کمزوری:** رومی حکمراں کی کمزوری نے امراء کے طبقہ کو من مانی کرنے کے لیے آزاد کر دیا۔ انہوں نے بادشاہ کی اطاعت کا قلادہ اتار پھینکا اور اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ یہی جاگیر دار کی حیثیت سے اپنے اپنے علاقوں میں طاقت کا سرچشمہ بن گئے۔

3۔ **جرمن اقوام کا اثر:** جرمن قوم مختلف قبیلوں میں تقسیم تھی۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار تھا۔ جب ایک وسیع علاقہ پر ان کا قبضہ ہو گیا تو انہوں نے زمین کو اپنے سرداروں میں بانٹ دیا۔ ان سرداروں نے اپنے ماتحتوں میں علاقوں کو مزید تقسیم کر دیا۔ یہ ماتحت سردار اپنے آقاؤں کو فوجی وسیاسی اور انتظامی خدمات دیتے۔ اس طرح مختلف مدارج کے جاگیر دار وجود میں آ گئے۔

4۔ **غلامی کا رواج:** رومی سرداروں اور امراء کے ماتحت غلاموں کی ایک بڑی تعداد معاشی خدمات کے لیے موجود تھی، جن کا استحصال کیا جاتا، جس کے نتیجے میں ان کی لگن میں کمی آ گئی۔ چنانچہ انہیں ترغیب دینے کے لیے کچھ آزادی اور حقوق بھی دیئے گئے۔ مثلاً خاندان رکھنے اور پیشہ منتخب کرنے کا۔ اب ان کی حیثیت نیم غلام یا زرعی غلاموں کی ہو گئی، جنہیں ان کے مالک کبھی بھی زمینوں سے بے دخل کر سکتے تھے۔

1.4.2 خصوصیات وساخت (Characteristic Features)

جاگیردارانہ نظام موروثی حقوق پر قائم تھا، یعنی ایک جاگیردار کی موت کے بعد اس کی جاگیر اس کے بیٹے کو مل جاتی اور یہ سلسلہ نسل در نسل قائم رہتا۔ اس طرح سماج دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک طبقہ زمینوں کے مالکوں کا تھا اور دوسرا کسانوں اور عوام پر مشتمل تھا۔ زمینوں کے مالکان یعنی جاگیردار شان و شوکت سے رہتے۔ انہیں خصوصی مراعات حاصل تھیں اور وہ دوسرے طبقہ یعنی عوام کا استحصال کرنے کے لیے آزاد تھے، جس کے نتیجے میں رعایا خصوصاً کسان مفلوک الحال اور نظرانداز ہو گئے تھے۔ اس نظام نے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی غرض کہ زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔

1۔ **سیاسی:** سیاسی طور پر یہ نظام ایک بادشاہ کے زیر نگیں جاگیروں کا ایک وفاق تھا، جس کی بنیاد غیر مرکزیت تھی۔ بادشاہ کی حیثیت برائے نام تھی اور تمام طاقت کا سرچشمہ جاگیردار تھے۔ درجہ بندی کے اعتبار سے ان کے مابین تعلقات بہت واضح تھا۔ یعنی بادشاہ اور جاگیردار، جاگیردار اور نائب جاگیردار، نائب جاگیردار اور ماتحت سردار سب اپنے حقوق و فرائض سے بخوبی واقف تھے۔ عام طور پر جاگیردار کے تین فرائضِ منصبی تھے (i) انصاف قائم کرنا (ii) رعایا سے مختلف ٹیکس وصول کرنا اور (iii) اپنی رعایا کے جان و مال کی حفاظت کرنا۔ دوسری طرف یہ جاگیردار بادشاہ کو مختلف ٹیکس اور خدمات مہیا کراتے۔ انہیں دوسرے جاگیرداروں سے جنگ و صلح کرنے کا اختیار تھا اور یہ سکے جاری کر سکتے تھے۔

2۔ **سماجی:** جاگیرداروں کی طاقت ان کے مضبوط قلعوں میں پوشیدہ تھی۔ جنہیں 'مینز' کہا جاتا تھا۔ کسی بھی حملے کی صورت میں حفاظت کے نقطہ نظر سے انہیں تعمیر کیا جاتا۔ ان میں ان کے اہل و عیال اور متعلقین رہتے اور یہ ان کی سماجی زندگی کا مرکز تھے۔

3۔ **معاشی:** یہ قلعے معاشی معاملات میں بھی مرکز تھے۔ زراعت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ کسان دو طرح کے تھے۔ آزاد اور نیم غلام۔ آزاد کسانوں کو اپنی مرضی سے کھیتی کرنے کی آزادی تھی۔ وہ ایک جاگیر چھوڑ کر دوسری جاگیر میں جا سکتے تھے۔ نیم غلام طبقہ کو یہ سہولت میسر نہ تھی۔ وہ کھیتی کے علاوہ جاگیرداری کی دوسری بہت سی خدمات کرنے کے لیے بھی مجبور تھے۔

1.4.3 جاگیردارانہ نظام کے محاسن (Advantages of the Feudal System)

1۔ افراتفری و انتشار کے ایسے دور میں جب بربر افواج کے بیرونی حملوں نے مغربی یورپ میں بدنظمی پیدا کر دی تھی۔ ان جاگیرداروں نے امن قائم رکھنے کا کام کیا اور اپنے اپنے علاقوں کا انتظام کر کے رعایا کو تحفظ فراہم کیا۔

2۔ مطلق العنان حکمرانوں کے اختیارات پر بھی انہوں نے قدغن لگائی اور عوام کو عیاش و ظالم بادشاہوں کے استحصال سے بھی محفوظ رکھا۔

3۔ عام خواتین نے بھی اسی دور میں واضح صورت اختیار کرنا شروع کی، جن سے ہر افراد کے فرائض و حقوق اور شہریت کا تصور بھی بہتر انداز میں عمل میں آیا۔

4۔ اس نظام میں فوجی نظم و نسق زیادہ پختہ ہوا۔ کمزوروں، عورتوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کا جذبہ جاگیرداروں میں مثالی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے لیے غیرت و جراءت لازمی تھی، جس نے جنگی مہارت کو بھی جنم دیا۔

5۔ ثقافتی اعتبار سے جاگیرداروں نے رومی اور گوتھک طرز کی بہترین تعمیرات کا کام بھی انجام دیا۔

1.4.4 جاگیردارانہ نظام کی خامیاں (Defects of the Feudal System)

1۔ سیاسی سطح پر نقصان دہ غیر مرکزیت پیدا ہوئی۔

2۔ بادشاہوں کی مطلق العنانیت تو ختم ہوئی لیکن اس کی جگہ جاگیرداروں کے بااختیار ہونے سے عوام پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ دوسری طرف ان میں باہمی اور بادشاہ سے جنگوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، جس سے بدانتظامی پیدا ہوئی اور امن میں خلل پڑا۔

3۔ فوجی زندگی کی اہمیت بڑھ گئی۔ صنعت و تجارت کو نقصان ہوا۔ ہر جاگیردار اپنے علاقے سے گذرنے والے قافلوں پر محصول لگانا اور کبھی کبھی تو یہ ان قافلوں کو لوٹ بھی لیتے۔ اس دور میں کسانوں کا سب سے زیادہ استحصال ہوا۔ وہ محنت کرتے لیکن محصولات کی زیادتی کی بنا پر خود اپنے لیے کچھ نہیں بچا پاتے۔ ساتھ ہی انہیں بیگار بھی ادا کرنی پڑتی۔

1.4.5 جاگیردارانہ نظام کا زوال (Decline of Feudalism)

اس نظام کے قیام کا بنیادی سبب بدنظمی اور سیاسی انتشار تھا، جس کو اس نے ختم کرکے رعایا کو تحفظ دیا اور امن وامان قائم کیا۔ مگر دھیرے دھیرے یہ خود بدنظمی کا سبب بننے لگا اور جاگیرداروں کے ہاتھوں جبر واستحصال کا ایسا دور شروع ہوا، جس نے عوام کے تحفظ کے احساس کو بھی ختم کردیا اور اس کی عمارت منہدم ہونے لگی۔ مندرجہ ذیل وہ بنیادی اسباب ہیں جنہوں نے جاگیرداری نظام کو زوال کے راستے پر گامزن کیا:

1۔ **بادشاہوں کی طاقت میں اضافہ:** اس نظام کی تمام خامیوں کے باوجود اس دور میں زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت میں اضافہ ہوا۔ اس نے ایک نئے خوشحال طبقہ کو جنم دیا۔ ان افراد نے بادشاہ کی معاونت کی۔ محصولات میں اضافہ ہوا جس سے شاہی فوج اور جاگیرداروں کی افواج پر بادشاہ کا انحصار کم ہوا۔ مذکورہ تجارتی طبقہ جاگیرداروں کی جنگوں سے پیدا شدہ صورتحال کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس کی مدد سے بادشاہ نے انتظامیہ پر بھی اپنی گرفت مضبوط کرلی اور اقتدار میں مرکزیت قائم ہوئی۔

2۔ **بارود کی ایجاد:** جاگیرداروں کی طاقت ان کے قلعوں اور گھڑسوار افواج میں مرکوز تھی۔ بارود کی ایجاد کے بعد توپوں اور بندوقوں نے ان کے قلعوں کو مسمار کردیا، اور فوجیں بھی تلواروں، تیروں اور بھالوں سے ان کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ نتیجتاً بادشاہ کے سامنے یہ جاگیردار سست اور کمزور ہوگئے۔

3۔ **صلیبی جنگوں کے اثرات:** بیت المقدس پر مسلمان اور عیسائی دونوں اپنا حق جتاتے تھے لیکن اس پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ عیسائیوں نے اسے حاصل کرنے کے لیے 1095 سے 1453 عیسوی تک پوپ کی اپیل پر اپنے بادشاہوں کی قیادت میں عظیم جنگی خدمات انجام دیں۔ ان صلیبی جنگوں کو جو مسلمانوں اور عیسائیوں میں لڑی گئیں صلیبی جنگیں (Crusades) کہا جاتا ہے۔ مذہبی جوش میں دور دراز علاقوں سے عیسائی بہادر بیت المقدس آئے۔ ان جنگوں میں جاگیرداروں کی ایک بڑی تعداد ماری گئی، جس کے سبب مغربی یورپ میں

جاگیر داروں کی طاقت میں کمی آئی اور بادشاہوں کو ان کے کچلنے کا موقع مل گیا۔

4۔ **باہمی تصادم:** یہ مفاد پرست طبقہ آپس میں بھی بر سر پیکار رہا۔ ایک دوسرے کے مابین ہونے والی جنگوں نے نہ صرف ان کی افرادی قوت کم کی بلکہ فوج اور معاشی اعتبار سے بھی انہیں بہت کمزور کر دیا۔ جاگیر داروں کے آپسی جھگڑوں کے تسلسل نے بادشاہوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ انہیں اپنے زیر نگیں لا سکیں۔ برطانیہ میں ہونے والی ''گلابوں کی جنگ'' جو تقریباً 100 سال تک جاری رہی اور جس میں ایک بڑی تعداد میں فوجی اور جاگیر دار مارے گئے۔ اس ٹکراؤ کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

5۔ **تجارت میں ترقی:** صلیبی جنگوں کے نتیجے میں یورپی اقوام ایشیاء کے مختلف حصوں سے واقف ہوئیں۔ ان کے تجارتی روابط میں اضافہ ہوا اور تاجروں کی یونین قائم ہوئیں۔ یہ خوشحال طبقہ جاگیر داروں کا دشمن تھا کیونکہ وہ انہیں اپنی تجارت کا مخالف سمجھتے تھے اور ساتھ ہی انہیں یہ بھی احساس تھا کہ سماج میں انہیں وہ مقام حاصل نہیں ہے جس کے وہ مستحق تھے۔

6۔ **نئے شہروں کا قیام:** صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی کے نتیجے میں نئے بڑے بڑے شہر وجود میں آئے۔ جہاں تجارتی میلے لگے اور تیار شدہ اشیاء فروخت ہونے کے لیے آئیں۔ چنانچہ دیہی علاقوں سے بہت سے کسان اور نیم غلام ان شہروں کی طرف آنے لگے۔ اس ہجرت نے جاگیر داروں کو کمزور کیا کیونکہ وہ اسی طبقہ پر زیادہ منحصر تھے۔ ان تجارتی سرگرمیوں نے مغربی یورپ میں ایک نئی صورتحال کو پیدا کیا جس میں جاگیر داروں اور تاجروں میں ٹکراؤ نظر آیا اور بالآخر اول طبقہ ختم ہو گیا۔

7۔ **کرنسی کا چلن:** عہدِ وسطیٰ میں بارٹر سسٹم کا رواج تھا اور خرید و فروخت میں کرنسی کا استعمال کم ہوتا تھا۔ تجارت کے میدان میں ترقی اور صلیبی جنگوں نے کرنسی کی اہمیت میں اضافہ کیا۔ جاگیر داروں کو تعیش کا سامان خریدنے یا صلیبی جنگوں میں شامل ہونے کے لیے باہر جانے کی صورت میں کرنسی کی ضرورت پڑنے لگی جو تاجروں سے ہی حاصل ہوتی تھی۔ انہوں نے کسانوں اور زرعی غلاموں سے کرنسی مانگنا بھی شروع کر دیا۔ یہی نہیں تاجر جاگیر داروں سے کرنسی کے بدلے ان کی خصوصی مراعات اور خود انتظامی کے حقوق کا سودا کرنے لگے۔ زرعی غلام پیسہ دے کر آزادی حاصل کرنے لگے۔ ان سب کے نتیجے میں تاجروں کی اہمیت بڑھ گئی اور جاگیر دار طبقہ کمزور ہوتا گیا۔

8۔ **کسانوں کی بغاوتیں:** یہ پورا نظام کسانوں کے استحصال اور ان کے حقوق کی پامالی پر مبنی تھا۔ اپنے اوپر ہونے والے اس ظلم کے خلاف وقتاً فوقتاً کسان بغاوت بھی کرتے رہتے۔ 1338ء میں یورپ میں خوفناک بیماری پھیلی جسے 'کالی موت' کہا گیا۔ اس سے براعظم کی تقریباً نصف آبادی ختم ہو گئی۔ دیہی علاقوں میں کسان مزدوروں کا قحط پڑ گیا۔ چنانچہ مجبور ہو کر جاگیر داروں نے کسانوں کے تئیں نرم رویہ اختیار کیا اور انہیں زیادہ اجرت دینے لگے۔ 1381ء میں برطانیہ میں کسانوں کی ایک بڑی بغاوت ہوئی جسے بڑے ظالمانہ طریقے سے کچل دیا گیا۔ فرانس میں بھی اس طرح کی بغاوتیں ہوئیں۔ اب کسان اپنے حقوق کے سلسلے میں بیدار ہونے لگے تھے۔ ان بغاوتوں نے جاگیر دارانہ نظام کی بنیادیں ہلا دیں۔

9۔ اس نظام کی بنیاد زراعت پر تھی اور اس کی اکائی جاگیر ہوتی تھی۔ جاگیر کے دو حصے ہوتے۔ عام طور پر پہلا حصہ جو کل جاگیر کا دو تہائی ہوتا، جاگیر دار کے قبضہ میں ہوتا اور ایک تہائی حصہ زرعی غلاموں کے پاس ہوتا۔ اہم بات یہ ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ آزاد کسان اس نظام کے تحت زرعی غلاموں کی حیثیت سے کام کرنے پر مجبور تھے۔ اس کا ایک ہی سبب تھا، ان کے پاس وہ وسائل اور اوزار نہیں تھے جو خالی پڑی

زمینوں کو لائق کاشت بنانے کے لیے ضروری تھے۔ جاگیردار انہیں قابل کاشت زمین اور اوزار فراہم کرتے۔ دوسری طرف جاگیرداروں کو بھی کبھی زمینوں پر کھیتی کے لیے اہل افراد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک دوسرے کی ضرورتوں کو مل کر اس نظام کے تحت پورا کیا جاتا۔ اس میں ایک بڑی پیچیدگی تھی۔ زرعی کسانوں کی تعداد تو بہت تھی لیکن کاشت کے لیے جو مدت میسر تھی وہ کم تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ جس وقت جاگیردار اپنی زمینوں پر کھیتی کے لیے کسانوں کو مجبور کرتا، اس وقت وہ کسان خود اپنی زمینوں پر کھیتی کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے۔ اس کے علاوہ جب پیداوار میں اضافہ ہونے لگا تو جاگیرداروں نے اس کا فائدہ کسانوں کو نہیں دیا بلکہ ان کی زمین گھٹا دی جو ظاہر ہے کہ کسانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ یہ وہ اسباب تھے جنہوں نے عہدِ وسطیٰ کے یورپ کی ایک اہم خصوصیت یعنی جاگیردارانہ نظام کو ختم کر دیا۔ اور ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ کلیسا کی طاقت بھی کم ہو گئی تھی اور جاگیردارانہ نظام بھی انحطاط کا شکار تھا۔ ان دونوں تبدیلیوں نے یورپ میں جدید دور کے آغاز کا راستہ ہموار کیا۔

1.5 جدید دور کا آغاز (The Rise of the Modern Period)

1453 عیسوی میں قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ جس نے یورپی تاجروں کے لیے اس راستے سے مشرق کی تجارت کے دروازے لگ بھگ بند کر دیئے۔ نتیجتاً سمندری راستے کی تلاش میں پہلے کولمبس 1492ء میں امریکہ اور بعد میں واسکوڈی گاما 1498ء میں کالی کٹ ہندوستان گیا۔ عام طور پر مورخین یورپ کے جدید دور کا آغاز 1453ء کے اسی واقعہ سے مانتے ہیں۔ کچھ مورخین 1492ء میں امریکہ کی دریافت، کچھ 1493ء میں فرانس کا اٹلی پر حملہ اور کچھ 1517ء میں مارٹن لوتھر کی اصلاحی تحریک سے جدید عہد کی شروعات مانتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ پندرہویں صدی یورپ میں نئے عہد کی نقیب بن کر آئی۔ اس دور کی اپنی جداگانہ خصوصیات تھیں، جن کی بنا پر اسے ہم بہ آسانی عہدِ وسطیٰ سے الگ کر سکتے ہیں۔ نئے نظریات' افکار اور زندگی گذارنے کے طریقہ کار دور جدید کی پہچان ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں تبدیلی نہ آئی ہو۔ سیاست میں میکاؤلی نے تمام بندشوں سے آزاد کر کے کی بات کی، مارٹن لوتھر نے قدیم روایتی مذہبی شکنجوں سے آزاد کرنے کا کام کیا۔ سائنس کے میدان میں نئی نئی دریافتوں نے ترقی کی راہ کھول دی۔ ریمسن نے قدیم طرزِ تعلیم کو نئی سمت دی۔ غرض سماج کی ہر سطح پر غیر معمولی تبدیلیاں وجود پذیر ہوئیں۔ رابرٹ ڈرگنگ کے مطابق وہ خصوصیات جو عہدِ وسطیٰ کو جدید دور سے الگ کرتی ہیں، وہ ہیں: (i) قومی ریاستوں کے اخلاقی قدروں میں بہتری، امریکہ اور ایشیاء میں یورپی اقوام کی توسیع، یورپ میں سرمایہ داری، عقلیت پسندی، پروٹسٹنٹ کلیساؤں کا قیام، جدید سائنس میں ترقی، بین الاقوامی سطح پر ٹکراؤ اور مختلف طاقتوں میں توازن، تجارت میں زبردست اضافہ اور جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ۔ مختصراً جدید عہد کے آغاز میں تین عوامل بنیادی حیثیت رکھتے ہیں: (الف) بازنطینی سلطنت کے زوال کے بعد یونانی فلسفیوں، ادیبوں، دانشوروں اور فنکاروں کی اٹلی آمد، جس نے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کو جنم دیا (ب) جاگیرداری نظام کا خاتمہ اور طاقتور سلطنتوں کا قیام اور (ج) سرمایہ دارانہ نظام کا قیام۔

1.6 قومی ریاستوں کا قیام (The Founding of the Nation States)

پندرہویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ میں برطانیہ، فرانس اور اسپین جیسی قومی ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ انہوں نے مقدس رومی سلطنت پوپ اور کلیسا کی مطلق العنانیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مذہب اور سیاست دونوں میدانوں میں مذکورہ پرانی طاقتوں کے اقتدار کو رد کر دیا۔ جاگیرداروں کا زوال اور بڑھتی ہوئی تجارت کے تحفظ کے لیے ان ریاستوں کا قیام وقت کا تقاضہ تھا۔ قدیم عہد میں اس طرح کی ریاستیں نہیں کے برابر تھیں۔ عہدِ وسطیٰ میں بتدریج وہ حالات پیدا ہوئے جن کی کوکھ سے ان ریاستوں نے جنم لیا۔ مغربی یورپ میں ان ریاستوں کے قیام کے لیے مندرجہ ذیل اسباب بہت اہم ہیں:

1.6.1 جاگیرداری نظام کا زوال (Decline of Feudalism)

جاگیرداروں کی حیثیت چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی سی تھی جو مسلسل برسرپیکار رہتے تھے اور مختلف اسباب کی بناپر یہ نظام کمزور ہوتے ہوتے ختم ہونے لگا۔ اب جاگیردار بھی تجارت کے میدان میں آگئے اور شہروں میں قیام کرنے لگے جس کی وجہ سے انہیں بھی ایک ایسی قوت درکار تھی جو امن و امان قائم رکھ سکے۔ اب انہیں مرکزیت پر مبنی اقتدار چاہیے تھا۔ کسانوں اور تاجروں کی مدد سے بادشاہوں نے جاگیرداروں کو ختم کر کے مطلق العنان شہنشاہیت کی بنیاد رکھی۔ ہنری ہفتم نے برطانیہ میں اور ہنری چہارم نے فرانس میں اپنا اقتدار قائم کیا جو مکمل طور پر مرکزیت کی بنیادوں پر استوار تھا۔

1.6.2 متوسط طبقہ کا عروج (Rise of the Bourgeoisie)

قومی ریاستوں کے قیام میں متوسط طبقہ نے اہم کردار ادا کیا۔ اس طبقہ کے افراد تعلیم یافتہ اور خود کفیل تھے۔ یہ لوگ عقل سے کام لیتے اور دلیل کی بنیاد پر قدم اٹھاتے۔ کلیسا کے قائم کردہ نظام سے یہ مطمئن نہیں تھے بلکہ کلیسا کے مادی نقطہ نظر سے غیر متفق تھے۔ کلیسا کے ذریعے پھیلائے گئے اس نظریہ کو وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ غربت ایک سچے عیسائی کی خوبی ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ خود پوپ اور دیگر پادری وغیرہ کس آرام و آسائش کی زندگی گذارتے ہیں۔ مذہبی طبقہ کا پُر تعیش معیار زندگی ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ چنانچہ یہ متوسط طبقہ رومن کیتھولک کلیسا کی برائیوں کے خلاف کھل کر سامنے آیا۔ اس متوسط طبقہ کے پاس مادی وسائل بھی تھے اور عقل بھی۔ چنانچہ انہوں نے ان دونوں چیزوں سے بادشاہ کی معاونت کی۔ مشہور مورخ ہیز نے لکھا ہے کہ 'متوسط طبقہ کی پیدائش اور بادشاہت سے اس کا قریبی تعلق عہدِ وسطیٰ کی جدید دور میں تبدیلی کے لیے سب سے اہم حقیقت ہے' اس تعلیم یافتہ مالدار طبقہ نے بادشاہ کی ضرورتوں کو پورا کیا جس کے بدلے میں حکمراں کی طرف سے انہیں تاجرانہ مراعات اور معاشی سہولیات حاصل ہوئیں۔ ان کے مطابق ملک کی ترقی کے لیے مضبوط بادشاہت کی ضرورت تھی۔ سو انہوں نے اس کے قیام کے لیے نہ صرف دلیلیں دیں بلکہ راستہ بھی ہموار کیا۔

1.6.3 ابتدائی مصلحین کا کردار (The Role of Early Reformers)

اس عہد میں یورپی ممالک میں بہت سے مذہبی مصلحین اور سیاسی مفکرین پیدا ہوئے۔ جنہوں نے کلیسا اور مذہبی طبقہ کی برائیوں

کے خلاف آواز بلند کی اور عوام میں بیداری پیدا کی۔ برطانیہ کا جان آئی کلف (1384–1320)ان میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔آکسفورڈ یونیورسٹی کے اس پروفیسر کو یورپ میں اصلاحی تحریک کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔اس کے شاگردوں میں جان ہس بہت مشہور ہوا۔اس نے اپنے استاد کے خیالات و نظریات کی بڑے پیمانے پر اشاعت کا کام کیا۔اس طرح کے اصلاحی کام کرنے والوں نے یورپ میں ذہنوں کو ہموار کرنے کا کام کیااور عوام کوان حقیقتوں سے آگاہ کیا جن تک سب کی رسائی نہیں تھی۔ان کی کوششوں نے قومی ریاستوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

1.6.4 آتشیں اسلحہ کی ایجاد (The Invention of Firearms)

بادشاہوں کی طاقت میں اضافہ کا ایک بڑا سبب اس دور میں آتشی اسلحہ کی ایجاد ہے۔ بارود اور توپوں نے جاگیرداروں کے قلعوں کو آسانی سے منہدم کر دیااور بندوقوں کے سامنے ان کے گھوڑ سوار نہ ٹھہر سکے۔اس اسلحہ پر بادشاہوں نے اپنا مکمل کنٹرول رکھا۔یہی نہیں انھوں نے جاگیرداروں کے فوج رکھنے پر پابندی لگائی اور خود مستقل مرکزی فوج کی تشکیل کی، جس کے نتیجے میں جاگیرداروں کے لیے بادشاہ کے سامنے جھک جانے اور ماتحتی قبول کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا۔

1.6.5 قومی جذبات (National Sentiments)

صلیبی جنگوں اور دیگر جنگوں نے قومیت کے تصور کو مضبوط کیا۔اس کو مزید جِلااس دور کے ادب نے بخشی۔ وطنیت کے یہ جذبات متوسط طبقہ میں بطور خاص نظر آتے ہیں۔اس سے قومی بادشاہوں کو تقویت حاصل ہوئی۔اس دور میں بادشاہ کی اطاعت و فرمانبرداری کو ہی حب الوطنی کا درجہ حاصل تھا۔ قومی افتخار و وقار کے جذبے سے سرشار عوام نے بادشاہوں کو طاقتور بنادیا۔اس کے علاوہ دور دراز کے علاقوں میں تجارت اور نوآبادیات کی دوڑ بھی قومی فخر ومباہات کے اسباب تھے جس کے لیے طاقتور بادشاہ کا ہونا ضروری تھا۔

1.6.6 کلیسا کی کمزور حیثیت (Weak Position of the Church)

عہدِ وسطیٰ میں کلیسا کو سیاست پر بالادستی حاصل تھی۔ پوپ کی مرضی سب پر حاوی تھی۔اس کی منظوری کے بناء بادشاہ تخت نشین نہیں ہو سکتے تھے اور اس کی ناراضگی پر تخت چھوڑنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ صورتحال تبدیل ہوئی۔ نشاۃ ثانیہ نے عوام میں بےداری پیدا کی۔ توہمات اور عقائد کے مقابلے میں عقلیت پسندی کو اہمیت حاصل ہوئی۔ نظریہ اور فکر کی بنیاد دلائل پر رکھی جانے لگی۔اس کے نتیجے میں پوپ اور مذہبی طبقہ کمزور ہونے لگا۔ مذہبی طبقہ کی بے راہ روی اور پُر تعیش زندگی پر تنقید شروع ہوگئی اور عوام نے ہی ان کے مقابلے میں بادشاہ کو مضبوط کیا۔ ایک دلچسپ حقیقت اور ہے، وہ یہ کہ اس دور میں جو افراتفری اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی،اس کو دور کرنے اور امن وامان قائم کرنے کے لیے خود کلیسا نے بادشاہوں کی حمایت کی اور بالواسطہ حکمرانوں کو بااختیار بنانے کا کام کیا۔ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے نے بادشاہوں کو یہ موقع بہ آسانی فراہم کردیا کہ وہ کلیسا کے مفادات کو نشانہ بناسکیں۔ مذہبی اصلاحی تحریکیں اس کے لیے پہلے ہی راستہ ہموار کرچکی تھیں۔ چنانچہ بادشاہ کلیسا کی بالادستی سے آزاد ہوگئے۔

1.6.7 صلیبی جنگوں کے اثرات (Effects of the Crusades)

صلیبی جنگوں نے یورپ کو مغربی ایشیاء اور بازنطینی سلطنت سے نہ صرف متعارف کرایا بلکہ ان کی خصوصیات کو سمجھنے کا موقع بھی دیا۔ مغربی ایشیاء میں مطلق العنانیت قائم تھی۔ 1453ء میں قسطنطنیہ کے سقوط کے بعد مسلم افواج نے مغرب میں پیشرفت کی تو انہوں نے خطرے کو محسوس کر لیا۔ اس صورتحال نے بھی مضبوط قومی ریاستوں کی تشکیل میں مدد دی۔

1.7 سرمایہ داری کا عروج (The Rise of Capitalism)

پندرہویں صدی سے قبل عہدِ وسطیٰ میں جاگیردارانہ نظام کی بنیاد زراعت تھی، جس میں خود کفیل اکائیوں کو اہمیت دی جاتی تھی۔ زر سے زیادہ مبادلہ نظام کا چلن تھا۔ اس میں معاشی سرگرمیوں کا دائرہ محدود تھا۔ لیکن تیرہویں صدی سے صورتحال میں تبدیلی آنے لگی۔ جاگیرداروں کی ملکیت میں اضافہ ہوا۔ شہروں میں تجارتی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ خود کفیل دیہاتوں کی جگہ شہر معاشی تگ ودو کا مرکز بننے لگے، جس کے نتیجے میں جاگیردار بھی شہروں کی طرف کھنچنے لگے۔ اور انہوں نے اپنا اضافی سرمایہ جو طویل عرصے سے جمع تھا، اسے تجارت میں لگانا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں ان شہروں کی تجارت میں اضافہ ہوا۔ اسی دوران برطانیہ، پرتگال، روس، ڈنمارک جیسے طاقتور ممالک وجود میں آچکے تھے۔ جغرافیائی دریافتوں نے تجارت کی رفتار کو تیز کیا۔ شہروں میں گلڈ سسٹم شروع ہونے اور کرنسی کے بڑھتے رواج نے بھی تجارت کو ترقی دی۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ جیسے جیسے تجارت بڑھتی گئی، سرمایہ کا دخل بھی زیادہ ہوتا گیا۔ پندرہویں صدی سے قبل ہی سرمایہ داری ایک واضح حیثیت کے ساتھ نمودار ہو چکی تھی۔ سرمایہ داری کے عروج کے پیچھے مندرجہ ذیل اسباب کارفرما تھے۔

یورپ میں صلیبی جنگوں نے مختلف پہلوؤں سے اپنے اثرات مرتب کیے۔ گیارہویں سے چودہویں صدی عیسوی کے درمیان بیت المقدس کی مقدس زمین پر قبضہ کو لے کر ترکوں اور عیسائیں کے بیچ ہونے والی صلیبی جنگوں (Crusades) نے تجارت میں اضافہ کیا۔ بے شمار یورپی باشندے بیت المقدس کو آزاد کرانے کے لیے براعظم سے باہر نکلے۔ یہاں مشرق میں سامان تعیش نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی، جس کے نتیجے میں یہی لوگ بعد میں ان اشیاء کے بڑے خریدار بن گئے۔ ان کی مانگ کے سبب مذکورہ اشیاء کو بازار مل گیا۔ علاوہ ازیں بڑھتی آبادی نے بھی مانگ میں اضافہ کیا۔ ان صلیبی جنگوں کے سبب بہت سے افراد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تجارت کو فروغ دیا۔

ساتھ ہی جاگیرداری نظام جو زیادہ تر زراعت اور خود کفیل معیشت پر منحصر تھا، تجارت کے موافق ہی نہیں تھا بلکہ رکاوٹ بھی تھا۔ تیرہویں صدی کے بعد جب جاگیرداری نظام زوال پذیر ہوا تو تجارت کو فروغ ملا۔ پندرہویں صدی سے قبل قومی ریاستوں کو عروج حاصل ہوا۔ ان میں برطانیہ، اسپین، پرتگال، ہالینڈ اور بلجیم وغیرہ اہم ممالک تھے۔ ان سب جگہوں پر امن وامان اور انتظام وانصرام کی صورتحال بہت بہتر تھی جو تجارت کی ترقی کے لیے لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں سرمایہ داری کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ علاوہ ازیں یورپ میں رومن نمبر استعمال کیے جاتے تھے جو ناقص تھے۔ مغربی ایشیاء سے روابط پیدا ہونے سے یہ لوگ عربی ہندسوں سے متعارف ہوئے جس

کے بعد یورپ میں ان کا استعمال شروع ہوا۔ یہ نظام حساب و کتاب کے لیے زیادہ موزوں تھا اور اس کے استعمال نے تجارت کو آسان اور بہتر بنانے میں مدد دی۔ یورپ میں جدید دور کا آغاز نئی جغرافیائی دریافتوں کا بھی گواہ ہے۔ پرتگال اور اسپین سمیت کئی ممالک نے اس سمت میں پیش رفت کی۔ نئے علاقوں کی دریافت اور ان میں آمد و رفت کے سبب یورپی تجارت میں اضافہ ہوا اور بتدریج سرمایہ داری کو عروج حاصل ہوا۔ تجارت کی ترقی کے ساتھ اس عہد میں یورپ میں بینک قائم ہونے لگے۔ بینکنگ نظام سرمایہ داری کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ کیونکہ بینکوں کے ساتھ ہی ایسی کمپنیاں وجود میں آئیں جو تجارت میں سرمایہ کاری کرنے لگیں۔ انہوں نے صرف یورپ میں ہی سرمایہ کاری نہیں کی بلکہ جب نوآبادیات قائم ہونے لگیں تو ان ممالک میں بھی انہوں نے سرمایہ لگانا شروع کر دیا۔ اس نے تجارت کو زبردست فروغ دیا۔ یہاں تک کہ نوآبادیات کی معیشت کا رخ ہی بدل دیا۔ یہاں بھی یورپی سرمایہ دارانہ نظام کے قوانین نافذ کر دیئے گئے۔

1.8 جدید دور کی دیگر اہم خصوصیات (Other Salient Features of the Modern Period)

1.8.1 افکار و نظریات میں تبدیلی (Change in Ideas and Thoughts)

عہدِ وسطیٰ میں کلیسا کے ذریعہ دی گئی مذہبی معلومات پر آنکھیں بند کر کے یقین کیا جاتا تھا۔ زبان و ادب، سیاست، قانون سبھی پر اس کا اثر تھا۔ لاطینی زبان ایک طرح سے پورے یورپ کی مادری زبان تھی۔ پوری عیسائی دنیا پر لاطینی قوانین نافذ تھے۔ تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم سب سے اہم تھی۔ جدید دور کے آغاز نے صورتحال بالکل بدل دی۔ عقل اور دلائل پر مبنی علوم کی ترویج شروع ہوئی۔ مقامی زبانوں کی اہمیت بڑھ گئی۔ یونانی اور عبرانی زبانیں پڑھائی جانے لگیں۔ علم کا ماخذ مذہب نہیں مشاہدہ و تجربہ اور عقل ہو گئے، جس کے نتیجے میں نئی دریافتیں ہوئیں اور نئی ایجادات وجود میں آئیں۔ کوپرنکس نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ کلیسا اس نظریہ کا مخالف تھا، لیکن اس کو تسلیم کر لیا گیا۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد نے تو کایا ہی پلٹ دی۔ اب زبان و ادب اور دیگر علوم عوام تک بہ آسانی پہنچنے لگے۔ کتابوں کی اشاعت نے عقل و دانش پر مبنی علوم کو ترقی دی اور عام کیا۔ اس ترقی کے نتیجے میں عوام کو نہ صرف اپنے حقوق معلوم ہوئے بلکہ ان میں وہ بیداری پیدا ہوئی جس نے شخصی آزادی اور ایک دوسرے کے لیے احترام کا جذبہ پیدا کیا۔ مورخ گرانٹ نے لکھا ہے 'نشاۃ ثانیہ کے سبب سماج میں تنقیدی اور تجرباتی فکر پیدا ہوئی۔ زندگی کے تئیں ایک نیا زاویۂ نظر وجود میں آیا، جس نے عوام کو اس لائق کیا کہ وہ عہدِ وسطیٰ کی تنظیم کو للکار سکے۔' عوام نے مذہبی توہمات سے باہر نکل کر سائنسی بنیادوں پر سوچنا شروع کیا۔ کسی بھی بات کو قبول یا رد کرنے سے قبل اس کے عیوب و محاسن پر کھل کر بحث ہونے لگی۔ عہدِ وسطیٰ کے دقیانوسی اور روایتی رسم و رواج کا خاتمہ ہونے لگا اور سائنسی و معروضی اندازِ فکر عام ہو گیا۔

1.8.2 جغرافیائی تحقیقات (Geographical Discoveries)

اس عہد کی ایک اہم خصوصیت جغرافیہ کے میدان میں پیشرفت تھی۔ کلیسا کے توہمات سے آزاد ہو کر یورپی نے اس سمت نئی تحقیقات کیں جنہوں نے آنے والے وقت میں عالمی اثرات مرتب کیے۔ 1453ء میں قسطنطنیہ کے سقوط کے بعد یورپ مشرقی علاقوں خصوصاً ہندوستان سے تجارت بند ہو گئی۔ اس کے لیے انہوں نے نئے راستوں کی تلاش شروع کی جو بحری راستہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس وقت تک

سمت کا تعین کرنے والے آلے قطب نما(Compass) کی ایجاد ہو چکی تھی جس کے سبب سمندر کا سفر آسان ہو گیا تھا۔اس سلسلے کی پہلی اہم کامیابی پرتگال کو ملی جب اس کے بحری جہازوں نے 1415ء میں افریقہ کے ساحل پر قبضہ کیا۔اس سے حوصلہ پا کر حیرت انگیز بحری اسفار کا دور شروع ہو گیا، جس کے نتیجے میں 1492ء میں کولمبس امریکہ اور 1496 میں واسکوڈی گاما ہندوستان (کالی کٹ) پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔1497ء میں انگریز جہاز راں جان کیوٹ نے نیو فاؤنڈ لینڈ دریافت کیا۔1510ء میں میگلن نے زمین کا چکر لگایا۔مذکورہ تحقیقات نے یورپ کی دنیا ہی بدل دی۔اور اگلی کئی صدیوں تک کئی براعظموں میں ان کی سرگرمیاں جاری رہیں۔

1.8.3 نوآبادیات کا آغاز (The Beginning of Colonialism)

امریکہ اور ہندوستان کے بحری راستہ کی دریافت نے سامراجیت کا آغاز کیا۔مضبوط بحری طاقت کی بنیاد پر پرتگال، اسپین، برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک نے ایشیاء وآفریقہ کے کمزور و پسماندہ علاقوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنی نوآبادی میں تبدیل کر دیا۔یہ نوآبادیات اپنے آقاؤں کے لیے سیاسی و معاشی وسائل کا ایک بڑا وسیلہ بن گئیں، جس کے نتیجے میں بین الاقوامی سطح پر تجارت کو بھی وسعت حاصل ہوئی۔ جدید عہد میں بہادر قسمت آزماؤں نے نہ صرف سمندر کے سینے چیرے بلکہ نئے نئے علاقے دریافت کر کے ان پر قابض بھی ہوئے۔اپنی مضبوط بحریہ کا استعمال کر کے پرتگال، اسپین اور برطانیہ جیسے ممالک نے ایشیاء وافریقہ اور جنوبی امریکہ کے بہت سے حصوں پر قبضہ کر لیا۔ان سامراجی قوتوں نے اپنی نوآبادیات کے کمزور عوام کا زبردست استحصال کیا۔دوسری طرف ان طاقتور یورپی ممالک میں زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کرنے کی ہوڑ لگ گئی، جس نے ایک ایسے تصادم کو وجود بخشا جس کے نتیجے میں عظیم جنگیں برپا ہوئیں۔

1.8.4 تجارت کی تنظیم نو (Reorganisation of Trade)

عہدِ وسطیٰ کے یورپ میں تجارت کی بنیاد گلڈس پر تھی۔یہ صنعت کاروں کی تنظیمیں تھیں لیکن ان کا دائرہ محدود تھا۔نئے راستوں اور نئے علاقوں کی دریافت نے تجارت کے مزید مواقع فراہم کیے۔نوآبادیات نے تو اس میدان میں انقلاب ہی برپا کر دیا۔تجارت دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ یورپی تاجر اپنے مقبوضہ علاقوں سے خام مال سستے داموں حاصل کرتے اور پھر اس سے تیار شدہ مال ان ہی نوآبادیات میں بیچتے۔اس طرح انہیں اپنے سامان کے لیے ایک بڑا بازار بھی مل گیا۔یورپ میں سرمایہ کاری کو فروغ حاصل ہوا۔بینک قائم ہوئے۔ بڑے بڑے کارخانے وجود میں آئے۔اس نے صنعتی انقلاب اور سرمایہ دارانہ نظام کو جلا بخشی۔تاجروں کی کمپنیاں وجود میں آئیں جن میں بڑے پیمانے پر سرمایہ لگایا جانے لگا۔

1.8.5 شہروں کا قیام (Establishment of Cities)

جدید دور کی ایک خصوصیت شہروں کا عروج تھا۔اس کے ساتھ ہی سماج میں متوسط طبقہ نے بھی اہمیت اختیار کی۔یہ تعلیم یافتہ تھے۔ ان میں تاجر، صنعت کار اور بینکرس شامل تھے۔صنعت وحرفت اور تجارت نے انہیں خوشحالی عطا کی تھی۔یورپ نے اپنی نوآبادیات کے ساتھ تجارت میں وسعت اختیار کی جو خصوصاً سمندری راستے پر منحصر تھی۔ نتیجتاً ساحلوں پر شہر بسائے گئے اور بندرگاہیں قائم کی گئیں۔یہ تجارتی

مرکز ہی بعد میں تہذیب و ثقافت کے مرکز بھی بن گئے۔ یہاں کے پڑھے لکھے خوشحال افراد نے شاہی گھرانوں کو اپنی حمایت دے کر انکی پوزیشن کو مضبوط کیا۔ جاگیرداروں کے مقابلے میں شاہی گھرانوں کی حمایت کے پس پشت ان کے تجارتی مفاد تھے۔ یہ امن وامان اور شانتی چاہتے تھے۔اس کے لیے انہوں نے بادشاہت کا ساتھ دیا۔ مشہور مورخ فرڈیننڈ شیوبل نے لکھا ہے ''بڑے شہروں کے قیام کے نتیجے میں نہ صرف شہری کاری (Urbanisation) میں اضافہ ہوا بلکہ اس واقعہ نے براعظم یورپ میں بین الاقوامی تعلقات کو بڑھانے کا رجحان بھی پیدا کیا'' حقیقتاً ان شہروں کی ترقی نے متوسط طبقہ کا سیاست میں عمل دخل بڑھایا اور سماجی ساخت کو بھی متاثر کیا۔ معاشی طور پر زراعت کے مقابلے میں تجارت زیادہ اہم ہوگئی۔

1.8.6 چھاپہ خانہ کی ایجاد (The Invention of the Printing Press)

اس ایجاد نے عہدِ وسطیٰ کو جدید دور میں تبدیل کرنے کے عمل میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد جرمنی میں گٹن برگ نے کی تھی۔ جس کے بعد 1476ء میں برطانیہ میں اس کا استعمال شروع ہوا۔ اس کے نتیجے میں کتابیں بہ آسانی چھپنے لگیں اور لوگوں کو فراہم ہونے لگیں۔ تعلیم کی ترویج و اشاعت میں ترقی ہوئی۔ علم کا رجحان بڑھنے سے لوگوں کے اذہان کھل گئے۔ عقل و دانش کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ یہی وہ روشنی تھی جس نے یورپ کی بالادستی دنیا کے ایک بڑے حصے پر قائم رکھی۔

1.8.7 بین الاقوامی قوانین (International Laws)

عہدِ وسطیٰ میں مختلف ممالک کے درمیان تعلقات کی بنیاد کیتھولک کلیسا کے اصول وضوابط تھے۔ اصلاحی تحریکوں نے انہیں اکھاڑ پھینکا۔ چنانچہ بین الاقوامی رابطے کے لیے ایسے قوانین وضع کیے گئے جو سب کے لیے قابل قبول ہوں۔ آرتھر ہیسل کے مطابق ''ایک ملک جب دوسرے ملک پر حملہ آور ہوتا تو باقی ماندہ سلطنتیں بے پرواہ رہتیں۔ لیکن جب طاقتور بادشاہ اور مستقل افواج وجود میں آگئیں اور یہ حکمران دور دراز کے علاقوں میں بھی برسرپیکار ہونے لگے تو اس طرح کے حملے اور پالیسیاں سبھی کے لیے باعث فکر بن گئیں۔ اسے روکنے اور طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے دیگر ممالک معاہدہ کرنے اور وفاق بنانے لگے۔'' جدید عہد میں طاقتور سلطنتوں کے وجود میں آنے سے سفارتی تعلقات نے نئے رخ اختیار کیے۔ آپسی مقابلہ میں سفارتی سطح پر بھی محاذ آرائیاں ہونے لگیں جو بڑی جنگوں میں بھی تبدیل ہوگئیں۔

1.8.8 دولت کی فراوانی (Accumulation of Wealth)

جدید یورپ میں آغاز سے ہی ہونے والی معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے ایک بڑا سرمایہ اکٹھا ہوگیا۔ اس کے تین بنیادی سبب تھے۔ پہلا جنوبی امریکہ کی مقبوضات سے چاندی کا حاصل ہونا، دوسرے صلیبی جنگوں کے سبب تجارت میں اضافہ، تیسرے متوسط طبقہ کا وجود میں آنا۔ اس دور میں ایسے بینکرس پیدا ہوگئے جو جاگیرداروں سے زیادہ مالدار تھے۔ یہ بینکر حکومتوں کی طرح سے مدد کرتے۔ فرانس نے جب اٹلی پر حملہ کیا تو اس کی فلورنس کے ایک بینکر نے مدد کی۔ مقدس رومی سلطنت کو بھی کافی عرصہ تک اگھس برگ کا ایک بینکر مدد دیتا رہا۔ اس طرح کے سرمایہ نے سیاسی اور سماجی اثرات بھی مرتب کیے۔

1.8.9 ثقافتی بیداری (Cultural Awakening)

اس دور میں تہذیب و ثقافت بھی نشاۃ ثانیہ کے عمل سے گذری۔ اس کا آغاز اٹلی سے ہوا اور پھر یہ دوسرے یورپی ممالک میں بھی پھیل گئی۔ اس نے زبان وادب اور فنون لطیفہ سمیت کئی میدانوں میں نئی مثالیں قائم کیں۔ نظریات وافکار میں تنوع پیدا ہوا۔ تہذیب و ثقافت کے اس احیاء نے سماج پر گہرا اثر ڈالا۔ اس میں قدیم یونانی و رومی ادب و فنون کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ نئے خیالات نے لوگوں کے رجحان میں تبدیلی کی۔ جستجو کے نئے دروازے کھلے اور مادی ضروریات کی طرف لوگ تیزی سے راغب ہوئے۔

1.8.10 مذہبی اصلاحی تحریکیں (Religious Reform Movements)

جدید دور کی ایک اہم خصوصیت وہ تحریکیں تھیں جنھوں نے رومن کیتھولک کلیسا کے اثرات کو کم کیا۔ اس دور کے آغاز سے ہی کلیسا کی طاقت کمزور ہونے لگی۔ کلیسا کے پاس بے اندازہ دولت تھی لیکن باطنی طور پر اس ادارہ کی جڑیں کھوکھلی تھیں۔ اس سے متعلق افراد غیر اخلاقی زندگی گذارتے۔ وہ عیش وآرام میں مست رہتے۔ کردار کے اس زوال کو لوگوں نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ کلیسا نے اپنے اوپر انگلی اٹھانے والوں کو سزائیں دیں۔ یہ تصادم جاری رہا یہاں تک کہ مارٹن لوتھر نے پوپ کے خلاف بیڑہ اٹھایا اور ایک نئی مذہبی روایت قائم کی جسے پروٹسٹنٹ کلیسا کہا گیا۔

1.8.11 سائنسی ایجادات (Scientific Inventions)

اس دور میں جنگی ساز وسامان واسلحہ سمیت بہت سی نئی ایجادات ہوئیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے لوگوں نے اپنی اپنی ضرورتوں کے مطابق اشیاء ایجاد کرلیں۔ پرنٹنگ پریس اور قطب نما(Compass) آلہ اس دور کی اہم ایجادات ہیں جنھوں نے یورپ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ان نئی ایجادات نے ایک طرف تو بادشاہوں کے ہاتھ مضبوط کیے وہیں دوسری طرف عوام کے لیے بھی زندگی کی نئی راہیں کھولیں۔

1.9 عہدِ وسطیٰ اور جدید دور کا موازنہ

(Comparison between the Medieval and Modern Periods)

تاریخ کا ہر دور اپنی الگ خصوصیت رکھتا ہے۔ وقت کے ساتھ سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ افکار و نظریات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ دنیا کے ہر خطہ کی تاریخ اسی حقیقت کی گواہ ہے۔ جب ہم یورپ کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح طور پر دونوں ادوار کی تبدیلیاں نظر آجاتی ہیں۔ جنھیں ہم بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ وسطی اور جدید دور کا یہ فرق مندرجہ ذیل ہے:

سیاسی سطح پر اختلاف: عہدِ وسطیٰ میں طاقتور مرکزی حکومتیں یورپ میں نظر نہیں آتیں۔ وسائل ہوتے ہوئے بھی پوپ اور کلیسا کو ان پر بالادستی حاصل تھی۔ انتظامی معاملات پر جاگیرداروں کا اختیار تھا۔ لیکن جدید دور میں صورتحال بدل جاتی ہے۔ بادشاہ کلیسا کے شکنجے سے آزاد

ہو جاتا ہے۔ حکومت پر سے مذہبی دباؤ ختم ہونے کے بعد حکمراں کی حیثیت مضبوط ہو جاتی ہے۔ جاگیرداری نظام کے خاتمہ نے مضبوط شہنشاہیت قائم کرنے میں مدد دی، جس کے نتیجے میں سامراجیت پیدا ہوئی اور نوآبادیاتی نظام نے دنیا کے نقشہ کو بدل دیا۔

سماجی سطح پر اختلاف: عہدِ وسطیٰ کا سماج دو طبقوں میں تقسیم تھا۔ ایک اعلیٰ اور دوسرا نچلا۔ اعلیٰ طبقہ میں پادری اور جاگیردار شامل تھے جبکہ نچلے طبقہ میں کسان اور دیگر عام لوگ۔ جدید دور میں تجارت وصنعت کی ترقی کے سبب ایک تیسرا طبقہ پیدا ہوا جسے متوسط کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اعلیٰ طبقہ کے افراد کی مانند دولتمند تو نہیں تھے مگر تعلیم یافتہ تھے۔ ذہنی سطح بلند تھی اور ساتھ میں دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس میں تاجر، اساتذہ، وکیل اور صنعتکار وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ عہدِ وسطیٰ کے سماج پر مذہب کا ضرورت سے زیادہ اثر تھا لیکن جدید دور میں یہ اثر ختم ہو چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں جدید دور میں لوگوں کو پہلے کے مقابلے زیادہ فکری اور شخصی آزادی حاصل تھی۔

معاشی سطح پر اختلاف: وسطی معیشت میں تجارت کی بنیاد گلڈس پر تھی۔ تاجروں اور صنعت کاروں کی الگ الگ گلڈس تھیں، جو بالترتیب تجارت اور صنعتوں کی نگرانی کرتیں۔ اسی طرح اشیاء اور ان کی تقسیم کے لیے بھی الگ گلڈس تھیں۔ تجارت محدود تھیں۔ لیکن جدید یورپ میں تجارت وصنعت نے بہت ترقی کی، جس کے نتیجے میں گلڈس کی اہمیت ختم ہو گئی۔ چنانچہ ان کی جگہ جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں قائم کی گئیں۔ تجارت کے بڑھتے ہوئے دائرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بینک قائم ہوئے۔ ان سب نے مل کر سرمایہ دارانہ نظام کے قیام کی راہ ہموار کی جو عہدِ وسطیٰ میں نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں تجارت پر حکومت کا کنٹرول برائے نام تھا۔ لیکن جدید دور میں تجارت کے میدان میں ترقی کے ساتھ ساتھ حکومت کا کنٹرول بھی اس پر بڑھ گیا۔ اس کے لیے حکومت نے قوانین وضع کیے اور اصول وضوابط مقرر کیے۔ تاجروں کی سہولیات کا خیال رکھا جانے لگا۔

مذہبی سطح پر اختلاف: عہدِ وسطیٰ کے یورپ میں پوپ اور عیسائیت کا بول بالا تھا۔ کوئی بھی شخص یہاں تک کہ بادشاہ بھی اس کے احکامات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ کلیسا کے پاس لامحدود دولت تھی اور لوگ اس کے اندھے عقیدت مند تھے۔ لیکن نئے عہد میں یہ صورتحال تبدیل ہو گئی۔ مذہبی اصلاحی تحریکوں کے نتیجے میں کلیسا اور پوپ کی بالادستی دم توڑ گئی۔ ان مذہبی اداروں کی تنظیم نو ہوئی۔ کچھ ممالک میں شاہی کلیسا وجود میں آئے۔ یہی نہیں طریقہ کار میں تبدیلی ہوئی۔ کلیسا پر پوپ کا پہلے جیسا اختیار بھی ختم ہو گیا۔ اس دور میں مذہبی آزدی حاصل ہوئی۔ ہر فرد مذہب کے معاملے میں آزاد تھا۔ یہ عہدِ وسطیٰ کے بالکل برعکس تھا۔ اندھی تقلید کی جگہ عقل وشعور کو مذہب کی بنیاد بنایا گیا۔ اس دور میں ہونے والی دیگر تبدیلیوں کے نتیجے میں عیسائی مبلغوں کو مذہب کی اشاعت کے زیادہ مواقع فراہم ہوئے۔ نئے راستوں اور علاقوں کی دریافت کے بعد مذہب کی روشنی وہاں تک پہنچانے کی کوشش بڑے پیمانے پر ہوئی۔

1.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

پانچویں صدی عیسوی میں سلطنت روما کے زوال کے ساتھ جس عہدِ وسطیٰ کا آغاز ہوا تھا، وہ پندرہویں صدی میں ختم ہو گیا۔ تقریباً ایک ہزار سالوں پر محیط یورپ کے عہدِ وسطیٰ کی دو بنیادی خصوصیات تھیں۔ ایک مذہب اور کلیسا کا دبدبہ اور دوسرے جاگیردارانہ نظام۔ اس دور میں عیسائیت پورے یورپ کے باشندوں کا مذہب تھا۔ پوپ جو سب سے بڑا مذہبی پیشوا تھا سب سے طاقتور تھا۔ عوام ہی نہیں حکمراں بھی اس کے آگے سرنگوں تھے۔ کوئی بادشاہ اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اشارے پر جانشینی کے مسئلے حل کیے جاتے۔ کلیسا کے پاس لامحدود دولت تھی۔ زمین کے ایک بڑا حصہ اس کی ملکیت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی طبقہ، بشپ اور پادری وغیرہ خوشحال زندگی گذارتے اور ان کا شمار اعلیٰ طبقہ میں ہوتا۔ جاگیردارانہ نظام اس دور کی دوسری خصوصیت تھا۔ سیاسی افراتفری اور بدنظمی کے نتیجے میں جاگیردار عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لیے آگے آئے۔ گو وہ بادشاہ کے ماتحت ہوئے اور وہی انہیں جاگیر عطا کرتا، لیکن عملی طور پر وہ خود مختار تھے۔ ان کی جاگیر میں رہنے والے عوام کسان یا نیم غلام کی حیثیت سے ان کی بے بس رعایا تھے۔ زراعت، معیشت کی بنیاد تھی لیکن پیداوار کا اصل نفع ان جاگیرداروں کو حاصل ہوتا جبکہ کسان استحصال کا شکار تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی سے یہ صورتحال تبدیل ہونا شروع ہوئی۔ جب قسطنطنیہ پر ترک مسلمانوں نے قبضہ کر لیا، جس کے نتیجے میں یورپ کے تجارتی روابط مشرقی حصے سے منقطع ہو گئے۔ واسکوڈی گاما اور کولمبس کی بحری مہمات نے امریکہ کی دریافت کی اور ہندوستان کا نیا راستہ تلاش کیا۔ جس نے تجارت کے نئے مواقع فراہم کیے۔ زراعت کی اہمیت کم ہوئی۔ جاگیردارانہ نظام زوال پذیر ہو گیا۔ مذہبی اصلاحی تحریکوں نے پوپ اور کلیسا کو کمزور کیا۔ اور ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ اس دور کی خصوصیات میں قومی ریاستوں کا قیام، سرمایہ دارانہ نظام، نئی سائنسی ایجادات، نئے شہروں کا وجود اور نوآبادیات شامل ہیں۔ جدید عہد نے یورپ میں سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور مذہبی ہر سطح پر تبدیلیاں پیدا کیں۔

1.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

کلیسا	:	عیسائیوں کی عبادت گاہ
ٹیتھ (Tithe)	:	مذہبی ٹیکس
پوپ	:	رومن کیتھولک عیسائیوں کا سب سے بڑا مذہبی سربراہ
جاگیر	:	سرداروں کی ملکیت اراضی کے وہ بڑے قطعات جن پر انہیں انتظامی اختیارات حاصل ہوئے۔
زرعی غلامی	:	جاگیرداروں کے کھیتوں پر بیگار کرنے والے کسان
مینر	:	جاگیرداروں کے قلعہ
کیروسیڈ	:	گیارہویں صدی سے پندرہویں صدی کے درمیان عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی مذہبی جنگیں

قطب نما	:	(Compass) بحری سفر میں سمت بتانے والا آلہ
نوآبادیات	:	وہ ممالک جن پر کسی دوسرے ملک کا قبضہ ہو

1.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. ہن حملہ آوروں نے کس سلطنت کا خاتمہ کیا؟
2. بازنطینی سلطنت کے دارالحکومت کا نام بتایئے۔
3. پوپ کس مذہبی گروہ کا سربراہ ہے؟
4. کس حکمراں کی موت کے بعد جاگیردارانہ نظام کا آغاز مانا جاتا ہے؟
5. واسکوڈی گاما ہندوستان کب پہنچا؟
6. ہنری ہفتم نے کس ملک میں اپنا اقتدار قائم کیا؟
7. قسطنطنیہ پر ترکوں نے کب حملہ کیا؟
8. عہدِ وسطیٰ میں تجارتی تنظیمیں کیا کہلاتی تھیں؟
9. عہدِ وسطیٰ کے یورپ میں سماج کتنے حصوں میں تقسیم تھا۔

1.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پانچویں صدی عیسوی میں رومی سلطنت کی صورتحال پر روشنی ڈالیے۔
2. "عہدِ وسطیٰ میں کلیسا ایک طاقتور ادارہ تھا" اس کی وضاحت کیجیے۔
3. جاگیردارانہ نظام کی خامیاں بیان کیجیے۔
4. قومی ریاستوں کے قیام کے کوئی دو سبب بیان کیجیے۔
5. صلیبی جنگوں سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

1.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جاگیردارانہ نظام سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ اس کے زوال کے اسباب کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. سرمایہ داری کے آغاز اور عروج پر مفصل روشنی ڈالیے۔
3. جدید عہد کی بنیادی خصوصیات پر اظہارِ خیال کیجیے۔

1.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد(Suggested Learning Resources)

1. Acton, Lord, *Lectures on Modern History*, London, 1906.
2. Cameron, Kenneth Neill, *Humanity and Society*: *A World History*, Aakar, Delhi, 2009.
3. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
6. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
7. Fisher, H.A.L, *A History of Europe*, Edward Arnold Publishers Ltd., London, 1916.
8. Hazen, Charles Downer, *Modern European History*, G. Bell & Sons Ltd., London, 1919.
9. Mahajan, V.D., *History of Modern Europe since 1789*, S. Chand & Co. Ltd., New Delhi, 1959.
10. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*, Trinity Press Pvt. Ltd., New Delhi, 2012.

اکائی 2۔ نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح مذہب اور تحریک رد اصلاح مذہب

(Renaissance, Reformation, and Counter Reformation)

اکائی کے اجزاء

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 نشاۃ ثانیہ

2.2.1 نشاۃ ثانیہ کے فروغ کے اسباب

2.2.2 نشاۃ ثانیہ کے فروغ کی خصوصیات

2.3 نشاۃ ثانیہ اور فنون لطیفہ

2.4 نشاۃ ثانیہ اور ادب و سائنس

2.5 دیگر یورپی ممالک میں نشاۃ ثانیہ

2.6 نشاۃ ثانیہ کے اثرات واہمیت

2.7 اصلاح مذہب تحریک

2.7.1 تحریک اصلاح مذہب کے اسباب

2.7.2 جرمنی میں اصلاح مذہب تحریک: مارٹن لوتھر، ژونگلی اور کالوِن

2.7.3 برطانیہ میں اصلاح مذہب تحریک

2.8 رد اصلاح مذہب تحریک

2.9 اکتسابی نتائج

2.10 کلیدی الفاظ

2.11 نمونہ امتحانی سوالات

2.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید (Introduction)

’رینیساں‘(Renaissance) کے معنی ہیں ’نشاۃ ثانیہ‘(Rebirth) یا احیاء یا کسی ختم ہوئی تہذیب و تمدن یا آثار کا دوبارہ زندہ ہونا۔ مورخین اس تحریک کو تہذیبی و تمدنی احیاء کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ اس تمدن کا نام ہے جس نے لوگوں کے دلوں سے سلطنت، معاشرت، فطرت، علوم و فنون اور فلسفہ کے متعلق ان خیالات کو محو کر دیا جو عہدِ وسطیٰ میں قائم تھے۔ عہدِ وسطیٰ کے تنگ و محدود خیالات رفتارِ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہو چکے تھے۔ پس جب چودھویں و پندرہویں صدی میں یونان و روما کے قدیم علوم پھر سے روشناس عالم ہو رہے تھے اور قدیم زمانے کے علوم و فنون کے خزانوں کا انکشاف ہونے لگا تو لوگوں میں یہ حوصلہ پیدا ہو گیا کہ ویسی ہی آزادانہ زندگی بسر کرنی چاہیے جس نے عہدِ قدیمہ کو خوش و خرم و دلفریب بنا دیا تھا اور آہستہ آہستہ قدیم خیالات نے عہدِ وسطیٰ کے حالات و خیالات سے مل کر ایک خاص ہیئت اختیار کر لی جسے نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ نے انسان کے خیالات و تعلقات زندگی پر بہت اثر ڈالا تھا۔ اس نے خاندان اور نظامِ معاشرت کے اندر انسان کے درجہ و منزلت کو بدل دیا تھا۔ سلطنت کے متعلق خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ تنگ نظری کی جگہ ذہنی وسعت کو فروغ دے کر دلوں میں علم کا ایک شوق موجزن کر دیا تھا۔ اخلاقی آزادی کا ذوق بڑھا دیا اور قوائے ظاہری و باطنی اور دنیا کی حلال و پاکیزہ چیزوں سے تمتع حاصل کرنے کے خیال کو بہت ترقی دے دی اور نظریۂ سیاسی کو بھی بدل دیا۔ اس طرح نشاۃ ثانیہ کا مفہوم ’تہذیب کی دوبارہ زندگی نہیں رہا بلکہ اس سے مراد وہ تمام اہم ثقافتی ترقی سے ہے جو اٹلی میں 1300ء کے بعد رونما ہوئی اور 1600ء سے قبل تمام یورپ میں پھیل گئی۔ محدود معنی میں نشاۃ ثانیہ کا مطلب احیاءِ علوم ہے، یعنی یونان و روم کے علوم کی تجدید۔ اگر وسیع معنی میں دیکھا جائے تو نشاۃ ثانیہ کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک تحریک کی حیثیت سے ایک ذہنی بیداری کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس ذہنی بیداری کے باعث یورپ میں جدید تہذیب کا آغاز ہوا۔ اس دور کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں لوگوں نے تہذیب اور کلیسائی قیود سے نجات حاصل کر کے غور و فکر کا طریقہ اپنایا کیا۔ تحقیق اور مشاہدہ ’استفسار اور دلائل کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ یہی وہ عہد ہے جس میں ہر میدان میں نمایاں ترقی ہوتی رہی، اس لیے اس تبدیلی اور ترقی کے زمانے کو تہذیبی و ثقافتی نشاۃ ثانیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- تیرہویں صدی سے سولہویں تک ہونے والی تہذیبی و تمدنی تبدیلیوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- نشاۃ ثانیہ کے فروغ کے اسباب و عوامل معلوم کر سکیں گے۔
- نشاۃ ثانیہ میں مختلف علوم و فنون کی ترقی اور اس ترقی میں اہم شخصیات کی خدمات کا علم حاصل کر سکیں گے۔
- اصلاح مذہب تحریکِ (Reformation) اور رد اصلاح مذہب تحریک (Counter Reformation) کے اسباب و محرکات معلوم کر سکیں۔

2.2 نشاۃ ثانیہ (Renaissance)

نشاۃ ثانیہ عہد وسطیٰ میں یورپ خصوصاً اٹلی سے اٹھنے والی ایک ثقافتی تحریک تھی جو 13ویں صدی سے سولہویں صدی تک جاری رہی۔ یہ عہدِ قدیم ذرائع کی بنیاد پر علم کی تحصیل، شاہی و پاپائی سرپرستی میں اضافے، مصوری میں متعین سمت میں پیش رفت اور سائنس کے میدان میں ترقی کا احاطہ کرتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کی ابتداء اور انتہائی ترقی دونوں اٹلی میں ہوئی اور بعد میں تمام یورپ میں اس تحریک کی اشاعت ہوئی۔ اٹلی میں روم کی تہذیب و تمدن کا اثر باقی جگہوں سے زیادہ رونما ہوا اور یہاں شہنشاہیت کا اثر تمام جگہوں سے زیادہ کمزور تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہاں جاگیری طریقہ نے کبھی مضبوطی کے سات جڑ نہ پکڑی۔ شہری آزادی حاصل کرنے میں اٹلی کے شہر سب سے آگے تھے۔ یہاں کے شہروں کے محل وو قوع بھی ایسے تھے کہ وہ ذہنی تحریک کے پیدا ہونے کے لیے موزوں تھے اور ایک مدت تک تہذیب و تمدن میں انہی شہروں نے تمام دنیا کی رہبری کی تھی۔ یورپ کی تاریخ میں عہدِ وسطیٰ اور جدید عہد کی ابتداء میں قدیم تعلیم، ادب، فنون لطیفہ اور علوم و سائنس کا جو احیاء ہوا اسے تہذیب و تمدن کا نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔ تہذب و تمدن کے نشاۃ ثانیہ کا مطلب عہدِ وسطیٰ سے عہدِ جدید کی جانب لانے والی ان تمام تبدیلیوں سے ہے جس میں جاگیر داری نظام کا زوال، قدیم زبان و ادب کے مطالعہ میں دلچسپی، قومی ریاستوں کا عروج، جدید علوم و سائنس کی ابتداء، چھاپہ خانہ کی ایجاد، بارود، قطب نما اور نئے تجارتی راستوں کی تلاش، نئے ممالک اور امریکہ کی تلاش اور ابتدائی سرمایہ داری کی ترقی وغیرہ شامل ہیں۔ فشر (Fisher) کے مطابق: 'سب سے پہلے اٹلی کے شہروں میں قدیم یونانی اور رومی فنونِ لطیفہ، زبان و ادب، ثقافت کی تنظیم نو، انسانیت پسند تحریک کی شروعات ہوئی۔ مذہبی میدان میں قدیم یونانی تہذیب کا ملاپ، فن تعمیر اور فن مصوری کی نئی شکل، انفرادی اور آزادانہ تجارت کے اصولوں کا ارتقاء، نئی دلچسپی اور نئے نظریات، تاریخی اور سائنسی تنقید، چھاپہ خانہ کی ایجاد، فلسفہ اور مذہبی قوانین کی نئی شکل و صورت اور تنقید وغیرہ جیسی خصوصیات کے مجموعہ کو تہذیبی اور تمدنی نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے۔' شیول (Schevill) کے مطابق: 'نشاۃ ثانیہ کے معنی عہدِ وسطیٰ سے لاتعلقی نہیں تھا، بلکہ یہ ایک عالمی تحریک تھی اور اس میں ہر طرح کی تبدیلیاں آئیں جو عہدِ وسطیٰ کے یورپ کے خاتمہ اور جدید عہد کی ابتداء تھی۔' مختصراً عہدِ وسطیٰ کے آخری ایام میں پورا یورپ رومن کیتھولک کلیسا اور جاگیر داری نظام کے زیر اثر تھا۔ مگر آہستہ آہستہ وہاں بیداری کے رجحان رونما ہونے لگے۔ یہ رجحان ویسے تو 13ویں صدی سے شروع ہوئے تھے مگر چودھویں اور پندرہویں صدی میں اس نے ایک واضح شکل اختیار کرلی اور کچھ علاقوں میں سولہویں صدی کی ابتداء میں بھی اس رجحان کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہی وہ عہد ہے جس میں ہر میدان میں نمایاں ترقی ہوتی رہی، اس لیے اس تبدیلی اور ترقی کے زمانے کو تہذیبی و ثقافتی نشاۃ ثانیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

2.2.1 نشاۃ ثانیہ کے فروغ کے اسباب (Causes of the Renaissance)

نشاۃ ثانیہ کے فروغ کے متعدد اسباب ہیں، جن میں سب سے اہم معاشی سبب ہے۔ 1200ء کے بعد صنعت و تجارت کو بے انتہا فروغ ہوا اور شہر دولت مند اور خوشحال ہو گیئے۔ شمالی اٹلی کا شہر وینس (Venice) تجارت کا اہم مرکز بن گیا۔ ایک اہم تجارتی مرکز کے طور پر ملان (Milan) کی بھی شہرت ہونے لگی تھی۔ یہاں زربفت اور لوہے کا سامان تیار ہوتا تھا۔ لوکا (Lucca) میں ریشم کی تجارت کا اجارہ

داری تھی۔ فلورنس(Florence) بینکاری کا مرکز تھا۔ اونی اور ریشمی کپڑے کی ایک عمدہ منڈی کے طور پر بھی اس شہر کی مقبولیت تھی۔ 1300 سے 1600ء کے درمیان اٹلی کے اہم شہروں نے محنت اور جانفشانی کے بعد اپنی ہیئت میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ اسی دوران تجارتی راستے دریافت کیے گئے۔ اس سلسلے میں واسکوڈی گاما (Vasco da Gama) نے 1498 میں ہندوستان کا راستہ معلوم کیا۔ کولمبس (Columbus) نے 1492 میں امریکہ کا پتہ لگایا۔ 1521ء میں کورٹز (Cortes) نے میکسیکو (Mexico) فتح کیا اور 1532ء میں پزارو(Pizzaro) نے پیرو(Peru) فتح کیا۔ اس طرح سونے چاندی کے وسیع ذخائر ان کے ہاتھ آئے۔ قیمتی دھاتوں کی اس افراط نے یورپ کی معیشت میں انقلاب برپا کر دیا اور معاشی ترقی کا باعث بنی۔

یورپ کا مشرق سے تعلقات پیدا کرنا بھی نشاۃ ثانیہ کے فروغ کا باعث بنا۔ تہذیب کی بہت سی اقدار یورپ نے مشرق سے سیکھیں۔ جب یورپ میں تاریکی چھائی ہوئی تھی اس وقت عالمِ مشرق (عالمِ اسلام) ترقی کی انتہائی معراج پر تھا۔ تجارت کے سلسلے میں اور صلیبی جنگوں کے دوران یورپ کے لوگ خاص طور پر مشرقی ممالک آئے اور انہوں نے تہذیب اور علم و ثقافت کے نئے سبق سیکھے۔ مسلم اسپین نے بھی اٹلی اور صقلی (صقلیہ) کو تہذیب یافتہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ قرطبہ (Cordoba) ،اشبیلہ (Seville) اور غرناطہ (Granada) کی اعلیٰ درسگاہوں میں یورپ کے عیسائی طلباء حصولِ تعلیم کے لیے گئے اور جب وہ فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے ملک پہنچے تو انہوں نے علم کی شمعیں روشن کیں۔

عہدِ وسطیٰ کے اواخر میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور دانشوروں نے انسانی ذہن کو مذہبی قیود سے آزاد کیا اور یہ درس دیا کہ تحقیق ومشاہدہ، دلائل و استفسار کے سبب حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے مذہب(Religion) اور استدلال (Reason) کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کی۔ اساتذہ اور دانشوروں نے بہت سی عربی کتابوں کا یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اس طرح علم و عمل کی نئی راہیں دریافت کیں۔ ان میں راجر بیکن(Roger Bacon)، البرٹس ڈورر(Albrecht Durer)، تھامس اکویناس (Thomas Aquinas) اور دانتے الیگھیری (Dante Alighieri) خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے علم و فکر کی نئی راہیں کھولیں۔ انہوں نے تحقیق و مشاہدے پر زور دیا اور علم کے حصول کی اہمیت پر زور دیا۔ تھامس اکویناس نے اس بات پر بے حد زور دیا کہ انسان کو اپنی حقیقت کا احساس کرنا چاہیے اور یہ احساس اسی وقت ممکن ہے جب وہ خدا کو پہچان لے۔ دانتے نے ڈیوائن کومیڈی (*Divine Comedy*) تحریر کی۔ اس میں اس نے اپنے روحانی تجربات درج کیے۔

عہدِ وسطیٰ میں یونیورسٹی کے قیام نے بھی بڑی حد تک نشاۃ ثانیہ کی آمد میں مدد کی۔ ان یونیورسٹیز میں طب، قانون اور بہت سے غیر مذہبی علوم کے مطالعے کے باعث علوم و فنون کی ترقی ممکن ہو سکی۔ چودھویں صدی کے اوائل میں قومی زبانوں کو فروغ حاصل ہوا جن میں اطالوی، ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن اور انگریزی وغیرہ اہم ہیں۔ ان قومی زبانوں کی ترویج نے علم کے حصول کو بہت آسان بنا دیا اور ان زبانوں کی وجہ سے قومی یکجہتی کو بھی فروغ ملا۔ اب ہر شخص مذہبی کتابوں کو پڑھ سکتا تھا اور مذہب کو سمجھ سکتا تھا۔ اب پادریوں کی اطاعت میں جکڑے

رہنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ جرمنی میں گٹن برگ (Guttenberg) نے چھاپہ خانہ قائم کر کے کتابوں کی اشاعت شروع کی۔ اس طرح کتب کی فراہمی آسان ہو گئی اور علم عام ہو گیا۔

1453ء میں جب عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تو بہت سے یونانی ترکِ وطن کر کے یورپ جا پہنچے۔ انہوں نے اہلِ یورپ کو تعلیم و تہذیب سے روشناس کرانے میں مدد کی اور یورپ کے نظامِ تعلیم کو درست کیا۔ اٹلی کے تاجروں اور صنعت کاروں نے اپنی دولت کو علم و فن کی ترقی پر خرچ کیا۔ سیاحوں کو نئے ممالک کی دریافت کرنے کی مہم پر لگایا گیا۔ سائنس دانوں نے تجربے اور تحقیق کے ذریعے نئے اصول دریافت کیے اور ان سے علمی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مصوروں نے مناظرِ قدرت اور معاشرتی زندگی کی تصویریں اتاریں۔ شعراء نے آزاد اور خوشگوار فضا میں اپنی نظمیں تحریر کیں۔ معماروں نے عمدہ مکانات بنائے۔ مصوروں نے عوامی زندگی کی تصویریں اتاریں اور سائنس دانوں نے ایسے اصول دریافت کیے، جنہوں نے عام انسان کی زندگی کو آسان اور خوشحال بنا دیا اور اس طرح ایسا ماحول تیار ہوا جس سے عام لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ دنیا کی ہر شئے انسان کے لیے بنائی گئی ہے۔

2.2.2 نشاۃ ثانیہ کے فروغ کی خصوصیات (Characteristics of the Renaissance)

عہدِ وسطیٰ کے یورپ میں سماج، تعلیم اور تہذیب و ثقافت پر رومن کیتھولک کلیسا پوری طرح سے حاوی تھا۔ مذہب کے زیرِ اثر سماج میں مذہبی صحیفوں (گرنتھوں) کے مطالعہ اور مروجہ غلط رسم و رواج پر عمل کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ عوام اور سماجی طبقات پر کیتھولک کلیسا کا بہت گہرا اثر تھا۔ کسی کو اپنی رائے اور نظریات پیش کرنے کی آزادی نہ تھی۔ مصنف، تخلیق کار، سائنٹسٹ داں اور فلسفی کلیسا کے زیرِ اثر تنگ نظری کا ثبوت دے رہے تھے۔ ایسے میں نشاۃ ثانیہ نے عہدِ وسطیٰ کی تہذیب و ثقافت کے مقابلے میں ایک نئی سوچ و فکر اور تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھایا جس کی درجِ ذیل خصوصیات تھیں:

انسانیت پسندی: انسانیت پسندی (Humanism) نشاۃ ثانیہ کی اہم خصوصیت ہے۔ اسی فلسفہ سے عہدِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے مطابق انسان کی ذات کائنات کا مرکز ہے۔ اس لیے مجموعی انسانی زندگی کا مطالعہ اور اس کی ترقی کی کوشش انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ Humanism (انسانیت پسندی) کی اصل اور ابتداء *Humanitus* (ترقی یافتہ علم) سے ہوئی ہے۔ اس لیے انسانیت پسند ادیبوں نے انہوں نے عہدِ وسطیٰ میں رائج ادب کے تئیں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی بلکہ قدیم یونانی اور رومی ادب کا علم ضروری بتایا۔ یہ تحریک عہد وسطیٰ میں رائج مذہبی روایات کی دشمن تھی کیونکہ اس عہد میں انسان مذہب، کلیسا اور پادریوں کا غلام تھا اور یہ انسانی اقدار کے بالکل منافی تھا۔ ان ادیبوں نے ان تمام مضامین کا مطالعہ کرنے پر زور دیا، جس کا تعلق حیاتِ انسانی (Humanity) سے تھا۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے ایسے ادب کی تشکیل کی جس کا دقیانوسی مذہب سے کم اور انسان اور اس کے سماج سے زیادہ تعلق تھا۔ اٹلی کے بعد یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی انسانیت پسندی کے نظریہ کی تبلیغ ہوئی۔ پیٹراک (Petrarch, 1304–1374) تحریک انسانیت پسندی کا بانی (Father) تھا جسے فلورنس سے ملک بدر کر دیا گیا۔ اس نے علم کے حصول اور اشاعت کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس نے نظم کی

ایک نئی صنف کی تشکیل کی جسے سونیٹ(Sonnet) کہتے ہیں۔اپنی محبوبہ لارادی نووس کی یاد میں اس کی نظم 'لارا'(Laura)بہت معرکہ الآراء ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں یہ خیال عام تھا کہ آخرت اس دنیا سے زیادہ اہم ہے۔ پیٹراک اس خیال کا مخالف تھا۔اس نے دنیاوی زندگی کی اہمیت پر زور دیا اور مذہب کی قید وبند سے انسان کو آزاد کرانے کی تحریک چلائی۔ پیٹراک میں حب الوطنی کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ وہ مناظرِ قدرت کا بھی پرستار تھا اور اسے یونانی ثقافت سے بے حد لگاؤ تھا۔

گیوانی بوکاسیو(Giovanni Boccaccio)نے رومی علوم کے مطالعہ پر کافی توجہ دی۔اس نے کہانی کی ایک کتاب 'ڈی کیمرون' (De-Cameron) لکھی۔ اس میں جو کہانیاں ہیں اس کا موضوع جاگیرداری عہد کے رومان اور عام کہانیاں ہیں۔ بالدسارے کیسٹیگ لیونے(Baldassare Castiglione, 1478–1529)نےCourtierنام کے جریدہ کے ذریعے تحریکِ انسانیت کی ترویج اور جدید تہذیب کی نشوونما میں حصہ لیا۔فلسفہ اور سیاست کے میدان میں بھی نئی تصنیفات منصۂ شہود پر آئیں۔

تحریکِ انسانیت نے لوگوں میں یونانی زبان پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ تعلیم وتعلم میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ایک نئے زاویۂ فکر کے مطابق تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ایک مرتبہ پھر سسرو(Cicero)کے خیالات کی ترویج ہوئی۔اس کا کہنا تھا کہ لوگوں کو اس طرح تعلیم وتربیت دی جانی چاہیے کہ وہ سماج کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔ تحریکِ انسانیت کو فروغ دینے میں اہلِ ثروت کا بھی بڑا دخل رہا۔انہوں نے علوم وفنون کی سرپرستی کو بخوشی قبول کیا اور دانشوروں وفنکاروں کی حوصلہ افزائی کی اور مالی اعانت بھی کی۔اس طرح علوم وفنون کو بے انتہا فروغ ملا۔ تحریکِ انسانیت کے زیرِ سایہ عورتوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے اور اپنا صحیح مقام حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ وہ اب مردوں کے شانہ بشانہ چل سکتی تھیں۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔میلان، فرارا، مانٹوا اور فلورنس کے شاہی درباروں میں عورتیں اہم حیثیت کی حامل تھیں۔

انفرادیت: نشاۃ ثانیہ نے انفرادیت کے خیال کی پرورش کی اور بڑے لوگوں کی قدر ومنزلت اس عہد میں ہونے لگی۔ نشاۃ ثانیہ کی لہر نے انفرادی اور شخصی عمل وتخلیق میں فخر محسوس کا اور اس کی جدیدیت پسندوں اور انسانیت پسند عالموں وادیبوں نے تعریف کی۔ سماج کے دوسرے طبقے اور پیشہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے بھی انفرادی اور شخصی نکتۂ نظر کو تسلیم کیا جو پہلے سے چلی آرہی رسم ورواج اور اقدار کے مخالف تھا۔

لامذہبیت: نشاۃ ثانیہ کی تیسری خصوصیت لامذہبیت(Secularism) تھی۔ عہدِ وسطیٰ کے ادب اور تعلیم پر کیتھولک کلیسا کا کنٹرول تھا جس کے باعث زیادہ تر ادب کی تخلیق مذہب سے متاثر ہوئی۔ لیکن تہذیبی وثقافتی نشاۃ ثانیہ انسیانی ذہن ودماغ کو تقلید جامد اور روایتی تنگ ذہنی سے آزاد کر کے ان میں وسعت ذہنی اور سائنسی نکتۂ نظر کو پروان چڑھایا جس کے نتیجے میں مذہب اور اندھی تقلید کا اثر کم ہونے لگا اور لامذہبیت کو فرغ ملا۔

معاشرتی زندگی میں تبدیلی: نشاۃ ثانیہ کے باعث شہروں کی زندگی کے ساتھ ساتھ معاشرتی ربط وضبط کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں۔ دعوتیں، جلسے، رقص و سرود کی محفلیں اور بہت سی تقریبات ایسی قائم ہوئیں جو پہلے نہیں تھیں۔ اس طرح نشاۃ ثانیہ میں نظام معاشرت خود ایک فن لطیف بن گیا اور ان سب کی وجہ سے اخلاق و مذہب میں بھی تبدیلی آئی۔

سیاسی نظریہ میں تبدیلی: عہدِ وسطیٰ کے یورپ میں بادشاہ اور حکمراں کو خدا کا مقرر کردہ تصور کیا جاتا تھا، اس لیے تمام لوگ اس کے تابع فرمان ہوا کرتے تھے۔ کسی کو یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ یہ سوال کرسکے کہ حکومت کی یہ صورت مفید ہے یا نہیں؟ نشاۃ ثانیہ نے اس سیاسی خیال میں ایک اصولی تغیر پیدا کردیا۔ اب یہ خیال رائج ہو چلا کہ 'حکومت' انتظام مملکت کے لیے قائم ہوتی ہے اور اس لیے حکومت کی بہترین صورت وہی ہے جس میں انتظام سب سے بہتر ہو سکے۔ یہیں سے یہ بحث شروع ہوئی کہ حکومت کے اغراض کیا ہیں؟ اور ان اغراض کے حاصل کرنے کا موزوں ترین ذریعہ کیا ہے؟ علمِ سیاسیات کی ابتداء نشاۃ ثانیہ کی اسی بحث سے ہوئی۔ لوگ یہ یقین کرنے لگے کہ حکومت کی کوئی خاص شکل خدا کی مقرر کردہ نہیں ہے بلکہ انسان کی بنائی ہوئی ہے، اس لیے انسان کو یہ حق ہے کہ جس قسم کی حکومت کے تحت وہ رہنا چاہے ویسی ہی حکومت قائم کرے۔ نئے خیالات کے زیر اثر ہی میکیاولی (Machiavelli, 1469–1527) نے *The Prince* نامی کتاب لکھی اور اس میں حکومت کی عملی کارروائیوں سے بحث کی۔ اس نے فلورنس کی تاریخ بھی مرتب کی۔ وہ محب وطن اور اٹلی کے اتحاد کا علمبردار تھا۔ اپنی کتاب *Discourses of Livy* میں وہ تاریخ اور حکومت و سیاست سے متعلق اپنے فلسفہ کو پیش کرتا ہے۔ اپنی دوسری کتاب *Art of War* میں اس نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حکمراں ایام جنگ میں کس کس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ برطانیہ میں تھامس مور (Thomas More) نے *Utopia* نامی کتاب لکھی جس میں اس نے یہ بتایا کہ ایک مکمل سلطنت کیسی ہونی چاہیے۔

عہد قدیم میں دلچسپی: نشاۃ ثانیہ نے عہدِ وسطیٰ کے مقابلے میں قدیم زمانے کو ترجیح دی۔ عہدِ وسطیٰ زہد و رہبانیت کا زمانہ تھا اور انہیں یونانیوں کی آزاد خیالی، حسن پرستی اور عیش و طرب کی کچھ خبر نہ تھی۔ نشاۃ ثانیہ میں جب قدیم علوم کی بازیافت ہوئی تو آنکھیں کھلیں اور لوگ قدیم زمانے کو واپس لانے کے لیے کوشاں ہوگئے۔ اس طرح لاطینی و یونانی زبان و ادب کے حصول کا ذوق و شوق انتہا کو پہنچ گیا اور ہر طرف پرانے مصنفین کے ایسے قلمی مسودات کی تلاش ہونے لگی جن کا اب تک پتہ نہیں چلا تھا۔ نادر نسخوں (Manuscripts) کے اکٹھا کرنے، ان کی تلاش کرنے، پھر ان کو کتب خانوں میں جمع کرنے اور ان کی نقلیں کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔

کلیسا مخالف رجحان: نشاۃ ثانیہ میں تنقیدی اور سائنسی نظریات کے فروغ کے سبب جہاں لامذہبیت کو فروغ ملا وہیں عوام نے کیتھولک کلیسا اور اس سے وابستہ مذہبی اہلکاروں پر توجہ مبذول کی۔ اس دوران انہیں کلیسا اور مذہبی اہلکاروں میں بہت سی برائیاں اور کمیاں نظر آئیں جس کی انہوں نے تنقید شروع کردی۔ نتیجتاً کیتھولک کلیسا اور اس سے منسلک مذہبی رہنماؤں کے خلاف عوامی بغاوت شروع ہوگئی۔ کیتھولک کلیسا نے اپنے مخالفین کو سزائیں دیں۔ بعد میں کلیسا مخالف رجحان نے اصلاح مذہب تحریک کا راستہ ہموار کیا۔

قومیت پر مبنی رجحان کا فروغ: نشاۃ ثانیہ میں قومیت کے رجحان کو بھی فروغ ملا۔ مغربی یورپ میں بہت سے Nation State منظر عام پر

آئے۔ ان ریاستوں کے حکمراں نے بادشاہت کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ قوم پرستی کے احساس کے فروغ کے سبب اس عہد میں ملکی زبانوں اور قومی زبان وادب کو بھی فروغ ملا۔

2.3 نشاۃ ثانیہ اور فنون لطیفہ (Renaissance and the Fine Arts)

نشاۃ ثانیہ میں یونانیوں اور رومیوں کے بنائے ہوئے مجسموں کی دریافت ہوئی جس کے باعث قدماء کی دستکاریوں کی حسن و خوبی کی طرف خیال مائل ہوا اور اسی زمانے سے فنون لطیفہ کے مطمحِ نظر میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب مصور اپنے پرانے خیالات کو ترک کر کے یونانی خیال کے مطابق حسن و لطافت کی تصویریں بنانے لگے۔ خوبصورت مردوں اور حسین عورتوں کی تصویریں اس طرح دکھائی جاتی تھیں کہ وہ اس دنیا کے عیش و عشرت میں مشغول ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کی وجہ سے خیالات یکسر تبدیل ہو گئے اور عہدِ وسطیٰ کی ہر چیز سے نفرت ہو گئی اور قدیم زمانے کی ہر شئے قابل قدر و قابل تقلید سمجھی جانے لگی۔ اس عہد میں آرٹ، فن تعمیر، فن مصوری اور فن سنگتراشی میں بے حد تبدیلیاں آئیں۔ اس عہد کے فن کاروں نے آرٹ کو ایک نئے انداز میں پیش کیا۔ مصوری کو تو ترقی کے اس درجے پر پہنچا دیا گیا جہاں اسے مغربی دنیا کی معراج کہا جانے لگا۔ درجِ ذیل سطور میں چند فنون اور فنکاروں سے متعلق بحث ہوگی۔

مصوری (Painting)

گیوانی بوکاسیو (Giovanni Boccaccio) فلورنس کا ایک مشہور فنکار تا۔ اس نے مصوری کو نئے اقدار سے روشناس کرایا۔ اس کے آبکار نقاشی (Frescoes) جسے Caesars Tribute کے نام سے جانا جاتا ہے، فلورنس کے کارمائن کلیسا کی دیواروں پر پائے گئے ہیں جو نہایت خوبصورت ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے روشنی اور سایہ کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ بوٹی سیلی (Botticelli) نے زہرہ کی پیدائش (Birth of Venus) نامی تصویر بنائی۔ نشاۃ ثانیہ کی مصوری کے دور عروج میں لیونارڈو ڈا ونسی (Leonardo-da-Vinci, 1452–1519)، مائیکل انجیلو (Michelangelo, 1472–1564) اور رافیل (Raphael, 1483–1520) جیسے معروف مصوروں نے اپنے شاہکار پیش کیے۔ لیونارڈو ڈا ونسی فلورنس کا شہری اور نشاۃ ثانیہ کا بہترین مصور تھا۔ اس کے بہترین شاہکاروں میں مونالیزا (Monalisa) اور آخری طعام (The Last Supper) بہت مشہور ہیں۔ اس کا شاہکار 'ورجن آف راک' (Virgin of Rocks) بھی نہایت اعلیٰ پایہ کا ہے۔ فن مصوری پر اس کی ایک کتاب بھی ہے جو 'Treatise of Painting' کے نام سے ہے۔ مائیکل انجیلو فلورنس کا رہنے والا تھا اور بہت ہی قابل مصور تھا۔ اس کے شاہکاروں میں سب سے مشہور 'آخری فیصلہ' (The Last Judgement) ہے۔ اسے دنیا کے بہترین شاہکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مائیکل انجیلو کو فنِ تعمیر، فنِ جنگ اور دوسرے کئی فنون سے دلچسپی تھی۔ وہ مصور سے زیادہ سنگ تراش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں 'معماری اور مصوری پر سنگ تراشی کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس فن کے ذریعہ زندگی کو اچھی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔' رافیل، لیونارڈو ڈا ونسی سے کافی متاثر تھا۔ اس کا شمار بھی نشاۃ ثانیہ کے بڑے فنکاروں میں ہوتا تھا۔ 1500 سے 1510 کے دوران رافیل نے اپنی اعلیٰ ترین تخلیقات پیش کیں۔ لیونارڈو کی تصویر

مونالیزا اسے اس نے تصویریں بنانے کی نئی تکنیک سیکھی۔ مائیکل انجیلو کا اثر بھی اس کی تصویر کشی میں ظاہر ہوتا ہے۔ 1509 اور 1511 کے درمیان کی اس کی جو نقش نگاری ہے ان کا موضوع انسان کی ذہنی صلاحیت تھا۔ یہ تصاویر نشاۃ ثانیہ کے دور کی اعلیٰ ترین تخلیق میں شمار ہوتی ہیں۔ اس نے مشہور شاہکار (The Sistine Madonna) ترتیب دیا۔ 1508ء میں پوپ جولیس دوم نے اسے روم بلایا اور Sistine Chapel کے بغل کے کمروں کو آراستہ کرنے کا کام سپرد کیا۔ ایک کمرے میں اس نے دو آبکار تصاویر بنائیں جو توجہ کا مرکز ہیں۔ ان میں ایک Disputa اور دوسری School of Athens کے نام سے مشہور ہے۔ ٹیٹین (Titian, 1477–1576) وینس کے بہترین مصوروں میں سے ایک تھا۔ اس نے مصوری کی ان تمام خصوصیات کو اپنانے کی کوشش کی جسے لیونارڈو ڈاونسی، مائیکل انجیلو اور رافیل نے پیش کیا۔ اس نے قدرتی مناظر اور افراد دونوں کی تصویریں بنائیں۔ اس کا شاہکار Assumption of Virgin کے نام سے مشہور ہے۔ وینس کے دیگر مصوروں میں ٹنٹوریٹو (Tintoretto) اور ویرونیز (Veronese) کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ وینس کا فنِ مصوری مذہبی سے زیادہ عوامی تھا، اس لیے اس نے اکثر افراد کی تصویر کشی کی اور ایسے مناظر پیش کیے جو وینس کی زندگی کے ترجمان تھے۔ وینس کے لوگ بھی اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کی تصویریں بنوانے میں بے حد دلچسپی لینے لگے تھے۔ لہٰذا شبیہی تصاویر کو بہت فروغ ملا۔

سنگ تراشی یا مجسمہ سازی (Carving or, Sculpting)

نشاۃ ثانیہ کے سنگ تراشی کا پہلا نمونہ غالباً لاریزو گبرٹی (Lorenzo Ghiberti) نے پیش کیا۔ فلورنس کے اصطباغ خانہ (Baptistery) کے شمالی سمت میں اس نے کانسے کے دو دروازے بنائے اور ان پر 18 تختیاں (panels) لگائیں جن پر عہد نامہ جدید (New Testament) سے مناظر پیش کیے۔ لیکن اس کی کامیابی کی معراج شمالی سمت کے دو دروازے ہیں جن پر عہد نامہ قدیم (Old Testament) کو موضوع لے کر تصاویر بنائی گئی ہے۔ یہ تصاویر فطرت پسندی کی عمدہ مثال ہیں اور ان میں تناظر و پس منظر میں بہت کامیابی سے تاثر دیا گیا ہے۔ یہ دروازے اس قدر خوبصورت ہیں کہ مائیکل انجیلو بے اختیار پکار اٹھا تھا کہ یہ تصاویر 'جنّت کے دروازوں کو مزین کرنے کے لیے نہایت موزوں ہیں۔' ڈوناٹیلو (Donatello, 1386–1466) اٹلی کا دوسرا مایہ ناز سنگ تراش تھا۔ ڈوناٹیلو نے سنگ تراشی کی قدیم روایات کو اپنی بنیاد بنایا اور بہت سی مجسمے بنائے۔ تاہم اس کے مشہور ہونے کا بنیادی سبب وینس میں بنا سینٹ مارک (کلیسا) کا مجسمہ ہے۔ یہ قدیم (کلاسیکی) خیالات کے تمام تراثرات سے مرصع ہے۔ اس کا ایک دوسرا شاہکار گٹامیلٹا (Gattamelata) کے نام سے موسوم ہے جس میں ایک فوجی جرنل کو گھوڑے پر سوار دکھایا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا اپنے جرنل کی کامیابیوں پر خندہ زن، نہایت شاہانہ انداز میں بڑھتا چلا جارہا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے ایک سنگ تراش منٹینا (Mantegna) نے تناظر کے مسائل پر عبور حاصل کیا۔ وہ علم الابدان میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا۔ اسی لیے اس کے شاہکار زیادہ متناسب اور مکمل معلوم ہوتے ہیں۔ مائیکل انجیلو بھی مصور کے ساتھ ایک ماہر سنگ تراش تھا۔ اس نے سنگ مرمر کا ایک مجسمہ سینٹ پیٹر کے کلیسا میں 'Pieta' کے نام سے نصب کیا۔ اس مجسمہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں روایتی عیسائی جذبات کو کلاسیکی عینیت پسندی سے ملا کر پیش کیا ہے۔ کانسے سے تیار اس کا سب سے اہم شاہکار ڈیوڈ (David) ہے۔ پوپ جولیس دوم کے مقبرے کے لیے بھی اس نے نادر نمونے تیار کیے۔ اس کے علاوہ لوکا ڈیلا روبیا (Luca della Robbia)

اور ویروچیو(Verrocchio)کا بھی شمار نشاۃ ثانیہ کے اہم ترین سنگ تراشوں میں ہوتا ہے۔

فن تعمیر (Architecture)

نشاۃ ثانیہ کے دوران فن تعمیر میں بھی نیا رجحان ابھر کر سامنے آیا۔ اولین معمار جس نے رومی فن تعمیر کو اپنایا، فلپو برونیلیشی (Filippo Brunelleschi,1377–1466) تھا۔اس کی تعمیر کردہ متعدد خوبصورت عمارتیں فلورنس شہر کی خوبصورتی کا باعث بنیں۔اس کی تعمیر میں عہد وسطیٰ کے خیالات اور رومی خیالات کے امتزاج کا طریقہ اختیار کیا گیا۔نشاۃ ثانیہ میں جو عمارتیں اور محل تعمیر ہوئے ان میں میڈیسی خاندان کے حکمراں کاسمو میڈیسی کا محل، فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔اسے مشیلزو (Michelozzo)نے تعمیر کیا۔ بعد میں البرٹ(Albert) نے اسی طرح کا ایک دوسرا محل روسلائی (Rucellai Palace) تعمیر کیا۔ برامانٹ (Bramante)نے نشاۃ ثانیہ کے روم میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔اس کے شاہکاروں میں ٹیمپیٹو(Tempietto)کا کلیسا قابل ذکر ہے۔اس عہد کی سب سے اہم تعمیر سینٹ پیٹر کا کلیسا ہے جسے پہلے شہنشاہ کانسٹنٹائن نے تعمیر کرایا تھا جسے اس دور میں از سر نو تعمیر کیا گیا۔اس کی دوبارہ تعمیر کے لیے پوپ جولیس دوم نے برامانٹ، مائیکل انجیلو اور رافیل کے علاوہ دیگر ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ مشہور معمار پلاڈیو (Palladio)نے وسینزا(Vicenza)شہر کا میونسپل ہال تعمیر کیا۔یہ عمارت بھی بہت دلکش اور خوبصورت ہے۔

موسیقی (Music)

نشاۃ ثانیہ میں فن موسیقی میں نئے رجحانات فروغ پانے لگے۔ اس عہد کے موسیقاروں نے سر(Harmony)، تال (Rhythm)اور ہم آہنگی(Symmetry)کو بنیاد بنا کر موسیقی کے فن کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ نئی نئی دھنیں، تال اور سُر بنائے گئے اور آلاتی موسیقی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا گیا۔اٹلی کے موسیقار پیلسٹرینا(Palestrina)اور گیبریلی(Gabrieli) نے یونانی، رومی اور عبرانی روایات سے متاثر ہو کر موسیقی کے میدان میں نئے نئے تجربے کیے۔

2.4 نشاۃ ثانیہ اور ادب وسائنس (Renaissance, Literature, and Science)

نشاۃ ثانیہ میں دانشوروں نے قدیم یونانی ورومی ادب کے مطالعہ، غور وخوض اور اس پر بحث ومباحثہ کے بعد مروجہ نکتۂ نظر کے ساتھ اسے مربوط کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے قسطنطنیہ کے دانشوروں نے اس کی طرف اپنا دھیان مرکوز کیا۔ مگر 1453ء میں قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہو جانے کے باعث وہاں کے دانشور و علماء مغربی یورپ کے دیگر علاقوں میں ہجرت کر گئے اور ان کے ساتھ قدیم زبان وادب کے مطالعہ اور اس پر غور وخوض کا رجحان بھی پہنچا جس کی وجہ سے علم وادب، سائنس وآرٹ اور فنونِ لطیفہ کے میدان میں نئی شناخت قائم ہوئیں اور قدیم طرز پر ہی نئے عہد کی پکار اور تقاضوں کی بنیاد رکھی گئی۔اس طرح علم وادب کے میدان میں تین اہم نظریات سامنے آئے۔

1. انسانیت (Humanism)
2. کلاسیکیت (Classicism)

3. انفرادیت (Individualism)

انسانیت پسند علماء و دانشوروں نے قدیم یونانی و رومی ادب کے مطالعے پر خاص توجہ دی۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کو تہذیب کے دائرے میں رہ کر ترقی کے منازل طے کرنے کے لیے قدیم زبان و ادب اور تہذیب و تمدن کا علم رکھنا ضروری ہے۔ انہوں نے عہدِ وسطیٰ میں رائج مذہب اور مذہبی کتابوں کے تئیں کسی طرح کی دلچسپی و وفاداری کے بجائے قدیم مذہبی صحائف کی بازیافت میں دلچسپی لی اور ان میں جو خامیاں تھیں، ان کی اصلاح کر کے ان کے تحفظ و اشاعت پر زور دیا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ انسان ان سبھی مضامین کا مطالعہ کرے جو انسانی زندگی سے متعلق ہوتا کہ انسان عہدِ وسطیٰ کی اندھی تقلید اور خرافات سے اپنے کو آزاد کر سکے۔ انسانیت پسند دانشوروں کے اثر سے عوام کا یقین آہستہ آہستہ عہدِ وسطیٰ میں رائج مذہب و فلسفہ سے اٹھتا گیا اور پندرہویں صدی کے نصف آخر میں انسانیت پسند نظریہ اٹلی میں پروان چڑھا۔

اٹلی میں نئے عہد کا رہنما عظیم شاعر دانتے (Dante, 1265–1321) تھا جس نے اپنی نظموں کے ذریعے عوام کو متاثر کیا۔ اپنی مادری زبان اطالوی میں اس نے اپنی شہرہ آفاق تمثیلی نظم 'ڈیوائن کومیڈی' (*Divine Comedy*) تحریر کی۔ اس میں اس نے موت کے بعد روح کے جنّت و جہنم کے ارد گرد چکر لگانے کی منظر کشی کی ہے۔ اس کتاب میں عذاب جہنم کے واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ فرانسیسکو پیٹرآرک (Francesco Petrarch, 1304–1374) نے بھی دانتے کے طرز پر نظمیں تحریر کیں۔ اس نے قدیم یونانی اور عہدِ وسطیٰ کی لاطینی زبان کے امتزاج میں اپنی قابلیت دکھائی۔ اس نے قدیم میں جدید کے سنگم کو بڑے اچھے انداز میں پرویا ہے اور انسانیت پر زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بابائے انسانیت پسندی کہا جاتا ہے۔ پیٹرآرک کے نظریات کو جیوانی بوکاچیو (Giovani Boccaccio, 1313–1375) نے اپنی کہانیوں کے ذریعے آگے بڑھایا۔ اس کی تخلیقات میں 'فیامیٹا' (Fiametta) اور 'ڈی کیمران' (Decameron) ہیں۔ ڈی کیمران کی وجہ سے ہی اسے بڑی شہرت ملی۔ 'ڈی کیمران' کا دوسرا نام 'دس دن' (Ten Days) بھی ہے۔ یہ سو چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ہے جو 1349 سے 1353 کے درمیان تحریر کی گئیں۔ 'کواٹرو سنٹو' (Quattrocento) کے نام سے مشہور پندرہویں صدی کے اٹلی میں لاطینی زبان کا احیاء ہوا اور قدیم رومی ادب کے مطالعہ کا رجحان تیز ہوا۔ اس عہد کے ادیبوں نے لاطینی زبان کا استعمال کرتے ہوئے 'دانتے' اور 'بوکاسیو' کے ذریعے استعمال شدہ اطالوی زبان پر طنز کیا، جس کے باعث اس عہد میں اعلیٰ درجہ کا ادب تخلیق نہ ہو سکا۔ اس عہد کے مشہور مصنف 'پاگیو' (Poggio)، 'بیکادیلی' (Beccadelli) اور 'فیلفو' (Filelfo) تھے۔

کواٹرو سنٹو عہد کی اہم خصوصیت یونانی زبان و ادب کا مطالعہ تھی۔ 1313ء میں یونانی عالم 'مینول کریسولورس' (Manual Chrysoloras) قسطنطنیہ سے وینس گیا اور اس کے ساتھ بہت سے دانشور و ادیب بھی گئے، جس کے باعث وہاں کے لوگ یونانی زبان کے مطالعہ کی طرف راغب ہوئے اور 'جیوانی آرسپا' (Giovanni Aurispa) نے 1413 سے 1423 کے درمیان 250 یونانی صحائف کا احیاء کیا اور اس طرح 'سوفوکلیز' (Sophocles)، 'یوری پیڈیس' (Euripides) اور 'تھیوسی ڈائیڈس' (Thucydides) جیسے دانشوروں کے صحائف جدید دنیا کے سامنے آئے۔

1500ء میں شروع ہونے والے عہد کو 'سینکویسنٹو' (Cinquecento) کے نام سے جانا جاتا ہے جس میں قدیم و جدید اثرات کو یکجا کرنے اور حقیقت پسندی (Realism) کا رجحان اہم تھا۔اسی زمانے میں اطالوی زبان کو یونانی اور لاطینی زبان کے مساوی کرنے کی کوشش کی گئی۔اس عہد میں رزمیہ شاعری، ناٹک اور تاریخ تینوں فن میں کئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔'لوڈوویکو اریوستو' (Ludovico Ariosto, 1474–1533) اہم رزمیہ شاعر تھا۔اس کی شاعری 'آرلینڈو فیوروسو' (Orlando Furioso) کے نام سے بہت مشہور ہے۔ایک شاعر جوکوپو سنازارو (Jocopo Sannazaro, 1458–1530) تھا جس نے 'آرکیڈیا' (Arcadia) نامی نظم لکھی۔ناٹک کے فن میں اٹلی کے ناٹک نویس بہت زیادہ ترقی نہیں کر سکے۔اٹلی کے مشہور مفکر و مورخ نکولو میکیاولی، مشہور ناٹک نویس تھا۔اس نے 'لا میندراگولا' (La Mandragola) نام سے ناٹک تحریر کیا جو موجودہ نشاۃ ثانیہ کے سماج پر ایک طنز تھا۔دوسرا ناٹک نویس پیترو آرتینو (Pietro Aretino 1492–1556) تھا، جس نے اپنے ناٹکوں میں انسانی زندگی کی بہت ہی آسان واضح انداز میں منظر کشی کی ہے۔زیر مطالعہ عہد (نشاۃ ثانیہ) میں بہت سی تاریخی کتابیں میں منصۂ شہود پر آئیں۔مشہور دانشور میکیاولی نے اپنی مشہور کتاب '*An Account of the Evolution of Florentine Republic to the Lorenzo de Medici*' کے نام سے تحریر کی۔ایک اور مورخ 'فرانسیسکو گیکارڈینی' (Francesco Guicciardini, 1483–1540) ہے جس نے 'فلورنس کی تاریخ' اور 'اٹلی کی تاریخ' کے نام سے کتابیں لکھیں۔اس کے علاوہ دوسرے مورخین نے بھی مذکورہ فنون پر اپنی تخلیقات پیش کیں۔

اٹلی میں ادب اور آرٹ کی طرح سائنس کے شعبہ میں بھی کافی ترقی ہوئی۔لیونارڈو ڈاونسی مصور کے ساتھ ہی سائنس داں بھی تھا۔ اس نے پودوں، جانوروں اور پرندوں کا سائنسی مطالعہ کیا۔اس نے بندوق، اڑنے کی مشین، کاٹنے کی مشین اور دوسری میکانکی ایجادات کیں۔ وہ علم نجوم کا بھی ماہر تھا۔اس نے یہ ماننے سے انکار کیا کہ سورج زمین کے ارد گرد گردش کرتا ہے۔نکولس کوپرنیکس Nicolaus (Copernicus, 1473–1543) نے ایک رصد گاہ قائم کی اور تجربہ و تحقیق کے بعد بتایا کہ زمین اور دیگر سیارے سورج کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔گلیلیو (Galileo, 1564–1641) اٹلی کا عظیم سائنس داں تھا۔اس نے دوربین ایجاد کی۔اس نے سیاروں سے متعلق بہت سی معلومات بھی جمع کیں۔اٹلی میں علمِ طب کو کافی فروغ ملا۔بولون یونیورسٹی علمِ طب کے مطالعہ کا مرکز تھی۔اطالوی اطباء نے بہت سے تجربات کیے۔دوران خون (Circulation of Blood) کا اصول گرچہ ہاروے نے پیش کیا اور جراحی بعد میں عام ہوئی، لیکن اس کی ابتداء اٹلی میں ہو چکی تھی۔

گیسنر (Gesner) نے پودوں اور جانوروں کا سائنسی مطالعہ کیا۔گیسنر کو علم حیوانیات (Zoology) کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ سولہویں صدی میں کیلنڈر کے میدان میں انقلابی اصلاحات ہوئیں۔ابھی تک جولین کیلنڈر استعمال ہوتا تھا جس میں سال میں مہینوں کے دنوں کی تعداد معین نہیں تھی۔1582ء میں پوپ تیرہویں گریگری (Gregory-XIII) اس سمت میں کامیاب ہوا۔اس نے رائج کیلنڈر کو 10 دن پیچھے کرکے یہ طے کر دیا کہ ایک برس میں 365 دن ہوں گے اور نیا سال یکم جنوری سے شروع ہوگا۔اس کیلنڈر کو یورپ کے تمام

ممالک نے اپنایا۔ سولھویں صدی میں علمِ طبیعات (Physics) کے میدان میں بھی قابلِ ذکر ترقی ہوئی۔ پورٹا(Porta) نے 'جادوئی لالٹین' (Magic Lantern) کی ایجاد کی۔ نیدر لینڈ کے شہری جان سین (Jansen) نے 1590ء میں خوردبین (Microscope) کی ایجاد کی۔ اس کے بعد اسی عہد میں ٹیلی اسکوپ مشین کی ایجاد بھی ہوئی۔ برطانیہ کے ولیم گل برٹ (William Gilbert) نے مقناطیسی مضامین کا مطالعہ کیا اور اس طرح بجلی کی ایجاد ہوئی۔ اس عہد کا ماہر طبیعات گلیلیو(Galileo) تھا۔

پندرہویں صدی سے لے کر سولھویں صدی کے وسط تک علم ریاضی (Mathematics) کے میدان میں بہت ترقی ہوئی۔ اٹلی میں تارتاگلیا(Tartaglia) اور کارڈن(Corden) نے 'مکعب مساوات' (Cubic Equation) کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اسٹیبنس(Stabnus) نے نظام اعشاریہ(Decimal) کے استعمال پر زور دیا۔ جان نیپئر(John Napier) نے سب سے پہلے 'لگارتھم' (Logarithm) کی ایجاد کی اور وہ نظام اعشاریہ کا استعمال کرنے والا وہ پہلا شخص تھا۔

2.5 دیگر یورپی ممالک میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance in the Other European Countries)

نشاۃ ثانیہ کے زیر اثر جو تحریک انسانیت وجود میں آئی وہ اٹلی سے بہت جلد یورپ کے دیگر ممالک میں پھیل گئی۔ اس تحریک کے اہم رہنما میں ایراسمس، کولیٹ، سر تھامس مور، ربیلا، فرانسس بیکن اور سر والٹر وغیرہ خاص ہیں۔ ایراسمس(Erasmus) نیدر لینڈ کے شہر 'روٹرڈم' میں 1466ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے یونانی اور لاطینی ادب میں عمدہ تعلیم حاصل کی۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں اور چھاپہ خانہ کی ایجاد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں شائع بھی کیا۔ اس کی مشہور کتاب *Praise of Folly* انسانی خامیوں کا نقشہ کھینچتی ہے۔ ایراسمس نے مذہب کے نئے تصور کو موثر انداز میں پیش کیا۔ اس نے شمالی یورپ میں مذہبی شعبے میں اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کا کہنا تھا کہ دنیاوی زندگی کے ساتھ مذہبی فرائض کی انجام دہی بھی ہو سکتی ہے۔ مذہبی کتابوں کے مطابق ہر کام انجام پا سکتا ہے۔ لہٰذا دنیا سے الگ رہ کر راہبانہ زندگی گزارنے میں کوئی مصلحت نہیں۔ وہ کلیسا کی قائم کردہ ڈسپلن اور کلیسا کی بلاوجہ اہمیت کا قائل نہیں تھا۔ وہ رسم و رواج کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ تعلیم ہی سب سے عمدہ زیور ہے جو انسان کو صحیح معنی میں انسان بنا سکتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے فرائض کی بجا طور پر انجام دہی کے لائق ہو سکے۔

کولیٹ اور مور: شمالی یورپ میں تحریک انسانیت کے علمبرداروں میں ''کولیٹ'' اور ''مور'' تھے۔ دونوں ہی انگریز تھے۔ کولیٹ کے زیر اثر نئے انداز تعلیم کے اسکول نے ترقی پائی۔ سر تھامس مور کا نام اس کی تصنیف اٹوپیا(*Utopia*) کی وجہ سے مشہور ہوا۔ اس کتاب میں اس نے ایک عینی ریاست کا تصور پیش کیا ہے اور اپنے زمانے کے سماج پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔

ربیلا: ربیلا (Rabelais, 1490–1553) نشاۃ ثانیہ کے فرانس کا اہم مصنف تھا۔ اسے سات سال کی عمر میں رہبانیت کے سلسلے میں داخل کر دیا گیا، لیکن وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس نے طب کی تعلیم حاصل کی اور یونانی اور لاطینی ادب کا مطالعہ کیا۔ اسے عہدِ وسطیٰ کے مذہبی نظام اور تعلیم سے چڑ تھی۔ فرانسیسی زبان میں لکھی اپنی تصنیف *Heroic Deeds of Gargantua and*

Pantagruel میں اس نے رائج رسوم پر کڑی تنقید کی ہے۔ اپنے کرداروں کے ذریعے اس نے اس وقت کی مذہبی، اخلاقی اور دیگر اقدار پر شدید طنز بھی کیا ہے۔

فرانسس بیکن: فرانسس بیکن (Francis Bacon, 1561–1626) مشہور سیاست داں مفکر تھا۔ 1625ء میں اس کی کتاب 'نووم اور گانم' (Novum Organum) یعنی نیا آلہ شائع ہوئی، جس میں اس نے سائنسی علوم کا ایک نیا تصور اور سائنسی استوا کی نئی منہاج پیش کی۔ اس نے استقرائی استدلال (Inductive Method) کی بنیاد ڈالی۔ اس کے مطابق استقرائی طریقہ 'حق' کے راز معلوم کرنے کا واحد طریقہ ہے اور صحیح علم حاصل کرنے کے لیے اس پر عمل ضروری ہے۔

انگریزی ادب: سولہویں صدی کے انگریزی ادب میں نشاۃ ثانیہ کا اثر نمایاں ہے۔ چاسر (Chaucer) کی کتاب کنٹربری کہانیاں (*Canterbury Tales*) وقت کی سماجی حالت کی عکاسی کرتی ہے۔ شیکسپیئر (1564–1616) نے درختوں میں زبانیں، چشموں میں کتابیں، پتھروں میں مذہبی وعظ و بیانات اور ہر شئے میں اچھائی دیکھی۔ اس کا 'جولیس سیزر' سیاست کا ایک سبق ہے۔ اس کا 'رومیو جولیٹ' محبت کرنے والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ شیکسپیئر نے انسانی کردار کو نہایت ہی عمدہ اور موثر انداز میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

آرٹ: نشاۃ ثانیہ کے آرٹ کی خصوصیات نہایت ہی موثر انداز میں یورپ پر حاوی ہونے لگیں۔ فلینڈرس کے شہر اینٹورپ کے ایک مصور کونیٹن میسس نے مقامی طرز برقرار رکھ کر اطالوی اثرات کو قبول کیا۔ اس کا شاہکار Entombment بہت مشہور ہے۔ جرمنی میں بھی آرٹ کے فن میں اطالوی اثرات محسوس ہونے لگے۔ 'البرٹ ڈیورر' نے جرمن موضوعات کو اطالوی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کی تیارہ کردہ شبیہ نفسی عمدہ قسم کی مصوری کی مثال ہے۔ جرمن فن مصوری کی تاریخ میں ہالبن فورڈ (Holbein Ford) کا نام بہت مشہور ہے۔

سائنس: انگریز سائنس داں اور طبیب ہاروے (Harvey)، اٹلی کے علم طب کا بڑی حد تک مرہون منت ہے۔ اس نے نظامِ دورانِ خون (Circulation of Blood) کا اصول پیش کیا۔ ہاروے نے دل کی حرکت پر جو مقالہ تحریر کیا اسے عالمی حیثیت حاصل ہے۔ اس مقالے میں اس نے یہ بتایا ہے کہ خون دل سے جسم کے دوسرے حصے میں اور پھر ان حصوں سے دل میں برابر آتا جاتا رہتا ہے۔ انگریز سائنس داں سر آئزک نیوٹن نے قوت کشش مرکزی (Gravitation Laws) کے قوانین مرتب کیے۔

2.6 نشاۃ ثانیہ کے اثرات و اہمیت (Effects and Importance of Renaissance)

نشاۃ ثانیہ نے دور جدید کا آغاز کیا۔ نیا اندازِ فکر، نئی راہیں، نئے اقدار اور انسان کی اہمیت، یہ نشاۃ ثانیہ کی اہم خصوصیات تھیں۔ نشاۃ ثانیہ نے یورپ میں ذہنی بیداری پیدا کی۔ نشاۃ ثانیہ نے یونان اور روم کے علوم و فنون کی از سر نو ترویج کی، جس سے علم و فن کو ترقی ہوئی۔ یورپ

تاریکی سے نکل کر روشن دنیا میں آیا اور اس پر تہذیب کی نئی اقدار کے راز افشاء ہوئے۔ نشاۃ ثانیہ نے لوگوں میں اس بات کا جذبہ بیدار کیا کہ وہ بیرونی ممالک کی تلاش میں باہر نکلیں۔ اس طرح علم میں اضافہ کے ساتھ نئی دنیا بھی دریافت ہوئی۔ کولمبس نے 1492ء میں امریکہ دریافت کیا۔ واسکوڈی گامانے 1498ء میں ہندوستان تک بحری راستہ دریافت کیا۔ کارٹز نے میکسیکو کا پتہ لگایا۔ ان دریافتوں کے بہت دور رس معاشی اور سیاسی نتائج برآمد ہوئے۔

2.7 اصلاح مذہب تحریک (The Reformation Movement)

رومن سلطنت کے زوال کے بعد کلیسا نے عیسائیوں کی حفاظت کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کلیسا بہت ہی طاقتور تھا اور اس کی طاقت کی وجہ سے کلیسا کی بے انتہا دولت اور زمین تھی جو اسے بطور امداد ملا کرتی تھیں۔ روم کا پوپ یورپ کا سب سے طاقتور مذہبی رہنما تسلیم کیا جاتا تھا۔ بادشاہ بھی کلیسا کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اس طرح کلیسا ایک ایسا ادارہ بن گیا تھا جو سماج کی فکری ترقی اور فروغ کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ لیکن نشاۃ ثانیہ جس کے اثرات مذہبی پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے، اس طرح کلیسا اور پوپ میں جو برائیاں جڑ پکڑ چکی تھیں، اس کے باعث عوام کا اعتماد ان مذہبی رہنماؤں اور اداروں سے اٹھ رہا تھا۔ سولہویں صدی میں عوام نے کلیسا کے خلاف زوردار آواز بلند کی اور بہت سے حکمراں نے اس کی حمایت کی۔ اسی کو عرف عام میں ''اصلاح مذہب تحریک'' کہا گیا۔

''اصلاح مذہب تحریک'' کا عہد 1517ء سے 1648ء کے وسط تک تسلیم کا جاتا ہے۔ اس تحریک کے بارے میں دانشوروں نے اپنے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ جن میں ''رابرٹ ایرگینگ'' (Robert Ergang) بھی ہیں۔ ان کے مطابق ''اصلاح مذہب تحریک بہت پیچیدہ اور دور رس تھی۔ نشاۃ ثانیہ کی طرح یہ تحریک بھی عہدِ وسطیٰ کی تہذیب کے خلاف ایک عام ردعمل کی شکل میں تھی۔ لیکن اس نے قوموں/ملکوں کی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا، کیونکہ انسان آرٹ اور ادب کے مقابلے میں مذہب میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اس نے عہدِ وسطیٰ کے کیتھولک مذہب کے اوپر قدیم عیسائی مذہب کی تعلیم کو ترجیح دی۔ اور عیسیٰؑ و پال آگسٹائن کے مقاصد پر زور دیا اور جدید ماحول و ترقی کے راستے بھی ہموار کیے''

سی۔اے۔ایچ ہیز (C.J.H. Hays) کے مطابق 'دراصل سولہویں صدی کے آغاز میں شدید مذہبی بیداری کی وجہ سے عیسائیوں کی اکثریت کیتھولک کلیسا کی سخت ناقد بن گئی۔ انہوں نے کلیسا میں پوری طرح سے اصلاحات کی کوشش کی۔' مورخ ایچ اے ایل فشر (H.A.L Fisher) کے الفاظ میں 'پروٹیسٹنٹ اصلاح مذہب کلیسا کی مذہبی ریاست اور مراعات، پادریوں کے خصوصی اختیارات، مختلف ذاتوں کے متشدد، تنگ اور محدود نظریہ کے خلاف تحریک تھی۔' اس تحریک کے نتیجے میں لوگوں کی مذہبی زندگی کا دوبارہ احیاء ہوا۔ اس نے پوپ کے حقوق کی مخالفت کر کے سیاسی شکل اختیار کرلی۔ 'شیول' نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ حقیقت میں یہ دوہری تحریک تھی جس کا مقصد ایک طرف عیسائیوں کی زندگی کی اخلاقی ترقی تھی اور دوسری طرف پوپ کے اقتدار (طاقت) کو کم کرنا تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے اثر سے جو متجسس نظریہ پیدا ہوا، اس نے عوام اور حکمراں کو کلیسا کی برائیوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے کا حوصلہ دیا۔ ان بغاوتوں کے سبب طویل

عرصے تک مذہبی کشمکش اور اختلافات جاری رہے۔ لیکن ان بغاوتوں اور اختلافات کا نتیجہ بعد میں مذہبی رواداری ہی نکلا۔

2.7.1 تحریک اصلاح مذہب کے اسباب (Causes for the Reformation)

تحریک اصلاح مذہب کے درجہ ذیل اسباب تھے۔

رومن کیتھولک کلیسا کا بنیادی فرض سے انحراف: چوتھی صدی میں روم کے شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو ریاستی مذہب بنایا اور اس طرح مذہبی ادارہ کلیسا قائم ہوا۔ اگرچہ ابتدائی دور میں کلیسا نے تہذیب کی ترقی میں قابل ستائش کام کیا، لیکن بعد میں اس نے لوگوں کے اعتماد اور یقین کا غلط استعمال کیا۔ یہ مذہبی ادارہ رفتہ رفتہ خود مختار ہونے لگا۔ مذہبی حکام نے اپنے بنیادی فرائض کو چھوڑ دیا اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ پادریوں میں گناہ اور بدعملی عام ہوگئی۔ عوام کو مذہبی ٹیکس ادا کرنے پر مجبور کیا جانے لگا۔ کلیسا کا سیاسی ڈھانچہ اتنا مضبوط ہوگیا کہ بادشاہ بھی پوپ کو زیر کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔ عیسائیت کے بنیادی اصولوں اور ابتدائی سینٹ جیسے سینٹ پیٹر وغیرہ کی تعلیمات کو اہمیت نہ دے کر عوام کو توہم پرست بنایا جانے لگا۔

پندرہویں صدی میں کلیسا کی برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک کارڈینل نے پوپ سے کہا تھا ''کلیسا کی غلطیوں نے عوام کے ذہنوں میں ہمارے خلاف نفرت پیدا کر دی ہے۔ اگر اس میں کوئی بہتری نہیں آئی تو عوام پادریوں پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ عوام یہ بھی کہے گی کہ پادری اصلاحات میں دلچسپی نہیں رکھتے ہیں'' لیکن اس کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی۔ چودھویں اور پندرہویں صدی میں کلیسا کی بدعنوانی اور بُرے طریقوں کے خلاف آواز اٹھی لیکن اسے دبادیا گیا۔ یہ آواز ہمیشہ کے لیے نہیں دبائی جاسکی۔ آہستہ آہستہ کلیسا کی خرابیوں اور بدعنوانی کے خلاف تحریک زور پکڑتی گئی۔ جان وکلف (John Wycliffe, 1328–1384) نے برطانیہ میں کلیسا کے اقتدار کی مخالفت کی۔ کلیسا کے مروجہ عقائد کو رد کیا۔ اپنے دوستوں کی مدد سے بائبل کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس کے پیروکاروں 'وکلف' کی تعلیمات کی تبلیغ کی۔ بوہیمیا کے ''جان ہس (1415–1370) نے بھی کلیسا کی من مانی کی زبردست مخالفت کی۔ ہس 'وکلف سے متاثر تھا۔ اس کو بہت شہرت ملی، لیکن بعد میں اسے زندہ جلادیا گیا۔ اس سے لوگوں میں کلیسا مخالف آگ بھڑک گئی۔

نشاۃ ثانیہ کا اثر: نشاۃ ثانیہ کی وجہ سے عوام کا شعور بیدار ہوا۔ اس عہد کے مصنفین نے کلیسا کی ان برائیوں کی نشاندہی کی، جن کے ذریعے معاشرے کا استحصال کیا جارہا تھا۔ عظیم انسانیت پسند مصنف ''ایراسمس'' نے اپنی کتاب *The Prais of Folly* میں کلیسا کی برائیوں پر سخت حملہ کیا۔ ''ہٹن'' (Hutten) نے *Letters of Obscure Men* میں کلیسا میں موجود برائیوں کے خلاف عوام کو بیدار کیا۔ تھامس مور نے ''اٹوپیا'' میں کلیسا کی بدعنوانیوں کے خلاف لکھا۔ ''جان کولیٹ'' نے بھی کلیسا کے خلاف لکھا۔ مارٹن لوتھر نے تو اس میدان میں بے نظیر کام کیا۔ اس نے بائبل کا جرمن زبان میں ترجملہ کیا، جس کے ذریعہ عام معاشرے کو بھی بائبل کے بنیادی اصولوں کا علم ہوا اور اصل مذہب اور کلیسا کی طرف تبلیغ و پروپیگنڈہ کرنے والے مذہب کے درمیان فرق واضح ہوگیا۔ عام لوگ زیادہ دیر تک کلیسا کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس طرح نشاۃ ثانیہ نے تحریک اصلاح مذہب کو نئی قوت اور رفتار بخشی۔

معاشی سبب: فلاح عامہ کے کاموں سے خوش ہو کر لوگوں نے کلیسا کو زمین اور پیسہ عطیہ کیا۔آہست آہستہ کلیسا ایک طاقتور ادارہ بن گیا۔ لیکن بعد میں اس کے اخراجات اتنے بڑھ گئے کہ اس نے عوام سے ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا۔کلیسا کی پُر تعیش زندگی کے لیے جو ٹیکس لگائے گئےان کے نام ہیں:

1۔پیٹر کانذرانہ (Peter's Penee) 2۔عشر (Tithes) 3۔سالانیہ (Annates)

کلیسا کے مذکورہ ٹیکسوں نے یورپی معاشرے کے مختلف طبقات پر نقصان دہ اثر ڈالا۔یہ عام لوگوں کی معیشت پر ناقابل برداشت بوجھ تھا۔ساتھ ہی اس وقت صنعتی انقلاب کی وجہ سے کاروبار میں ترقی ہوئی۔سرمایہ دار طبقہ ابھرا۔سرمایہ دار طبقہ کلیسا کی دولت کو بیکار سمجھتا تھا۔اس سے پیداوار میں کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔صرف یہی نہیں بلکہ بادشاہ کاخیال تھاکہ جو سرمایہ (جائیداد) کلیسا کے پاس ٹیکس کے طور پر رہ گئی ہے وہ صرف حکومت کا ہے،اس لیے کلیسا کی طرف سے کیا جانے والا حد سے زیادہ استحصال معاشرے پر بوجھ بن گیا تھا۔اس طرح کلیسا کی معاشی نوعیت نے بھی مذہبی اصلاح کی راہ ہموار کی۔

سائنسی و منطقی نظریات کے اثرات: پندرہویں اور سولہویں صدی کے مصنفین کی تخلیقات نے عہدِ وسطیٰ کے توہمات اور تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر انسان کو ایک نیا نقطہ ٔ نظر فراہم کیا، جس کے باعث اندھی تقلید کی مخالفت شروع ہو گئی۔ایچ۔اے۔ایل فشر نے بڑھتی ہوئی سائنسی اور فکری دلچسپی کا تجزیہ اس طرح کیا ہے ''سولہویں صدی کی فکری بیداری اگرچہ پروٹیسٹنٹ تحریک سے مختلف تھی،تب بھی وہ اصلاح مذہب تحریک کا ایک سبب تھی۔اس کی وجہ سے مذہبی اصلاح تحریک کامیاب ہوئی۔نشاۃ ثانیہ نے رومن کلیسا کی طرف سے منظور شدہ حقوق،رسم و رواج،عقائد وغیرہ کو چیلنج کیا جس سے لوگوں کا کلیسا سے اعتماد ختم ہو گیااور عوام نے کلیسا کے خلاف ردعمل ظاہر کرنا شروع کر دیا۔سوچنے اور سمجھنے پر جو پابندیاں لگائی گئی تھیں وہ ختم ہونے لگیں۔یورپ میں ترقی پسند اور فکری بیداری نے روایتی علم،اس کے عیوب اور توہمات پر طنز و تشنیع کرتے ہوئے انہیں چیلنج کیا۔

سیاسی وجوہات: عہدِ وسطیٰ میں کلیسا نے سیاسی شکل اختیار کر لی تھی۔جب تک جاگیر دارانہ نظام موجود تھا۔کلیسا نے اہم کام انجام دیے،یعنی یورپ میں سیاسی اتحاد قائم کرنا اسی ادارے کا کام تھا۔لیکن جیسے جیسے جاگیر دارانہ نظام ٹوٹتا گیا،عام لوگوں کی اہمیت بڑھتی گئی اور نئی قومی ریاستیں وجود میں آئیں۔کلیسا کی سیاسی مداخلت کھٹکنے لگی۔عوام کلیسا کی مداخلت نہیں چاہتے تھے۔کلیسا کی مداخلت کس حد تک تھی اس کا ثبوت برطانیہ کے بادشاہ ہنری کے اس واقعہ سے ہوتا ہے،جب کسی معاملے میں تاخیر کی وجہ سے انہیں سردیوں میں پوپ گریگوری کے پاس معافی مانگنے کے لیے ننگے پاؤں جانا پڑا۔''رابرٹ اِرگینگ'' نے قومی بادشاہوں کی طرف سے پوپ کی مداخلت کی عدم قبولیت کی وضاحت درج ذیل جملوں میں کی ہے:''اس طرح مغربی یورپ کے اکثر ممالک میں کلیسا اور ریاست کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو رہی تھی۔سیکولر حکمرانوں نے سیاسی میدان میں کلیسا کی مداخلت کو رکاوٹ سمجھنا شروع کر دیااور صرف مذہب اور اخلاقیات کو مذہبی سرگرمیوں کا دائرہ سمجھنا شروع کر دیا''۔اس طرح نئی ریاستوں کے وجود میں آنے سے مذہبی اصلاح کی تحریک کو تقویت ملی۔اس نے کلیسا کے آزاد وجود کو ختم کر دیا۔عہدِ

وسطیٰ میں کلیسا ریاست کے اندر ایک ریاست تھی۔(The Church was a state within a state)۔یہ صحیح ہے کہ اصلاح مذہب کو لے کر تنازعات بھی ہوئے، لیکن آخر کار کلیسا کی سیاسی مداخلت ختم ہو گئی۔

کلیسا میں تفرقہ: پندرہویں صدی کے آغاز میں کلیسا میں اختلاف ہو گیا۔ پوپ گریگوری کی موت کے بعد 1378ء میں پوپ کی نامزدگی کے لیے دو افراد کا انتخاب ہوا۔ اطالوی گروہ نے اربن VI کو پوپ منتخب کیا۔ اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر روم کو بنایا۔ فرانسیسیوں نے کلیمنٹ VII کو پوپ بنایا۔ دونوں کے مابین کافی کشیدگی تھی۔ اس کشیدگی کو دور کرنے کی غرض سے 1417ء میں رومن مارٹن پنجم کو پوپ بنا کر کیتھولک کلیسا کو دوبارہ منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ کلیسا (کلیساؤں) کے اس باہمی اختلاف نے بھی مصلحین کی آواز کو تیز کر دیا۔

معافی نامہ کی فروخت: پوپ کے اخراجات اتنے بڑھ چکے تھے کہ اس کے پاس جو بھی دولت تھی وہ کم پڑنے لگی۔ دولت کی حصولیابی کے لیے نئے طریقے ڈھونڈے جانے لگے۔ ان میں سے ایک 'گناہوں کے معافی نامہ کی فروخت تھی' یہی چیز بالآخر اصلاح مذہب کی ایک اہم وجہ بن گئی۔ قدیم زمانے میں عیسائیت میں اگر کوئی شخص اپنے گناہوں کے لیے صحیح طور پر توبہ کرتا اور مستقبل میں غلط کام نہ کرنے کا وعدہ کرتا، تو وہ اپنے گناہوں سے بَری ہو جاتا تھا، لیکن کلیسا کے نئے نظام میں ایک شخص پیسے دے کر بھی گناہ سے بَری ہو سکتا تھا۔ اسے رہائی کا پروانہ مل جاتا تھا۔ جسے 'گناہوں سے آزاد' (Letter of Indulgences)، 'گناہوں سے معافی' (Absolution) اور 'تقسیم' (Dispensation) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مارٹن لوتھر نے 1517ء میں کلیسا کے نمائندے ٹیٹزل (Tetzel) کی سخت مخالفت کی۔ وہ جرمنی کے شہر بیٹن برگ میں معافی کے کاغذات فروخت کرنے آیا تھا۔ اس واقعہ سے پروٹیسٹنٹ تحریک شروع ہوئی جو رومن کیتھولک کلیسا کی برائیوں کے خلاف کھڑی تھی۔ 'شیول' نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے: 'معافی کے کاغذات کی فروخت کلیسا کی مخالفت کی فوری وجہ تھی۔ مارٹن لوتھر نے اپنی مشہور 95 مذہبی اقساط کی فہرست تیار کی جس میں معافی کے کاغذات کی فروخت کی مخالفت بھی شامل تھی۔' اس طرح پاپائی نظام کے خلاف تحریک شروع ہو گئی۔

انسانیت پسندی کے اثرات: انسانیت پسند مفکرین نے عہدِ وسطیٰ کے کلیسا کے توہمات اور خود مختاری کی کھل کر مخالفت کی اور بائبل کے مطالعہ کی ترغیب دی۔ 1516ء میں ایراسمس نے کہا کہ بائبل کے مطالعہ کا سبھی کو حق ہے۔ انسانیت پسندوں نے ایک طرح فکری بیداری اور مثبت نظریہ پیدا کر کے کلیسا کی بدعنوانی اور من مانی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ ''ہینز'' نے اصلاح مذہب تحریک کے واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''1500ء تک کیتھولک کلیسا (سلطنت) میں مذہبی اختلافات اور مذہبی اتحاد لمحاتی اور عارضی تھے۔ ایک طرف بادشاہوں اور پوپوں کے تنازعہ کی وجہ سے چھوٹے اور معمولی اختلافات ہوئے اور دوسری طرف بعض پادریوں یا لوگوں کی طرف سے کلیسا کے اصولوں کو رد کرنے کی وجہ سے ''جان ہس'' اور ''وکلف'' کا الحاد شروع ہو گیا تھا۔ لیکن عہدِ وسطیٰ میں مذہب اور الحاد کا شاید ہی کوئی اختلاط ہوا ہو۔ سولہویں صدی کے پہلے نصف میں مختلف قسم کا کردار تیار ہو چکا تھا۔ اختلاف و الحاد دونوں کا گہرا امتزاج ہو چکا تھا۔ یہی چیز عہدِ وسطیٰ کے کیتھولک کلیسا کے لیے مہلک ثابت ہوئے۔'' کلیسا کے مطلق العنان، بدعنوان اور سخت رویہ سے سماج کے مختلف طبقے اکتا گئے۔ انہیں انسان نواز مفکروں

سے کلیسا کے خلاف بولنے کا حوصلہ ملا اور کامیاب نمائندگی کے لیے مارٹن لوتھر جیسا شخص سامنے آگیا اور کلیسا کی زوردار مخالفت شروع ہوگئی اور اصلاح مذہب تحریک لوتھر کی رہنمائی میں تیزی سے پھیلنے لگی۔

2.7.2 جرمنی میں اصلاح مذہب تحریک: مارٹن لوتھر، ژونگلی اور کالوِن

(The Reformation Movement in Germany: Martin Luther, Zwingli, and Calvin)

مارٹن لوتھر (Martin Luther)

سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر کی قیادت میں اصلاح مذہب تحریک بہت تیزی سے پروان چڑھی۔ تحریک کے دائرہ کار کے بارے میں اے جے گرانٹ نے کہا ہے کہ "اگرچہ مذہبی تحریک ابتداء میں ایک عام تحریک تھی، لیکن جرمنی کی سیاسی اور سماجی حالت اور یورپی ممالک کے بین الاقوامی تعلقات کی وجہ سے یہ ایک عجیب وغریب صورت اختیار کرگئی۔ لوتھر کی مذہبی تحریک ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگی۔ اس نے گزشتہ اور آنے والی صدی میں ہونے والی سازشوں، سیاسی حسد، سفارت کاری، خانہ جنگیوں اور بین الاقوامی جنگوں سے تقویت حاصل کی"۔ اصلاحی تحریک میں "بائبل کی طرف واپسی" (Back to the Bible) اور عہدِ وسطیٰ کے کلیسا کی تعلیمات سے دست برداری نے زور پکڑا۔ مارٹن لوتھر کو اصلاح مذہب تحریک کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے اس تحریک کو اخلاقی اور مذہبی شکل فراہم کی۔ مارٹن لوتھر جرمنی میں 10 نومبر 1483ء کو پیدا ہوا۔ 1501ء میں مارٹن لوتھر کو ارفرٹ یونیورسٹی (University of Erfurt) میں قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ 21 سال کی عمر میں اس نے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے مذہب کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ 1508ء میں لوتھر وِیٹن برگ یونیورسٹی (University of Wittenberg) میں مطالعۂ مذہب کا پروفیسر مقرر ہوا اور اس نے 'ایمان' اور 'توکل' کے اصول کی تبلیغ کرنی شروع کردی۔ 'وِیٹن برگ' میں لوتھر کو سننے کے لیے لوگ دور دراز سے آتے تھے۔ اس سے وِیٹن برگ یونیورسٹی اور لوتھر دونوں ہی مقبول ہوئے۔

1511ء میں لوتھر کو روم جانے کا موقع ملا۔ وہاں پہنچ کر اس نے کہا "پاک روم" "شہیدوں کے خون نے تمھیں پاک کیا ہے۔ میرا دلی سلام قبول کرو۔ لیکن جب 1512ء میں وہ روم سے لوٹا تو وہ الجھن اور پریشانی میں تھا۔ روم میں پھیلی بدعنوانی اور توہمات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا، لیکن پھر بھی کیتھولک کلیسا سے الگ ہونے کی بات اس کے دل میں نہیں آئی، بلکہ کلیسا میں اصلاحات کی بات وہ ضرور سوچنے لگا۔ اسی زمانے میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جس کے باعث لوتھر نے کیتھولک کلیسا کی کھلی مخالفت شروع کردی۔ 1517ء میں پوپ کا ایک نمائندہ "جان ٹیٹزل" "معافی نامہ" کے فروخت کی غرض وِیٹن برگ پہنچا۔ معافی نامہ اس لیے فروخت کیا جارہا تھا کہ اس سے پوپ کی عدالت کے اخراجات پورے ہوسکیں اور سینٹ پیٹر کے گرجاگھر کی تعمیر کے لیے پیسہ وصول ہوسکے۔ "ٹیٹزل" معافی نامہ کا پرچار یہ کہہ کر رہا تھا کہ "جیسے ہی معافی نامہ کے لیے دیئے گئے سکوں کی کھنک گونجتی ہے ویسے ہی آدمی کی روح (جس کے لیے پیسہ دیا جاتا ہے) سیدھے جنت میں چلی جاتی ہے" لوگ بہت خوشی سے معافی نامہ خرید رہے تھے۔ لوتھر نے بڑی جرأت کے ساتھ معافی نامہ کی مخالفت کی۔ اس نے اسے عیسائی

مذہب کے بنیادی اصولوں کے خلاف بتایا۔ 31 اکٹوبر 1517ء کو لوتھر نے پچانوے 95 مقالے لکھے جس میں اس نے پاپائے روم کے معافی کے صداقت ناموں پر بھی نکتہ چینی کی تھی۔ ایک عام مذہبی مناظرہ میں لوتھر نے اعلانیہ کلیسائے رومہ کی تعلیمات پر اعتراض کیے جس کے باعث پوپ، بادشاہ آگسٹین، اور ان کے حامیوں نے لوتھر کے خلاف سخت مہم شروع کر دی۔ لوتھر نے اپنی اصلاح کی مہم اور تیز کر دی اور کلیسا کے اندر جو بد نظمی، بے ایمانی، عیاشی اور بد عنوانیوں کا زور تھا ان سب پر حملہ شروع کر دیا۔ لوتھر نے یہ کہا کہ بندے اور خدا کے درمیان کسی پوپ یا پادری کے وسیلے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے علی الاعلان عوامی جلسہ میں پوپ کے احکامات کو نذرِ آتش کر دیا۔ کلیسا نے 1521ء میں اسے مذہب سے خارج کر دیا۔ اس کی گرفتاری کے احکامات جاری کیے گئے۔ وہ کچھ دن سکسنی کے فریڈرک سوم کے قلعہ میں ٹھہرا۔ یہاں اس نے عہد نامہ جدید (New Testament) کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ اس کے علاوہ اس نے درج ذیل کتابیں لکھیں۔

1. An Open Letter to the Christian Nobility of the German Nation concerning the Reform of the Christian Estate (1520).
2. On the Freedom of a Christian (A Treatise on Christian Liberty, 1520).
3. Prelude on the Babylonian Captivity of the Church (October 1520).

جون 1526ء میں سلطنت کی پروٹیسٹنٹ نام کی مجلس (اجلاس) سپیئر میں ہوئی، لیکن اس میں نئی رائے کے حوالے سے قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ 1529ء میں سپیئر میں دوسرا اجلاس ہوا۔ اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ 1521ء میں ورمس کے اجلاس میں پاس احکامات کو سختی سے نافذ کیا جائے۔ لوتھر کے پیروکاروں نے اس کی مخالفت کی۔ اسی وجہ سے لوتھر کے ماننے والوں کو پروٹیسٹنٹ (Protestant) کہا گیا۔ لوتھر کا اثر جرمنی میں تیزی سے پھیلنا شروع ہوا۔ 25-1524 میں جنوبی، مشرقی اور وسطی جرمنی کے کسانوں نے اندھی غلامی کی صورتحال کے خاتمے، ٹیکس کے غیر منصفانہ نظام کے خاتمہ اور جاگیرداری مراعات کے خاتمے جیسے کئی مطالبات کے ساتھ ایک تحریک شروع کی۔ لوتھر نے کسانوں کی تحریک کی حمایت کی، لیکن اس تحریک کے پُر تشدد ہونے پر اس نے اپنی حمایت واپس لے لی اور حکمرانوں سے کہا کہ وہ اس تحریک کو دبا دیں۔ اس طرح کسان تحریک کو کچل دیا گیا۔ اس سے لوتھر کی مقبولیت کم ہوئی۔

مقدس رومی سلطنت کا بادشاہ 'پروٹیسٹنٹ' کی مخالفت کو روکنا چاہتا تھا۔ چارلس پنجم کے سخت رویہ سے بچنے کے لیے 1531ء میں 'شیال کڈن' میں پروٹیسٹنٹ حکمرانوں نے ایک وفاق تشکیل دیا، لیکن عثمانیوں کے حملوں کی وجہ سے چارلس اتحاد پر توجہ نہیں دے سکا۔ چارلس نے پروٹیسٹنٹوں کو دبانے کی پالیسی کو 1546ء تک ملتوی کر دیا۔ جیسے ہی چارلس کو اندرونی و بیرونی مشکلات سے نجات ملی، اس نے پروٹیسٹنٹ مخالف مہم شروع کر دی، جس کے نتیجے میں جرمنی میں 1546ء اور 1555ء کے درمیان خانہ جنگیاں ہوئیں۔ یہ خانہ جنگیاں 1555ء میں معاہدہ آگسبرگ کے ذریعہ ختم ہوئیں۔ مارٹن لوتھر کا انتقال 1546ء میں اس معاہدہ سے پہلے ہو چکا تھا۔ در حقیقت لوتھر وہ پہلا شخص تھا جو کیتھولک کلیسا میں رائج خامیوں کے خلاف آواز اٹھانے میں کامیاب رہا۔ اس کی تعلیمات جو پروٹیسٹنٹ ازم کے نام سے مشہور ہوئیں

صرف جرمنی تک محدود نہیں تھیں، بلکہ جرمنی کے باہر کئی ممالک تک پہنچیں۔ فشر نے لوتھر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'مارٹن لوتھر کو دنیا میں منفرد مقام اس لیے نہیں ملا کہ وہ اصلی تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ ایک سچا نمائندہ تھا۔'

مارٹن لوتھر نے ایک نئے کلیسا کی بنیاد ڈالی، جس کے بنیادی اصول تھے کہ سچائی کا راستہ انجیل مقدس میں موجود ہے، اور خدا تک اور اس سچائی تک پہنچنے کے لیے کسی وسیلے کی ضرورت نہیں۔ انسان اپنے عقیدے کی بنا پر خود وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ لوتھر کے نام پر ہی لوتھرین کلیسا کی بنیاد پڑی۔ اس کے مرنے کے بعد پروٹیسٹنٹ تحریک یورپ کے کئی ملکوں میں پھیل گئی۔ پروٹیسٹنٹ دو فرقوں میں تقسیم ہو گیا اور عیسائیت کے مذہبی محاذ پر آج بھی یہی دو فرقے چھائے ہوئے ہیں۔

ژونگلی (Zwingli, 1488–1531)

مارٹن لوتھر کے علاوہ ژونگلی نے بھی کیتھولک کلیسا کی برائیوں کی مخالفت کی۔ یہ 1484ء میں سوئٹزرلینڈ میں پیدا ہوا۔ اور باسل، برین اور ویانا وغیرہ کے اعلیٰ تعلیمی ادارے میں تعلیم پائی۔ وہ ایراسمس سے متاثر تھا۔ اس نے کیتھولک کلیسا کی مخالفت شروع کی۔ 1517ء میں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ پاپائیت کا خاتمہ ضروری ہے۔ لوتھر کی طرح ژونگلی نے بھی معافی نامہ کی مخالفت کی تھی۔ اس نے زیوریخ شہر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور وہاں کا وہ پادری بن گیا تھا۔ تھیچر نے ژونگلی کے پروپیگنڈے کے کام کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "1518ء میں پادری ژونگلی نے معافی نامہ کے فروخت کے اصول کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ زوریخ کو اپنے پروپیگنڈہ کا مرکز بنانے پر اسے مصلحین کے موثر گروہ کی حمایت حاصل ہو گئی، جس طرح لوتھر کو جرمنی میں کامیابی ملی تھی۔ اسی طرح ژونگلی کو سوئٹزرلینڈ میں کامیابی حاصل ہوئی۔" ژونگلی نے پوپ کی مخالفت سیاسی وجوہات سے کی تھی۔ 1521ء میں پوپ لیو دہم نے فرانس سے جنگ کے لیے کرایہ کے فوجی سوئٹزرلینڈ سے حاصل کرنے کی بات کی تھی۔ ژونگلی نے 1523ء میں "زورخ" کی مذہبی کونسل میں شرکت کی اور اصلاح مذہب کی 67 باتیں شائع کیں۔ 1525ء میں اس نے کیتھولک کلیسا سے الگ ہو کر "Reformed Church" قائم کیا۔ ابتداء میں لوتھر اور ژونگلی کی اصلاح مذہب تحریک میں کوئی فرق نہیں تھا، لیکن کچھ مذہبی اصولوں اور کلیسا کی شکل کے حوالے سے دونوں میں اختلاف پیدا ہوئے۔ ژونگلی نے لوتھر کے (Consubstantiation) نظریہ کی مخالفت کی۔ ژونگلی کو بائبل اور عیسیٰؑ کی تعلیمات میں یقین تھا۔ اس نے کلیسا میں موجود بدعنوانی کی مخالفت کی۔ دھیرے دھیرے ژونگلی کے اثرات بڑھنے لگے۔ لیکن جب ژونگلی اور اس کے پیروکاروں نے سوئٹزرلینڈ کے کئی صدیوں کے کیتھولک لوگوں کو جبراً نئے مذہب میں تعلیم و تربیت دینے کی کوشش کی تو مذہبی جنگ شروع ہو گئی، جس میں ژونگلی خود لڑتا ہوا مارا گیا۔ آخرکار 1531ء میں کاپیل کی صلح کے ذریعے امن قائم ہوا۔ اس صلح کے بعد جرمنی کے نقش قدم پر سوئٹزرلینڈ بھی پروٹیسٹنٹ اور کیتھولک (دو) حصوں میں بٹ گیا۔

جان کالون (John Calvin, 1509–1564)

اصلاح مذہب تحریک کا تیسرا لیکن مضبوط مصلح جان کالون تھا۔ یہ 1509ء میں فرانس کے صوبہ 'نوشا' میں پیدا ہوا۔ اسے قانون

کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے 'اورلینزیونیورسٹی' بھیجا گیا۔ 1533ء میں اسے ایک مقدس عیسائی فرقہ قائم کرنے کی تحریک ملی۔ اس پر لوتھر کی تعلیمات کا اثر تھا۔ اس نے کیتھولک کلیسا سے اپنے تعلقات ختم کر لیے اور اس کے پیروکاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ فرانسیسی حکمراں فرانسس اول کی جابرانہ پالیسی کی وجہ سے کالون سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ وہاں اس نے مذہبی کتاب *Institute of the Christian Religion* لکھی۔ کالون نے یہ کتاب فرانسس اول کے نام منسوب کی لیکن بادشاہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کالون نے اس کتاب میں بہت سے خیالات لوتھر اور ژونگلی کے بھی درج کیے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ 1536ء میں کالون جینیوا پہنچا۔ اس نے شہر کے لوگوں کو منظم کیا اور بہت سی اصلاحات کر کے وہ جینیوا کا رہنما بن گیا۔ اس نے پاکیزگی کی زندگی گزارنے پر اصرار کیا۔ اسے پروٹیسٹنٹ پوپ کہا جانے لگا۔ 'رابرٹ ایرگنگ' نے کالون کے اصولوں کو اس طرح بیان کیا ہے: 'کالون مسلک کا بنیادی اور خاص اصول پہلے سے طئے شدہ قسمت یا تقدیر کا اصول ہے۔ کالون کے مطابق خدا کی طرف سے دنیا میں صرف کچھ خاص لوگ بھیجے جاتے ہیں تاکہ وہ منتخب اچھے کاموں اور مقاصد کو پورا کریں۔ کالون کے مطابق مذہب اور سیاست دونوں معاملات میں بائبل کو اختیارِ اعلیٰ حاصل ہے۔' کالون نے بزرگوں کو بھی اہمیت دی۔ وہ اپنے پیروکاروں کے لیے تو جمہوری اور روادار تھا، لیکن دوسروں کے لیے سخت تھا۔ کالون کی تعلیمات یورپ کے کئی ممالک (جرمنی، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، سکاٹ لینڈ، ہنگری اور پولینڈ) میں پھیل گئیں۔ فرانس اور برطانیہ بھی کالون کے اصولوں سے متاثر تھے۔ کالون مسلک کو سرمایہ داری کے بہت قریب سمجھا جاتا تھا۔

لوتھر اور کالون کی تعلیمات میں فرق

(Difference between the Teachings of Luther and Calvin)

دونوں نے بائبل کے اعلیٰ اختیار اور اس پر یقین کے اصول کو تسلیم کیا۔ دونوں نے کیتھولک کلیسا کے توہمات کی مخالفت کی۔ دونوں نے پاکیزگی پر زور دیا۔ لیکن دونوں کے طریقے مختلف تھے۔ دونوں کے درمیان بنیادی اختلافات درج ذیل ہیں:

1۔ لوتھر تین مقدسات پر یقین رکھتا تھا۔ پیدائش' ہولی سپر اور سرٹیفکیشن۔ کالون نے پہلے دو کو تسلیم کیا، سرٹیفکیشن کو نہیں مانا۔

2۔ کالون نے لوتھر کے مقابلے میں کردار کی پاکیزگی پر زیادہ زور دیا۔

3۔ لوتھر کا سیاسی اثر ورسوخ تھا جبکہ کالون اس سے آزاد تھا۔

4۔ لوتھر اصلاحات کے حق میں تھا لیکن کالون کلیسا میں بنیادی تبدیلیوں کا حامی تھا۔

5۔ لوتھر کے مطابق خدا پر ایمان کے ذریعہ نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اعتماد اچھے کاموں کی پہلی شرط ہے۔ لیکن کالون کے مطابق پہلے سے طئے شدہ تقدیر اور خدا کی رحمت سے ہی نجات مل سکتی ہے۔ لوتھر نے ایمان پر زیادہ زور دیا جبکہ کالون نے کہا کہ ہر چیز کا فیصلہ پہلے سے ہوتا ہے۔

6۔ لوتھر کے مقابلے میں کالون کلیسا کو جمہوری طریقے سے منظم کرنا چاہتا تھا۔

7۔ لوتھر جرمن بادشاہت سے متاثر تھا، لیکن کالون ہالینڈ میں ریپبلکن رہا اور اسکاٹ لینڈ میں بھی جمہوریہ کے قیام کی حوصلہ افزائی کی۔ لوتھر

اور کالون دونوں نے اپنے اپنے طریقے سے مذہبی اصلاح کا پروگرام تیار کیا، لیکن اس سے عام لوگوں کو فائدہ نہ پہنچ کر صرف متوسط اور امیر طبقہ ہی کو فائدہ پہنچ سکا۔

2.7.3 برطانیہ میں اصلاح مذہب تحریک (The Reformation Movement in England)

گوکہ یورپ کے دیگر ممالک کی طرح برطانیہ میں بھی کیتھولک کلیسا کا غلبہ تھا، لیکن یورپ کی مذہبی تحریکوں کا اثر برطانیہ پر بھی پڑنے لگا۔ لوتھر کی تعلیمات نے کیمبرج اور آکسفورڈ کے دانشوروں کو متاثر کیا۔ انسانیت پسند ایراسمس کا برطانیہ کے لوگوں پر بھی اثر تھا۔ شہنشاہ ہنری ہشتم نے کیتھولک کلیسا کی حمایت میں ایک کتاب *Défense of Seven Sacraments* لکھی۔ پوپ نے ہنری کو مذہب کے محافظ کے نام سے بھی نوازا لیکن بعد میں تعلقات خراب ہوگئے۔ 1534ء میں ہنری نے پوپ سے تعلقات مکمل طور پر توڑ لیے۔ بالادستی کے ایکٹ کے ذریعے برطانیہ کا حکمراں کلیسا کا سربراہ بن گیا۔ یہی نہیں بلکہ 1539ء کے ایکٹ 'Act of Six Articles' کے ذریعے کیتھولکوں پر بہت سی پابندیاں لگائی گئیں۔ شہنشاہ کے مذہبی احکامات پر سختی سے عمل کرنے کے انتظامات کیے گئے۔ ہنری کے بعد ایڈورڈ ششم (1547–1553) نے بھی کیتھولک مخالف پالیسیاں اپنائیں، جن کی وجہ سے برطانیہ میں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔ یہ مذہبی عدم استحکام اور تنازعہ ٹیوڈور حکمراں ایلزبتھ کے دور میں ختم ہوا۔ الزبتھ نے اپنی قابلیت اور دور اندیشی سے برطانیہ کو ان مذہبی تنازعات سے بچایا جس میں یورپ کے دیگر ممالک بھی الجھے ہوئے تھے۔ درمیانی راہ اختیار کر کے اس نے کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ کو ملا جلا کر رکھا۔ اس طرح برطانیہ میں قومی کلیسا یا انگلیکن کلیسا کا ظہور ہوا اور یہ مستقل ثابت ہوا۔

2.8 رد اصلاح مذہب تحریک (Counter Reformation)

سولہویں صدی میں شروع ہونے والی ایک ایسی مذہبی تحریک جس کا مقصد اصلاح مذہب تحریک (Reformation) یا پروٹیسٹنٹ تحریک (Protestantism) کو پھیلنے سے روکنا تھا اور ساتھ ہی کیتھولک کلیسا کی اصلاح کرنا تھا تاکہ مخالفین کو اعتراضات کا موقع نہ ملے، رد اصلاح مذہب تحریک کہلائی جسے 'کیتھولک اصلاح مذہب تحریک' (Catholic Reformation) کا بھی نام دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ تحریک اصلاح مذہب کے لیے پروٹیسٹنٹ تحریک کا رد عمل تھی۔ اس تحریک کی ابتداء قدامت پسند اور کٹر کیتھولک رہنماؤں نے کی۔ ان رہنماؤں کا مقصد یہ تھا کہ کیتھولک کلیسا کو پندرہویں صدی کے نشاۃ ثانیہ اور سولہویں صدی کے پروٹیسٹنٹ تحریک کے اثرات سے بچایا جائے۔ پندرہویں صدی بلکہ سینٹ کیتھرین آف سینا (St. Catherine of Siena) کے وقت یعنی چودھویں صدی ہی سے کیتھولک ارباب کلیسا کی دنیاداری اور بدنظمی کے خلاف آواز بلند کی جارہی تھی۔ اور اس زمانے میں کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ کی تفریق ہی سب سے بڑی تبدیلی بنی ہوئی تھی، جس نے کلیسائی سیاست کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ پاپائیت کسی بھی تحریک کو دبانے یا کوئی نئی تحریک چلانے کے قابل نہیں رہی جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں کلیسائی نظام پر بادشاہ، ملک یا اس کے نمائندے حاوی تھے۔ تھامس مور، سینٹ جان فشر (St. John Fisher)، اراسمس اور کارڈینل جمینز (Cardinal Jimenez) نے روم سے دور رہتے ہوئے بھی

کیتھولک کلیسا میں جو خرابیاں تھیں، انہیں دور کرنے کے لیے ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن ان کی آواز صدا بہ صحرا ہو گئی۔ لیکن جب سولہویں صدی میں 'تحریک اصلاح مذہب' یا 'پروٹیسٹنٹ تحریک' نے زور پکڑنا شروع کیا تو پھر پاپائے روم اور دیگر قدامت پسند کیتھولک رہنماؤں کی آنکھیں کھلیں۔ تحریک اصلاح مذہب کو دبانے کے لیے ابتدائی کیتھولک کوششیں ناکام ہو گئیں۔ رد اصلاح مذہب کی دوسری کوشش 1523 سے 1534 تک جاری رہی، جس کے دوران عام آدمیوں کو کیتھولک عقیدے پر قائم رکھنے کے لیے کچھ فتوے جاری کیے گئے۔

جب پال سوم پاپائے روم منتخب ہوا تب ہی اگنیشیس آف لویولا (Ignatius of Loyola) نے یسوعی (Jesuits) تحریک شروع کی۔ اس طرح پوپ کو مددگار مل گئے اور اس نے 1545ء میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا۔ غرض پروٹیسٹنٹ تحریک کو روکنے اور کیتھولک کلیسا کو مختلف طرح کی خرابیوں سے پاک کرنے کے لیے پاپائے روم اور دیگر کیتھولک مذہبی رہنماؤں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ کانفرنس کے فیصلوں پر عمل درآمد کے لیے ایک ادارہ مجلس ٹرینٹ (Council of Trent) تشکیل دیا گیا جو 1545ء سے 1563ء تک اپنا کام انجام دیتا رہا۔ اس مجلس کا کام کیتھولک عقائد کی تشریح کرنا، مخالفین کے حملوں کا جواب دینا اور کیتھولک کلیسا کی خرابیوں کو دور کرنا تھا۔ ایک ادارہ انڈیکس (Index) کا تھا جس کا کام پاپائے روم کے حکم پر ایسی صحافت اور تخلیقات و ادب پر پابندی عائد کرنا تھا جو کلیسائے روم کی تعلیم اور پوپ کے خلاف ہو۔ ان سب سے بڑھ کر ایک طاقتور ترین ظالمانہ اور جابرانہ ادارہ 'مذہبی عدالت' (Inquisition) کا تھا جو بدعتی خیالات کا اظہار کرنے والوں کو 'سرسری سماعت' (Summary Trial) کے بعد سخت سے سخت سزائیں دیتا اور ان پر بھاری جرمانے عائد کرتا تھا۔ ایسی عدالتیں یورپ کے مختلف علاقوں میں قائم کی گئیں تھیں۔ بدعتی خیالات رکھنے والے کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جان ہس (John Huss) کو مجلس کانسٹنس (Council of Constance) کے فیصلے کے مطابق 1414ء میں زندہ جلا دیا گیا۔ بادشاہوں میں اس رد تحریک اصلاح مذہب (Counter Reformation) کا سب سے زبردست مددگار مقدس رومی سلطنت کا طاقتور حکمراں فلپ دوم (1556-1598) تھا جو اپنے تمام وسائل پروٹیسٹنٹ تحریک کو کچلنے کے لیے کام میں لایا۔ لیکن چونکہ یہ عوامی تحریک بن گئی تھی، اس لیے وہ بھی اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہوا۔

2.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

یورپ کا وہ عہد جو نشاۃ ثانیہ کہلاتا ہے، انسانی تاریخ کا ایک اہم دور ہے۔ یہ عہد چودھویں اور سولہویں صدی کے درمیان کا ہے، جس میں یورپ کی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب آیا۔ اس عہد میں علوم و فنون نے غیر معمولی ترقی کی، جس سے تجارت، فنونِ لطیفہ، موسیقی، ادب غرض کہ انسانی سرگرمی کی شکل ہی بدل گئی۔ نشاۃ ثانیہ کی وجہ سے جو تبدیلیاں آئیں، ان کا اثر اعتقادات پر پڑا۔ کلیسا کا زور گھٹنے لگا۔ رومن کیتھولک کلیسا کی سختیوں اور دنیاوی مسائل میں غیر معمولی مداخلت کے خلاف بغاوتیں ہونے لگیں اور پروٹیسٹنٹ کلیسا وجود میں آیا۔ نشاۃ ثانیہ کے زیر اثر عام بول چال کی زبان اور لاطینی ادبی اظہار کے لیے استعمال ہونے لگی۔ 13ویں صدی میں اٹلی میں ایک عظیم شاعر 'دانتے' پیدا ہوا۔ اٹلی میں 'پیٹرارک' نے نئے علوم کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ عہدِ وسطیٰ میں علوم صرف راہبوں تک محدود تھے۔

انسانیت پسند دانشوروں کا عقیدہ تھا کہ علم، مسرت کا دوسرا نام ہے اور ہر شخص کو اس کا حصہ دار بننے کا حق ہے۔ سر تھامس مور نے اپنی مشہور نظم 'یوٹوپیا' میں یہاں تک کہا کہ پُر مسرت زندگی کے لیے دوسری دنیا کے انتظار کی ضرورت نہیں، وہ اسی زمین پر حاصل کی جاسکتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ نے بڑے بڑے فنکار پیدا کیے۔ ان میں لیونارڈو ڈاونسی' مائیکل انجیلو، رفائل، ٹی ٹین، بوٹے چلی اور گیبرٹی جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے فنکار اسی دور کی پیداوار ہیں۔ ادب میں بھی اٹلی نے اس زمانے میں بڑی شخصیتیں پیدا کیں۔ میکیاولی جیسا نامور مصنف اسی دور میں پیدا ہوا۔ نشاۃ ثانیہ میں کمپاس ایجاد ہوا۔ واسکوڈی گاما اور کولمبس نے دوسری دنیا کے دروازے کھول دیے۔ سائنس کے میدان میں انقلابی انکشافات ہوئے۔ کوپر نیکس نے جب یہ خیال پیش کیا کہ اس کائنات کا مرکز زمین نہیں بلکہ سورج ہے تو اس نے سائنسی تصورات میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ پروٹیسٹنٹ فرقہ کا بانی مارٹن لوتھر تھا۔ اس نے کلیسا کے سربراہوں کی فضول خرچی، آرام طلبی اور بدعنوانی کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور کلیسا میں اصلاح کی مہم شروع کر دی۔ لوتھر نے 95 مقالے لکھے جن میں اس نے پاپائے روم کے معافی کے صداقت ناموں پر بھی نکتہ چینی کی۔ اس نے کلیسائے روم کی تعلیمات پر بھی اعتراض کیا۔ رد تحریک اصلاح مذہب ایک ایسی مذہبی تحریک تھی جس کا مقصد 'تحریک اصلاح مذہب' یا پروٹیسٹنٹ تحریک کو پھیلنے سے روکنا تھا اور کیتھولک کلیسا کی اصلاح کرنا تھا۔

2.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

Renaissance	:	حیات نو، نشاۃ ثانیہ، کسی قدیم ثقافت یا تہذیب کا دوبارہ ابھرنا
احیاء	:	تجدید کرنا، پھر سے نیا کرنا، پہلی جیسی حالت یا بہتر حالت میں بحال کر دینا
Tithes	:	مذہبی ملک یا اوقاف کی پہلے سال کی آمدنی جو پاپائے اعظم کو دی جاتی تھی۔
تشنیع	:	لعنت ملامت، سخت کلامی
احتساب	:	یورپ میں کیتھولک مخالف لوگوں کو سزا دینے کے لیے بنایا گیا ظالمانہ ادارہ
یسوعی	:	کیتھولک مذہب میں اصلاح کر کے اسے غیر کیتھولکوں کے حملوں سے بچانے والی تنظیم

2.11 نمونہ امتحانی سوالات (Learning Outcomes)

2.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. نشاۃ ثانیہ کی ابتداء و ترقی کہاں ہوئی؟
2. کورٹز (Cortes) نے میکسیکو کو کب فتح کیا؟
3. پزارو (Pizarro) نے پیرو (Peru) کو کب فتح کیا؟
4. ڈیوائن کومیڈی (*Divine Comedy*) کس کی تصنیف ہے؟
5. جرمنی میں چھاپہ خانہ کس نے قائم کیا؟

6. تحریک انسانیت کا بانی کسے کہتے ہیں؟

7. 'لارا' (Laura) کس کی تصنیف ہے؟

8. دوربین کی ایجاد کس نے کی؟

9. گیس کی ایجاد کس نے کی؟

10. 'انسٹی ٹیوٹ آف دی کرسچین ریلیجن' کس کی تصنیف ہے؟

2.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. نشاۃ ثانیہ کے فروغ کے اسباب بیان کیجیے۔
2. نشاۃ ثانیہ میں فنونِ لطیفہ کا فروغ کس طرح ہوا؟ تحریر کیجیے۔
3. انسانیت پسندی پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. مارٹن لوتھر کے کارنامے تحریر کیجیے۔
5. تحریک اصلاح مذہب کے اسباب بیان کیجیے۔

2.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. نشاۃ ثانیہ کی خصوصیات بیان کیجیے۔
2. تحریک اصلاح مذہب کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تفصیل سے تحریر کیجیے۔
3. رد اصلاح مذہب تحریک پر اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔

2.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Cameron, Euan, *The European Reformation*, OUP, New York, 2012.
2. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
3. Gottlieb, Anthony, *The Dream of Enlightenment*: *The Rise of Modern Philosophy*, Penguin, UK, 2017.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Mahajan, V.D., *History of Modern Europe since 1789*, S. Chand & Co. Ltd., New Delhi, 1959.
6. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
7. Morland, Paul, *The Great Human Tide*: *How Population Shape the Modern World*, John Murray, Great Britain, 2019.

8. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*, Trinity Press Pvt. Ltd., New Delhi, 2012.
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
11. Merriman, John, *A History of Modern Europe from the Renaissance to the Present*, W.W. North & Company, New York, 2010.
12. محسن، سید علی، تاریخ یورپ عہدِ جدید 1500 تا 1871، حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد۔

اکائی 3۔ جغرافیائی دریافتیں اوراس کے نتائج

(Geographical Discoveries and Their Consequences)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 جغرافیائی دریافتوں کے اسباب

3.2.1 مادی اور تجارتی منافع کی خواہش

3.2.2 عیسائیت کی تبلیغ کا جوش

3.2.3 فن جہاز رانی کا ارتقا

3.3 پرتگالی بحری مہم جوئی

3.3.1 مشرق کے لیے سمندری راستے کی دریافت

3.3.2 کابرال کا برازیل پر قبضہ

3.4 اسپینی بحری مہم جوئی

3.4.1 امریکہ کی دریافت

3.4.2 کولمبس کی مہم کے نتائج

3.4.3 کورٹیس اور ایزٹیک نسل

3.4.4 پیزارو اور انکا نسل

3.5 دیگر یورپی مہمات

3.6 جغرافیائی دریافتوں کے نتائج

3.6.1 نوآبادیت کا آغاز

3.6.2 تجارت اور کاروبار کی ترقی

3.6.3 سونے اور چاندی کی افراط

3.6.4 نئی فصلوں کا متعارف ہونا
3.6.5 نسل انسانی کے علم میں اضافہ
3.6.6 غلاموں کی تجارت
3.6.7 مقامی آبادی کا صفایا
3.7 اکتسابی نتائج
3.8 کلیدی الفاظ
3.9 نمونہ امتحانی سوالات
3.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید (Introduction)

پندرہویں صدی کے اواخر اور سولہویں صدی کے اوائل میں یورپی ملاحوں نے بہت سے جرأت مندانہ سفر کیے تھے۔ ان بحری اسفار (sea voyages) کی وجہ سے نہ صرف نئی دنیا (امریکہ) دریافت ہوئی بلکہ مشرق اور ہندوستان کے لیے نئے اور بہتر راستے بھی کھوج نکالے گئے۔ ان سمندری اسفار کی شروعات بحر اوقیانوس (The Atlantic Ocean) کے ساحل سے ہوئی تھی۔ پندرہویں صدی کے آخر تک بحر اوقیانوس ایک رکاوٹ تھا اور اپنے آپ میں ایک اختتام تھا۔ رومی دور میں یہاں تک کہ عہد وسطیٰ میں بھی چھوٹے چھوٹے بحری جہاز بحر اوقیانوس کے یورپی ساحلوں پر واقع بندرگاہوں تک ہی جاتے تھے۔ وہ اس سے آگے بحر ناپید کنار میں کھو جانے سے ڈرتے تھے۔ 1317 عیسوی میں، وینس والوں نے بڑے تجارتی جہاز بنائے جو واضح طور پر ایڈریاٹک اور شمالی سمندر کے درمیان آنے جانے لگے تھے۔ پندرہویں صدی کے بعد سے جہاز رانی، مستول کے سازوسامان اور استعمال میں بہتری، بحری قطب نما (Mariners' Compass) اور اصطرلاب (Astrolabe) کے استعمال کی وجہ سے، خشکی سے اوجھل دور سمندر میں جانا ممکن ہو گیا۔ پرتگالیوں نے اس موقع سے سب سے پہلے فائدہ اٹھایا اور اسپینیوں نے ان کی پیروی کی۔ بعد ازاں ان بحری اسفار میں بحر اوقیانوس کے ساحل کی دوسری ریاستوں جیسے برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ نے حصہ لیا۔ سمندری سفروں کی طرف انہوں نے اپنا رخ بھلے ہی کھوج بین کے لالچ میں کیا ہو، لیکن بنیادی طور پر ان کا مقصد ایشیا کے ساتھ براہ راست تجارت کرنا تھا۔ ساتھ ہی ان علاقوں کا پتہ لگانا تھا جہاں سے مصالحہ جات اور سونا چاندی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس معاملے میں سر فہرست ہندوستان کی سرزمین تھی جس کے لیے نئے بحری راستوں کی تلاش کے چلتے شمالی اور جنوبی امریکہ اور کیریبین جزائر دریافت ہوئے۔ ہندوستان اور مشرقی جزائر سے براہ راست تجارت اور نتیجتاً حاصل ہونے والی دولت کا لالچ اس قدر شدید تھا جس نے یورپی جہاز رانوں کو اپنی جان جوکھم میں ڈالنے پر آمادہ کر لیا۔ ایک بار نئی جغرافیائی دریافتوں کے بعد نوآبادیات قائم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور مقامی آبادی کی تباہی بربادی اور غلامی پر منتج ہوا۔ نوآبادیات کو لے کر یورپی طاقتوں کے درمیان شدید جھگڑے ہوئے

اور بالآخر پہلی اور دوسری عالمی جنگیں برپا ہوئیں۔اس اکائی میں ہم ان بحری مہمات اور ان کے اسباب اور نتائج کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- جغرافیائی دریافتوں کے اسباب اور مقاصد کو سمجھ سکیں گے۔
- جغرافی اکتشافات اور سمندری راستوں کی دریافت میں پرتگال اور اسپین کی کوششوں کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- امریکہ کی دریافت اور مقامی تہذیبوں جیسے ایزٹیک، انکا، مایا اور پیرو کی تباہی پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- ہندوستان کے بحری راستے کی دریافت اور پرتگالی بحری سلطنت کے قیام کو جان سکیں گے۔
- جغرافیائی دریافتوں کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کر سکیں گے۔

3.2 جغرافیائی دریافتوں کے اسباب (Reasons for Geographical Discoveries)

3.2.1 مادی اور تجارتی منافع کی خواہش (Desire for Material and Commercial Benefits)

براعظم ایشیا اور افریقہ سے یورپ کے تجارتی تعلقات بہت پرانے تھے اور صدیوں سے ایشیا بہت سی انتہائی قیمتی اشیاء کی یورپ کو فراہمی کا ذریعہ تھا۔رومی سلطنت کے زمانے میں ان تعلقات کو اور بھی فروغ ہوا۔یورپ میں ایشیا، کے ریشم، سوتی کپڑوں، کالی مرچ، سونے، چاندی، ہیرے جواہرات اور بعض منشیات کی بڑی مانگ تھی۔اس کے علاوہ لوہا، ادویات، اناج، چینی اور دیگر مصالح جات جیسے کچھ کچے مال، اور تیار شدہ مصنوعات جیسے قالین، فولادی اوزار و ہتھیار اور چینی مٹی کے برتن وغیرہ بھی خوب پسند کیے جاتے تھے۔مرچ، دار چینی، لونگ، ادرک، جائفل جیسے مصالحے بہت اہم تھے، جو دوائیں بنانے، گوشت کو محفوظ کرنے اور چٹنی (Sauce) وغیرہ بنانے میں استعمال کیے جاتے تھے۔یہ چیزیں نہ صرف گوشت اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء کا ذائقہ بڑھاتی تھیں بلکہ لمبے وقت تک خراب ہونے سے بچاتی تھیں۔یہ چیزیں یا تو یورپ میں دستیاب نہیں تھیں یا پھر یورپی اشیاء سے بہتر تھیں۔

رومی سلطنت کے زوال کے بعد یورپ کی سیاسی افراتفری کی وجہ سے اس تجارت کو بڑا نقصان پہنچا، لیکن ازمنہ وسطیٰ کے نصف آخر سے صلیبی جنگوں کی وجہ سے ایشیائی اور افریقی مصنوعات اور دیگر تعیش کی اشیا کی مانگ بہت بڑھ گئی۔حقیقت تو یہ ہے کہ دیگر اسباب کے علاوہ صلیبی جنگوں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اہل یورپ ان تجارتی شاہراہوں پر قابض رہیں جو یورپ کو چین اور ہندوستان سے ملاتی تھیں۔یہ شاہراہیں یورپ کی رگ جان کی حیثیت رکھتی تھیں۔ادھر مشرق میں عرب ایک عظیم تاجر قوم کی حیثیت سے ابھرے۔ان کے چھوٹے چھوٹے جہاز، کشتیاں اور تجارتی قافلے اٹلی کے ساحلوں تک پہنچنے لگے۔اس کے بعد سے ہی جنگوں کے باوجود عربوں اور یوروپی قوموں کے درمیان تجارت ترقی پذیر رہی۔اٹلی کے مختلف شہر تجارت کی اس افزائش سے بہت مالا مال ہو گئے جن میں وینس اور جینیوا خاص طور پر قابل

ذکر ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلنے لگے۔ عربوں کے بعد ترکوں کو عروج ہوا۔ان کی یورپ کی جانب پیش قدمی برابر جاری رہی۔اس طرح اہل یورپ ان تجارتی منڈیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جو پہلے ان کے قبضہ میں تھیں۔ تجارتی شاہراہوں پر ان کا کنٹرول باقی نہیں رہا۔سیاسی تبدیلیوں سے قطع نظریوں بھی خشکی کے راستے تجارت کا صدیوں پرانا راستہ خطرات سے خالی نہیں تھا۔راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔بسااوقات تجارتی قافلوں اور کاروانوں پر لٹیرے اور رہزن حملہ آور ہو جاتے تھے۔ طویل اور دشوار گزار راہوں سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔

ان مشکلات کی وجہ سے پندرھویں صدی میں یہ خیال پیدا ہونے لگا تھا کہ ہندوستان اور چین پہنچنے کے لئے راست سمندری راستے دریافت کئے جائیں۔اس میں پرتگال،اسپین، فرانس، نیدرلینڈ اور برطانیہ کے مہم پسند لوگ زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ مشرقی تجارت سے اب تک ان ممالک کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا تھا کیونکہ وہ تجارتی شاہراہ پر واقع نہیں تھے اور ان کے پاس ان ایشیائی سامان تک پہنچنے کا سیدھا راستہ نہیں تھا۔ان کے لیے سویز کا مشرق ایک نئی دنیا تھی۔بنیادی طور پر عرب تاجر ہندوستان، چین اور مشرقی جزیروں سے کارواں یا کشتیوں کے ذریعے وہاں کا سامان بحیرہ احمر اور خلیج فارس کے راستے مشرقی بحیرہ روم کے بازاروں تک لاتے تھے۔ان بازاروں میں مغربی اور مشرقی دنیا کے تاجر ملتے تھے اور ان کے درمیان سامان کا تبادلہ ہوتا تھا۔ بحیرہ روم کے ساحل پر واقع اطالوی بندرگاہوں جیسے وینس، جینوا وغیرہ کو مشرقی تجارت پر اجارہ داری حاصل تھی۔ بحیرہ روم کے ساحل سے بحراوقیانوس کے ساحل تک پہنچنے تک ایشیائی اشیا کی قیمتیں کافی بڑھ جاتی تھیں۔اس لیے پرتگالی اور اسپینی تاجر اطالوی شہروں کی اجارہ داری کو ختم کر کے مشرقی ممالک کے ساتھ براہ راست تجارت کرنا چاہتے تھے،تاکہ انہیں ایشیائی اشیا سستے داموں مل سکیں اور جو دولت دوسری قومیں سمیٹ رہی ہیں وہ ان کے حصہ میں آسکے۔ لہٰذا، یہ فطری تھا کہ پرتگالی اور اسپینی بادشاہوں نے اطالوی کنٹرول سے آزاد مشرقی دنیا کے نئے راستوں کی تلاش کے لیے ملاحوں کی حوصلہ افزائی کی۔انہوں نے محسوس کیا کہ مشرق کو جانے کے لئے کوئی سمندری راستہ دریافت کرلیا جائے تو ساری تجارت سیدھے ان کے ہاتھ آسکتی ہے۔اس تصور نے ان تمام ممالک میں جو بحراوقیانوس کے کنارے واقع تھے ایک نیا جوش وخروش پیدا کر دیا۔

3.2.2 عیسائیت کی تبلیغ کا جوش (Zeal for Propagating Christianity)

پندرھویں صدی میں جغرافیائی دریافتوں اور بحری اسفار کا ایک دوسرا محرک عیسائی مذہب کی تبلیغ کا جذبہ تھا۔ عیسائیوں نے ہمیشہ اپنے مذہب کی تبلیغ میں بڑے جوش وخروش سے کام لیا۔ابتدائی چار صدیوں میں عیسائی مذہب پوری رومی سلطنت پر چھا گیا تھا۔ جنوبی یورپ تمام وکمال اس کے قبضے میں آگیا۔آئندہ آٹھ سو سال میں عیسائی مبلغوں نے شمالی اور وسطی یورپ کی وحشی اور غیر مہذب اقوام کو عیسائی بنادیا۔ بارہویں صدی تک طرح پورا یورپ عیسائی مذہب قبول کر چکا تھا۔یورپ میں اب کوئی علاقہ ایسا نہیں تھا جہاں عیسائی کلیسا کی حکومت قائم نہ ہو چکی ہو۔ تیرھویں صدی سے عیسائی مبلغین نے ایشیا اور افریقہ میں اپنے کام کی رفتار تیز کر دی اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر مغربی ایشیا، ایران، چین اور ہندوستان پہنچنے لگے۔اس تبلیغی کام میں مدد دینے کے لئے فرانس کے بادشاہ اور پاپائے روم نے منگولوں کے خان اعظم کے پاس اپنی سفارتیں روانہ کیں اور کم وبیش اسی زمانے میں پولو (Polo) خاندان کے تین افراد جو وینس کے رہنے والے تھے سیاحت کے شوق میں چین پہنچے۔ان میں سب سے زیادہ مشہور مار کو پولو تھا جس نے چین میں سترہ سال گزارے۔اپنی سیاحت کے اختتام پر جب اس نے اپنا سفر نامہ

شائع کیا تو یورپ میں چین کی دولت کے سینکڑوں افسانے مشہور ہو گئے۔ مار کو پولو اور دیگر سیاحوں نے مشرق قریب اور مشرق بعید کے متعلق جو معلومات فراہم کی تھیں ان سے عیسائی مبلغین کے حوصلے بھی بلند ہوئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ وہ براعظم ایشیاء کو عیسائیت کے لئے اسی طرح فتح کر سکتے ہیں جس طرح یورپ کو حاصل کیا ہے۔ مزید برآں اسپینیوں کا مشنری جوش تھا جنہوں نے 1492 میں اسپین میں اسلامی اقتدار کا خاتمہ کیا تھا جس نے ان میں نیا مذہبی جوش پیدا کیا۔ اس جوش نے انہیں غیر عیسائی لوگوں میں عیسائیت پھیلانے کی تحریک دی۔ اس احساس سے بھی وہ سمندر پار جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

3.2.3 فن جہاز رانی کا ارتقا (The Rise of the Art of Sailing)

پندرھویں صدی تک اہل یورپ کی جغرافیائی معلومات میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں عربوں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ عرب عظیم جہاز ران اور تاجر تھے۔ ان میں بڑے بڑے جغرافیہ دان بھی پیدا ہوئے۔ تجارت اور سمندری سفر سے ان کی دلچسپی کے نتیجہ میں انہوں نے دو ایسے آلات ایجاد کئے جن سے بحری سفر میں بڑی آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ بحری قطب نما اور اصطرلاب کی مدد سے اب ایسے سمندروں میں بھی جہاز رانی ممکن ہو گئی جو زخار اور لامحدود سمجھے جاتے تھے۔ جب تک یہ دونوں آلات کی ایجاد عمل میں نہیں آئی تھی ملاح ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ زمین آنکھ سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ ساحلوں کے قریب قریب ہی جہاز رانی ہوتی تھی اگر کوئی جہاز بھٹک کر سمندر میں کہیں دور جا نکلتا تو اس کا صحیح وسالم کسی ساحل سے جا لگنا عملاً ناممکن تھا۔ قطب نما کی مدد سے جہاز رانی کے خطرات بہت کم ہو گئے۔ اس آلہ کی مدد سے سمتوں کا تعین کرنا آسان ہو گیا جس سے کسی بڑے سمندر میں جہاز کے کھو جانے کے اندیشے کم ہو گئے۔ اصطرلاب نے مزید سہولت پیدا کی۔ اس سے ملاح جہاز کا عرض البلد معلوم کر سکتا تھا۔ اب سمندر کیسا ہی ناپید کنار ہو ان دونوں آلات کی مدد سے منزل مقصود تک پہنچنا نسبتاً زیادہ یقینی اور آسان ہو گیا۔ اطالویوں نے تیرھویں صدی سے ان آلات سے کام لینا شروع کر دیا تھا اور پندرھویں صدی تک یورپی قوموں کے جہاز ان آلات سے لیس ہو کر سمندروں میں دور دراز کا سفر کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ نیز یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سمندری خطرات سے متعلق جو اوہام اور شکوک پائے جاتے تھے وہ اب دور ہونے لگے تھے۔ سمندروں میں جنوں، بھوتوں اور خوفناک آبی مخلوق کے قصے اب قصہ پارینہ بن چکے تھے۔ عام طور پر یہ خیال پختہ ہو چکا تھا کہ زمین چپٹی نہیں گول ہے۔ اگرچہ بحر او قیانوس کو اب بھی ناپید کنار سمندر سمجھا جاتا تھا لیکن ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس سمندر کے مغربی ساحل پر انڈیز (Indies) یعنی سرزمین ہند واقع ہے۔ اس لئے مشرق بعید کو پہنچنے کے لئے بحر اوقیانوس کو پار کر لینا کافی سمجھا جانے لگا۔ مگر بعض دوسرے گروہ جن کو بحری اکتشافات سے دلچسپی تھی ایک دوسرے راستہ کی ٹوہ میں تھے۔ وہ بحر اوقیانوس میں افریقہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر افریقی ساحل کا جنوبی کنارہ مل جائے تو وہاں سے مشرق کی سمت سفر جاری رکھ کر ہندوستان یا چین پہنچ سکتے ہیں۔ فلکیات اور نقشہ سازی میں ترقی کے ساتھ سمندری سفر مزید آسان ہو گیا۔ اپنے مفادات اور مستقبل کو ذہن میں رکھتے ہوئے یورپ کے لوگ سمندر پار فتح کو طاقت کا حقیقی اظہار اور ایک ضروری شرط سمجھتے تھے۔ اس ہنگامہ خیز صدی میں جب فرد اپنی ایک مخصوص شناخت کا مطالبہ کر رہا تھا، بہت سے مہم جوؤں نے سمندر کو فتح کرنے کا خواب دیکھا۔ پندرھویں صدی کے اختتام تک ان جدید بحری راستوں کی دریافت کے لئے یورپ میں بڑا جوش و

خروش تھا۔اسی زمانے میں مغربی یورپ میں جو طاقتور قومی مملکتیں قائم ہو رہی تھیں ان کو اس کام سے بہت دلچسپی تھی اور وہ ان بے شمار فوائد سے ناواقف نہیں تھیں جو کامیابی کی صورت میں انہیں حاصل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اس مسابقت میں پرتگال سب سے آگے تھا۔

3.3 پرتگالی بحری مہم جوئی (Portuguese Naval Adventures)

پرتگال اگرچہ ایک چھوٹا سا ملک تھا مگر بحری مہمات سے اسے بہت دلچسپی تھی۔ اگرچہ بہت سے یورپی ممالک نے سمندری سفر اور جغرافیائی دریافتوں میں حصہ لیا، لیکن پرتگال کا کردار سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ پندرہویں صدی کی جغرافیائی دریافتوں کی شروعات پرتگالیوں نے کی تھی۔ اس کے شہزادے ڈوم ہنری (Dom Henrique, 1394–1460) کو بحری اکتشافات کا بہت شوق تھا۔ اس نے اس سلسلے میں اتنے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا کہ اسے بعد کے مورخین نے 'جہاز راں ہنری' (Henry, the Navigator) کا لقب دے دیا۔ اس نے اپنی صلاحیتوں اور اثر و رسوخ کا استعمال جہاز رانی کے شعبے میں کیا۔ اس نے ملاحوں کی تربیت کے لئے ایک اسکول بھی قائم کیا تھا جس میں اٹلی کے تجربہ کار ملاحوں اور مشہور جغرافیہ دانوں کو جمع کیا گیا تھا۔ یہاں سے تربیت یافتہ ملاحوں کے جو جتھے نکلتے وہ بحری مہمات پر روانہ کئے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ سپاہی بھی ہوتے تھے اور پادری اور مبلغین بھی۔ اسی اسکول کے طلبہ میں کولمبس بھی شامل تھا۔

ہنری یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کے بحری راستہ کی دریافت کا سہرا پرتگال کے سر رہے۔ وہ اس مقصد کے لئے مسلسل بحری مہمیں روانہ کرتا رہا۔ یہ تمام مہمات افریقہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جنوبی اوقیانوس بھیجی جاتی رہیں کیونکہ پرتگال والوں کا خیال تھا کہ ہندوستان پہنچنے کا یہ قریب ترین راستہ ثابت ہوگا۔ اس کام میں ہنری نے اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ ہنری تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ اور توسیع سلطنت کا بھی خواہش مند تھا مگر اس کی زندگی میں اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ ان مہمات کا صرف اتنا نتیجہ نکلا کہ پرتگالی بہ مشکل افریقہ کے مغربی ساحل کا صرف نصف حصہ طے کر سکے اور 1460 عیسوی میں اپنے سرپرست کی موت کے وقت تک وہ صرف کیپ وارڈے (Cape Verde) تک ہی پہنچ پائے تھے جو افریقہ کا سب سے مغربی سرا تھا۔ افریقی ساحل کی طوالت پرتگالیوں کے اندازے سے بہت زیادہ نکلی مگر یہ کام ہنری کے بعد بھی جاری رہا۔

3.3.1 مشرق کے لیے سمندری راستے کی دریافت (Discovery of Sea Route to the East)

1488 میں پرتگالیوں کو پہلی بڑی کامیابی ہوئی جب کہ ان کا مشہور ملاح بارتھلیمو ڈیاز (Bartholomew Diaz) افریقہ کے طویل مغربی ساحل کا چکر کاٹ کر بحر ہند میں داخل ہوا۔ یہ ایک انتہائی امید افزا بات تھی اس لئے اس مقام کو جہاں سے افریقہ کے جنوبی ساحل کا چکر کاٹا گیا تھا، 'راس امید' (Cape of Good Hope) کا نام دیا گیا۔ اس کے بعد مزید دس سال تک ہندوستان پہنچنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ 1497 میں واسکوڈی گاما (Vasco Da Gama) ایک بڑی مہم کے ساتھ نکلا۔ وہ راس امید کا چکر کاٹ کر ایک عرب ملاح ماجد کی رہنمائی میں 1498 عیسوی میں جہاز رانوں کے خوابوں کی سرزمین ہندوستان پہنچا اور کالی کٹ پر لنگر انداز ہوا۔ اسے غالباً

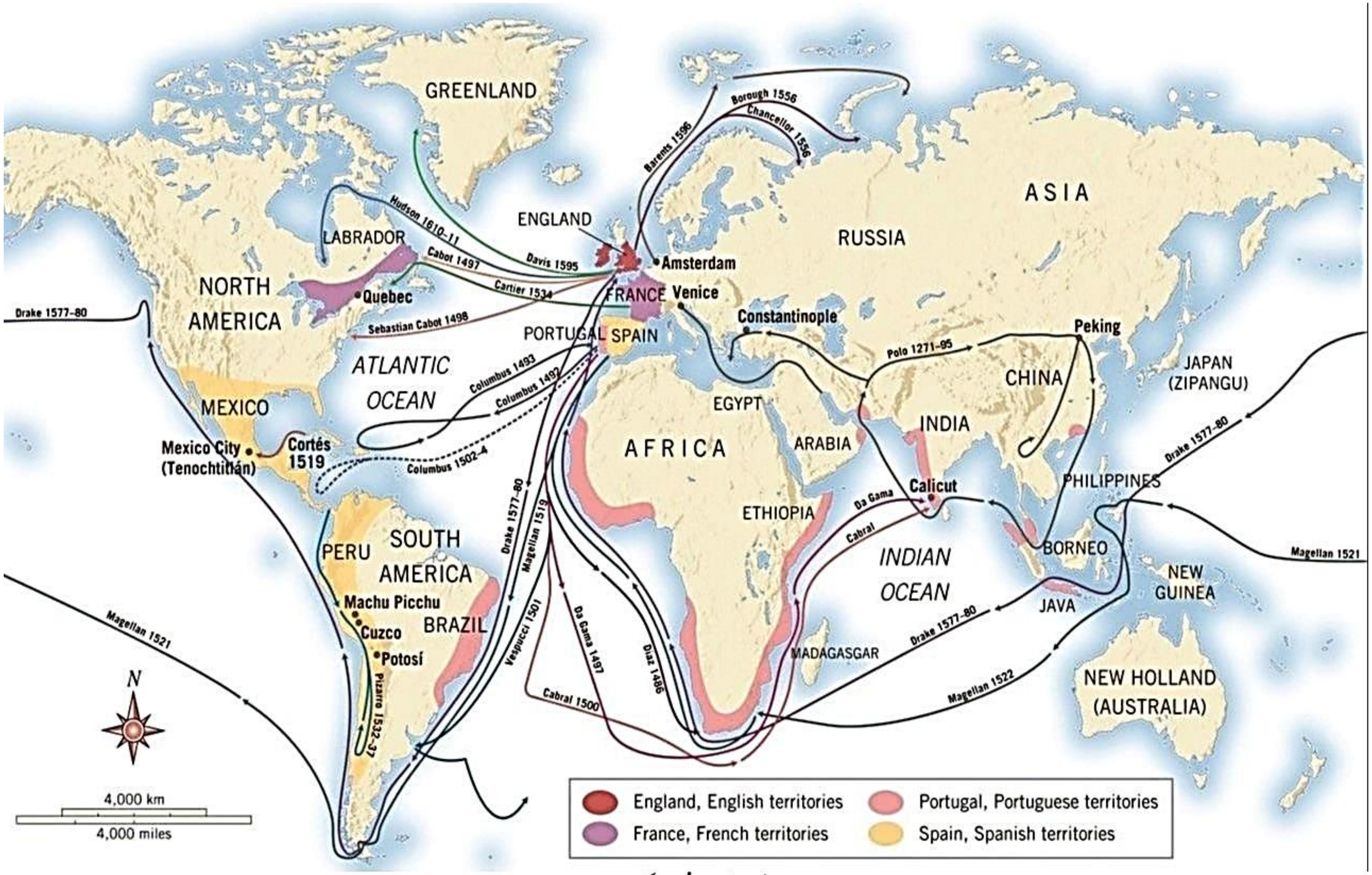

یورپی بحری دریافتوں کے راستے

(Source: https://www.studentsofhistory.com/routes-of-famous-european-explorers)

سمندری کھوج کا سب سے بڑا سفر سمجھا جاتا ہے۔اس سفر کے دوران واسکوڈی گاما 90 دن تک خشکی سے او جھل رہا جو کولمبس کی مہم سے تین گنا زیادہ تھا۔ واسکوڈی گاما اپنے سمندری سفر کے اخراجات سے ساٹھ گنا زیادہ مال لے کر واپس آیا۔ پرتگالیوں کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔اس شاندار کامیابی سے حوصلہ پا کر، بہت سے پرتگالی مہم جو مشرقی جزائر کے لیے روانہ ہوئے، جہاں انہوں نے ہندوستان اور مشرق بعید سے نہ صرف اپنی تجارت کا سلسلہ شروع کیا بلکہ ایک وسیع تجارتی اور سیاسی سلطنت بھی قائم کر لی۔ تبلیغ کے کام کو بھی بڑی شدت سے جاری رکھا گیا۔انہوں نے رفتہ رفتہ اپنی نو آبادیوں کا جال بچھا دیا اور سیلون، سماترا اور جاوا میں داخل ہوئے۔ 1517 میں پرتگالی چینی بندرگاہ کینٹن (Canton) اور 1542 میں جاپان تک پہنچ گئے۔سولہویں صدی مشرق میں پرتگالیوں کے انتہائی عروج کی صدی ہے۔دوسری طرف مغرب میں بھی انہوں نے فتوحات حاصل کیں۔ان کا ایک مہم جو جہاز راں کیبرال (Cabral)، مغرب کی طرف چلتے چلتے جنوبی امریکہ کے مشرقی سرے تک جا پہنچا اور اس طرح برازیل (Brazil) میں پرتگالی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

3.3.2 کابرال کا برازیل پر قبضہ (Cabral's Annexation of Brazil)

پرتگالیوں کا برازیل پر تسلط اتفاقی تھا۔1500 میں پیڈرو الواریس کابرال (Cabral Pedro Alvares)، کی قیادت میں جہازوں کا ایک جتھا پرتگال سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوا۔ سمندری طوفانی ہواؤں سے بچنے کے لیے اس نے مغربی افریقہ کے گرد ایک لمبا چوڑا چکر لگایا اور خود کو موجودہ برازیل کے ساحل پر پا کر حیرت زدہ رہ گیا۔ حسن اتفاق سے جنوبی امریکہ کا یہ مشرقی حصہ،اس علاقے میں آتا تھا جس کو نقشہ پر پوپ نے پرتگال کو سونپا تھا۔ لہذا انہوں نے اسے بغیر کسی اختلاف کے اپنی ملکیت سمجھ لیا۔ پرتگالی برازیل کے بجائے، مغربی ہندوستان سے تجارتی تعلقات بڑھانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ کیونکہ برازیل میں سونا ملنے کا امکان نہیں تھا۔ لیکن ایک قدرتی دولت یہاں موجود تھی اور وہ تھی لکڑی جس سے انہوں نے بیحد فائدہ اٹھایا۔ برازیل کے درخت 'برازیل وڈ' (Brazilwood) جس سے یورپی لوگوں نے اس علاقے کو موسوم کیا، ایک خوبصورت سرخ رنگ پیدا کرتے تھے۔ مقامی افراد، لوہے کے چاقو اور آری کے عوض جوان کے لیے عجوبہ تھے، بہت آسانی سے درخت کاٹنے اور کشتیوں تک لکڑی کے لٹھے پہنچانے کے لیے تیار ہو گئے۔ایک درانتی، چاقو یا کنگھی کے عوض یہ لوگ مرغیوں، بندروں، طوطے، شہد، موم اور سوتی دھاگوں کے ڈھیر کے ڈھیر یا کوئی اور چیز جو ان غریبوں کے پاس ہوتی، لا کر دے دیتے تھے۔

> تم فرانسیسی اور پرتگالی لوگ، کیوں اتنی دور سے لکڑیاں لینے کے لیے آتے ہو؟ کیا تمہارے ملک میں لکڑی نہیں ہے؟ ایک مقامی شخص نے ایک فرانسیسی راہب سے پوچھا۔ گفتگو کے آخر میں اس نے کہا: میرے خیال سے تم لوگ حد درجہ کے بے عقل ہو۔ تم سمندر پار کرنے میں اتنی پریشانیاں جھیلتے ہو اور اتنی زیادہ محنت کرتے ہو تاکہ اپنے بچوں کے لیے دولت اکٹھی کر سکو۔ کیا وہ زمین جو تمہاری پرورش کرتی ہے، تمہارے بچوں کا بھی رزق مہیا کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتی؟ ہمارے ماں باپ اور بچے ہیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہماری موت کے بعد وہ زمین جس نے ہماری پرورش کی ہے، ان کو بھی رزق مہیا کرائے گی۔اس لیے ہم سکون سے ہیں اور زیادہ فکر مند نہیں ہیں۔

عمارتی لکڑی کی تجارت، پرتگال اور فرانسیسی تاجروں کے درمیان شدید لڑائی کا سبب بنی۔ پرتگالی فتحیاب ہوئے اور انہوں نے ساحلی علاقوں میں بسنا اور ان کو نو آبادی بنانے کا فیصلہ کیا۔ 1534 میں پرتگال کے بادشاہ نے برازیل کے ساحلی علاقوں کو چودہ موروثی قیادتوں (Captaincies) میں تقسیم کر دیا۔ جو پرتگالی یہاں بسنا چاہتے تھے، بادشاہ نے ان کو زمین کی ملکیت اور مقامی لوگوں کو غلام بنانے کے حقوق عطا کیے۔ بہت سے پرتگالی آباد کار جن کو ہندوستان میں گوا میں جنگ کا تجربہ تھا وہ مقامی لوگوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتے تھے۔ 1540 کی دہائی میں پرتگالیوں نے بڑے بڑے کھیتوں میں گنا پیدا کرنا شروع کر دیا اور شکر بنانے کے لیے ملوں کو تعمیر کیا۔ یہ شکر یورپ میں فروخت ہوتی تھی۔ اس شدید گرم اور مرطوب آب وہوا میں شکر کی ملوں میں کام کرنے کے لیے، ان کا انحصار مقامی لوگوں پر تھا۔ جب مقامی لوگوں نے اس تھکا دینے والے اور بے کیف کام کرنے سے انکار کیا تو مل مالکوں نے آخری حربہ کے طور پر ان کو اغوا کرنا شروع کر دیا تاکہ ان سے غلاموں کی طرح کام لے سکیں۔ مقامی باشندے ظالم آقاؤں سے بچنے کے لیے جنگلوں میں پناہ لیتے رہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ساحلی علاقہ میں بڑی مشکل سے کوئی مقامی گاؤں بچا تھا بلکہ ان کی جگہ بڑے اور منظم یورپی شہر آباد ہو گئے۔ کھیتوں کے مالکان آب غلاموں کے لیے دوسرے مصدر مغربی افریقہ کی طرف رخ کرنے پر مجبور تھے۔ یہ اسپینی نو آبادیوں سے مختلف تھا۔ ایزایک اور انکا سلطنتوں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ کھیتوں اور کانوں میں کام کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے اسپینیوں کو انہیں رسمی طور پر غلام بنانے یا غلاموں کے لیے دوسری طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ 1549 میں پرتگالی بادشاہ کے زیر قیادت ایک باضابطہ حکومت کا قیام عمل میں آیا جس کی راجدھانی سلواڈور (Salvador) تھی۔ اس وقت سے یسوعی (Jesuits) برازیل آنے لگے۔ مقامی لوگوں کے ساتھ انسانی رابطہ کی بات کرنے، بے خوف جنگلوں میں جا کر گاؤں میں رہنے اور گاؤں کے باشندوں کو عیسائیت کو ایک عمدہ مذہب کی حیثیت سے پیش کرنے کی وجہ سے یورپ کے آباد کاروں نے یسوعیوں کو ناپسند کیا۔ یہی نہیں بلکہ یسوعیوں نے غلامی کی بھرپور تنقید کی۔

3.4 اسپینی بحری مہم جوئی (Spanish Naval Adventures)

دریں اثنا، اسپین اپنے ملاحوں کو مغرب کی طرف بھیج رہا تھا۔ پندرہویں صدی کے اواخر تک پڑھے لکھے لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ دنیا گول ہے اور مغرب کی طرف چل کر بھی مشرق تک پہنچا جا سکتا ہے۔ بہت سے جہاز راں اس بات پر اتفاق رکھتے تھے کہ مغرب کی طرف بحری سفر کر کے مشرقی جزائر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ کولمبس پہلا یورپی تھا جس نے ایسی کوشش کی۔

3.4.1 امریکہ کی دریافت (The Discovery of America)

امریکہ کی دریافت کا سہرا کرسٹوفر کولمبس (Christopher Columbus, 1451–1506) کے سر ہے جو ایک اطالوی جہاز راں تھا۔ وہ جنیوا (Geneva) کا باشندہ تھا اور مہم جوئی اور ناموری کا خواہاں تھا۔ اس زمانے کے مشہور ملاحوں اور جغرافیہ دانوں کی طرح کولمبس کو بھی ایشیا کا سمندری راستہ دریافت کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے اس شوق میں اس عہد کی جدید ترین جغرافیائی معلومات اکٹھا کر لی تھیں اور کارڈینل پائرے ڈایلی (Cardinal Pierre d'Ailly) کی علم فلکیات اور جغرافیہ کے موضوع پر لکھی گئی کتاب

امیگو منڈی (Imago Mundi, 1410) سے خصوصی طور پر متاثر تھا۔ وہ اپنے ہم عصر جغرافیہ دانوں کی طرح اس بات کا یقین رکھتا تھا کہ زمین گول ہے اور یہ کہ ایشیا یورپ کے مغرب میں واقع ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان اور چین کو پہنچنے کے لئے بحر اوقیانوس میں مغرب کی جانب سفر کرنا پڑے گا اور اس سمندر کے مغربی کنارہ پر براعظم ایشیا واقع ہے۔ کولمبس ایک تجربہ کار ملاح تھا اس نے بحر متوسط (Mediterranean) میں متعدد بحری مہمات کی سر کردگی کی تھی اور بحر اوقیانوس کے ساحلی علاقوں میں بھی جہاز رانی کی تھی۔ وہ بڑا حوصلہ مند آدمی تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے اپنے تجویز کردہ سمندری راستے سے ایشیا پہنچنے کا موقع مل جائے۔ اس کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ اس نے اطالیہ کے حکمرانوں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ انہوں نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس کے بعد وہ پرتگال کے شاہ جان دوم کے دربار پہنچا اس سے مالی اعانت اور سرپرستی کی درخواست کی مگر پرتگالیوں نے کولمبس کی تجویز کردہ مہم میں کوئی دلچسپی نہیں لی کیونکہ وہ ہندوستان پہنچنے کے لئے ایک عرصہ سے جنوبی اوقیانوس کے راستہ کی تلاش میں تھے۔ ان ناکامیوں کے بعد کولمبس اسپین پہنچا جہاں اس زمانے میں فرڈیننڈ اور ازابیلا کی مشترکہ بادشاہت میں ایک طاقتور قومی حکومت کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ اسپینی حکمرانوں جنہوں نے حال ہی میں غرناطہ فتح کیا تھا کو راضی کرنے میں کامیاب رہا۔ ازابیلا نے کولمبس کی مجوزہ مہم کی سرپرستی قبول کی۔ اس طرح اسے ایک متوسط درجہ کی سمندری مہم کی منظوری اور درکار امداد حاصل ہوگئی۔ اسپین کی مالی اعانت سے کولمبس 3 اگست 1492 میں پالوس (Palos) کی بندرگاہ سے اس تاریخ ساز مہم پر روانہ ہوا۔

بحر حال، کولمبس اور 87 ملاحوں پر مشتمل اس کے عملہ نے بحر اوقیانوس کے اس طویل سفر اور اس منزل کے لیے کچھ خاص تیاری نہیں کی تھی۔ جہازوں کا بیڑا صرف ایک چھوٹے مسلح تجارتی جہاز (پرتگالی :Nao) جس کا نام سانتا ماریا (Santa Maria) تھا اور دو ہلکی اور چھوٹی کشتیوں پر مشتمل تھا، جن کا نام پنٹا (Pinta) اور نینا (Nina) تھا۔ کولمبس نے چالیس مضبوط ملاحوں کے ساتھ مل کر، خود ہی سانتا ماریا کی کمان سنبھالی۔ آگے کی طرف سفر کرتے وقت تجارتی ہوا موافق تھی مگر راستہ طویل تھا۔ 8 ہفتوں تک مسلسل سفر چلتا رہا اور تاحد نظر آسمان اور سمندر کے علاوہ کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کولمبس اور اس کے ساتھی عجیب بیم ورجا کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ آخر کار وہ بے چین ہونے لگے۔ مایوسی کی حالت میں کچھ ملاحوں نے اپنے کپتان کے خلاف بغاوت بھی کی اور واپس چلنے کا مطالبہ کیا۔ سمندر ناپید کنار ثابت ہو رہا تھا۔ امید کم اور خدشات زیادہ تھے۔ کسے امید تھی کہ یہ قافلہ منزل مقصود تک پہنچے گا بھی۔ اس سے پہلے وہ اپنے ہم عصروں کی طرح سبکباران ساحل ہی تھے۔ پہلی مرتبہ ایک بحر ناپید کنار میں داخل ہوئے تھے۔

خدا خدا کر کے اس مایوسی میں امید کی ایک کرن پھوٹی اور 12 اکتوبر 1492 کو آخر کار انہیں ساحل نظر آگیا۔ کولمبس کے خیال میں وہ ہندوستان پہنچ گئے تھے اور اس نے اتھلے سمندر سے گھرے ہوئے جزیرہ کو اپنی زبان میں باجامار (Baja mar) سے تعبیر کیا۔ در حقیقت وہ اور اس کے ساتھی جس مقام پر لنگر انداز ہوئے وہ بحر کریبین (Caribbean Sea) میں واقع بہاماس (Bahamas) کا ایک جزیرہ گواناہانی (Guanahani) تھا۔ انہوں نے اتفاقی طور پر امریکہ کا مشرقی ساحل دریافت کیا تھا۔ لیکن کولمبس جو بعد میں مزید تین مہموں کے ساتھ امریکہ آیا تھا تادم آخر اس دھوکہ میں رہا کہ اس نے اسپین کے لئے چین اور ہندوستان کا راستہ دریافت کیا ہے۔ وہ بہاماس اور

دیگر جزیروں کے قدیم باشندوں کو ہندوستانی (Indians) سمجھتا تھا۔اسی بناء پر امریکہ کے قدیم باشندے آج تک سرخ ہندی یا ریڈ انڈینس(Red Indians) کہلاتے ہیں اور بحر کیریبین کے جزائر کو 'جزائر غرب الہند'(West Indies) کہا جاتا ہے۔

بہرکیف جزیرے کے مقامی باشندوں اراواکوں (*Arawak*)نے ان کا استقبال کیا اور بخوشی اپنے کھانے پینے میں شریک کیا۔ درحقیقت ان کی فیاضی نے کولمبس کو انتہائی متاثر کیا۔ جیسا کہ کولمبس نے اپنی *logbook* (بحری سفر کی روداد) میں لکھا ہے ''وہ اتنے سادہ اور کھلے دل کے لوگ ہیں کہ وہ لوگ جنہوں نے یہ نہیں دیکھا ہے شاید یقین نہ کریں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، اگر کوئی ان سے مانگے تو وہ کبھی نہ نہیں کہیں گے، بلکہ اس میں شریک کریں گے اور اس طرح محبت کا اظہار کریں گے گویا وہ دل نکال کر رکھ دیں۔'' کولمبس نے گواناہانی میں جسے اس نے سان سلواڈور (San Salvador) کا نام دیا تھا ایک اسپینی جھنڈا نصب کیا اور مذہبی رسوم وعبادت منعقد کی اور مقامی باشندوں سے پوچھے بغیر، اپنے وائسرائے ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے ان کی مدد حاصل کی تاکہ وہ جلد از جلد کیوبناسکان (Cubanascan)یعنی کیوبا جسے اس نے جاپان سمجھا تھا اور کسکیا (Kiskeya) یا ہسپانیولا (Hispaniola) جو آج دو ملکوں ہیتی (Haiti) اور ڈومینکن ریپبلک (Dominican Republic)کے درمیان بٹا ہوا ہے، کے عظیم جزیروں تک پہنچ سکے۔ سونا اگرچہ فوراً نہیں مل سکا تھا مگر کھوجیوں نے پتہ لگایا تھا کہ یہ ہسپانیولا میں اندر جاکر پہاڑی ندیوں سے مل سکتا ہے۔اس کے بعد دوبارہ سفر شروع ہوا۔ یہ لوگ ابھی زیادہ دور بھی نہیں جاسکے تھے کہ سمندری مہم حادثوں کی لپیٹ میں آگئی اور پرجوش کیریب(Carib) قبائل کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اب عملے کے اراکین نے واپسی کا پرزور مطالبہ کیا جو کولمبس کو چار و ناچار قبول کرنا پڑا۔ واپسی کا سفر زیادہ مشکل ثابت ہوا کیونکہ جہاز دیمک زدہ اور بوسیدہ ہوچکے تھے اور عملہ تکان سے چور اور وطن کے فراق میں بے حال ہوگیا تھا۔ یہ سفر کل 32 ہفتوں میں پورا ہوا۔

تین مزید بحری سفر بعد میں شروع کیے گئے جن کے دوران کولمبس نے بہاماس، گریٹر اینٹلس(Greater Antilles)، جنوبی امریکہ کا براعظم اور اس کے ساحلی علاقے کی کھوج مکمل کی۔ اگرچہ کولمبس اپنی حقیقی کامیابیوں سے بے خبر ہی اس دنیا سے چلا گیا، لیکن اس کی دریافتوں کے ذریعے ہی امریکہ میں اسپینی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ وہ چلا تو تھا ہندوستان اور مشرقی جزائر کی تلاش میں، لیکن پہنچ گیا امریکہ۔ بعد کے اسفار نے یہ واضح کر دیا کہ جو اس نے دریافت کیا تھا وہ ہندوستان نہیں بلکہ ایک نیا براعظم اور ایک نئی دنیا ہے۔اس نئے براعظم کا نام فلورنس کے ایک جغرافیہ دان امریگو ویس پسی(Amerigo Vespucci)، کے نام پر امریکہ رکھا گیا جس نے صحیح اندازہ لگایا تھا کہ یہ کتنے بڑے ہو سکتے ہیں اور انہیں 'نئی دنیا' سے تعبیر کیا۔ امریکہ نام پہلی بار 1507 میں ایک جرمن پبلشر نے استعمال کیا تھا۔

کولمبس کے بعد امریکہ میں اسپینی ملاحوں کی آمد و رفت ایک عام بات ہوگئی۔ 1493 میں، پوپ کے حکم سے غیر عیسائی نئی دنیا کو اسپین اور پرتگال کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے مطابق برازیل کے مشرقی حصے اور گرین لینڈ (Greenland) کو چھوڑ کر مغربی نصف کرہ اسپین کو ملا اور مشرقی حصہ پرتگال کے حصے میں چلا گیا۔ پونس دلیون(Ponce the Loen)،دی سوٹو(De Soto)،اور اور میکسکو دریافت کیا۔ فرانسسکو کوروناڈو(Francisco Coronado) نئی دنیا میں مشہور افسانوی 'سونے کے سات شہروں' کی

تلاش میں عظیم وادی(Grand Canyon)اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے جنوب مغرب کو دیکھنے والا پہلا یورپی بن گیا اور بالآخر اس نے اسپین کے لیے میکسیکو کے شمال میں زمین حاصل کی۔ بلبوآ(Balboa) ، پناما(Panama) کو عبور کر کے بحر الکاہل کے ساحل پر پہنچ گیا۔ 1519ء میں پرتگالی ملاح فرڈیننڈ میگیلن(Magellan) کو اسپین نے ایسٹ انڈیز، جو آج جنوب مشرقی ایشیا کے نام سے جانا جاتا ہے، جانے کے لیے ایک راستہ بنانے کا کام سونپا تھا۔ اگرچہ سفر کے دوران ہی 1521 میں فلپائن میں میگیلن کی موت ہو گئی تھی، لیکن اس کے جہاز اور عملے نے زمین کا پہلا مکمل چکر لگایا اور ساری دنیا کا اپنا سفر مکمل کیا۔ اسی سال کورٹیز(Cortez) نے میکسیکو (Mexico) میں ازٹیک سلطنت کی فتح کی مہم شروع کی۔ پیزارو (Pizarro)نے 1531-32 میں پیرو(Peru)پر قبضہ کیا۔ کورٹیز اور پیزارو امریکہ میں اسپینی نوآبادیت کے قیام کے بانی شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی مہمات پر آئندہ صفحات میں ہم قدرے تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

3.4.2 کولمبس کی مہم کے نتائج (Consequences of Columbus' Expedition)

کولمبس نے نادانستگی کے عالم میں یورپ کی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی۔ اس نے ایک عظیم براعظم کو دریافت کیا تھا۔ نئی دنیا کی اس دریافت نے یورپ کی قسمت بدل ڈالی۔ پہلے تو یہاں ہسپانوی مہم جو اور آباد کار آتے رہے اور بعد میں یورپ کی دوسری قوموں نے بھی اپنی مہمیں روانہ کرنی شروع کیں۔ انگریز، فرانسی، ولندیزی، پرتگالی سب ہی اس دوڑ میں شریک ہو گئے۔ سب کو یہی دھن تھی کہ ایشیا پہنچنے کے لئے مزید نئے بحری راستے دریافت کئے جائیں۔ اس کوشش میں یورپ کی مغربی قوموں کی تجارت کو بہت بڑھاوا ملا۔ پرتگال نے تقریباً چھ سال بعد ہندوستان کا راستہ دریافت کر لیا جس کا اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اب نئے بحری راستوں سے مشرق سے تجارت ہونے لگی جس کے نتیجہ میں وینس اور جنیوا کے قدیم تجارتی شہر تباہ ہو گئے اور لندن(London)اور انٹورپ (Antwerp) مالا مال ہو گئے کیونکہ اب تجارتی شاہراہ بحر متوسط سے نکل کر اوقیانوس میں آگئی تھی۔ کولمبس کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لا متناہی لگنے والے سمندروں کے سروں کو دریافت کیا اور ثابت کر دیا کہ پانچ ہفتوں پر محیط سمندری سفر اور موافق تجارتی ہوا کی مدد سے ایک شخص کرہ ارض کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ سکتا ہے۔ اگرچہ اکثر جگہوں کے نام افراد کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ کولمبس کی یادگار کے طور پر صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ (The USA) کے ایک چھوٹے سے ضلع اور جنوبی امریکہ میں واقع ایک ملک کولمبیا (Columbia)کو منسوب کیا گیا ہے جن میں سے کسی ایک جگہ بھی وہ نہیں پہنچا تھا۔ نئی دنیا کی دریافت کا ایک اور اثر یہ ہوا کہ یورپی قوموں میں نوآبادیات کے حصول کے لئے مسابقت کا ایک خونریز سلسلہ شروع ہو گیا جو آئندہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ سولھویں صدی سے یورپ کی بیشتر لڑائیاں تجارتی شاہراہوں کے کنٹرول اور نوآبادیات کے حصول کے لئے لڑی گئیں۔ بحری انکشافات نے یورپ کی توسیع اور ترقی کے حیرت انگیز امکانات پیدا کر دیئے تھے ان موافق و مناسب حالات میں کوئی تعجب نہیں کہ یورپ ایک نئی دنیا کی تعمیر کی طرف بڑھنے لگا۔

3.4.3 کورٹیس اور ایزٹیک نسل (Cortes and Aztecs)

کورٹیس اور اس کے فوجیوں نے جنہیں فاتحین (Conquistadores) کہا جاتا ہے، میکسیکو کو سرعت اور بے رحمی کے

ساتھ فتح کر لیا۔ 1519 میں کورٹیس نے کیوبا سے میکسیکو کی جانب اپنا بحری سفر شروع کیا۔ اس نے نوٹوناکس (Totonacs) گروپ کے ساتھ دوستی قائم کی جو ایزٹیک نسل کی حکومت (Aztec Empire) سے علیحدہ ہونا چاہتے تھے۔ ایزٹیک بادشاہ مونٹے زوما (Montezuma) نے اس سے ملنے کے لیے ایک افسر روانہ کیا۔ اسپینیوں کی جارحیت، ان کے بارود اور گھوڑوں نے اسے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ مونٹے زوما خود ہی اس بات کا قائل ہو چکا تھا کہ کورٹیس ایک جلاوطن خدا کا اوتار ہے جو انتقام لینے کے لیے لوٹا ہے۔ اسپینیوں نے ٹلاکس کالانس (Tlaxcallans) جیسی سخت جنگجو قوم کو دبانا چاہا جنہوں نے شدید مزاحمت کے بعد ہی ہتھیار ڈالے تھے۔ اسپینوں نے بربریت کے ساتھ ان کا قتل عام کیا پھر وہ تینوچ ٹطلان (Tenochtitlan) کی طرف بڑھے جہاں وہ 8 نومبر 1519ء کو پہنچے۔ حملہ آور اسپینی، تینوچ ٹطلان کے مناظر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ یہ میڈرڈ (Madrid) سے پانچ گنا زیادہ بڑا تھا اور اس کی آبادی ایک لاکھ تھی۔ جو اسپین کے سب سے بڑے شہر اشبیلیہ (Seville) کی آبادی کا دوگنا تھی۔

مونٹے زوما نے کورٹیس کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ایزٹیک، اسپینیوں کو شہر کے قلب تک لے گئے، جہاں شہنشاہ نے ان پر تحائف کی بارش کر دی۔ ٹلاکس کالانس کے قتل عام کی خبر سن کر عوام ہراساں اور خائف تھے۔ ایک ایزٹیک روئداد نے صورت حال کی منظر کشی اس طرح کی ہے ایسا لگ رہا تھا کہ تینوچ ٹطلان نے کسی دیو کو پناہ دے دی ہو۔ شہر کے باشندے ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے ہر فرد نے مدہوش کرنے والا مشروم کھا لیا ہو اور کوئی مبہوت کرنے والی چیز دیکھ لی ہو۔ ہر ایک پر دہشت چھائی ہوئی تھی اور پوری دنیا کی آنتیں نکال لی گئی ہوں لوگ ایک خوف زدہ نیند میں ڈوب گئے تھے۔'' ایزٹیک لوگوں کے اندیشے بالکل صحیح ثابت ہوئے۔ کورٹیس نے بغیر کسی وضاحت کے بادشاہ کو اس کے گھر میں نظر بند کر دیا اور اس کے نام سے حکومت کرنے کی کوشش کی۔ اسپینی حکومت کے لیے بادشاہ کی اطاعت کو رسمی شکل دینے کے لیے کورٹیس نے ایزٹیک لوگوں کی عبادت گاہ میں عیسائی تصاویر آویزاں کر دیں۔ مونٹے زوما نے اپنے طور پر ایک سمجھوتہ کی پیش کش کی اور ایزٹیک اور عیسائی تصاویر دونوں ہی کو عبادت گاہوں میں نصب کروا دیا۔

اس فیصلہ کن وقت میں کورٹیس کو ایک نائب کو ذمہ داری سونپ کر فوری طور پر کیوبا واپس جانا پڑا۔ اسپینی تسلط کی زور زبردستی اور سونے کے مسلسل مطالبے نے ایک عام مزاحمت کو بھڑکا دیا تھا۔ الوارادو (Alvarado) نے موسم بہار کے ایک دن ہیوزیل پوچٹلی (Huitzilopochtli) نامی ایزٹیک تہوار کے دوران قتل عام کا حکم دے دیا۔ جب کورٹیس 25 جون 1520 کو واپس لوٹا تو اس کے لیے ایک مکمل بحران کی صورت پیدا ہو چکی تھی۔ شاہراہیں منقطع ہو چکی تھیں، پلوں پر قبضہ کیا جا چکا تھا اور ذرائع آمد و رفت بند ہو چکے تھے۔ اسپینیوں کو غذا اور پانی کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کورٹیس پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ اس دوران مونٹے زوما کی پراسرار حالت میں موت ہو گئی۔ ایزٹیک لوگوں کی اسپینوں سے دوبارہ جنگ شروع ہو گئی۔ چھ سو یورپی فاتحین اور ٹلاکس کالانس اور ان کے حلیفوں کی ایک بڑی تعداد آنسوؤں کی رات (Night of Tears) کے نام سے یاد کی جانے والی لڑائی میں ہلاک ہوئی۔ کورٹیس کو ٹلاکس کالا (Tlaxcala) کی طرف پسپا ہونا پڑا تا کہ نئے منتخب بادشاہ گوآٹے موک (Guatémoc) کے خلاف حکمت عملی تیار کر سکے۔

دریں اثناء ایزٹیک خوفناک چیچک سے مرنے لگے جو یورپی لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔ صرف 180 فوجیوں اور 30 گھوڑوں کے ساتھ کورٹیس تینوچ ٹٹلان میں داخل ہوا جہاں ایزٹیک آخری مقابلے کے لیے تیار تھے۔ ایزٹیک لوگوں کے خیال میں انہیں بدشگنی نظر آرہی تھی جو ان کے خاتمہ کے نزدیک آنے کی پیشن گوئی کررہی تھی۔ شاید اسی لیے بادشاہ نے اپنے لیے موت پسند کی تھی۔ میکسیکو کی فتح میں دو سال لگے۔ کورٹیس میکسیکو میں جدید اسپین کی جانب سے کیپٹن جنرل بن گیا اور چارلس پنجم (Charles V) نے اسے اعزازات سے نہال کردیا۔ میکسیکو سے اسپینیوں نے گواٹے مالا(Guatemala)، نکاراگوا(Nicaragua) اور ہونڈورس(Honduras) پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔

3.4.4 پیزارو اور انکا نسل (Pizarro and Incas)

کورٹیس کے برعکس، فرانسسکو پیزارو(Francisco Pizarro) غیر تعلیم یافتہ اور غریب تھا۔ جب 1502 میں وہ فوج میں شامل ہوا اور اپنا راستہ بناتے ہوئے وہ کیریبین جزائر تک پہنچ گیا۔ اس نے کہانیوں میں سن رکھا تھا کہ انکا نسل کی مملکت، سونے اور چاندی کا دیس (El-dor-ado) ہے۔ اس نے باربار کوشش کی کہ بحر الکاہل کی جانب سے وہاں پہنچے۔ ایک سفر میں جب وہ وطن کے لیے واپس ہورہا تھا تب وہ اسپینی بادشاہ سے ملنے میں کامیاب ہوگیا اور انکا کاریگروں کے عمدہ نمونے، سونے کے خوبصورت منقش مرتبان، اسے دکھائے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کا لالچ جاگا اور اس نے پیزارو سے وعدہ کیا اگر وہ انکا مملکت پر فتح حاصل کرلے تو وہ اسے وہاں کا گورنر بنادے گا۔ پیزارو نے منصوبہ بنایا کہ وہ کورٹیس کے طریقے پر چلے گا مگر یہ جان کر پریشان ہوگیا کہ انکا مملکت کی صورت حال مختلف ہے۔

1532 میں اٹاہولاپا (Atahualpa) نے ایک خانہ جنگی کے بعد انکا مملکت کے تخت پر قبضہ کرلیا۔ پیزارو اسی موقع پر وہاں پہنچا اور ایک ترکیب سے بادشاہ کو پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ بادشاہ نے آزادی کے بدلے سونے سے بھرا ہوا ایک کمرہ پیش کیا جو تاریخ میں مذکور سب سے بیش قیمت اور مہنگا فدیہ تھا، لیکن پیزارو نے اپنا وعدہ وفا نہیں کیا اور بادشاہ کو مروادیا۔ اس کے پیروکاروں نے بھی دل کھول کر لوٹ مار مچائی اور اس کے بعد ملک پر اسپینیوں کا قبضہ ہوگیا۔ فاتحین کی ظلم و بربریت نے 1534 میں ایک بغاوت بھڑکادی جو دو سال تک جاری رہی اور جس کے دوران ہزاروں افراد جنگ اور وبائی امراض کے سبب ہلاک ہوگئے۔ آنے والے پانچ سالوں میں اسپینیوں نے پوٹوسی (Potosi) یعنی موجودہ بالائی پیرو (Upper Peru) اور بولیویا (Bolivia) میں وسیع و عریض کانوں کو دریافت کیا اور ان میں کام کرنے کے لیے انکا نسل کے لوگوں کو غلام بنالیا۔

3.5 دیگر یورپی مہمات (Other European Expeditions)

بحر اوقیانوس کے ساحل پر دو اور قومی ریاستیں، برطانیہ اور فرانس شروع میں بحری اسفار اور جغرافیائی دریافتوں سے لاتعلق رہے، لیکن بعد میں وہ سرگرم ہوگئے۔ سترہویں صدی کے بعد ہی برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ نے دنیا کی اہم سامراجی اور تجارتی طاقتوں کے طور پر اسپین اور پرتگال کی جگہ لی۔ اطالوی نژاد جان کیبوٹ (John Cabot) کو برطانیہ نے 1497–98 میں ایشیا کا راستہ تلاش کرنے کے

لیے بھیجا تھا۔ اس کے بجائے، اس نے 1497 میں کناڈا میں واقع نیو فاؤنڈ لینڈ(Newfoundland) کے ساحل کی دریافت کی۔ کیبوٹ نے اپنے تین سفروں کے دوران برطانیہ کے لیے زمینیں حاصل کیں اور شمالی امریکہ میں برطانوی سلطنت، جان کیبوٹ کی سمندری مہمات کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ فرانسس ڈریک(Francis Drake) کو ملکہ الزبتھ اول نے نجی طور پر سفر کرنے اور ہسپانوی بحری جہازوں اور بندرگاہوں سے چوری کرنے کا کام سونپا تھا۔ 1577 سے 1580 تک اس نے اپنے طور پوری دنیا کا چکر لگایا، جو میگیلن اپنی زندگی میں نہیں کر پایا تھا۔ ایک فرانسیسی مہم جو جیک کارٹیئر، (Jacques Cartier) انے شمال مغربی راستے کی تلاش کے لیے کناڈا کے مشرقی حصے میں واقع دریائے سینٹ لارنس میں جہاز رانی کی۔ کارٹیئر پہلا یورپی تھا جس نے سینٹ لارنس کی خلیج اور دریائے سینٹ لارنس کے ساحلوں کو بیان کیا اور ان کا نقشہ بنایا، جسے اس نے دو بڑی بستیوں کے ارو کوئی ناموں اسٹاڈاکونا (کیوبیک سٹی) اور ہوشیلگا (جزیرہ مونٹریال) کے نام پر 'کناڈائیوں کا ملک' (The Country of Canadas) کا نام دیا۔ ما سے فرانس کے لیے کناڈا پر دعویداری مستحکم کرنے اور اسے کناڈا نام دینے کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ اٹلی سے تعلق رکھنے والے جیووانی ڈا ویرازنو (Giovanni da Verrazano)، کو فرانس نے شمالی امریکہ کے مشرقی ساحل کی تلاش کا کام سونپا تھا، جہاں اس نے 1524 میں جدید دور کے فلوریڈا سے کناڈا کے نیو برنسوک (New Brunswick) تک کا سفر کیا۔ سمندری سفر اور جغرافیائی دریافتوں کی دوڑ میں ڈچ بعد میں شامل ہوئے۔ برطانوی مہم جو اور ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے جہاز رانی کرنے والا ہنری ہڈسن (Henry Hudson) ایشیا کے لیے شمال مغربی راستے کی تلاش میں جدید دور کے نیویارک اور دریائے ہڈسن تک پہنچ گیا۔ اس نے اس علاقے میں ڈچ نوآبادیات کی بنیاد رکھی۔ اس نے 1723 میں نیو نیدرلینڈ (New Netherland) قائم کیا جسے بعد میں اس نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے حوالے کر دیا۔ ہالینڈ کا اور مہم جو ابیل تسمان (Abel Tasman) تھا۔ 1642 میں تسمان نیوزی لینڈ، تسمانیہ اور فجی پہنچنے والا پہلا یورپی بن گیا۔ اس نے 1644 میں آسٹریلیا کے شمالی ساحل کی تلاش کے لیے دوسرا سفر کیا۔ ڈچوں کے سب سے قیمتی مقبوضات، ملاکا (Malacca)، اسپائس آئی لینڈ (Spice Island)، کچھ ہندوستانی بندرگاہیں اور افریقہ کے کچھ حصے تھے، جو انہیں پرتگال سے ملے تھے۔

3.6 جغرافیائی دریافتوں کے نتائج (Consequences of Geographical Discoveries)

3.6.1 نوآبادیت کا آغاز (The Emergence of Colonialism)

یورپ کے لیے شمالی و جنوبی امریکہ کی دریافت کی اہمیت ابتدائی بحری سفر کرنے والوں کے علاوہ، دوسرے لوگوں کے لیے بھی تھی۔ جغرافیائی دریافتوں کی وجہ سے نوآبادیات کے قیام کا عمل شروع ہوا۔ اگرچہ یورپی تہذیب شروع سے ہی توسیع پسند رہی ہے لیکن سولہویں صدی سے اس توسیع پسندی نے استعمار یا سامراجیت (Imperialism) کی شکل اختیار کرلی۔ اگرچہ 1493 عیسوی میں پوپ کے حکم سے اس وقت کی دریافت شدہ نئی دنیا کو اسپین اور پرتگال کے درمیان تقسیم کر دیا گیا لیکن یورپ کے دیگر ممالک میں اس فیصلے کو قبول نہیں کیا گیا۔ اسپین اور پرتگال کے ساتھ ساتھ برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ نے بھی نوآبادیاں قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ سب سے پہلے، ہالینڈ نے اسپین اور پرتگال کی نوآبادیاتی حکومت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ درحقیقت اسپین اور پرتگال بھی 1493 عیسوی میں پوپ کے حکم

پر قائم کردہ لائن آف ڈیمارکیشن (Line of Demarcation) پر حرف بحرف عمل نہیں کر رہے تھے۔ اسپین نے فلپائن (Philippines) مجمع الجزائر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا جو کہ پوپ کے فیصلے کے مطابق پرتگالی علاقہ تھا۔ دوسری طرف پرتگالی، برازیل (Brazil) میں ایک مستقل نوآبادیاتی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ اس لیے جلد ہی بحراوقیانوس کی دوسری ریاستیں برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ بھی نوآبادیات کی اس دوڑ میں شامل ہو گئے۔

نئی دنیا میں پہلی اسپینی نوآبادی ہیتی جزیرے (Haiti Island) پر قائم ہوئی جسے اسپینی باشندے ہسپانیولا کہنے لگے۔ جلد ہی اسپینی مقبوضات، کیریبین جزائر (Caribbean Islands) اور اس سے ملحقہ سرزمین جو فلوریڈا (Florida) سے وینزویلا (Venezuela) تک پھیلی ہوئی تھی، تک پھیل گئے۔ کورٹیز نے میکسیکو والوں کی ازٹیک سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ کچھ دنوں بعد فرانسسکو پیزارو نے انکاوالوں کو شکست دی اور پیرو کو فتح کر لیا۔ میکسیکو اور پیرو سے بڑی مقدار میں سونا اور چاندی اسپین لایا گیا۔ اس عظیم خزانے کو دیکھ کر اسپینی نوآبادکار اور مہم جو جنوبی امریکہ کے دیگر علاقوں کو فتح کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔ ایک رئیس، جس نے اسپینی حکمراں سے نوآبادی قائم کرنے کی اجازت طلب کی تھی، ارجنٹائن (Argentina) اور پیراگوئے (Paraguay) میں اسپینی نوآبادیاں قائم کیں۔ عیسائیت کے ساتھ ساتھ یورپی تہذیب کی دوسری چیزیں بھی ان نوآبادیات میں لائی گئیں۔ اسی طرح بحراوقیانوس کے دیگر ممالک نے امریکی براعظم اور دنیا کے دیگر حصوں میں نوآبادیاں قائم کیں۔ یہاں یہ ضروری نہیں کہ نوآبادیوں کے قیام کی تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا جائے، مختصراً یہ کہنا کافی ہوگا کہ جغرافیائی دریافتوں کی وجہ سے دنیا پر یورپی غلبے کی شروعات ہوئی اور یورپی تہذیب و تمدن غیر عیسائی دنیا پر مسلط ہو گیا۔

3.6.2 تجارت اور کاروبار کی ترقی (Development of Trade and Commerce)

ان جغرافیائی دریافتوں اور نوآبادیاتی سلطنت کے قیام کے بہت سے نتائج برآمد ہوئے۔ سب سے پہلے اس نے تجارت اور کاروبار کو بحیرہ روم کی تنگ حدود سے نکال کر عالمگیر بنا دیا، یعنی بحیرہ روم کے تجارتی مراکز کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ جنیوا (Geneva) اور وینس (Venice) اندھیرے میں ڈوبنے لگے جبکہ لزبن (Lisbon)، بورڈو (Bordeaux)، لیور پول (Liverpool)، برسٹل (Bristol) اور ایمسٹرڈیم (Amsterdam) کی بندرگاہوں میں بحری جہازوں کی آمد سے جان پڑ گئی اور وہاں کے تاجر مالدار ہو گئے۔ مشرقی تجارت پر اطالوی شہروں کی اجارہ داری مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ تاریخ میں پہلی بار عظیم قومی ریاستوں کے بحری جہاز سات سمندروں میں سفر کرنے لگے۔ تجارت اور کاروبار کے پھیلاؤ کی وجہ سے تجارت کے حجم اور تجارتی سامان کی مختلف اقسام میں حیران کن اضافہ ہوا۔ اب مشرق کے مصالحوں اور کپڑوں کے ساتھ شمالی امریکہ کی تمباکو اور ویسٹ انڈیز کا شیرا اور رم، جنوبی امریکہ کے ناریل، کونین (quinine) اور رم، افریقہ کے موتی، شتر مرغ کے پر اور حبشی غلام جڑ گئے۔ ان اشیاء کے ساتھ ساتھ پرانے سامان کی رسد (supply) بھی بڑھ گئی۔ چینی، کافی، چاول اور کپاس مغربی نصف کرہ (Western Hemisphere) سے بڑی مقدار میں درآمد ہونے لگے۔ یہ اشیاء اب اسباب عیش و عشرت نہیں رہیں، کیونکہ اب یہ وافر مقدار میں دستیاب تھیں۔

3.6.3 سونے اور چاندی کی افراط (Abundance in Gold and Bullion)

مغربی یورپی ممالک میں سونے اور چاندی کی بھرپور فراہمی، جغرافیائی مہمات کا ایک اہم نتیجہ تھی۔ جس وقت کولمبس پہلی بار امریکہ گیا، یورپ کے پاس اتنا سونا اور چاندی نہیں تھا کہ وہ متحرک معیشت کو برقرار رکھ سکے۔ 50 سال کے بعد یورپ پر امریکی سونے اور چاندی نے اپنا اثر دکھایا۔ کچھ دنوں تک تو سونے کی رسد اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ چاندی سے بھی سستا ہو گیا تھا۔ 1540 عیسوی کے آس پاس یہ صورت حال تبدیل ہو گئی۔ میکسیکو(Mexico,)، بولیویا (Bolivia) اور پیرو (Peru) کی کانوں سے بڑی مقدار میں چاندی درآمد کی گئی۔ نتیجتاً، سونے کے مقابلے چاندی کی قیمت گر گئی اور اب اہم لین دین کے لیے سونا ذخیرہ کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس کے بعد تقریباً 80 سال تک یورپی معیشت چاندی پر منحصر رہی۔ سونے اور چاندی کی ریل پیل نے بین الاقوامی تجارت اور صنعت کاری کو مزید توسیع دی۔ بڑی مقدار میں چاندی کی گردش کی وجہ سے مہنگائی بڑھ گئی۔ اجرتوں اور قیمتوں میں حیران کن اضافہ ہوا۔ متوسط طبقہ جس کے ہاتھ میں تجارت اور کاروبار اور سونے چاندی کا ذخیرہ تھا، کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ دوسری طرف زمین سے جڑے جاگیر دار طبقے کی اہمیت کم ہونے لگی۔ حکومت کو انتظامیہ اور فوجوں کے رکھ رکھاؤ کے لیے مزید رقم کی ضرورت تھی۔ اس لیے بادشاہوں نے متوسط طبقے کی طرفداری کرنا شروع کر دیا۔ زیادہ دولت کی ضرورت کی وجہ سے بادشاہوں کو پارلیمنٹ اور جاگیرداروں کے ساتھ جھگڑا مول لینا پڑا۔

پورے یورپ میں افراط زر (مہنگائی) یکساں نہیں تھی۔ امریکہ سے آنے والے چاندی کے سیلاب کی وجہ سے جرمنی کی چاندی کی کان کنی کی صنعت تباہ ہو گئی۔ نتیجتاً جرمنی کی اقتصادی حیثیت میں کمی آ گئی، جب کہ برطانیہ اور ہالینڈ زیادہ اہمیت اختیار کر گئے۔ سونے چاندی کے بہتات سے سب سے پہلے اسپین نے فائدہ اٹھایا اور خوشحال ہو گیا۔ 1560 اور 1600 کے درمیان ہر سال ایک سو جہاز جنوبی امریکہ کی کانوں سے اسپین کے لیے چاندی لے جاتے تھے۔ لیکن اسپین اور پرتگال نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ انہوں نے اپنے کثیر منافع کو مزید تجارت کے فروغ یا تجارتی بحریہ بنانے میں نہیں لگایا۔

اسپین کی صنعتی ترقی اتنی کم ہوئی تھی کہ وہ مغربی نصف کرہ میں مصنوعات کے لیے اہل یورپ کی طلب کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ نتیجتاً، یورپ والوں نے کپڑا، کٹلری (چمچ، چھری کانٹے وغیرہ) اور کچھ دیگر سامان کے لیے شمالی یورپ کا رخ کیا۔ اسپین اور پرتگال اپنی وسیع سمندر پار سلطنتوں کے مسائل میں اس قدر محو ہو گئے کہ وہ یورپ میں اپنی منڈیوں سے محروم ہو گئے۔ بحر اوقیانوس کی سرحدوں پر واقع دیگر ممالک خاص طور پر برطانیہ ، فرانس، بیلجیم اور ہالینڈ نے ان دریافتوں سے فائدہ اٹھایا۔ ان ممالک کے تاجروں نے مشترکہ حصص والی کمپنیاں (Joint Stock Companies) تشکیل دیں، تجارتی مہمیں روانہ کیں اور نو آبادیں قائم کیں۔ خاص طور پر ڈچوں نے اس صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کیا۔ کاروباری ڈچ تاجر، لزبن (Lisbon) میں سامان خرید کر، جہازوں سے نیدرلینڈ لاتے اور شمالی اور مغربی یورپ میں بھاری منافع پر فروخت کر دیتے تھے۔ سولھویں صدی میں، اینٹورپ (Antwerp) اپنی بہترین بندرگاہ اور جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے یورپ کا سب سے ترقی یافتہ تجارتی مرکز تھا۔ لیکن سترہویں صدی تک ایمسٹرڈیم (Amsterdam) اور لندن (London) تجارتی دنیا میں عروج حاصل کر چکے تھے۔

3.6.4 نئی فصلوں کا متعارف ہونا (Introduction of New Crops)

بحری مہم جوؤں نے یورپ کے لوگوں کو نئی دنیا کی مصنوعات سے روشناس کرایا۔ان مصنوعات میں تمباکو(Tobacco)، آلو (Potato)، گنا(Sugarcane)، کاکاؤ (Cacao) اور ربر(Rubber)شامل تھیں۔یورپ، امریکہ کی نئی فصلوں خاص طور پر آلواور سرخ مرچ(Red Chilli)سے متعارف ہوا۔ پھر یورپ کے لوگ یہ تمام چیزیں دوسرے ممالک مثلاً ہندوستان لے گئے۔

3.6.5 نسل انسانی کے علم میں اضافہ (Advancement in the Domain of Knowledge)

ان تاریخی اسفاراور دریافتوں کی وجہ سے نسل انسانی کے علم میں اضافہ ہوااور اس کا ذہنی افق وسیع ہوا۔سمندری سفر کے دوران پیش آنے والی مشکلات اور مسائل کی وجہ سے انسان کا نظریہ اور طرز فکر بالکل بدل گیا۔یورپی متلاشیوں نے ایسے علاقوں اور لوگوں کو دریافت کیا جو مکمل طور پر الگ تھلگ اور کٹ کر زندگی گزار رہے تھے اور اب بھی ماقبل تاریخی حالات میں تھے۔کم از کم امریکی براعظم کے بارے میں معلومات اسی دریافت کا نتیجہ تھیں۔ان جغرافیائی دریافتوں کے نتیجے میں دنیا ایک ہی وقت میں بڑی اور چھوٹی نظر آنے لگی۔اب تک اہل یورپ کے لیے دنیا صرف یورپ اور ایشیا تک محدود تھی۔اب امریکی براعظم کی دریافت کے بعد دنیا وسیع نظر آنے لگی۔سمندر سے ہزاروں میل دور علاقے ایک دور دراز ملک کے بادشاہ کے تابع ہو گئے۔اسپین اور پرتگال جیسی چھوٹی ریاستیں اب عظیم سلطنتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ان ممالک کے بادشاہوں کو اتنے بڑے علاقوں پر حکومت کرنے کا اعزاز حاصل ہوا جس پر سکندر (Alexander)اور شارلیمین (Charlemagne)نے بھی حکومت نہیں کی تھی۔افریقہ اور امریکہ کے درمیان غلاموں کی تجارت اور یورپ، ایشیااور امریکہ کے درمیان تجارت دنیا کے دور دراز علاقوں کے درمیان خون کی از سر نو گردش کا ایک ذریعہ بنی۔ تجارت اور رشتے داری کی شکل میں ان تعلقات نے پوری دنیا کو باہم جوڑ دیا۔ نتیجتاً دنیا وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ چھوٹی بھی دکھائی دینے لگی۔بالآخر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان جغرافیائی دریافتوں کی وجہ سے دنیا پر یورپی غلبہ واثر قائم ہوااور یہی اسباب سرمایہ داری(Capitalism)، کاروباریت(Commercialism) اور سامراجیت (Imperialism)کے عروج کا باعث بنے۔ان جغرافیائی دریافتوں نے دنیا کو جدید دور کی دہلیز پر لا کر کھڑا کر دیا۔

3.6.6 غلاموں کی تجارت (Slave Trade)

ان جغرافیائی دریافتوں کا سب سے تاریک نتیجہ حبشی غلاموں کی بدنام زمانہ تجارت تھی۔یورپی تاجر، افریقہ کے مغربی ساحلوں پر حبشی غلاموں کو پکڑ کر بھیڑ بکریوں کی طرح بحری جہازوں میں لاد کر امریکہ لے جاتے تھے اور وہاں نیلامی کے ذریعے انہیں فروخت کیا جاتا تھا۔ان غلاموں سے امریکہ کے وسیع وعریض کھیتوں میں زرعی کام لیا جاتا تھا۔اس کی وجہ سے غلاموں کی تجارت بہت منافع بخش ثابت ہوئی۔امریکہ میں بڑی تعداد میں حبشی غلاموں کی آبادکاری کی وجہ سے براعظم کا نسلی اور سماجی ڈھانچہ ہی بدل گیا۔آبادی کو غلام بنانے کا عمل جنگ کے واضح ظالمانہ سلوک کی یاد تازہ کر دیتا تھا۔غلامی نیا خیال نہ تھا۔لیکن جنوبی امریکہ کا یہ تجربہ نیا تھا جو اپنے ساتھ پیداوار میں سرمایہ دارانہ نظام لیے ہوئے تھا۔کام کرنے کے حالات لرزہ خیز تھے۔ لیکن اسپینیوں نے اس استحصال کو اپنے اقتصادی مفاد کے لیے ضروری

سمجھا۔ 1601 میں اسپین کے فلپ دوم نے اعلانیہ طور پر بیگار پر پابندی لگادی، لیکن اس نے ایک خفیہ سرکاری حکم کے ذریعہ اسے جاری رکھنے کا بندوبست بھی کر دیا۔ 1609 کے قانون کے ساتھ حالات ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گئے۔ اس قانون نے مقامی لوگوں، عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کو یکساں طور پر مکمل آزادی عطا کر دی۔ یورپ سے آکر وہاں بسنے والے اس سے ناراض ہو گئے اور دو سال کے اندر انھوں نے بادشاہ کو اس قانون کے ختم کرنے اور غلام بنانے کی اجازت دوبارہ دینے پر مجبور کر دیا۔ نئی معاشی سرگرمیوں کی ابتداء کی وجہ سے، جنگلوں کو صاف کر کے، ان زمینوں پر مویشی پالن اور 1700 میں سونے کی دریافت کے بعد کان کی کھدائی کے لیے سستی مزدوری کی مانگ برقرار رہی۔ یہ واضح تھا کہ مقامی لوگ غلام بنائے جانے پر مزاحمت کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ اس لیے اس کے متبادل کے واسطے افریقہ کی طرف رخ کرنا پڑا۔ 1550 کی دہائی اور 1880 کی دہائی کے درمیان (جب برازیل میں غلامی ختم کر دی گئی تھی) 3,600,000 سے زائد افریقی غلام برازیل درآمد کیے گئے۔ یہ تعداد تقریباً شمالی و جنوبی امریکہ کے ذریعہ درآمد کیے گئے افریقی غلاموں کی مجموعی تعداد کی آدھی تھی۔ 1750 میں یہاں ایسے افراد پائے جاتے تھے جو ایک ہزار غلاموں کے مالک تھے۔ 1780 کی دہائی میں غلامی کے خاتمہ سے متعلق ابتدائی بحثوں سے وابستہ کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کی دلیل تھی کہ یورپیوں کے آنے سے قبل افریقہ میں غلامی موجود تھی۔ افریقہ میں پندرہویں صدی میں قائم ہونے والی ریاستوں میں بلاشبہ بیشتر کام انجام دینے والے غلام ہی تھے۔ ان لوگوں نے یہ بھی واضح کیا کہ یورپ کے تاجروں کا ساتھ ان افریقیوں نے دیا جو کم عمر مردوں اور عورتوں کو پکڑنے میں مدد کرتے تھے تاکہ ان پکڑے ہوئے لوگوں کو غلام بنا کر بیچا جا سکے۔ بدلے میں افریقی جنوبی امریکہ سے درآمد کی ہوئی فصلیں جیسے مکئی، مینیوک (Manioc) اور کساوا (Cassava) لیتے تھے۔ 1789 میں اپنی خودنوشت سوانح حیات میں آزاد کردہ غلام اولاؤدہ اقیانو (Olaudah Equiano) نے ان دلائل کا جواب یہ کہتے ہوئے دیا کہ افریقہ میں غلام فیملی کا حصہ سمجھے جاتے تھے۔ اولین جدید مورخین میں سے ایک ایرک ولیمس (Eric Williams) نے 1940 کی دہائی میں اپنی کتاب *Slavery and Capitalism* (سرمایہ داری اور غلامی) میں افریقہ کے غلاموں کے ذریعے سہے گئے مظالم کا نئے سرے سے تعین کیا ہے۔

3.6.7 مقامی آبادی کا صفایا (Extermination of the Native Population)

مقامی آبادی کے ایک بڑے حصہ کا طبیعی طور پر ہلاک ہونا، ان کے طرز زندگی کا خاتمہ اور کانوں، کھیتوں اور ملوں میں غلام بننا، شمالی و جنوبی امریکہ کے مقامی باشندوں کے لیے فوری نتائج تھے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ فتح سے پہلے میکسیکو کی آبادی 30 سے 37.5 ملین کے درمیان تھی۔ اینڈین (Andean) علاقہ کی آبادی بھی اتنی ہی تھی جبکہ وسطی امریکہ کی آبادی 10 سے 13 ملین تھی۔ یورپ کے لوگوں کی آمد سے قبل اصل مقامی باشندوں کی کل تعداد 70 ملین تھی۔ ڈیڑھ صدی کے بعد ان کی تعداد گھٹ کر 3.5 ملین رہ گئی۔ اس کے لیے بنیادی طور پر جنگ و جدل اور بیماریاں ذمہ دار تھیں۔ 1550 کی دہائی میں پیرو (Peru) کی چاندی کی کان میں کام شروع ہو گیا تھا اور راہب ڈومینکو ڈی سانٹو ٹومس (Domingo de Santo Tomas) نے انڈیز کی کونسل کو بتایا کہ 'پوٹوسی (Potosi) جہنم کا دہانہ ہے جو ہر سال ہزاروں ہندوستانیوں (Indians) کو نگل لیتا ہے اور لالچی کان مالک ان کے ساتھ آوارہ جانوروں کی طرح سلوک

کرتے ہیں۔'

3.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

پندرویں اور سولویں صدی کو بجا طور پر جغرافیائی اکتشافات کی صدی کہا جاتا ہے جس میں ایک نئے براعظم امریکہ اور ہندوستان تک پہنچنے کے بحری راستے کی دریافت ہوئی۔ امریکہ کی دریافت سے پہلے دنیا کے لوگ اس کے وجود سے ہی انجان تھے اور بحر اوقیانوس کو بحر ناپیدا کنار سمجھتے تھے۔ 15 ویں صدی میں ایجادات اور جغرافیائی معلومات میں اضافے کے سبب کچھ لوگوں کا یہ خیال کہتا گہرا ہوتا چلا گیا کہ دنیا گول ہے اور اگر یورپ سے مغربی سمت میں سیدھے سفر کیا جائے تو وہ ہندوستان پہنچ سکتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ لوگ افریقہ کے مغربی ساحل سے لگ کر جنوب کی سمت سیدھا سفر کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان لوگوں کا ماننا تھا کہ ایسا کر کے وہ افریقہ کا جنوبی کنارہ دریافت کر کے ہندوستان کی طرف بحری راستے سے جا سکتے ہیں۔ 15 ویں صدی میں قسطنطنیہ پر ترکوں کے قبضے کے بعد یورپی اقوام خاص کر وہ جو بحر اوقیانوس کے ساحل پر واقع تھے نئے راستوں کی تلاش میں لگ گئے کیونکہ وہ وینس کی طرح ترکوں سے کسی طرح کا تجارتی سمجھوتہ کر کے اپنے منافع کو کم نہیں کرنا چاہتے اور ساتھ ہی وہ وینس اور جنیوا کی مشرقی تجارت پر اجارہ داری کو چنوتی دینا چاہتے تھے۔ دیگر کچھ لوگ مہم جوئی، دولت کے لالچ اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کے جوش میں ان اکتشافی اور خطرناک بحری مہمات میں شامل ہوئے۔ پرتگال نے اس سمت میں پیش قدمی کی اور اس کے ایک شہزادے ہنری نے تو کافی سرمایہ اس کے لیے خرچ کیا اور بحری مہمات روانہ کیں۔ اسپین بھی پیچھے نہیں رہا اس نے بھی اپنے ملاحوں کو دور دراز سمندروں میں روانہ کیا۔ انہی میں سے ایک اطالوی مہم جو کولمبس نے اسپینی مدد سے امریکی براعظم دریافت کیا۔ پرتگالی جہاز راں ڈیاز بحری راستے سے جنوبی افریقہ کے جنوب ترین سرے 'راس امید' اور واسکوڈی گاما خوابوں کی سرزمین ہندوستان پہنچنے میں کامیاب رہا۔ جغرافیائی دریافتوں کے متعدد اہم نتائج نکلے۔ ایک طرف نوآبادیات کے قیام اور مقامی آبادی کی غلامی اور ماتحتی کا سلسلہ شروع ہوا تو دوسری طرف ان سے ملنے والے مادی منافع کی وجہ سے یورپی اقوام میں اسے حاصل کرنے کی ہوڑ لگ گئی۔ اسپین، پرتگال، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور کافی بعد میں جرمنی نے امریکہ افریقہ اور ایشیا میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ جغرافیائی دریافتوں سے یورپ میں سونے اور چاندی کی افراط ہو گئی جو کہ ان کی کمی سے جوجھ رہا تھا۔ اس کی مدد سے صنعتی انقلابات کا راستہ ہموار ہوا۔ امریکہ کی دریافت کی نتیجے میں یورپ اور دنیا نئی فصلوں جیسے ٹماٹر آلو اور تمباکو سے متعارف ہوئی جو کہ نئی دنیا سے لائی گئیں تھی۔ ساتھ ہی مقامی آبادی کی بڑی تعداد یورپی لوگوں کے کشت وخون اور ان کے ذریعے لائے گئے جراثیموں اور بیماریوں کی قوت مدافعت نہ ہونے کی وجہ سے ہلاک ہو گئی۔ اس کے علاوہ امریکی براعظم میں کام کرنے کے لیے افریقہ سے مقامی لوگوں کو پکڑ کے غلام بنا کر جہازوں میں بھر بھر کر لایا جانے لگا اور غلاموں کی بدنام زمانہ تجارت کا آغاز ہوا جو تقریبا دو صدیوں تک چلتا رہا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جغرافیائی دریافتوں کے نتائج بڑے دوررس ثابت ہوئے۔ اس نے یورپ کی برتری اور جدید دور کی بنیاد ڈالی، دنیا کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے ملایا اور ایشیائی، افریقی اور امریکی اقوام کی غلامی اور یورپی ممالک کے ہاتھوں ان ممالک کی لوٹ مار کا سلسلہ شروع کیا۔

3.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

قطب نما	:	(Compass) قطب نما یا کمپاس ایک ایسا آلہ تھا جو سمندر میں سفر کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ ایک یا زیادہ متوازی مقناطیسی سوئیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ اس میں ایک کاغذ پر تمام سمتوں کے ساتھ ساتھ ڈگریوں کا دائرہ بھی ہوتا تھا۔ یہ زمین کے قدرتی مقناطیسی کشش پر کام کرتا تھا جس میں قطب یا شمال کی سوئی ہمیشہ شمال کی طرف رہتی تھی۔
اسطرلاب	:	(Astrolabe) یہ ایک ابتدائی سائنسی آلہ تھا جو وقت کے تعین اور مشاہداتی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔
افراط زر	:	مہنگائی یعنی نقدی کے مقابلے میں جنس جیسے اناج یا اشیا کی کمی۔
مینیوک اور کساوا	:	(Manioc, Cassava) ویسٹ انڈیز کے پودے ہیں جن کے آٹے سے روٹی پکائی جاتی ہے۔
فاتحین	:	(Conquistadores) امریکہ میں اسپینی مہم جوؤں اور ابتدائی فاتحین کا لقب۔

3.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

3.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. وینس کہاں واقع ہے؟
2. قطب نما کسے کہتے ہیں؟
3. اصطرلاب کسے کہتے ہیں؟
4. جہازراں ہنری کسے کہا گیا؟
5. کیپوردے کس براعظم کا مغربی سرا ہے؟
6. راس امید کہاں واقع ہے؟
7. کون پرتگالی جہازراں سب سے پہلے راس امید پہنچنے میں کامیاب رہا؟
8. ہندوستان ابحری راستہ سب سے پہلے کس یورپی نے دریافت کیا؟
9. کون جہازراں ہندوستان کی تلاش میں جزائر غرب الہند (West Indies) پہنچ گیا؟
10. کس اسپینی نے ایزٹیک سلطنت پر فتح حاصل کی؟

3.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اہل یورپ مادی اور تجارتی منافع کے لالچ میں خطرناک بحری مہمات پر نکلے، مختصراً وضاحت کیجیے۔

2. فن جہاز رانی کے ارتقا پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
3. کابرال کے برازیل پر قبضے پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. کورٹیس اور ایزٹیک نسل کے تصادم پر نوٹ لکھیے۔
5. نوآبادیات کے آغاز پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔

3.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پرتگالی بحری مہم جوئی پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. امریکہ کی دریافت کس طرح ہوئی؟ تفصیلی طور پر وضاحت کیجیے۔
3. جغرافیائی دریافتوں کے نتائج پر تفصیلی تبصرہ کیجیے۔

3.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Armesto, Felipe Fernandez, *Pathfinders: A Global History of Exploration*, W.W. Norton & Company, New York, 2007.
2. Arnold, David, *The Age of Discovery*, *1400–1600*, Routledge, New Delhi, 2002.
3. Crosby, Alfred W. Jr., *The Columbian Exchange: Biological and Cultural Consequences of 1492*, Praeger Publishers Inc., 2003.
4. Davidann, Jon Thares, and Marc Jason Gilbert, *Cross-Cultural Encounters in Modern World History, 1453 – Present*, Routledge, New Delhi, 2019.
5. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
6. Love, Ronald S., *Maritime Exploration in the Age of Discovery, 1415–1800*, Greenwood Press, 2006.
7. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
8. Morison, Samuel, *The European Discovery of America*: *The Southern Voyages*, *1492–1616*, Oxford University Press, New Delhi, 1993.
9. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
10. Panikkar, K. M., *Asia and Western Dominance*: *A Survey of the Vasco Da Gama Epoch of Asian History*, *1498–1945*, L.G. Publishers Distributers, New Delhi, 2020.
11. ____________, *Malabar and the Portuguese*: *Being a History of the Relations of the Portuguese with Malabar from 1500 to 1663*, Gyan Publishing House, New Delhi, 2024.
12. Parry, J. H., *The Discovery of the Sea*, University of California Press, California, 1981.
13. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).

اکائی 4۔ ابتدائی نوآبادیت

(Early Colonialism)

اکائی کے اجزاء

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 پس منظر

4.3 استعماریت

4.4 اسباب

4.5 اسپین اوراس کی نوآبادیات

4.5.1 اسپین کی نوآبادیاتی تاریخ

4.5.2 اسپین کا نوآبادیاتی انتظام حکومت

4.5.3 اسپینی حکمرانوں کی معاشی پالیسی

4.6 پرتگال کی نوآبادیات

4.6.1 پرتگال کا نوآبادیاتی نظم ونسق اور معیشت

4.7 برطانیہ کی نوآبادیات

4.8 فرانس کی نوآبادیات

4.9 ڈچ کی نوآبادیات

4.10 اکتسابی نتائج

4.11 کلیدی الفاظ

4.12 نمونہ امتحانی سوالات

4.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید (Introduction)

1453ء میں قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ باز نطینی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی یورپ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ عام طور پر مورخین اس تاریخ سے براعظم یورپ کے جدید عہد کی شروعات مانتے ہیں۔ پندرہویں صدی میں یورپ نے کئی میدانوں میں تیزی سے ترقی کی۔ ان میں جہاز رانی کا فن بہت اہم تھا۔ قطب نما سمیت کئی اہم آلات کی ایجاد ہوئی۔ جہاز سازی میں جدید طریقے اپنائے گئے۔ نئے ڈیزائن کے جہازوں میں اسپین ربر نگاہ کے وہ جہاز خاص تھے جن میں مستول کے ستونوں پر مربع شکل کے بڑے بڑے کپڑے تان کر بادبان تیار ہوتے۔ چنانچہ بحری سفر آسان ہو گیا اور اس سے متعلقہ خطرات میں کمی آئی۔ اسی آسانی کا نتیجہ تھا کہ یورپی سیاح اور جہاز راں نئے جغرافیائی خطے دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے۔ قسطنطنیہ پر ترکوں کے قبضے کے بعد یورپی اقوام کے لیے مشرق سے تجارت کرنے کا راستہ بند ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے نیا بحری راستہ تلاش کرنا شروع کیا۔ فنِ جہاز رانی کی مہارت اور ترقی ان کی حوصلہ افزائی کے لیے کافی تھی، لیکن ساتھ ہی سیاسی و معاشی صورتحال بھی ان کی موافقت میں تبدیل ہو رہی تھی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کولمبس، واسکوڈی گاما اور دیگر مہم جو جہاز رانوں نے اپنے حکمرانوں کی مدد سے نئے جغرافیائی علاقے دریافت کیے، جو ان کی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بنے اور بتدریج ان خطوں پر متعلقہ یورپی ممالک نے پوری طرح کنٹرول کر لیا۔ اور ان کے تمام تر وسائل اپنے مفاد میں استعمال کرنے لگے۔ تاریخ میں یہ حکمراں ممالک سامراجی طاقتوں کے نام سے جانے جاتے ہیں جبکہ وہ خطے جن پر اُنہوں نے قبضہ جمایا نوآبادیات کہلائے۔ پندرہویں صدی عیسوی کے بعد سے یورپی طاقتوں نے ایشیاء، آفریقہ اور جنوبی امریکہ کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر کے ان کا سفاکانہ استحصال کیا۔ یہی نہیں ان صدیوں میں یورپ کے اندر زیادہ سے زیادہ نوآبادیات کی دوڑ لگ گئی اور بہت سارے ممالک ایک دوسرے سے متصادم ہونے لگے۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- یورپ میں استعماریت کے آغاز کو سمجھ سکیں گے۔
- ان اسباب کا تجزیہ کر سکیں گے جن کے نتیجے میں نوآبادیات کے حصول کی دوڑ لگ گئی۔
- نوآبادیاتی ممالک کی سیاسی و معاشی صورتحال کا اندازہ کر سکیں گے۔
- سامراجی طاقتوں کی کامیابی کے پس پشت صورتحال کا جائزہ لے سکیں گے۔

4.2 پس منظر (The Context)

بحری سفروں، جغرافیائی تحقیقات اور نشاۃ ثانیہ کے عہد میں ایشیاء، آفریقہ اور امریکہ کے بہت سے حصوں میں نوآبادیت قائم کی گئی۔ ان کا بنیادی مقصد مذکورہ علاقوں کی دولت سمیٹ کر اپنے ملک میں لانا تھا۔ اسپین کی امریکی نوآبادیات کا منصوبہ اسی مقصد کے پیش نظر قائم کیا گیا تھا کہ بحری تجارت سے زیادہ سے زیادہ منافع جائے۔ پرتگال نے بھی اسی کثیر منافع کے لیے مشرقی ممالک سے تجارتی روابط قائم کیے

تھے۔ مگر بتدریج اس کا نظریہ بدل گیا اور اس نے تجارتی منافع کے ساتھ ساتھ ان تجارتی علاقوں کو نوآبادیات میں تبدیل کرنے کی ٹھان لی۔ جس کے نتیجے میں سامراجیت کا آغاز ہوا۔ پرتگال اور اسپین کے بعد اس میدان میں برطانیہ داخل ہوا۔ شروع میں اس کا مقصد امریکہ میں اپنے شہریوں کو بسانا اور مشرق سے تجارت کرنا تھا۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد تجارت اور پیداوار میں جو زبردست اضافہ ہوا، اس کے پیش نظر برطانیہ کیلئے نوآبادیات ضروری بن گیا تاکہ وہ اپنے کارخانوں کے لیے خام مال فراہم کرسکے اور اپنی صنعتی تیار شدہ اشیاء نوآبادیاتی ممالک میں فروخت کرسکے۔ اس صورتحال نے یورپ کے مضبوط ممالک کو تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی ترغیب دی۔ نوآبادیات کے حصول نے یورپ کی اندرونی سیاست کو بھی متاثر کیا اور ممالک کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کرکے تصادم کی راہ ہموار کردی اور کئی جنگوں کے اسباب بھی پیدا ہوگئے۔

4.3 نوآبادیت (Colonialism)

جب کوئی ملک اپنی جغرافیائی حدود سے باہر نکل کر کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرلے اور اس کے وسائل کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرے تو یہ عمل سامراجیت کہلاتا ہے۔ قبضہ کرنے والا ملک سامراجی طاقت اور جس پر قبضہ کیا جائے وہ نوآبادی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ گذشتہ صدی تک ایشیاء، آفریقہ اور جنوبی امریکہ کے بہت سے علاقے یورپی ممالک کے زیر نگیں تھے۔ ان کمزور ممالک کی سیاست و معیشت پر یورپی کی بالادستی قائم تھی۔ اس نظام کی کچھ خصوصیات تھیں، مثلاً غیر ملکی حکمراں تعداد میں کم ہوتے تو بھی وہ ماتحت رعایا کا معاشی، سماجی اور ثقافتی استحصال کرتی۔ کچھ دانشوروں کے مطابق ایک ملک کا دوسرے ملک پر فوجی حملے کرکے اس کا اپنے ساتھ الحاق کرنے کو بھی سامراجیت کہتے ہیں۔ چارلس اے بیئرڈ کہتا ہے "سامراجیت وہ ہوتی ہے جس میں ایک ملک کی حکومت اور سفارتی مشنری دوسری قوم کے علاقوں اور خطوں کو حاصل کرنے کی کوشاں رہتی ہے اور اپنے صنعت و تجارت اور سرمایہ کاری کے مواقع کو بڑھانے کا کام کرتی ہے"۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی و معاشی طور پر مضبوط ممالک کا اپنے سے کمزور ملکوں پر قبضہ کرنا استعماریت ہے، جو حاکموں کے لیے نعمت اور محکوم اقوام کے لیے لعنت بن جاتا ہے۔ تاریخ یہی بتاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ کچھ دانشوروں کے مطابق سامراجیت(Imperialism) اور استعمار یا نوآبادیت(Colonialism) میں فرق ہے۔ ای ایف پیٹروز کہتا ہے کہ 'سامراجیت میں نئے زمینوں اور علاقوں کی شمولیت براہ راست اور واضح ہوتی ہے اور ان مقبوضات کو سامراجی طاقت براہ راست اپنے قوانین و انتظام کے تحت رکھتی ہے، جبکہ نوآبادیاتی نظام میں ماتحت علاقوں کے حکومت و انتظام کو پوری طرح اپنے ہاتھ میں مرکوز نہیں رکھتی۔' اس باریک فرق کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں نظام قابض ملک کے مفاد اور اس کے ذریعہ اپنی اور مقبوضات کے ہمہ جہتی استحصال پر مبنی ہیں۔

یوں تو قدیم اور وسطی دور میں بھی ممالک ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور اپنی مملکت کو بڑھاتے تھے، لیکن اس کی نوعیت اس حاکم و محکوم کے تعلق سے بنیادی فرق رکھتی ہے جو ہمیں جدید عہد میں نظر آتا ہے۔ عہدِ وسطیٰ تک قوموں کے پھیلاؤ اور ریاستوں کے وسیع ہونے

میں سیاسی عوامل زیادہ کارفرما تھے، لیکن جدیدی عہد میں یہ صورتحال بالکل بدل جاتی ہے۔آغاز سے ہی نشاۃ ثانیہ اور مذہبی اصلاحی تحریکوں کے اس عہد میں استعماریت کا تصور تبدیل ہوتا ہے۔ قومی ریاستوں کے قیام نے مقامی عناصر کو اہم بنادیا۔ عالمی سلطنت کے اتحاد و برپابری کو ختم کیا۔ جغرافیائی دریافتوں کے سبب یورپ کے باشندے اور عوام نئے ممالک سے متعارف ہوئے، جس کے نتیجے میں سلطنت کا وہ روایتی تصور جس کو یونان، روم اور عہدِ وسطیٰ کے کیتھولک کلیسا نے تسلیم کیا تھا، مٹ گیا۔ مذہبی اصلاحی تحریکوں کے باعث مختلف ممالک میں مذہب کی جو نئی تشریحات ہوئی، انہوں نے کیتھولک کلیسا کی اس یکتا کو بھی ختم کر دیا جو ماضی میں پائی جاتی تھیں۔اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ عہدِ وسطیٰ کی عالمی سلطنت کا تصور مذکورہ اسباب سے کثیر سلطنتوں میں ختم ہوگیا۔یعنی اب ایک کی جگہ مختلف سلطنتیں وجود میں آگئی۔ان کا مقصد عالمی یکجہتی قائم نہیں کرنا تھا بلکہ دنیائے معلوم خطوں کو آپس میں تقسیم کرنا تھا۔

صنعت و تجارت کی ترقی نے بھی استعماریت کی اہمیت میں اضافہ کیا۔ نوآبادیات کا حصول معاشی سرگرمیوں کے لیے لازمی ہو گیا۔ ان مقبوضہ علاقوں سے نہ صرف سونا و چاندی بڑی مقدار میں حاصل کیا گیا بلکہ ان کے وسائل اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا جانے لگے اور خام مال نوآبادیات سے برآمد کر کے اپنا تیار شدہ صنعتی مال اُن کو فروخت کرتے۔اس طرح نوآبادیات کا معاشی استحصال آغاز سے ہی سامراجی طاقتوں کا بنیادی مقصد تھا۔ نوآبادیات کے حصول میں مذہبی ذہنیت بھی کارفرما تھی۔ مذہبی اصلاحی تحریکوں نے اسے مزید قوی کر دیا تھا۔ یورپی اقوام نے جس نئے علاقوں کو دریافت کیا، ان کے باشندوں کو وہ بددین و بدعقیدہ سمجھتے تھے۔انہیں عیسائی بنانا مقدس فریضہ جان کر بڑے پیمانے پر تبلیغ کا کام بھی کیا گیا۔

ایشیاء، آفریقہ اور امریکہ کے مختلف علاقوں میں قبضہ کر کے انہیں نوآبادیات میں تبدیل کرنے کا پہلا مرحلہ سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے دوران ہوا۔اس دور میں پرتگال، اسپین، ہالینڈ، برطانیہ اور فرانس نے بڑی نوآبادیات قائم کیں۔ براعظم امریکہ میں جنوبی امریکہ کے بیشتر حصوں، وسطی امریکہ، میکسیکو، ویسٹ انڈیز اور آج کی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے کچھ حصوں پر اسپین نے قبضہ کیا۔ برطانیہ، فرانس نے بھی شمالی امریکہ کے کچھ حصوں پر اپنا تسلط جمایا۔ان یورپی ممالک کے بہت سے باشندے مستقل طور پر نوآبادیات میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہوئے۔اس دور میں براعظم آفریقہ کے تقریباً بیس فیصد ساحلی حصہ پر یوروسین قابض تھے۔ جس کے نتیجے میں غلاموں کی تجارت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ایشیاء میں بھی پرتگال، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ وغیرہ کے تاجر اپنی حکومتوں کی سرپرستی میں تجارتی مراکز قائم کرنے کے لیے داخل ہوگئے۔اور اپنی اپنی اجارہ داری کے قیام کے لیے کوشاں ہوگئے۔آغاز میں ایشیائی تجارت پر پرتگالیوں کا غلبہ رہا۔ مگر جلد ہی ہندوستان سے برطانیہ اور انڈونیشیا سے ڈچ تاجروں نے پرتگالیوں کو باہر کر دیا۔

4.4 اسباب (Causes)

مندرجہ بالا جائزہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ابتدائی نوآبادیاتی نظام کو قائم کرنے میں کئی اسباب و عوامل کارفرما تھیں:

1۔ **سقوط قسطنطنیہ:** 1453ء میں قسطنطنیہ کا ترکوں کے پاس چلا جانا بہت اہم واقعہ تھا۔اس کے بڑے دوررس نتائج مرتب ہوئے۔ یورپ

کی تجارت کا بری راستہ یہیں سے ہو کر جاتا تھا جو کہ ترکوں نے یورپی عیسائی دنیا کے لیے بند کر دیا۔اس کے متبادل مغربی تاجروں نے اپنی تجارت کو جاری رکھنے کے لیے بحری راستہ کی تلاش شروع کی اور نتیجتاً نئے علاقے دریافت ہوئے۔

2۔ **جغرافیائی دریافتیں:** یورپی اقوام نے اپنی مشرقی تجارت کے لیے جب بحری راستہ کی تلاش کی تو اس وقت وہ بحری طور پر اتنے ترقی یافتہ اور مضبوط ہو چکے تھے کہ سمندر پر طویل اور پُر خطر سفر کر سکیں۔ فن جہاز رانی اور جدید آلات کی نئی تکنیکوں نے انہیں ان بحری اسفار کا اہل بنا دیا تھا۔ چنانچہ کولمبس نے امریکہ اور واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا (تفصیل ہم اکائی اول میں پڑھ چکے ہیں)۔ نئے علاقوں کی دریافت نوآبادیات کے قیام کا سبب بن گئیں۔

3۔ **صنعت و تجارت میں ترقی:** ہم گذشتہ اسباق میں یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ جدید عہد کے آغاز میں تجارت میں توسیع ہوئی اور صنعت و حرفت ترقی پائی۔اب یورپ میں نئے قائم ہوئے کارخانوں کے لیے خام مال کی فراہمی کا سوال تھا، جس کے لیے نئے وسائل سے بھرپور علاقوں کی تلاش میں اہلِ مغرب نے کامیابی حاصل کی۔ یہی نہیں اپنے مال کی فروخت کے لیے انہیں ان نوآبادیات کی شکل میں نیا بازار بھی مل گیا۔ یہی وہ بنیادی اسباب تھے جس نے یورپی ممالک میں حریفانہ چمک پیدا کر دی۔ حکمراں اور عوام دونوں کے لیے نوآبادیات کا حصول صرف معاشی سہولیات کی فراہمی ہی نہیں تھا بلکہ قومی افتخار بھی تھا۔

4۔ **نشاۃ ثانیہ و مذہبی اصلاحی تحریکیں:** اس پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی جاچکی ہے کہ نئے افکار و نظریات نے یورپ کی سماجی اور مذہبی ساخت پر گہرا اثر چھوڑا جو بعد میں بنیادی تبدیلیوں کا سبب بنا۔ آفریقہ ،ایشیاء اور امریکہ کے پسماندہ علاقوں کے عوام اہلِ یورپ کی نظر میں نہ صرف غیر ترقی یافتہ بلکہ بد دین بھی تھے۔اسی وجہ سے عیسائی مبلغین کی ایک بڑی تعداد مذکورہ علاقوں میں سر گرم نظر آتی تھی۔ مذہب کے ابلاغ کے لیے پیدا ہونے والے جذبہ نے نوآبادیات کی اہمیت کو بڑھا دیا اور اسے سیاسی و معاشی افادیت کے ساتھ مذہبی تقدس بھی عطا کر دیا۔ اس میں ان صلیبی جنگوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جن کے نتیجے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مذہبی و معاشی رقابت تھی۔اس وقت یہ پالیسی بھی اپنائی گئی کہ ترکی مقبوضات سے باہر کوئی متبادل بحری راستہ تلاش کیا جائے جس سے ترکی کی مشرقی تجارت کی بنیادیں کمزور کی جاسکیں۔

اس دور میں زمین اور اس پر کاشت کرنے والے کسانوں کی محنت، معاشی خوشحالی وآسودگی کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔اس کے لیے امراء و اعلیٰ طبقہ نے کسانوں کی زمین پر قبضہ کر کے اسے اپنی جاگیروں میں تبدیل کیا تھا۔ جس سے عام آدمی پریشان تھے اور جس کا علاج نوآبادیاتی علاقوں میں جا کر ہی نکالا جا سکتا تھا لیکن یہ عام آدمی کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یورپ کے باہر، جس کے لیے اسے بڑی جد وجہد کرنی پڑتی تھی۔ نوآبادیات نے ایک نیا راستہ کھول دیا۔ نئے دور کے آغاز میں وہ صورتحال وجود میں آچکی تھی، جس کے نتیجے میں یورپی اقوام نے نئی دنیائیں تلاش کیں اور سیاسی و معاشی تسلط کی بنیاد پر اپنے مادرِ وطن کے لیے بے اندازہ دولت سمیٹی۔

4.5 اسپین اور اس کی نوآبادیات (Spanish Colonialism)

جدید دور کی پہلی وسیع سلطنت جس نے نوآبادیات کی داغ بیل ڈالی' اسپین کی تھی۔ اس کے قیام میں اتفاق کا زیادہ دخل تھا اور شاید اسی لیے اس کی عمر بھی کم ہوگئی، لیکن اس میں وہ تمام عناصر موجود تھے جو سامراجیت کے تصور کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس کی تنظیم عہدِ وسطیٰ کی شہری ریاستوں کے مانند تھی، جس میں ہر علاقہ اپنے میں خود کفیل تھا۔ اسپین نے اپنی نوآبادیات کی تجارت کو مکمل اپنے قابو میں رکھا۔ کسی بھی دوسرے ملک کو اسپین کی نوآبادیات کے ساتھ تجارت کرنے کی آزادی نہیں تھی۔ اسپین میں تیار مال ان نوآبادیات کے بازاروں میں فروخت ہوتا اور ان کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنی مصنوعات صرف اسپین کو بھیجیں۔ اس کے علاوہ ان نوآبادیات کا سارا سونا و چاندی بھی اسپین ہی لایا جاتا۔ اسپین کی یہ اجارہداری دیگر ممالک کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ جس کے نتیجے میں نوآبادی دور شروع ہوگئی اور یہ ممالک ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ اسی سمت میں اسپین کے وہ اقدامات بہت اہم تھے۔ ایک یہ کہ اسپین نوآبادیات سے براہ راست تجارت کرے گا دوسرا یہ کہ وہ امریکہ میں اپنی نوآبادیات قائم کرنا کرے گا۔

آغاز اسپین کا خاص حریف پرتگال تھا۔ دونوں کے درمیان تصادم کو دیکھتے ہوئے پوپ نے مداخلت کی اور 1494ء میں مصالحت کرادی جس کے مطابق دنیا کو ان دونوں کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا گیا۔ پوپ نے دنیا کے نقشے پر ایک خیالی لکیر 'اجورے' کھینچ دی جس کے مغرب میں اسپین کو اور مشرق میں پرتگال کو تجارتی حقوق حاصل ہوگئے۔ برطانیہ 'فرانس اور نیدرلینڈ نے اس سمجھوتہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ 1568ء میں برطانیہ نے اسپین کے عظیم بحری بیڑے کو شکست فاش دی، جس کے بعد اسپین کے زوال نے اسے اپنی گم گشتہ حیثیت کو واپس لانے کا کوئی موقع نہیں دیا۔

4.5.1 اسپین کی نوآبادیاتی تاریخ

اسپین کی نوآبادیات کی تاریخ 1492ء میں تب شروع ہوئی جب کولمبس نے امریکہ کی دریافت کی، جس کے نتیجہ میں اسپین نے مغربی مجمع الجزائر پر تسلط قائم کر لیا۔ اس کی پہلی نوآبادی علاقے سینٹو رومکو اور کیریبین سمندر کے جزیرے تھے۔ 1519ء کے آگے اسپین نے میکسیکو شمالی امریکی ریاست فلوریڈا، جنوبی امریکہ، پیرو' کولمبیا اور برازیل کو اپنی نوآبادیات کے خاطے میں بتدریج لایا۔ 1521ء میں اس نے ایشیاء میں فلپائین کے جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ مذکورہ نوآبادیات کے قیام کا بنیادی مقصد اُن علاقوں سے سونا حاصل کرنا تھا جن میں آدی واسی لوگ آباد تھے۔ اسکے نتیجہ میں اسپین نے 1519ء میں ہزاروں میکسِکن (Mexicans) کو قتل کر دیا اور اُن کے حکمران سے 2 لاکھ مارک سونا چھین لیا۔ اسی طرح فرانسیسکو پزارو نے 1531ء میں پیرو پر قبضہ کر کے بڑی مقدار میں سونا اور چاندی حاصل کر لیا۔ کورٹچ جو میکسیکو کا فاتح تھا۔ اس نے 24-1523 میں پیٹرو ڈی البرادو کی قیادت میں گوئیٹےمالا پر قبضہ جمایا اور مایا نسل کے بہت سے افراد کو بہ آسانی قتل کر دیا۔ خود کورٹچ نے ہانڈراس کیا۔ اور پناما پر بھی اسپین کی بالادستی قائم کی۔ اسی سلسلے میں نکاراگوا' لیون اور گرینڈا بھی اسپین کے زیر نگیں آگئے۔ ہزاروں کی تعداد میں ہند نژاد افراد مارے گئے، فرانسیسکو پزارو نے 34–1531 کے درمیان پیرو میں بڑی تباہی مچائی۔ 41–1540 میں

پیڑو ڈی سلویا نے چلی پر قبضہ کر لیا اور یہاں کے مقامی باشندوں کو زراعت کے لیے مجبور کیا۔ اُن کی بغاوت کو سختی سے کچل دیا۔

وسطی اور جنوبی امریکہ میں پیر جمانے کے بعد اسپین نے کولمبیا کو اپنے قبضہ میں لینا چاہا لیکن کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جنوبی امریکہ اسپین کیلیئے باعث کشش نہیں تھا۔ کیونکہ یہاں پر سونا اور چاندی دستیاب نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی اسپین چلی اور پیرو کے راستے ارجنٹینا تک پہنچ گیا۔ جنوبی امریکہ کے بعد اسپین نے مغربی مجمع الجزائر پر قبضہ جمایا۔ شمالی امریکہ میں بھی اسپین کے بہت مہم جو افراد نوآبادی قائم کرنے کے لیے کوشش کررہے 1528ء میں اسپین نے ڈی ترواز فلوریڈا، میکسیکو اور ٹکساس کو اپنے تسلط میں لایا۔ اسی طرح 1542 میں فرانسیسکو ڈی کورونا ڈو نے کنساس، ہرنینڈو ڈی سوٹو نے جنوبی کیرولینا اور ارکانس پر نوآبادیاتی حکومت قائم کی۔ یاد رہے کہ کورٹیج' جن کی بدولت یہ فتوحات حاصل ہوئیں، غیر سرکاری حیثیت کے حامل تھے اوران کی طاقت کی بنیاد فیڈریشن تھی۔ امریکہ میں ابتدائی اسپینوں کا داخلہ ذاتی مفاد اور قومی ملکیت کے حصول کے لیے تھا۔ قیمتی دھاتوں سونا اور چاندی کے علاوہ اسپین کے حکمراں نوآبادیاتی علاقوں کی زرعی کاشت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جسکے لئے اُنہوں نے وہاں پر ایک باضابطہ جاگیردارانہ نظام قائم کیا اور طاقت کے بل بوتے پر مقامی باشندوں سے زراعت کروائی۔ مال مویشی چروائے۔ یہ الگ چیز ہے کہ اُن کی نظر آخر میں سونا چاندی پر تھی۔

4.5.2 اسپین کا نوآبادیاتی انتظام حکومت

یورپ سے بہت دور واقع سلطنت کا انتظام وانصرام آسان کام نہیں تھا۔ اسپین نے اپنا قبضہ برقرار رکھنے اور اپنے مقبوضات سے فائدہ اٹھانے کے لیے جو طرزِ حکومت اپنایا وہ اسپین کے قدیم طریقے سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔ ان علاقوں کو برادر ریاستوں کی شکل دی گئی اور ان پر مطلق العنانیت کے ساتھ حکومت کی گئی۔ اسپینی' امریکہ پر حکومت کے لیے جو بلدیاتی ادارے قائم کیے گئے وہ صرف بادشاہ کو جواب دہ تھے اور تمام نوآبادیاتی مسائل ان ہی سے متعلق تھے۔ 1503ء میں Casa de Contractacion کے نام سے کراؤن ایجنسی قائم کی گئی تاکہ بحری تجارت سے منسلک تمام مسائل کا حل بن جائے۔ اس نے جہازرانی کے شعبہ کو مضبوط کیا اور ڈاک خدمات کے ذرائع کو آسان بنایا۔ لیکن نوآبادیاتی معاملات میں مرکزی صلاح کار اور انتظامی اُمور کی ذمہ کونسل آف انڈیز تھی، جو 1524ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس نے متعلقہ اُمور میں اطلاع فراہم کرنے کے لیے ایک بڑا ادارہ قائم کیا اور بلند اخلاقی اصولوں کو سامنے رکھ کر کام کیا۔

نچلی سطح پر قدیم اسپین کی طرح میونسپل بورڈ مقامی انتظامیہ کا ذمہ دار تھا۔ ان سے متعلقہ افسران کوریگڈور (Corregidor) کہا جاتا تھا۔ ان کے اوپر کے افسران گوبرنڈور (Gobernedora) کہلاتے تھے۔ کچھ میونسپل بورڈس میں الکیڈی میئر (alcalde Mayor) (ایسا میئر جسے عدلیے کے اختیارات بھی حاصل ہوں) مقرر کیے جاتے تھے۔ کوریگڈور' میونسپل بورڈ کے ساتھ ساتھ دیگر مقامی انتظامی اُمور کے بھی نگران تھے۔ اسپین کی ان نوآبادیات کا سہرا اُن پیشہ ور فاتحین (کارنکوس ڈور) کے خاطے میں جاتا ہے جنہوں نے حکومت سے کوئی مدد لیے بنا ہی یہ کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ کچھ تو ان میں نوآبادیاتی جاگیر بن گئے لیکن اسپینی حکومت نے ان پر اپنی گرفت مضبوط رکھی جس کے سبب وہ من مانی نہیں کر سکے۔

4.5.3 اسپینی حکمرانوں کی معاشی پالیسی

یادر ہے اسپین نے امریکی نوآبادیات سے بے پناہ معاشی فوائد حاصل کیے۔ جیسے کہ :

1۔ مذکورہ نوآبادیات سے حاصل ہونے والے محصول نے ملکی خزانہ میں اضافہ کیا۔

2۔ متعلقہ تجارت پر اسپین نے اپنی اجارہ داری برقرار رکھی۔

3۔ نوآبادیاتی معیشت کو اپنے مفاد کے مطابق تشکیل کیا۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسپین کی سامراجی حکومت مقامی افراد کی معاشی فلاح کے مقابلے میں اسپین کی معاشیات اور بادشاہ کی سیاسی قوت میں اضافہ کرنے پر یقین رکھتی تھی اور اسی سمت میں کوشاں تھی۔ اسپین میں قومی ریاست کے مقابلے میں علاقائیت کا تصور زیادہ طاقتور تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نوآبادیات کی دوڑ میں آغاز کرنے کے باوجود وہ دیگر یورپی ممالک سے پیچھے رہ گئے۔ وہ برطانیہ اور نیدر لینڈ کی طرح ان نوآبادیات کو ملکی مفاد میں استعمال نہیں کر پائے۔ یہ تو سچ ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں اسپین کی معیشت اپنے سمندر پار کی تجارت، صنعتوں اور جنوب میں زرعی ترقی کے سبب ایک خوشحال معیشت کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن ان کے حکمرانوں کی نیم جاگیردارانہ ذہنیت سمیت دیگر اسباب کی بنا پر غیر اسپینی تاجروں اور سرمایہ کاروں کو موقع مل گیا کہ وہ اسپینی نوآبادیات کی تجارت سے حاصل شدہ منافع کو شمال مغرب کے یورپی ممالک کے تجارتی مفاد میں لگا سکیں۔ اسی وجہ سے آخر میں اسپین کا نوآبادیاتی زوال ہو گیا۔

4.6 پرتگال کی نوآبادیات (Portuguese Colonialism)

1498ء میں پرتگال کے جہاز راں واسکوڈی گامانے ہندوستان سے تجارت کے لیے بحری راستہ دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے دونوں ممالک کے درمیان تجارتی روابط استوار کر دیئے، جس کے بعد گوا، دمن اور دیو میں پرتگال کی نوآبادیات قائم ہوئیں۔ انہوں نے عرب تاجروں کی اجارہ داری ختم کر دی اور سمندر پر حکمرانی کرنے کے مجاز ہو گئے۔ اسی دوران انہوں نے کیرالہ کے مالابار ساحل پر اپنی فوجی طاقت قائم کر لی۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ پرتگال نے اسپین کے طرز پر حاصل شدہ علاقوں کو اپنی نوآبادیات میں تبدیل کیا۔ حالانکہ سولہویں صدی کے آغاز میں پرتگال نے خالی تجارت کے مقصد سے مشرقی ممالک میں جو دلچسپی دکھائی تھی۔ بعد میں پرتگالی حکمرانوں نے ہندوستان، برازیل خلیج فارس پر واقع ہرمز اور لنکا میں ملاکا کو اپنی نوآبادیات کے ضمرہ میں لایا۔ اسطرح مشرقی تجارت پوری طرح ان کے زیر نگیں آگئی۔ 1500 عیسوی میں پرتگال کو ہندوستان کی مسالوں کی تجارت سے اور برازیل کو ٹمبر کی تجارت سے کثیر منافع حاصل ہوا۔ 1530ء بہت سے پرتگالی اور دیگر یورپی لوگوں نے برازیل میں اپنی بستیاں قائم کی۔ باہمت مہم جو افراد برازیل پہنچنے لگے۔ یہ تاجر مختلف اقسام کی اشیاء اور زیورات کے عوض برازیل کے مقامی افراد سے یورپی مارکٹ کیلئے ٹمبر حاصل کرتے تھے۔ ان تاجروں میں بہت ساروں نے مقامی عورتوں سے شادی کی تھی اور ان کو کیتھولک عیسائیت قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ اگرچہ ان غیر علاقائی بستیوں پر مقامی ہند نژاد افراد حملہ کرتے رہتے تھے۔ 1549ء میں پرتگال نے کئی مقامات پر بستیاں آباد کیں اور ضابطہ انتظام اور انصرام قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

1551ء میں پرتگال کی جانب سے ان بستیوں کے لیے ایک بشپ کا تقرر کیا گیا، جس سے مذہب کی تبلیغ میں اضافہ ہوا۔ عیسائی مبلغین مقامی ہند نژاد افراد کا دل جیتنے میں کامیاب رہے۔ اور انہوں نے مقامی باشندوں کو پرتگالی استحصال اور ظلم سے محفوظ رہنے کا یقین دلایا۔ ان مبلغین (Jesuit) نے مقامی افراد کو کھیتی کرنا سکھایا اور اُن کو مہذب بنانے کی کوشش کی۔ لیکن پرتگالیوں کے ذریعہ ہونے والے اپنے استحصال کے خلاف یہ ہند نژاد افراد مستقل صف آراء ہوتے رہے۔ 1553ء کے بعد ان کی بغاوتوں میں اضافہ ہو گیا۔ جس سے دونوں کے درمیان رسہ کشی جاری رہی۔ 1580ء میں جب پرتگال اسپین کے زیر نگیں آگیا تو برازیل کا مسئلہ بھی پس پشت چلا گیا۔ دراصل اس وقت اسپین کا بادشاہ فلپ دوم برطانیہ اور ہالینڈ سے جنگ کر رہا تھا۔ جس دوران ہالینڈ کے بہت سارے نوآبادیاتی علاقے پرتگال سے چھوٹ گئے اور جلد ہی ہالینڈ سے بھی بے دخل ہو گئے۔ مختصراً سولہویں صدی عیسوی میں پرتگال نے آفریقہ میں گنی، کانگو، انگولا اور موزمبیق میں فوجی چھاؤنیاں قائم کر لی تھیں۔ ہندوستان سے لے کر مکاؤ مجمع الجزائر تک ایک بڑی بحری سلطنت بھی ان کی کامیابیوں میں شامل تھی۔ سترہویں صدی تک میں سے بہت سے علاقے پرتگال کے ہاتھ سے نکل گئے۔ مغرب میں پرتگال نے صرف ان بندرگاہوں کو اپنے قبضے میں رکھا جو غلاموں کی تجارت کے مراکز تھے۔

4.6.1 پرتگال کا نوآبادیاتی نظم و نسق اور معیشت

پرتگال کی سیاسی ساخت کا پورا عکس ہمیں اس کی نوآبادیات کی انتظامیہ میں نظر آتا ہے۔ 'کونسل آف دی اسٹیٹ' اور 'کونسل آف دی انڈیز' (بیرون ملک کے لیے) نامی دو ادارے کافی حد تک نظم و نسق کے ذمہ دار تھے۔ اسپین کے مقابلے میں پرتگال کا انتظام کم پیچیدہ تھا۔ پرتگالی حکومت کے ذریعے مقرر کردہ گورنر مطلق العنان ہوتے تھے۔ صرف عدلیہ ہی ان کو صلاح و مشورہ دے سکتی تھی۔ پرتگال کی تجارتی پالیسی بہت حد تک اسپین کے مماثل تھی۔ نوآبادیاتی تجارت پر پرتگالی تاجروں کا ہی مکمل قبضہ تھا۔ کسی بھی دیگر ملک کے جہاز کو ان بندرگاہوں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بعد میں مزید پابندیاں لگا دی گئیں۔ ان سب کے باوجود پرتگال اپنی نوآبادیاتی تجارت سے بہت زیادہ فائدہ نہیں اُٹھا سکا کیونکہ اس کی معاشی حالت بہت مضبوط نہیں تھی۔

4.7 برطانیہ کی نوآبادیات (British Colonialism)

(Tudor) ٹیوڈر حکمراں ہنری ہفتم کے دور سے ہی برطانیہ نے بحری اور نوآبادیاتی مہم کا آغاز کیا تھا۔ پندرہویں صدی کی آخری دہائی (98–1497) میں انگریزوں نے شمالی امریکہ میں نیو فاؤنڈ لینڈ کو دریافت اور قبضہ میں کیا۔ جس سے اُن کو شمالی امریکہ میں تیرہ انگریزی نوآبادیات کو قائم کرنے کا موقع مل گیا جو بعد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ سر والٹر ریلے نے سب سے پہلے ملکہ الزبتھ کے عہد میں برطانوی نوآبادیات کے مہم کا آغاز کیا۔ اس نے شمالی امریکہ میں ورجینیا نامی نوآبادی بسائی۔ یہ علاقہ زرعی پیداوار خصوصاً آلو اور تمباکو کے لیے مشہور ہوا۔ 1634ء میں ورجینیا کے شمال میں بالٹی مور نے میری لینڈ اور ورجینیا کے جنوب میں شمالی کیرولینا اور جنوبی کیرولینا کی نوآبادیات قائم کی۔ ان فتوحات کی بدولت برطانیہ کی سامراجیت کا آغاز اور عروج ہوا۔ 1588ء میں برطانیہ کے جہاز مغرب

میں امریکہ اور مشرق میں ہندوستان و مشرقی مجمع الجزائر تک بلا روک ٹوک جانے لگے۔ برطانیہ کی بحری تجارت کا ٹوڈر عہد سے ہی شروع ہوا تھا۔ لیکن اس سمت میں عملی سرگرمیاں کا آغاز اسٹورٹ دور میں ہوا۔ اسپین اور پرتگال کی طرح برطانیہ کا نوآبادیاتی مقصد اپنی معاشی خوشحالی، بڑھتی ہوئی آبادی کیلئے ملک سے باہر بستیاں بنانا اور صنعت کے لیے خام مال اور بازار تراشنا تھا۔ علاوہ ازیں عیسائیت کا پھیلاؤ بھی انگریزی نوآبادیاتی پالیسی کا حصہ تھا۔ دراصل 1620ء میں جیمس اول کے عہد حکومت میں سے تقریباً 200 پیورٹن طبقہ کے پادری یا افراد تحفظ کیلئے شمالی امریکہ ہجرت کر گئے۔ تاریخ میں وہ ('Pilgrim Fathers') کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان لوگوں نے 'پلائی ماؤتھ' میں اپنی بستی قائم کی۔ بعد میں انہوں نے نیو برطانیہ 'میسوچیٹس' کنیکٹیکٹ اور ہیمپشائر، پنسلوانیا بی اور نیو یارک میں اپنی بستیاں قایم کی۔ امریکہ میں برطانوی نوآبادیات جغرافیائی سطح پر تین حصوں میں منقسم تھیں۔ شمالی، وسطی اور جنوب بعید۔

ایشیاء میں انگریز پہلے پہل تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ جس کا آغاز انہوں نے ہندوستان سے کیا۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی جو ہندوستان سے تجارت کی غرض کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ انہوں نے اپنا پہلا تجارتی مرکز (کوٹھی) سورت (گجرات) میں قائم کیا۔ یہاں انہیں پرتگالیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے پرتگالیوں کو بحری جنگوں میں شکست دے کر مختلف مقامات پر تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ انہوں نے مغل شہنشاہ سے بھی اجازت حاصل کی اور مدراس و کلکتہ میں قلعوں کی تعمیر کی۔ ہندوستان میں یہ دور سیاسی افراتفری کا دور تھا۔ مغل سلطنت تیزی سے روبہ زوال تھی۔ مختلف علاقائی ریاستیں وجود میں آچکی تھیں جو آپس میں برسرپیکار تھی۔ انگریزوں نے ان حالات کا فائدہ اٹھایا اور اپنی تجارتی پالیسی کو استعماریت میں تبدیل کر دیا۔ 1757ء میں (Plassey) کی جنگ میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر انگریز بنگال پر قابض ہوگئے۔ جس سے مقامی آبادی کا نگال پر قبضہ کر کے معاشی استحصال شروع ہو گیا۔ سارا ہندوستان انگریزوں کی نوآبادیات کا اہم حصہ بن گیا۔

4.8 فرانس کی نوآبادیات (French Colonialism)

ہنری چہارم کے عہد حکومت (1610–1589) میں فرانس نے ترکی، ہالینڈ اور برطانیہ کے ساتھ تجارتی معاہدے کیے۔ جس سے فرانسیسی تجارت و صنعت کو بہت فروغ ملا۔ جسکے بڑھاوے کیلئے فرانس نے ایک بحری فوج کو وجود میں لایا۔ اس دور میں فرانسیسی تاجروں نے ہندوستان اور شمالی امریکہ میں تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ لوئی چہاردہم کے دور حکومت (1755–1661) میں اس سمت میں کافی تیزی سے پیشرفت ہوئی۔ اس نے فرانسیسی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے ہر ممکن طریقے اپنائے۔ تجارتی جہازوں کو سرکاری تحفظ دیا گیا۔ فرانس کی بندرگاہوں کا استعمال کرنے والے غیر ملکی جہازوں سے محصول وصول کیا۔ ساتھ ہی فرانسی حکومت نے ایک مضبوط جہازی بیڑا بھی تیار کیا۔ حکومت کی اعانت سے فرنچ ویسٹ انڈیا کمپنی کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ مغربی مجمع الجزائر میں واقع گاڈیلوپ اور مارٹینک (Guadeloupe, Martinique) کے جزیروں میں فرانس کی نوآبادی قائم کی گئی۔ کناڈا میں ہڈسن کمپنی نے نوآبادیات بسائیں جن کی بنا پر فرانس اور برطانیہ بہت سارے علاقوں میں آمنے سامنے آگئے۔ بالآخر 1763 میں فرنچ کناڈا اور مسی سپی کے علاقے فرانس

سے چھوٹ گئے۔ نتیجتاً فرانس دونوں امریکہ اور ہندوستان کی اپنی نوآبادیات کو قائم رکھنے میں ناکام رہا۔ حسب دستور یہ برطانیہ کی نوآبادیات کا حصہ بن گیا۔

4.9 ڈچ کی نوآبادیات (Dutch Colonialism)

نشاۃ ثانیہ کے بعد ڈچ یعنی کہ ولندیزی سلطنت کہ بھی نوآبادیات کے قیام کی دوڑ میں شامل ہو گیا۔ان کا مقصد بھی تجارت تھا۔اس دور میں تجارت اور نوآبادیات دونوں مال و دولت کی فراہمی کا وسیلہ سمجھے جاتے تھے۔ قیمتی دھاتیں سونا و چاندی کا حصول بھی اسی نوآبادیاتی منصوبے کا حصہ تھا۔ ہالینڈ نے بھی ایک چارٹرڈ کمپنی تشکیل کی، جس کا مقصد ایشیاء کے مشرق بعید علاقہ سے مسالوں کی تجارت پر اجارہ داری قائم کرنا تھا۔اس کے لیے ضروری تھا کہ ڈچ کمپنی انڈونیشیا کے جزیروں پر قبضہ کرے۔ وہاں اپنی تجارتی فیکٹریاں قائم کرے اور علاقائی حکمرانوں کو اپنے زیر نگیں لائے تاکہ ان کی فیکٹریوں اور تجارت میں کسی طرح کی دخل اندازی نہیں ہو سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہالینڈ نے بحری افواج اور جہازی بیڑے اس کام کیلئے تعینات کر دیئے جس سے ہالینڈ کی نوآبادیات کا آغاز ہوا۔1616ء میں گوانا میں ڈچ نوآبادی قائم ہو گئی۔ امریکہ میں بھی ڈچ افراد نے پیشرفت کی اور اس کے بعد انہوں نے کچھ اسپینی جزائر پر بھی قبضہ کر لیا۔ امریکہ میں ڈچ نوآبادیات کی خاص پیداوار تمباکو اور شکر تھا۔ اُنہوں نے ویسٹ انڈیز کو شکر کی پیداوار کا مرکز بنا دیا۔ یہ لوگ مقامی سیاہ فام باشندوں کی کڑی مشقت کراتے۔ شمالی امریکہ میں بی ڈچ نوآبادیات قائم ہوئیں۔ 1621ء میں ڈچ کمپنی نے نیو نیدرلینڈ آباد کیا اور 1626ء میں نیو ایمسٹرڈم بسایا گیا۔ لیکن بعد میں برطانیہ نے ڈچ کی ساری نوآبادیات پر قبضہ کر لیا۔

ڈچ ایشیاء کے مختلف حصوں میں نوآبادیات قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ 1619ء میں انہوں نے جاوا کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا۔انہوں نے انڈونیشیا کے کچھ علاقے بھی اپنی آبادیات میں شامل کی۔اس کے علاوہ 1641ء میں انہوں نے پرتگالیوں سے ملکا اور 1658ء میں کولمبو حاصل کر لیا۔ ہندوستان میں مچھلی پٹنم، کورومنڈل، مالابار اور بنگال کے کچھ حصوں میں اپنے تجارتی مرکز قائم کیے۔ لیکن نوآبادیاتی نقطہ نظر سے ڈچ کی یہ کامیابیاں بہت اہم نہیں تھی۔ البتہ مشرقی مجمع الجزائر اور جنوب مشرقی ایشیاء میں مسالوں کی تجارت پر ان کی اجارہ داری قائم رہی۔ اسپین، پرتگال، برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کے علاوہ بلجیم اور اٹلی نے بھی نوآبادیات قائم کیں، لیکن استعماریت کی دنیا میں ان کا داخلہ تاخیر سے ہوا۔

4.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

پندرہویں صدی کے نصف میں مغرب کی مشرقی تجارت کے برّی راستہ پر ترک قابض تھے، جس کے بعد یورپی اقوام نے نئے بحری راستے کی تلاش شروع کی۔ اس وقت تک یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے نتیجے میں بڑی اہم تبدیلیاں آچکی تھیں۔ توہمات اور کلیسا کی گرفت سے آزاد ہو کر سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے تے۔ خاص طور سے جغرافیائی معلومات نے انہیں بڑی سہولیات فراہم کیں۔ فن جہازرانی کی ترقی اور نئی ایجادات نے ان کے لیے بحری سفر آسان کر دیا تھا۔ صنعت و حرفت اور تجارت نئی اونچائیوں تک پہنچ گئے

تھے۔ کثیر منافع کی لالچ نے یورپی کو نئی دنیا میں تلاش کرنے پر راغب کیا۔ چنانچہ اس دور میں نہ صرف حکومتوں نے اس طرف توجہ دی بلکہ با حوصلہ مہم جو افراد بھی اس کام کیلئے سامنے آئے جنہوں نے اس سمت پیشرفت کی۔ کولمبس کے ذریعے امریکہ کی دریافت ہوئی اور واسکوڈی گاما کے ذریعے سے کالی کٹ دریافت ہوا۔ ان انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے کئی صدیوں تک انگریز ایشیاء 'آفریقہ اور امریکہ کے براعظم پر قابض ہو گئے۔ یورپی تاجروں' فوجیوں اور حکمرانوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر مقامی باشندے استحصال کا نشانہ بن گئے۔

تجارت کے لیے اور بہتر مواقع کی تلاش میں اسپینی اور پرتگالی تاجر و جہاز راں ایشیاء 'آفریقہ اور امریکہ کے مختلف ساحلوں پر اترے۔ وہاں کے مقامی حالات ان کے موافق ثابت ہوئے۔ یہ غیر ترقی یافتہ آبادیاں بہ آسانی ان کی مقبوضات بن گئیں۔ ویسٹ انڈیز کے جزائر ہوں یا جنوبی امریکی ریاستیں، یہاں کے افراد اور وسائل یورپی کے جبر واستبداد کے گواہ ہیں۔ جنوبی امریکہ میں میکسیکو' برازیل' پیرو اور کولمبیا' ایشیاء میں فلپائن اسپین کی اہم نوآبادیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح پرتگال نے برازیل کے کچھ حصوں کے علاوہ آفریقہ میں گنی 'انگولا' کانگو اور موزمبیق سمیت ہندوستان میں گوا' دمن' دیو اور لنکا میں ملکا جیسی اہم نوآبادیات حاصل کر لیں۔ اگرچہ برطانیہ آبادیات کی دوڑ میں آخری ایام میں شامل ہو گیا لیکن جلد ہی وہ دنیا کی سب سے وسیع سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایشیاء 'آفریقہ اور امریکہ براعظموں کے مختلف علاقے اس کی نوآبادیات میں شامل ہوئے۔ ہندوستان جیسا وسیع و عریض اور قدرتی وسائل سے بھرپور ملک انگریزوں کی سب سے اہم اور قیمتی نوآبادی تھا۔ فرانس نے بھی شمالی امریکہ اور ہندوستان کے علاوہ آفریقہ میں اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ لیکن برطانوی مسابقت نے انہیں ان حصوں میں بہت زیادہ کامیابیاں حاصل کرنے سے محروم رکھا۔ انڈونیشیا اور مشرق بعید کے دیگر علاقوں پر ڈچ تسلط قائم ہوا۔ خاص طور سے یہاں کے مسالوں کی تجارت ہالینڈ کے ہاتھوں میں رہی۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ پندرہویں صدی میں یورپ میں ہونے والی مذہبی' سیاسی' معاشی اور سائنسی تبدیلیوں نے نوآبادیات کے قیام میں اہم کرار ادا کیا۔ دوسری جانب جن علاقوں پر یورپی اقوام قابض ہونے میں کامیاب ہوئیں، وہاں کی صورتحال بھی اس کی ذمہ دار ہے۔ عموماً یہ ممالک نہ صرف معاشی طور پر پسماندہ تھے بلکہ سیاسی طور پر بھی مضبوط نہیں تھے۔ ہندوستان معاشی طور پر اتنا کمزور نہیں تھا لیکن یہاں کی سیاسی افراتفری اور آپسی رسا کشی نے غیر ملکیوں کو قدم جمانے کا موقع فراہم کیا۔ جنوبی امریکہ اور آفریقہ کے بیشتر ممالک کا بھی یہی حال تھا۔ ان یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نوآبادیات کی ابتداء ان ہی ممالک کے ہاتھوں ہوئی جو مضبوط بحری طاقت تھے، جن کی سمندروں پر حکمرانی تھی وہی زمینوں پر بھی تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ نوآبادیات کے آغاز و قیام نے نہ صرف متعلقہ ممالک کو متاثر کیا بلکہ آنے والے وقت میں دیرپا عالمی اثرات بھی مرتب کیے۔ نوآبادیات کے حصول نے یورپ میں جس رسہ کشی کو جنم دیا اس سے تصادم شروع ہوا جن کا بالآخر عظیم جنگوں کے ساتھ ہی خاتمہ ہوا۔

4.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

قطب نما	:	سمت بنانے والا آلہ
خام مال	:	مصنوعات کی تیاری میں کام آنے والا خام مال

سامراجیت	:	ایک ملک کا دوسرے ملک پر قبضہ کرنا
براعظم	:	دنیا کو خشکی کے سات بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کو براعظم کا نام دیا گیا ہے
اجارہ داری	:	مکمل اختیار حاصل کر لینا
خود کفیل	:	کسی دوسرے کا محتاج نہ ہونا
ہند نژاد افراد	:	پیدائشی ہندوستانی
ڈائیسپورا	:	بیرون ملک سکونت اختیار کرنے والے افراد
بندرگاہ	:	بحری جہازوں کے رکنے اور روانہ ہونے کی جگہ
بحری تجارت	:	سمندر کے راستے سے ہونے والی تجارت
مستول	:	پانی کے جہاز کا وہ لمبا ستون جس پر بادبان (کپڑا) باندھا جاتا ہے

4.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. یورپ میں جدید عہد کا آغاز کب سے ہوا؟
2. ترکوں کے کس علاقہ پر قبضہ کرنے سے یورپ کی مشرقی تجارت کا راستہ بند ہو گیا؟
3. بادبان کسے کہتے ہیں؟
4. استعماریت کا آغاز کس صدی سے ہوا؟
5. کولمبس نے امریکہ کس سن میں دریافت کیا؟
6. ایشیاء میں فلپائن کے جزیرے کس ملک کے قبضہ میں تھے؟
7. پیرو کے اسپینی فاتح کا نام بتائیے۔
8. Jesuit کون تھے؟
9. امریکہ میں ڈچ نوآبایات کی خاص پیداوار کیا تھی؟
10. برطانیہ نوآبادیات کا آغاز کس حکمراں کے عہد سے ہوا؟

4.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. استعماریت کسے کہتے ہیں؟
2. نوآبادیات کے حصول کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔

3. ڈچ نوآبادیات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. نوآبادیات کی تاریخ میں فرانس کے کردار کی وضاحت کیجیے۔
5. اسپین کے نوآبادیاتی زوال کی وجوہات بیان کیجیے۔

4.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ابتدائی نوآبادیاتی نظام کے قیام کے کیا اسباب تھے؟ تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. پرتگال کی استعماریت پر مفصل نوٹ لکھیے۔
3. جنوبی امریکہ میں اسپین کی نوآبادیاتی جدوجہد کا مفصل جائزہ لیجیے۔

4.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Armesto, Felipe Fernandez, *Pathfinders: A Global History of Exploration*, W.W. Norton & Company, New York, 2007.
2. Arnold, David, *The Age of Discovery*, *1400–1600*, Routledge, New Delhi, 2002.
3. Black, Jonathan, *The Secret History of the World*, Quercus, London, 2007.
4. Cameron, Kenneth Neill, *Humanity and Society*: *A World History*, Aakar, Delhi, 2009.
5. Crosby, Alfred W. Jr., *The Columbian Exchange: Biological and Cultural Consequences of 1492*, Praeger Publishers Inc., 2003.
6. Davidann, Jon Thares, and Marc Jason Gilbert, *Cross-Cultural Encounters in Modern World History, 1453 – Present*, Routledge, New Delhi, 2019.
7. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
8. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
9. Love, Ronald S., *Maritime Exploration in the Age of Discovery, 1415–1800*, Greenwood Press, 2006.
10. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
11. Morison, Samuel, *The European Discovery of America*: *The Southern Voyages*, *1492–1616*, Oxford University Press, New Delhi, 1993.
12. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
13. Parry, J. H., *The Discovery of the Sea*, University of California Press, California, 1981.
14. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
15. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).

اکائی 5۔ قومی ریاستوں کا عروج

(The Rise of Nation States)

اکائی کے اجزاء

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 پس منظر

5.3 قومی ریاستوں کا تصور

5.3.1 قومی ریاستوں سے پہلے

5.3.2 قومی ریاستوں کی تاریخ

5.4 یورپ میں قومی ریاستوں کا ظہور

5.4.1 ابتدائی جدید دور کا مفہوم

5.4.2 قومی ریاستیں اور قومی بادشاہت

5.4.3 ترتیب زمانی کے مطابق یورپ میں اہم سیاسی واقعات

5.4.4 قومی ریاستوں کے ظہور کے اسباب

5.4.5 قومی ریاستیں۔ برطانیہ میں ٹوڈر کا ظہور

5.4.6 اسپین۔ فلپ دوم

5.4.7 فرانس بحیثیت قومی ریاست

5.5 اکتسابی نتائج

5.6 کلیدی الفاظ

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید (Introduction)

قومی ریاستوں کا عروج ابھی حال ہی کی بات ہے۔ پندرہویں صدی سے پہلے یورپ میں قومی ریاست کا تصور موجود نہیں تھا۔اس وقت زیادہ تر لوگ خود کو کسی قوم کا حصہ تصور نہیں کرتے تھے۔ وہ لوگ بہت کم ہی ترکِ وطن کرتے تھے۔اور باہر کی دنیا کے بارے میں بہت کم واقفیت رکھتے تھے۔لوگ اپنے مقامی مذہب کی شناخت کے ساتھ جانے جاتے تھے۔بیک وقت ریاستی حکمراں اپنے ملکوں پر بہت کم کنٹرول رکھ پاتے تھے، جس کی وجہ سے مقامی جاگیر دار بہت طاقتور ہو گئے تھے اور بادشاہوں کو اکثر اپنی حکمرانی کے لیے اپنے ماتحت کی حمایت و تعاون پر منحصر ہونا پڑتا تھا۔ ہر ملک کے اپنے اپنے قوانین اور طریقے ہوتے تھے، جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوا کرتے تھے۔ سولہویں صدی کے ابتداء میں قومی ریاستوں کا ظہور جدید یورپی تاریخ کا ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ابتدائی جدید دور میں کئی بادشاہوں نے جاگیر داروں کی طاقت کم کیا اور ابھرتے ہوئے تجارتی طبقوں کے ساتھ اتحاد اور طاقت کو مضبوط کرنا شروع کیا۔اس مشکل حالات میں بعض اوقات تشدد کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ حکمرانوں کو اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے کافی وقت لگتا تھا۔ بادشاہ اور ملکہ نے اپنے علاقوں کے تمام لوگوں کو متحد کر کے اپنے ماتحت لانے کا کام کرنے کی کوشش کی۔ان قومی ریاستوں کے ظہور نے بھی قوم پرستی کی لہروں کو دیکھا۔چونکہ ان حکمرانوں نے اپنی رعایا کو نئی قائم ہونے والی قومی ریاستوں کے ساتھ وفاداری نبھانے کی ترغیب دی۔ پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ کے سیاسی نقشے پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آسٹریا کی روسی اور عثمانی سلطنتوں کے علاوہ برطانیہ ، فرانس ، پرتگال ، اسپین ، ڈنمارک ، ناروے ، پولینڈ ، ہنگری اور سویڈن جیسی قومی ریاستوں کو عروج حاصل ہوا ہے۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- قومی ریاست کے معنی و مفہوم اور اس کی نوعیت کا علم حاصل کر سکیں گے۔
- یورپ میں قومی ریاستوں اور ان ریاستوں کے حکمرانوں کے عروج کے عوامل جان سکیں گے۔
- برطانیہ میں ٹیوڈرڈ مطلق العنانیت کے بارے میں سمجھ سکیں گے۔

5.2 پس منظر (The Context)

تیس سالہ جنگ (The Thirty Year War)

پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کے درمیان (1618–1648) پورے وسطی یورپ میں لڑی جانے والی تیس سالہ جنگ نے قومی ریاستوں کے ظہور کی قانونی اساس ڈالی۔اس جنگ میں یورپ کی بہت سی قومیں شامل تھیں، جن میں بہت سی چھوٹی جرمن ریاستیں آسٹریا کی سلطنت ، سویڈن ، فرانس اور اسپین شامل تھے۔ یہ جنگ بنیادی طور پر فرانس اور برطانیہ کے درمیان لڑی گئی۔ یہ ایک وحشیانہ جنگ تھی۔اس

جنگ میں کلیساپروٹسٹنٹ کو ختم کرنے میں ناکام رہے۔ یہ جنگ 1648ء میں ویسٹ فالیا(Westphalia) کے معاہدہ پر دستخط کے ساتھ ختم ہوگئی۔ جس کو ویسٹ فالیا کا امن(Peace of Westphalia) بھی کہا جاتا ہے۔اس کے تحت کسی ریاست کے خود مختار حکمراں کو مذہب اور قوم(Nation) اور ریاست (State) دونوں کے تمام عناصر پر اختیار حاصل تھا۔ جس کے سبب یورپ میں ایک خود مختار ریاست کے جدید تصور کا ظہور ہوا۔

مرکزیت (Centralisation)

ایسا انتظامی طریقہ جس میں کسی ریاست یا ملک کے قوانین کو بنانے' ترمیم کرنے' پالیسی بنانے کا اختیار صرف مرکز کو حاصل ہوتا ہو، اس کو مرکزیت کہتے ہیں۔ جس کے سبب مملکت یا ریاست کو ترقی کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مرکزی حکومت کو سارے ملک کے لیے قانون بنانے اور اس کے نفاذ کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ مرکزیت کے سبب ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مختلف علاقوں' مقامی حکومتوں کو مختلف میدانوں میں تیز رفتار ترقی حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ تاجرین یا صنعتکار مقامی حکومت کے محصول نظام و قوانین سے بے فکر ہو کر ملک بھر میں اپنی تجارتی اکائیاں قائم کر سکتے ہیں۔ جاگیر دارانہ نظام کے مقابلے میں قومی ریاستوں کی فوجی طاقت کافی زیادہ ہوتی ہے۔ حکمران ملک کی ضرورت کے اعتبار سے قومی فوجی طاقت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ جو کسی بھی وزیر کے ماتحت نہیں ہوتے۔ فوجیوں کو قومی سطح پر فوجی تربیت دی جاتی ہے، جس کے سبب فوج بہتر مظاہرہ کر سکتی ہے۔ مختلف واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئی قائم ہونے والی قومی ریاستوں میں قدیم طرز کی سیاسی تنظیمیں اثر و رسوخ رکھتے تھیں۔

نپولین عنصر (The Napoleon Factor)

قومی ریاستوں کے ظہور اور ارتقاء میں نپولین ایک اہم عنصر تھا۔ یورپی ممالک کے عروج میں نپولین بونا پارٹ نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں فرانس کے انقلاب کے دوران پیدا شدہ عدم تحفظ کے ماحول یا افراتفری کے باعث جاگیر دارانہ نظام وغیرہ کو ختم کر کے قومی آئین یا دستور بنانے کا کام ہوا۔ اس طرح ملک کی حفاظت کے لیے قومی فوج کی از سر نو تنظیم عمل میں آئی۔ قومی فوج کو منظم کرنے کا کوئی ایک ہی مقصد نہیں تھا بلکہ اس کے پس پشت بہت سے مقاصد تھے۔ فرانس نے اپنی قومی فوج کے سبب اپنی پڑوسی ریاستوں اٹلی اور جرمنی کے جاگیر داروں پر کنٹرول کیا اور ان پر غلبہ حاصل کیا۔ نپولین کی فوجی طاقت اور کامیابی نے یورپ کی باقی ریاستوں میں عوامی شعور بیدار کیا۔ اپنے اپنے ممالک کے تحفظ اور علیحدہ ریاستوں کے قیام کی راہیں ہموار ہوئیں۔ ان حالات میں یورپی ممالک کی عوام نے نپولین کو شکست دینے کے لیے آپس میں اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔

5.3 قومی ریاست کا تصور (Concept of Nation State)

قومی ریاستوں کا ذکر کرتے وقت ہم تین نکات قوم(Nation)، ریاست(State) اور قومی ریاست(StateNation) پر غور کرتے ہیں۔ کسی ملک میں بسنے والے افراد کو ایک قوم تصور کرتے ہیں۔ اس طرح عوام قوم کے تصور کو اجاگر کرتے ہیں۔ جو ملک کے عوام

کو ایک دوسرے سے اعتماد کی حد تک جڑتے ہیں۔ ریاست (State) حکومت کا ادارہ ہے۔ ریاست اپنے حدود اربعہ قوانین، قواعد واصول، ضوابط اور انتظامی امور سے جانے جاتے ہیں۔ قومی ریاست (Nation State) ایک ملک کو ظاہر کرتا ہے جس میں عوام حکومت کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرتے ہیں۔ عوام اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان میں مشترکہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ملک یا قومی ریاست کے طبعی طور پر حدود اربعہ پائے جاتے ہیں۔ ان ہی سرحدوں کے اندر ایک ملک کے باشندوں کی طرح آپس میں ربط وضبط کے ساتھ قائم رہتے ہیں۔

5.3.1 قومی ریاست سے پہلے (Before the Nation State)

قومی ریاست کے تصور سے قبل تاریخ میں مختلف اقسام کے ممالک یا ریاستیں قائم تھیں۔ مثلاً پندرہویں صدی عیسوی میں اٹلی (Italy) سرکار کا ایک آزاد ادارہ تھا جو شہر کے مرکز میں تھا، جس کو شہری ریاست یا (City State) کہتے ہیں۔ شہری ریاست شہروں کے علاقے میں قائم ہوتے تھے۔ لیکن ان اداروں کے اختیارات شہر کے باہر بھی ہوا کرتے تھے اور حسبِ ضرورت وہ اپنے اختیارات کا استعمال کرتے تھے۔ شہری ریاستوں کے قوانین جہاں تک عمل درآمد ہوتے وہاں تک شہری ریاست کی سرحد ہوتی تھی۔

5.3.2 قومی ریاست کی تاریخ (History of Nation State)

قومی ریاست کے تصور پر مختلف ماہرین تاریخ داں نے کافی بحث کی ہے۔ کتاب *Imagined Communities* کے مصنف Benedict Anderson کے مطابق پرنٹ میڈیا کے سبب قومی ریاست کے تصورات رونما ہوئے۔ 1500ء اور 1600ء کے درمیان پرنٹنگ پریس کی ایجاد و ٹکنالوجی کی ترقی کے سبب قومی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ ذرائع ابلاغ اور پریس وغیرہ میں عوامی یا مقامی زبان میں مشترکہ خصوصیات وغیرہ پر بحث ہونے لگیں، جس سے قومی شناخت کا تصور بھی پیدا ہوا۔

5.4 یورپ میں قومی ریاستوں کا ظہور (Rise of Nation States in Europe)

5.4.1 ابتدائی جدید دور کا مفہوم (Defining the Early Modern Period)

براعظم یورپ کے مختلف ریاستوں یا ممالک میں 100 سال سے چل رہی جنگ کے سبب معاشی اعتبار سے یورپ تباہ ہو چکا تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے ذریعے یورپ کی تجدید نو کی جانے لگی، جس کے سبب تجارتی سرگرمیاں وجود میں آنے لگیں۔ غریب و متوسط طبقے کو ترقی کے مواقع حاصل ہوئے۔ اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات پیدا ہونے لگے۔ شہری ریاستوں کے تاجروں کی دولت اور وقار میں اضافہ ہونے لگا۔ متوسط تاجرین کی ترقی کے ساتھ اشرافیہ یا شرفاء کے معیار ورتبے میں کمی واقع ہونے لگی۔ تجارتی سرگرمیاں، لین دین وغیرہ شہری علاقوں میں مرکوز ہونے لگی۔ روایتی طریقہ کار کے تحت اراضیات کے مالک کو رتبہ حاصل تھا، لیکن جدیدیت نے اس نظریہ کو پلٹ دیا۔ زمین کی اہمیت کم ہونے لگی۔ پروٹیسٹنٹ اصلاحات اور اختیارات کی لامرکزیت اور یورپ میں بڑھتے ہوئے اثرات کے سبب کیتھولک کلیسا کی مشکلات بڑھنے لگیں۔ صنعتی ترقی نئی اختراع و سائنسی ایجاد کے سبب کمزور طبقات کے طرزِ زندگی میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ یورپ کے تاریک دور سے نکل کر جدید یورپ میں داخل ہوا۔ یورپ کا جدید ابتدائی دور 1400ء کے آخری دور سے شروع ہو کر 1700ء

میں صنعتی انقلاب کے دور تک قائم تھا۔ سائنس کی اہمیت وافادیت، ایجادات تجارتی اصولوں کا وجود تجارتی مراکز کا قیام وغیرہ اس دور کی اہم خصوصیت رہی ہے۔ اس طرح 1700ء کے آخری دور سے عصرِ حاضر تک جدید دور کہلاتا ہے۔

5.4.2 قومی ریاستیں اور قومی بادشاہت (Nation States, and National Monarchs)

عہدِ وسطیٰ کی عوام اپنے آپ کو کسی ریاست یا قوم سے تعلق رکھنے سے متعلق غور و فکر نہیں کرتی تھی۔ یعنی آج کے دور میں جس طرح ہر شخص اپنے آپ کا تعلق کسی نہ کسی قوم یا ملک سے ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح عہدِ وسطیٰ میں شاذ و نادر تھا وہ اپنے آپ کو پیرس (Parisians)، فلورنس کے باشندے (Florentines)، اٹلی کے باشندے (Neapolitans)، لندن کے باشندے (Londoners)، آسٹریا (Viennese) وغیرہ کہتے تھے۔ جب حکمرانوں یا بادشاہوں نے پندرہویں صدی عیسوی میں اپنی سرحدوں کو وسعت دینا شروع کیا تب عوام نے اپنے آپ کو ریاستوں کے باشندے کہنے لگی۔ اور بادشاہت سے وفاداری کا اظہار کرنے لگی، یعنی عوام اپنے آپ کو ایک مخصوص ریاست کے باشندے کہلانے لگے۔ اس طرح جدید ریاستوں کا ظہور ہوا۔ یہ ریاستیں بادشاہوں کے زیر نگرانی تھی، لیکن تبدریج قومی ریاست کی ٹھوس شکل اختیار کرنے لگی۔ قومی بادشاہوں نے امن وامان کو برقرار رکھنے کی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ عوام میں اتحاد و اتفاق کو پروان چڑھانے لگے۔ مخالفین و باغیوں کو طاقتور فوج کے ذریعے کنڑول کیا گیا۔ جدید یورپ میں قومی بادشاہت کے ضم ہونے کے مختلف عوامل ذمہ دار ہیں۔

5.4.3 ترتیب زمانی کے اعتبار سے یورپ میں اہم سیاسی واقعات

(Major Political Events in Europe as per Time Frame)

تاریخ یا دور	اہم واقعات
1500 عیسوی سے قبل	عوام کی اکثریت اپنے دیہات یا گاؤں میں گزر بسر کرتی تھی۔ زمیندار یا جاگیرداروں کو اپنی پیداوار کا محصول ادا کرتی تھی۔ آزادانہ طور پر دوسرے مقامات تک سفر نہیں کر سکتے تھے، بلکہ بہت کم ضرورت کے مطابق گاؤں سے باہر نکلتے تھے۔
1485 عیسوی	ہنری ہفتم (Henry-VII) نے برطانیہ کی گلابوں کی جنگ (War of Roses) میں فتح حاصل کرنے کے بعد برطانیہ کے تخت شاہی پر ٹوڈر (Tudor) خاندان کی بنیاد رکھی اور برطانیہ یا انگریزی ریاستوں کی ترقی کے اقدامات کیے۔ 1455 تا 1487 کے درمیان برطانیہ کی تخت شاہی کے دعویدار کے طور پر House of Lancaster اور House of York کے درمیان جنگیں ہوئی۔ House of Lancaster کے فوجی سرخ گلاب Red Rose کا بیاج لگاتے اور York کے فوجی سفید گلاب White Rose کا

	بیا چ لگاتے تھے،اس لیے اس جنگ کو جنگ گلاب کہتے ہیں۔
1492ء	ہسپانوی (Spanish) بادشاہ فرڈینینڈ (Ferdinand) اور Isabella اسپین سے سب کو واپس طلب کیا۔ایک عالمی طاقت کے طور پر اسپین کو ابھرنے کا موقع حاصل ہوا۔
1547–1584	خوفناک ایوان (Ivan The Terrible): یہ روس کا پہلا شاہی خاندان کا حکمران ہے۔ اس نے سرکاری اداروں کو متحد کرتے ہوئے پہلی روسی قومی ریاست قائم کی۔
1638–1715	فرانسیسی بادشاہ لوئی (Louis XIV) نے مکمل شاہی حکومت قائم کی اور فرانس براعظم یورپ کی ایک طاقتور مملکت کی حیثیت سے ابھرا۔
1648ء	1648ء میں ویسٹ فالیا کا امن (Peace of Westphalia) معاہدہ طئے ہوا۔اس معاہدے کی رو سے 30 سالہ جنگ کا خاتمہ ہوا۔ یہ امن معاہدہ Munster اور Osnabruck کے درمیان 1648ء میں ہوا۔Westphalia جرمنی کا ایک علاقہ ہے جہاں پر امن معاہدہ طئے ہوا۔
1789ء	فرانسیسی انقلاب کا آغاز ہوا۔ جدید فرانسیسی ریاست کا تصور وجود میں آیا اور براعظم یورپ میں قومیت کے جذبے کو فروغ حاصل ہوا۔
1871ء	اٹلی اور جرمنی کا اتحاد مکمل ہوا۔
1919ء	پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر معاہدہ وارسالی (Treaty of Versailles) طئے ہوا۔اس معاہدہ کے سبب مختلف کئی ریاستوں کی تقسیم عمل میں آئی اور ساتھ ہی نئی ریاستیں قائم ہوئیں۔
1945ء	اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔

5.4.4 قومی ریاستوں کے ظہور کے اسباب (Causes for the Rise of Nation States)

براعظم یورپ میں قومی ریاستوں کے عروج کے چند اہم اسباب کو ذیل میں بتلایا گیا ہے:

a) **صلیبی جنگوں کا اثر (Effect of the Crusades):** دورِ وسطیٰ میں یورپ میں جاگیر دارانہ خصوصیات تھی اور کئی ممالک میں بادشاہ نے امراء یا شرفاء کے ساتھ سیاسی اختیارات تفویض کیے تھے۔عیسائیت کے تحفظ کے لیے بادشاہ اور امراء رضاکارانہ طور پر جدوجہد کررہے تھے۔ایک جانب بازنطینی سلطنت اور دوسری جانب مشرقی امراؤں کے ساتھ روابط نے انہیں مطلق العنان حکمران یا بادشاہت کا تصور دیا۔ صلیبی جنگوں کی وجہ سے امراء یا شرفاء کا خاتمہ ہوا۔ کئی نامور یا طاقتور شرفاء یا رئیس جو صلیبی جنگوں میں شریک تھے اور بادشاہ کے لیے آسانیاں پیدا کیں تاکہ بادشاہت قائم ہوسکے۔

b) **نشاۃ ثانیہ کا اثر(The Impact of Renaissance)**: نشاۃ ثانیہ کے دور میں تین عوامل کے سبب مطلق العنانیت کو فروغ حاصل ہوا۔

1۔ جسٹینین قانون(Law of Justinian): عہدِ وسطیٰ کے مشہور بازنطینی حکمران اور بھاری کرنسی حاصل ہوئی۔اس کے مطابق بادشاہ کو کامل اختیارات حاصل ہوئے، جس سے یہ تصور پروان چڑھا کہ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے وہ قانون الٰہی کا حق رکھتا ہے اور ملک میں قانون اور انصاف کا سرچشمہ ہوتا ہے۔اس کے سبب بادشاہ کے الٰہی حق کے نظریہ (Theory of Divine Right of King)کو تقویت حاصل ہوئی۔

2۔ شہزادہ میکاولی(Machiavelli's *Prince*): میکاولی کے مطابق مملکت کے استحکام وتحفظ کے لیے ایک طاقتور قیادت یا حکمران کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے سبب معیشت پروان چڑھتی ہے۔ بادشاہت ایک اہم اور موزوں طرزِ حکومت ہے، جس کے سبب ملک میں استحکام اور خوشحالی پیدا ہوتی ہے۔

3۔ پندرہویں، سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں سائنسی ایجادات اور نئے ممالک کی تلاش میں حکمرانوں نے کافی سرپرستی کی۔ تحقیقات میں کامیابی کے سبب حکمرانوں کے معیار اور مرتبہ میں اضافہ ہوا۔کیتھولک کلیسا کی جانب سے زمین اور اس کا حجم، نظامِ شمسی وغیرہ پر دیئے گئے نظریات کو مسترد کیا گیا۔

c) **اصلاحی اقدامات(Reformation)**: صلیبی جنگوں اور اصلاحی تحریکوں نے پوپ اور کیتھولک کلیسا کے موقف کو کافی کمزور کیا۔ کیتھولک بادشاہ کیتھولک کی سرپرستی کرتے تھے۔اسپین کے فلپ دوم(Philip-II)، چارلس پنجم (Charles-V) کیتھولک کی حمایت اور تائید کرتے تھے۔ یورپی بادشاہوں پر انحصار کرنا یا ان کی ہمت افزائی کی اُمید رکھنا کیتھولک کلیسا کی کمزوریوں کو ظاہر کرتا ہے، جس سے ہنری ہشتم(Henry-VIII)نے پوپ کے اختیارات و مرتبے کو مسترد کرتے ہوئے فائدہ حاصل کیا۔

d) **متوسط طبقہ کا ظہور(The Rise of the Middle Class)**: قومی ریاستوں کے ظہور ہوتے ہی متوسط طبقے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔کیتھولک طاقتور کلیسا کے مقابلے میں بادشاہ کی حمایت کرتے تھے۔ متوسط طبقہ کے افراد شہروں اور اضلاع میں رہتے تھے۔ یہ تاجروں وکاروباری افراد سے ملاقات کرتے جہاں سے انہیں سیاسی معلومات حاصل ہونے لگیں۔ متوسط طبقہ سیکولر ذہنیت رکھتا تھا۔ یہ قواعد وضوابط اور اصولوں پر عمل کرتے تھے اور ذاتی زندگی کی ترقی اور تحفظ کو اہمیت دیتے تھے۔

e) **پرعزم حکمراں (Determined Monarch)**: سولہویں صدی عیسوی میں براعظم یورپ میں طاقتور مطلق العنان بادشاہت قائم تھی۔ہنری ہشتم(Henry-VIII) برطانیہ کا ایک طاقتور بادشاہ گزرا ہے جو مخالفین کی کسی بھی بات کو برداشت نہیں کرتا تھا۔اس طرح امراء، شرفاء و پوپ کو بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔اس طرح فرانس کا حکمراں فرانسس اول(Francis-I) بھی اس دور کا طاقتور بادشاہ گزرا ہے۔ برطانیہ عالمی سطح کا پہلا ملک ہے جہاں پر قومیت(Nationalism) کا جذبہ ابھرا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ 1485ء میں ٹوڈر بادشاہ(Tudor Monarch)حکمران کی بھی عظیم بادشاہت تھی۔

5.4.5 قومی ریاست - برطانیہ میں ٹوڈر خاندان کا ظہور (Nation States: Rise of Tudor England)

برطانیہ میں شاہی مطلق العنانیت (Royal Absolutism in England)

برطانیہ براعظم یورپ کا ایک اہم ملک ہے۔ یہ ایک مضبوط طرز پر متحد ملک نہیں تھا بلکہ برطانیہ پر ٹوڈر(Tudor) خاندان کی حکومت سے قبل برطانیہ' برطانیہ' ویلس(Wales)' اسکاٹ لینڈ(Scotland) اور آئیر لینڈ(Ireland) چار مختلف خطوں میں منقسم تھا۔ برطانیہ (برطانیہ) اور فرانس ایک دوسرے کے قدیم دشمن ہیں جن کے درمیان 1337 تا 1453 کے درمیان سو سالہ جنگ چل چکی ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں دونوں ممالک میں حب الوطنی کا جذبہ فروغ پایا۔ برطانیہ کے تخت شاہی کے لیے برطانیہ کے House of York اور House of Lancaster کے درمیان 1455 تا 1487 کے درمیان 30 سالہ جنگ ''جنگ گلاب'' (Rose" "War) ہوئی۔ یہ دونوں برطانیہ کے امراء یا شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس 30 سالہ جنگ کے سبب شاہی خاندان یا امراء کے خاندانوں کی تباہی ہوئی اور دوسری جانب عوام امن کے خواہشمند تھے۔ امراء ہی مذکورہ حالات یا بدامنی پیدا ہونے کے ذمہ دار تھے۔ ان حالات میں بادشاہ ہنری ہفتم (Henry-VII) جو 1485 تا 1509 کے دوران برطانیہ کا بادشاہ تھا۔ اس نے کافی فائدہ اٹھایا۔ اس نے امراء کی جاگیریں ضبط کرتے ہوئے ان کے اثر و رسوخ کو کم کیا۔ اور دوسروں پر خوف پیدا کرتے ہوئے ایک طاقتور مضبوط بادشاہت قائم کیا۔ امراء/باغیوں پر کنٹرول کرنے کے لیے Court of Star Chamber قائم کیا۔ ہنری ہفتم نے اس کورٹ کے ذریعے سیاسی استحکام پیدا کرنے یا بدنظمی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ اور باغی امراء کے مقدمات کو بھی حل کرنے کے لیے کورٹ کا استعمال کیا۔ بادشاہ کی دانشمندی اور تمام طبقات کی حمایت کی وجہ سے ٹیوڈر(Tudor) خاندان کا مستقبل کافی روشن ہوا۔ ہنری ہفتم (Henry-VII) اپنے آپ کو ایک متحرک' قابل اور دانشمند حکمران کی حیثیت سے متعارف کروایا جو انگریزی بادشاہت میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

بادشاہ ہنری ہشتم اور ٹیوڈر مطلق العنانیت (King Henry-VIII and Tudor Despotism)

ہنری ہشتم برطانیہ کا ایک طاقتور حکمران گزرا ہے جو قوی الجثہ اور اونچے قد کا مالک تھا۔ یہ خوبصورت' تعلیم یافتہ اور ذہین و چالاک تھا۔ جس نے 1509ء سے 1547 تک تقریباً 40 سال تک برطانیہ پر شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ یہ ٹیوڈر(Tudor) خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ہنری ہشتم کے دور میں ٹیوڈر خاندان کی خود مختاری اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ہنری ہشتم براعظم یورپ کے دیگر ممالک میں سب سے طاقتور اور مصمم ارادے کا مالک تھا۔ سیاسی میدان میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ ہنری ہشتم کی شخصی زندگی پریشان کن رہی۔ اس نے چھ شادیاں کیں۔ ہنری ہشتم کو ابتدائی دور میں تھامس والسے (Thomas Wolsey)، تھامس کرام ویل (Thomas Cromwell) اور تھامس کران مر (Thomas Cranmer) جیسے مشہور لوگوں کی رہبری و سرپرستی حاصل رہی۔ یہ بتدریج ہر میدان میں تجربات و مشاہدات کے ذریعے مہارت حاصل کرتا رہا۔ اس لیے آخری دور میں یہ کافی خود مختار ہو چکا تھا۔ یہ کسی پر انحصار نہیں کرتا تھا۔ اس کے اختیارات کو کیتھولک کلیسا کے سوا کوئی چنوتی نہیں دے سکتا تھا۔ پارلیمنٹ بادشاہ کے مطیع تھی۔ یہ خود مختار مطلق العنانیت کا مالک تھا۔ پوپ سے اختلافات کے دوران بادشاہ کی خود مختاری اور مطلق العنانیت عروج پر تھی۔

انگریزی اصلاحات (English Reformation)

انگریز بادشاہ عیسائی مذہب کے کیتھولک عقائد کو سختی سے ماننے والے تھے۔ یہ خود مختار اور مطلق العنانیت کے حامی تھے، اسی لیے مخالفین یا احتجاج کرنے والوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اس دور میں اصلاحی تحریک براعظم یورپ میں تیزی سے پھیل رہی تھی جو شاہی حکومت کے لیے خطرہ کی علامت تھی۔ جرمن مفکر مارٹن لوتھر (Martin Luther) عیسائی مذہب کے پروٹیسٹنٹ عقائد کا ماننے والا تھا۔ اس نے پروٹسٹنٹ اصلاحی تحریک (Protestant Reformation) شروع کی۔ اس نے کیتھولک نظریات یا عقائد پر تنقید کیا۔ جس کے جواب میں بادشاہ ہنری ہشتم (Henry-VIII) نے *The Defence of the Seven Sacraments* کے نام سے 1521ء میں کتاب شائع کی جس میں لوتھر کے نظریات کی مذمت اور کیتھولک عقائد کی حمایت کی ہے۔ جس پر پوپ (Pope) نے خوش ہو کر ہنری ہشتم کو 'دین کا محافظ' (Defender of the Faith) کے خطاب سے نوازا۔ پوپ اور ہنری ہشتم کے درمیان اختلافات نے دلچسپ موڑ اختیار کیا۔

ہنری ہشتم کے یورپ کے ساتھ اختلافات اور تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوا۔ اس کی شخصی اور سیاسی مجبوریوں کے سبب پوپ (Pope) کے گزارش کرنے پر مجبور ہو کر اس نے اپنی پہلی بیوی کیتھرین آف آراگوں (Catherine of Aragon) سے شادی منسوخ کرے۔ این بوئلین (Anne Boleyn) ہنری ہشتم کے دربار میں کام کرنے والی نوکرانی تھی، جس سے عشق ہوا اور شادی کا خواہشمند تھا۔ ہنری ہشتم نے اپنی پہلی بیوی کیتھرین آراگوں سے علیحدگی اختیار کیا تھا جس کے سبب اس کا این بوئلین سے شادی کرنا لازمی تھا۔ این بوئلین کے حاملہ ہونے سے یہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہو گیا۔ ہنری ہشتم نے بچے کو قانونی حیثیت دینے کے لیے خفیہ طور پر شادی کر لی۔ مذکورہ حالات میں پوپ کی جانب سے تاخیر کے اسباب کو سمجھنے سے بادشاہ قاصر رہا۔ پوپ جن حالات کا سامنا کر رہا تھا، ان حالات سے پوپ ناراض تھا۔ کیتھرین، چارلس پنجم (Charles-V) کی خالہ تھی۔ کیتھرین کے پوپ پر ہنری کی درخواست کو منظور نہ کرنے یعنی گزارش کو مسترد کرنے پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ ان حالات میں ہنری کو جواب دیے بغیر پوپ نے مسئلے کو ٹال دیا۔ ہنری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ پوپ کا رویہ اور عدم تعاون سے کافی مشتعل ہو کر برطانیہ میں کیتھولک کلیسا پر پوپ کے تسلط کو برخواست کرنے کے اقدامات کیے۔

ہنری کے مشیر خاص تھامس کرام ویل (Thomas Cromwell) نے کہا کہ بادشاہ برطانیہ کی حیثیت سے کیتھرین کو طلاق دینے کے لیے پوپ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ ہنری نے کرام ویل کو برطانیہ کے کینٹربری (Canterbury) کا آرچ بشپ مقرر کیا۔ یعنی عیسائی عبادات گاہ کلیسا کا سب سے اعلیٰ مقام و مرتبہ یا عہدہ دیا گیا، جس نے کیتھرین اور ہنری کی شادی اور طلاق کے مسئلہ کو حل کرتے ہوئے ان کی شادی کو منسوخ کیا۔ پارلیمنٹ کے ذریعے ہنری ہشتم نے برطانیہ پوپ کی جگہ لے لی۔ یعنی بحیثیت بادشاہ کے ساتھ ساتھ وہ پوپ کے اختیارات بھی اپنے قبضے میں رکھتا تھا۔ برطانیہ میں Act of Appeal ہے جس کے تحت پوپ سے کوئی قانونی شادی' طلاق یا بادشاہ سے اختلاف وغیرہ کے معاملات کو پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مذکورہ ایکٹ بادشاہ کو کامل اختیارات عطا کرتا ہے۔ اس قانون کے مطابق کیتھرین (Catherine) کو طلاق کے معاملے کو پوپ کے روبرو پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح برطانیہ میں Act of

Annates تھا جس کے تحت پہلی مرتبہ پوپ منتخب ہونے پر روم کو پوپ کو رقم ادا کرنا تھا۔ پہلے سال کی آمدنی میں پوپ کو ایک تہائی آمدنی دی جاتی تھی۔ یہ پوپ کی آمدنی حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ لیکن ہنری ہشتم نے اس قانون پر پابندی عائد کر دی جس کے سبب حکومت کی جانب سے پوپ کو رقم ادا کرنے سے منع کیا گیا۔ اس پابندی کے سبب پوپ کی آمدنی بند ہوئی۔ سولہویں صدی میں برطانیہ کی پارلیمنٹ میں Act of Supremacy پاس ہوا، جس کی رو سے پوپ کلیسا کا صدر تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن اس قانون میں تبدیلی لائی گئی۔ لیکن First Act of Supremacy کی رو سے ہنری ہشتم اور اس کے جانشین کو کلیسا کے صدر (Super Head) ہونا تسلیم کیا گیا، یعنی بادشاہ کو ہی کامل مطلق اختیارات حاصل دیا گیا۔ اس قانون کی رو سے بد عنوان یا رشوت یافتہ پوپ کو برخواست کیا گیا۔

داخلی پالیسی (Internal Policy)

ہنری ہشتم نے اپنے دورِ حکومت میں وزراء خاص کر کارڈینل وولسی (Cardinal Wolsey) کے صلاح و مشوروں سے پالیسیوں کو اختیار کرتا تھا۔ کارڈینل وولسی ہنری ہشتم کے دور کا کامیاب وزیر' اندرونی و بیرونی پالیسیوں کا نگران تھا اور مشیر خاص کا مرتبہ رکھتا تھا۔ ہنری ہشتم نے متوسط طبقہ کی حمایت اور شاہی اختیارات کو مستحکم کرنے پر زور دیا۔ ہنری نے کارڈینل وولسی کے مشوروں سے اپنے والد ہنری ہفتم (Henry-VII) کے دور کے امراء پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ برطانوی پارلیمنٹ پر بہت کم بھروسہ کرنے کی پالیسی اور حکمت عملی پر عمل کیا۔ ہنری ہشتم کو Court of Star Chamber سے کامیابی حاصل ہوئی، جس نے اس کے دور میں بھی اپنے کام کو جاری رکھا۔ Star Chamber دراصل شاہی دربار ہے۔ 1515 تا 1522 تک تقریباً سات سال تک شاذ و نادر ہی پارلیمنٹ کو طلب کیا گیا۔ پارلیمنٹ میں ہنری ہشتم کے تائید کرنے والے اراکین تھے، جس کے سبب پارلیمنٹ نے بادشاہ کی خواہش کے مطابق اصلاحات کیں۔

ہنری ہشتم، نشاۃ ثانیہ کو فروغ دینے والا ایک مثالی بادشاہ ثابت ہوا۔ اس کا دربار عظیم دانشوروں و سرپرستوں سے مامور تھا۔ ریچرڈ فاکس (Richard Fox)' کارینل وولسے (Carinal Wolsey)' سر تھامس مور (Sir Thomas More) چند اہم اور قابل ذکر درباری دانشور ہیں۔ کارڈینل وولسے (Cardinal Wolsey) نے آکسفورڈ میں Christ Church College قائم کیا، جس میں نوجوان اسکالرس کو فلسفہ' قانون اور اخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تھامس مور (Thomas More) جو ماہر بشریات یا انسانیت (Humanist) تھا، وہ کتاب اٹوپیا (Utopia) کا مصنف اور کالج کا چانسلر (Chancellor) تھا۔ ہنری ہشتم کوئی معمولی شہزادہ یا بادشاہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک تعلیم یافتہ مختلف زبانوں کا ماہر تھا۔ لوتھر کے خلاف ایک واضح طور پر مذہبی کتاب کا مصنف 'لیوٹ' (Lute) اور 'ہارپ' (Harp) پر کام کرنے والا، جوسٹر اور کمان، اس شان کا امتزاج رکھتا تھا، جس کی فکری قوت اور سیاسی خواہش بالکل اس کے حکمرانوں کی عمر کے مطابق تھی۔

خارجہ پالیسی (Foreign Policy)

ہنری ہشتم برطانیہ کو براعظم یورپ کا ایک ترقی یافتہ اعلیٰ درجہ کا ملک بنانے کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں اہم کردار ادا کرنے والا

ملک بنانے کا متمنی تھا۔اسی سبب اپنی پالیسی میں برطانیہ کے معاملات کو اولین ترجیح دیتے ہوئے دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات کو استوار کیا۔ یہ تمام ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے قریبی تعلقات رکھنے والے ممالک سے ترجیحات کی بنیاد پر تعلقات کو برقرار رکھنا تھا، مثلاً تھامس وولسے (Thomas Wolsey) کیتھولک کلیسا کا رکن اور بادشاہ ہنری ہشتم کے دور کا غرباء کی مفت مدد کرنے والا عظیم فلاحی کارکن تھا۔اس کے خیال میں فرانس کے بادشاہ فرانسس اول (Francis-I) کے خلاف جنگ میں برطانیہ کے بادشاہ چارلس پنجم (Charles-V) کی تائید کرنے سے برطانیہ کا مقام و مرتبہ اور شہرت میں اضافہ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ چارلس ہفتم ہالینڈ کا حکمران ہنری کا بھتیجہ (nephew) تھا، جس کے سبب اس کے برطانیہ کے اچھے تعلقات تھے۔ شخصی یاذاتی طور پر برطانیہ کو بادشاہ چارلس پنجم کی حمایت وتائید سے پوپ (Pope) کی خوشنودی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ طویل مدت میں ذاتی مفادات، عزت وشہرت کا حصول تھا۔ برطانیہ کی جنگوں میں بھی ان مصارف کو برداشت کرنے کے باوجود سیاسی میدان میں خاطر خواہ مفادات حاصل نہیں ہوئے، لیکن عزت و شہرت و اقتدار میں اضافہ ہوا۔ برطانوی سفارت کاری کی ابتداء نظریاتی اور عملی دونوں صورت میں ہوئی، مثلاً 1520ء میں کلاتھ گولڈ کے میدان میں ہنری ہشتم اور فرانسیس اول کی شاندار ملاقات نے شہنشاہ چارلس پنجم پر مطلوبہ اثر ڈالا۔ یہاں تک کہ شہنشاہ نے تھامس وولسی سے ہنری ہشتم کو فرانس کے ساتھ جنگ میں اس کا ساتھ دینے کے لیے رشوت دی۔آخر میں ہنری نے انگریز خاتون این بولین سے شادی کرنے کے ارادے کی وجہ سے وولسی، پوپ، شہنشاہ چارلس پنجم اور فرانسیسی بادشاہ کے ساتھ ہی سب کو مایوس کیا۔

5.4.6 اسپین-فلپ دوم (Spain: Philip-II)

اسپین (Spain) براعظم یورپ کا ایک اہم شاہی ملک ہے جو براعظم یورپ کے جنوب مغرب (South Western) کی جانب واقع ہے۔ رومن شہنشاہ چارلس پنجم (Charles-V) کا بیٹا فلپ دوم (Philip-II) اسپین کا بادشاہ تھا۔ ان کی والدہ کا نام Isabella تھا جو پرتگال کی رہنے والی تھی۔ فلپ دوم 21 مئی 1527ء کو پیدا ہوا اور 7 سال کی عمر میں 1598ء کو انتقال ہوا۔ یہ Philip of Prudent کے نام سے مشہور تھا۔1556تا1598 تک اسپین کا حکمران رہا۔اس کے دور حکومت میں اسپین کے اثر و رسوخ واختیارات میں کافی اضافہ ہوچکا تھا۔اس نے رومن کیتھولک کو برقرار رکھا۔ وہ اپنے آپ کو رومن کیتھولک کا Champion تصور کرتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ (Ottoman) کے مسلم اور عیسائی طبقہ کے پروٹیسٹنٹ (Protestant) فلپ کے رویہ کے مخالف تھے۔ فلپ دوم نے چار شادیاں کیں جس میں سے تین بیویوں سے اولاد ہوئی۔ تمام شادیاں یورپی طاقتور حکمرانوں کے خاندانوں میں کیں۔ اس لیے یہ شادیاں اسپین کی سیاسی، معاشی میدان میں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ فلپ دوم کی پہلی شادی 1543ء میں Maria Manuela سے ہوئی جو پرتگال کی شہزادی اور رشتے میں cousin ہوتی تھی۔ یہ اس کے ماموں (maternal uncle) پرتگال کے جان سوم (John-III)، پھوپھی (paternal aunt) آسٹریا کی کیتھرین کی دختر تھی۔اس کا انتقال 1545ء میں ہوا۔ فلپ دوم کی دوسری شادی برطانیہ کی میری اول (Mary-I) سے ہوئی جو رشتے میں فلپ دوم کی پہلی cousin ہوتی تھی۔اس شادی کے سبب فلپ دوم برطانیہ اور آئرلینڈ (Ireland) کا مشترکہ حکمران بنا۔ان دونوں اپنے اپنے ممالک میں حکومت کی لیکن زیادہ تر الگ رہتے تھے۔اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں

ہوئی۔ میری کا انتقال 1558ء میں ہوا، جس کے سبب برطانیہ اور آئرلینڈ میں فلپ دوم کی حکومت نہیں رہی۔ فلپ دوم کی تیسری شادی 1559ء میں فرانس کے حکمراں ہنری دوم (Henry-II) اور کیتھرین ڈی میڈیکی (Catherine De Medici) کی بڑی لڑکی Elisabeth of Valois سے ہوئی۔ ان سے دو اولادیں ہوئیں۔ اس شادی کے سبب فرانس اور اسپین کے درمیان چلی آرہی خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا اور ان دونوں ممالک کے درمیان تعاون میں اضافہ ہوا۔ الزبیتھ کا انتقال 1568ء میں ہوا۔ فلپ دوم کی چوتھی شادی 1570ء میں Anna of Austria سے ہوئی جو رشتے میں بھانجی (niece) ہوتی ہے۔ اس سے اولاد نرینہ فلپ سوم کی پیدائش ہوئی۔ مذکورہ بالا ازدواجی رشتوں کے سبب فلپ دوم کو براعظم یورپ کے مختلف ممالک کی حکمرانی کا اعزاز حاصل ہوا۔

داخلی پالیسی (Internal Policy)

براعظم یورپ کے دیگر ممالک کی طرح اسپین حکمران بھی قانونی اعتبار سے شاہی نظام چلاتے تھے۔ اپنے علاقے کے تحفظ کے لیے ان کے درمیان اتحاد و باہمی تعاون بھی تھا۔ ساتھ ہی ان کے درمیان اندرونی طور پر ایک دوسرے سے حسد یا جلن بھی رہتی تھی۔ یہ House of Habsburg (یہ یورپ کی اہم اور شاہی خاندان) سے اختلاف رکھتے تھے، اس لیے یہ اپنے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ فلپ دوم کے اختیارات کو مقامی اسمبلیوں نے کم کیا، جس کے سبب مقامی امراء کے مقابلے میں فلپ دوم کے اثر و رسوخ کم ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسپین میں بسنے والے موریسکو آبادی (اسپین کی مسلمانوں کو موریسکو کہتے ہیں) کے مسئلے پر فلپ دوم گھرا ہوا تھا۔ فلپ دوم کے ماتحتوں نے اسپین کے موریسکو قوم (اسپین کی مسلم آبادی) کو زبردستی عیسائی مذہب میں تبدیل کیا تھا جس کے سبب 1569ء میں موریسکو (Morisco) قوم نے بغاوت کی۔ اسپین کے جنوبی صوبے Granada میں موریسکو کے رسم و رواج کو مفلوج یا ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ فلپ دوم نے حکم دیا کہ Granada کے صوبے سے موریسکو (مسلم آبادی) کو باہر نکال کر مختلف صوبوں میں منتشر کر دیا جائے۔

اسپین کم آبادی والا ملک تھا جس کے سبب سرکار اور بادشاہ کو بھی کم آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ فرانس ایک کثیر آبادی والا ملک تھا جہاں پر بادشاہ کی آمدنی بھی زیادہ تھی۔ فلپ دوم کو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا ناگزیر تھا۔ محصول یا ٹیکس ہی آمدنی بڑھانے کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ شرح محصول کو بڑھانے کے لیے فلپ دوم کو کافی رکاوٹیں پیش آئیں۔ محصول کی وصولی مقامی امراء کے ذمہ تھی۔ اسپین کے مقامی مالی وسائل کا استحصال کرتے ہوئے فوجی مہمات کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی، جو اس کی فوجی پالیسی کے لیے اہم ثابت ہوا۔ اس کے باوجود خزانہ دیوالیہ کا شکار ہوا۔ فلپ دوم کے دور میں پانچ اہم ریاستیں مالی بحران کا شکار ہوئیں۔

فلپ دوم اور اس کے والد چارلس پنجم کے طرزِ حکمرانی میں فرق تھا۔ فلپ دوم کے والد چارلس پنجم کو عہدِ وسطیٰ کے بادشاہ غیر مستقل سکونت کے طرز پر حکمرانی پر مجبور کیا گیا تھا۔ جبکہ فلپ دوم یورپ میں جدیدیت کی جانب ترقی کرتے ہوئے حکمرانی کر رہا تھا۔ یہ ریاستوں کو کنٹرول کرتا تھا اور اس سے متعلق ہدایت جاری کرتا تھا۔ سلطنت پر مکمل نظر رکھتا تھا۔ دربار میں نہ ہونے کے باوجود اپنے رہائشی مقام

سے ہدایات جاری کرتا تھا۔ طبعیت کی ناسازی کی صورت میں اپنی رہائش گاہ El Escorial سے نگرانی کرتا اور ضرورت کے مطابق ہدایات جاری کرتا۔ فلپ دوم نے اپنی رہائش گاہ El Escorial کو اسپین کے شہر San Lorenzo میں تعمیر کیا گیا تھا جو اسپین کا دارالخلافہ Madrid سے 45 کیلو میٹر دور واقع ہے۔ یہ عمارت عالمی سطح پر نشاۃ ثانیہ دور کی ایک جدید عمارت ہے۔ اس عمارت کی تعمیر اسپین کے مشہور و معروف تجربہ کار انجینئر Juan Bautista de Toledo کے تعاون سے ہوئی تھی۔ فلپ دوم اور انجینئر دونوں نے مل کر اس تاریخی عمارت کا نقشہ تیار کیا تھا تاکہ یہ عالمی سطح پر عیسائی مذہب میں مرکزی حیثیت حاصل کر سکے۔ فلپ دوم کیتھولک عقائد کا ماننے والا تھا، اس لیے کیتھولک عقائد کے تحفظ کے لیے سارے یورپ میں پروٹیسٹنٹ (Protestant) کے خلاف محاذ تیار کیا تھا۔

خارجہ پالیسی (Foreign Policy)

فلپ دوم کی خارجہ پالیسی میں مذہبی عقائد بھی نظر آتے ہیں۔ چونکہ یہ کیتھولک عقائد کا معتقد تھا، اس لیے کیتھولک عقائد اور خاندانی مفادات دونوں کے عوامل کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی خارجہ پالیسی کو تشکیل دیا۔ فلپ دوم اپنے آپ کو سلطنت عثمانیہ ترکی اور پروٹیسٹنٹ کے خلاف کیتھولک عقائد کا محافظ اور Chief Defender تصور کرتا تھا، اسی لیے وہ ان سے مخالفت کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ اس نے کیتھولک عقائد کا دفاع اور اپنے صوبوں میں عبادت کی آزادی کو محدود کیا۔ نیدر لینڈ میں حب الوطنی اور پروٹیسٹنٹ عقائد کو ماننے والوں کی کافی تعداد موجود تھی، اس لیے نیدر لینڈ میں پروٹیسٹنٹ کی جڑیں کافی مضبوط تھیں۔ 1568ء میں نیدر لینڈ (Netherlands) میں بغاوت کے بعد فلپ دوم نے ڈچ (Dutch) کی علیحدگی کے خلاف مہم چلائی ہے۔ نیدر لینڈ کی بغاوت کو کنٹرول کرنے اور اس کو مستحکم بنانے کی حکمت عملی اختیار کی جو آگے چل کر ملک میں بدامنی کا سبب بنی اور بتدریج کیلوانسٹ (Calvinist) قیادت کی بغاوت اور 80 سالہ جنگ کا سبب ہوئی۔ سولہویں صدی میں اسپین کے کافی سرمایہ کے خرچ ہونے کا سبب بھی بنا۔

جان کالون (John Calvin) سولہویں صدی کا فرانسیسی مذہبی رہنما تھا جو عیسائی مذہب کے پروٹیسٹنٹ (Protestant) عقائد کا معتقد تھا۔ اس نے پروٹسٹ اصلاحی (Protest Reformer) تحریک چلائی۔ اس کے ماننے والوں کو Calvinism کہتے ہیں۔ فلپ دوم کیتھولک عقائد کا معتقد تھا جس کے سبب ان کے درمیان اختلافات مزید شدت اختیار کر گئے۔ ان اختلافات و جنگ کے سبب اسپین پر مالی بوجھ میں اضافہ ہوا۔ فلپ دوم نے اسپین کے پروٹیسٹنٹ علاقوں میں کیتھولک عقائد کو بحال کرنے کی کوشش کی جس کے سبب یورپ میں 1585 تا 1604 تک اینگلو۔ اسپین جنگ (Anglo-Spanish War) ہوئی۔ یہ جنگ اسپین اور برطانیہ سلطنتوں کے درمیان وقفہ وقفہ سے جاری تنازعات و اختلافات کا نتیجہ بھی یہ اختلافات سابق میں کبھی ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ اسپین کیتھولک عقائد اور برطانیہ پروٹیسٹنٹ عقائد کے ماننے والے تھے۔ ان اختلافات کے سبب ان کے درمیان مختلف محاذوں پر جنگ ہونے لگی۔ 1588ء میں برطانیہ (انگریز) نے فلپ دوم کے اسپین کے آرماڈا (Armada) (اسپین کی جنگی ساز و سامان و فوج) کو شکست دی، جس کے سبب فلپ دوم کے کیتھولک عقائد کو بحال کرنے کا منصوبہ ناکام ہوا۔ اس کے باوجود ان کے درمیان 16 سال تک مسلسل جنگ چلتی رہی۔ اس پیچیدہ جنگ میں فرانس، آئرلینڈ (Ireland) اور نشیبی ممالک جنگ کے اہم مراکز یا میدان تھے۔ 1596ء اور 1597ء میں اسپین آرماڈا

(Armada) یعنی فوجی کمک روانہ کی گئی۔ لیکن غیر موزوں آب و ہوا اور ناقص منصوبہ بندی کے سبب اسپین کی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ فلپ دوم کے انتقال تک یہ جنگ جاری رہی۔

فلپ دوم کیتھولک عقائد کا ماننے والا تھا، اس لیے فرانس میں ان ہی عقائد کو عام کرنے اور ترویج کے لیے جنگوں سے بھی گریز نہیں کیا۔ ملک فرانس (French) میں کیتھولک (Catholics) اور پروٹیسٹنٹ (Protestant) کے عقائد والوں کے درمیان مذہبی جنگ ہوئی جس کو Huguenots یعنی عیسائی جنگ کہتے ہیں۔ دوران جنگ کیتھولک سے تعلق رکھنے والے ادارے کیتھولک لیگ (Catholic League) کو فلپ دوم نے کافی مالی امداد فراہم کی اور 1589 تا 1598 کے دوران جنگ کے آخری مراحل میں راست طور پر مداخلت کرنا شروع کیا۔ 1590ء میں ہنری چہارم (Henry-IV) کے پیرس کے محاصرہ کے خلاف پارما کے ڈیوک (Duke of Parma) الیگزینڈر فرانسیس کو روانہ کیا (یورپ کے چھوٹے سے علاقے یا ملک یا جزیرہ کے خود مختار حکمران کو Duke کہتے ہیں۔ پارما اٹلی کے شمال میں موجود ایک بڑا شہر ہے جس کے حکمران کو Duke of Parma کہتے ہیں) 1592ء میں فرانسیسی شہر Rouen کے محاصرہ کے خلاف فرانس میں پروٹیسٹنٹ بادشاہت کے خلاف کیتھولک لیگ کے بقاء و تحفظ کے لیے کافی اقدامات کیے جا چکے تھے، جس کو کیتھولزم (Catholicism) کہتے ہیں۔ 1593ء میں ہنری چہارم (Henry-IV) نے کیتھولک عقیدے کو اختیار کرنے پر اتفاق کیا۔ مسلسل جنگ سے بیزار ہو کر زیادہ تر فرانسیسی کیتھولک لیگ کے سخت موقف کے خلاف تھے۔

1594ء تک کیتھولک لیگ کے چند اراکین ہنری چہارم کے خلاف ملک بھر میں کام کر رہے تھے جنہیں اسپین کی حمایت حاصل تھی، اس لیے 1595ء میں ہنری چہارم نے اسپین کے خلاف باضابطہ سرکاری طور پر اعلان جنگ کیا تاکہ کیتھولک کو یہ بتلایا جا سکے کہ فلپ دوم کے مذہب کا سہارا لے کر فرانسیسی اور پروٹیسٹنٹ پر حملہ کر رہے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلپ دوم تبدیلیٔ مذہب کے سبب اسپین میں کٹھ پتلی کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ علاقائی مفادات کے تحت جنگ میں شامل ہے۔ 1598ء میں فرانس کے حکمراں ہنری چہارم اور اسپین کے حکمران فلپ دوم کے درمیان معاہدہ امن ورونس (Peace of Vervins) طے ہوا جس کے تحت ان دونوں کے درمیان مذہبی جنگ کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد فرانس کے بادشاہ ہنری چہارم نے فرانسیسی پروٹیسٹنٹ کو مذہبی آزادی کے (Edicts of Nantes) اور شہری حقوق عطا کیا اور فرانس میں فلپ دوم کی مداخلت کا خاتمہ ہوا۔ اور ہنری چہارم کو تخت سے بے دخل کرنے اور فرانس میں پروٹیسٹنٹ کو دبانے میں ناکام ہوا۔ اس کے باوجود ہنری چہارم کی تبدیلی مذہب سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے فرانسیسی کیتھولک کی کافی مدد کی۔ کیتھولزم فرانس کا سرکاری اور اکثریتی مذہب قائم رہا جو اسپین کیتھولک بادشاہ کے لیے بہت اہم تھا۔ 1571ء میں جنگ لے پنٹو (The Battle Lepanto) میں ترک کے خلاف فلپ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس میں Holy League نے جس کو پوپ نے تشکیل دیا تھا، کامیابی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ فلپ دوم کے ناجائز بھائی John of Austria کے کنٹرول میں تھا۔ وہ پرتگال کے تخت پر بہت ہی کامیابی کے ساتھ تخت نشین ہوا۔

5.4.7 فرانس بحیثیت قومی ریاست

فرانس کا ظہور: 9ویں سے 11ویں صدی تک مغربی فرانس کے بادشاہوں کے زیر حکمرانی لوگوں اور زمینوں کو تبدیل کر دیا گیا۔ کیرولنگس پروٹوٹریٹ آف لوکل آرڈر، بیرونی یلغار اور طاقت کے اندرونی قبضوں کے دباؤ میں منہدم ہو گیا۔ بڑھتی آبادی اور تیز ہوتی ہوئی معیشت کو ریاستوں میں دوبارہ منظم کیا گیا، جن کے رہنماؤں نے بادشاہوں، بشپ اور راہبوں کے پرانے پروگراموں کو آگے بڑھانے کے لیے کوشش کی۔ ان غلاموں میں سے ایک جو پیرس۔ اورلینز کے محور پر قائم تھا اور بعد میں اسے "آئل۔ ڈی فرانس" (Île-de-France) کے نام سے جانا گیا۔ وہ فرانس کی نئی خاندانی سلطنت کا مرکز تھا۔ اسے کیپٹن فرانس بھی کہا گیا۔ سماجی اور ثقافتی علاقے کے طور پر فرانس کا ظہور فرانس کی سیاسی وسعت سے قبل تھا۔ پہلے سے ہی بارہویں صدی میں صلیبی جنگ جو رومان بولنے والی سرزمین سے "فرانکس" (Franks) کے بات کرتے تھے تو اس کا مطلب کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے "فرانسیسی" جبکہ رومانوی اور جرمن زبان کی آبادی کے درمیان پرانی حدود کی استقامت نے ایک عظیم تر مغربی فرینک لینڈ کے نظریہ کو دوام بخشا۔

نپولین کی اہمیت: نپولین بوناپارٹ قومی ریاست کی ترقی میں ایک اہم فرد تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں فرانسیسی انقلاب کی افراتفری کے درمیان، عہدِ وسطیٰ کے جاگیردارانہ قوانین کو ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ پر قومی قانون (ضابطہ) بنایا گیا۔ ایک قومی فوج بنائی گئی۔ فرانس بحیثیت قومی ریاست اٹلی اور جرمنی میں جاگیردار پڑوسیوں پر غلبہ حاصل کرنے کی استطاعت کا ایک اہم عنصر تھی۔ نپولین کی فوجی فتوحات نے بقیہ یورپ میں بھی قومی ریاستوں کے قیام کی راہ ہموار کی۔ بہت سے مقامات پر لوگوں نے نپولین کو شکست دینے کے لیے بطور ایک قوم متحد بھی ہو گئے۔

5.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عالمی سطح پر دور حاضر میں قومیت کے تصور کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔ 1500ء سے قبل براعظم یورپ میں قومی ریاستوں کا ظہور نظر نہیں آتا۔ اس سے قبل کئی ممالک میں عوام اپنے آپ کو کسی ملک کے شہری یا شہریت میں شامل نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے ہی علاقے تک محدود رہتے تھے۔ بہت کم معاملات میں اپنے علاقوں سے باہر نکلتے تھے جس کے سبب انہیں دنیا کی کوئی جانکاری حاصل نہیں تھی۔ حکمران بھی اپنے علاقوں پر بہت کم کنٹرول رکھتے تھے۔ مقامی زمینداروں کو کافی اختیارات حاصل تھے۔ بادشاہ بھی ان مقامی زمینداروں کی خوشنودی پر رہا کرتے تھے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں ملکی اصولوں میں اختلافات پائے جاتے تھے۔ عہد جدید سے قبل شاہی حکمران دربار کے کمزور حکمرانوں کی بدولت سلطنت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ اس طرح کے مشکل مراحل بعض وقت بغاوت کو ہوا دیتے تھے۔ بادشاہ کے ہاتھ میں طویل مدت تک اختیارات ہوتے تھے۔ بادشاہ یا ملکہ ملک کے تمام افراد کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہوئے انہیں اپنے ملک میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ قومیت کے تصور کا ظہور پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ دیکھا گیا ہے کہ نئی وجود میں آنے والی ریاستوں میں بادشاہوں کی جانب سے عوام کو شہریت سے مستفید ہونے کی ترغیب دی گئی۔ انیسویں صدی عیسوی میں براعظم یورپ

میں پہلی بار قومی ریاستوں کا وجود عمل میں آیا۔ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں قائم ہونے والی ریاستوں میں کیتھولک کلیسا کے پیچیدہ تعلقات تھے۔ مختلف موقعوں پر کیتھولک کلیسا کو جزوی شہریت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ مثلاً اٹلی میں پوپ کی دعوت پر فرانس اور اسپین نے مداخلت کی لیکن بعض مطلق العنان بادشاہ کلیسا پر بھی اپنے اختیارات رکھتے تھے۔ برطانیہ میں ہنری ہشتم (Henry-VIII) کی جانب سے کلیسا پر کنڑول کرنے پر اختلافات پیدا ہوئے، جس کے سبب 1530ء میں آزاد پروٹیسٹنٹ کلیسا کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح کے اختلافات کیتھولک کلیسا میں بعض اوقات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن بعض کیتھولک عقائد کے معتقدین کسی دوسرے عقائد کو اختیار کرنے پر منع کرتے تھے جس کے سبب خانہ جنگی (Civil War) جیسے حالات پیدا ہونے لگے۔

5.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

گلابوں کی جنگ : (Wars of the Roses) ایک ہی شاہی خاندان بلانتا جانت ہا کے دو گھرانوں لنکا شایر اور یارک شایر کے درمیان جنگوں کا نام ہے۔ ان جنگوں میں ان کے ساتھ ان کے حامی بھی لڑ رہے تھے۔

آرچ بشپ : عیسائی مذہب میں پادریوں کے اعلیٰ افسر کو آرچ بشپ کہا جاتا ہے۔

Despotism : استبداد، ظلم و جبر سے حکومت کرنا، خود مختاری۔

5.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. تیس سالہ جنگ کن ممالک کے درمیان ہوئی؟
2. کتاب *Imagined Communities* کے مصنف کون ہیں؟
3. نشاۃ ثانیہ (Renaissance) سے کیا مراد ہے؟
4. جنگ گلاب کے دور میں برطانیہ کا بادشاہ کون تھا؟
5. کونسی جنگ کے نتیجے میں Peace of Westphalia کا معاہدہ ہوا؟
6. Justinian کون ہے؟
7. اسپین میں کیتھولک عقائد کا محافظ یا قابل اعتبار کس کو کہا جاتا ہے؟
8. جنگ صد سالہ کن ممالک کے درمیان واقع ہوئی؟
9. Court of Star Chamber سے کیا مراد ہے؟
10. سات مقدمات (Seven Sacraments) سے کیا مراد ہے؟

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جنگ تیس سالہ پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. قومی ریاست سے کیا مراد ہے؟ تحریر کیجیے۔
3. فلپ دوم کی خارجہ پالیسی بیان کیجیے۔
4. ہنری ہشتم کی داخلی پالیسیوں کی وضاحت کیجیے۔
5. قومی ریاستوں کے ظہور کے اسباب بیان کیجیے۔

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. برطانیہ کے ٹوڈر خاندان کے عروج پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. اسپین کے بادشاہ فلپ دوم پر تفصیلی بحث کیجیے۔
3. فرانس کی بحیثیت قومی ریاست کی وضاحت کیجیے۔

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Anderson, Benedict, *Imagined Communities: Reflections on the Origins and Spread of Nationalism*, Verso, London, 2006 (First Edition 1983).
2. Droz, Jacques, *Europe between Revolutions, 1815–1848*, Fontana Press, London, 1967.
3. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
4. Gottlieb, Anthony, *The Dream of Enlightenment*: *The Rise of Modern Philosophy*, Penguin, UK, 2017.
5. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
6. Hobsbawm, Eric J., *On Nationalism*, edited and introduced by Donald Sassoon, Little Brown, Great Britain, 2021.
7. Hobsbawm, Eric J., *Nations and Nationalism since 1780*: *Programme*, *Myth*, *Reality*, Cambridge University Press, Delhi, 2013 (first published 1990).
8. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
9. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
10. Morland, Paul, *The Great Human Tide*: *How Population Shape the Modern World*, John Murray, Great Britain, 2019.
11. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.

12. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
13. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
14. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
15. Soboul, Albert, *Understanding the French Revolution*, People's Publishing House, Bombay, 1989.

اکائی 6۔ یورپ میں مطلق العنانیت

(Absolutism in Europe)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید
6.1 مقاصد
6.2 پس منظر
6.3 مطلق العنانیت کا تصور
6.3.1 مطلق العنانیت کی خصوصیات
6.3.2 فلسفیانہ اساس
6.3.3 روشن خیال مطلق العنانیت
6.4 یورپ میں مطلق العنانیت کا ظہور اور فروغ
6.4.1 یورپ میں مطلق العنانیت کے فروغ کے اسباب
6.4.2 شاہی مطلق العنانیت کی اساس
6.4.3 پرشیا کا عروج
6.4.4 فریڈرک اعظم
6.5 مطلق العنانیت کے مسائل
6.6 فوج اور فریڈرک دوم کی ریاست
6.7 اکتسابی نتائج
6.8 کلیدی الفاظ
6.9 نمونہ امتحانی سوالات
6.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید(Introduction)

شاہی حکومت اور اس کے طرز عمل سے آپ واقف ہیں۔ شاہی یا بادشاہی حکومت ایک قدیم طرز حکومت ہے۔ جس میں کامل اختیارات بادشاہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ بادشاہ کا حکم قابل عمل ہوتا ہے۔ کسی بھی صورت میں حکم کی عمل آوری میں کوتاہی نہیں کی جاسکتی۔ شاہی حکومت کو قدیم دور سے رائج رہا ہے۔ لیکن عصر جدید میں اسی شاہی حکومت کو مطلق العنان حکومت بھی کہتے ہیں۔ مطلق العنانیت کی اصطلاح ایک جدید اصطلاح ہے۔ جس میں شاہی اقتدار پر دیگر اداروں جیسے کلیسا، مقننہ اور دوسرے سماجی غلبہ رکھنے والے گروہوں کا کوئی کنٹرول نہیں رہ سکتا۔ مطلق العنانیت کے رجحان کی ابتداء یورپ میں سترہویں صدی میں ہوئی۔ اور یہ طرز فکر فرانسیسی انقلاب کی ابتداء تک قائم رہا۔ مطلق العنانیت کا عروج جاگیرداری نظام کے خاتمہ، شہنشاہ سے قربت رکھنے اور اس کے اقتدار کے استحکام، ریاستی اقتدار کے عروج، ریاستی قوانین کی تدوین کے علاوہ کلیسا اور امرائے عظام کے اثرات کے انحطاط کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ مطلق العنانیت عہد وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے دور کی بادشاہت سے مختلف ہے۔ جس میں بادشاہ کے اپنے خاص امراء یا اشرافیہ کو جاگیردارانہ اختیارات حاصل تھے اور رسمی طور پر تمام امراء مساویانہ حقوق رکھتے تھے۔ درحقیقت عہد وسطیٰ کا بادشاہ امراء میں سے ایک ہوا کرتا تھا۔ ان کے درمیان حقیقی اقتدار و اختیارات بھی تقسیم ہوئی تھی۔ مطلق العنان بادشاہ وہ تھے جنہیں ملک میں اقتدار اعلیٰ حاصل تھا۔ ان کے اقتدار پر کسی قسم کی روک تھام، نگرانی یا کسی کی بھی بالادستی نہیں تھی۔ کوئی ایسا ادارہ بھی نہیں تھا جو ان کے اختیارات میں حصہ داری رکھتا۔ یہ بادشاہ خداداد اقتدار کے عقیدے پر عمل پیرا تھے۔ یعنی انہیں اقتدار اعلیٰ خدا کی جانب سے تفویض کیا گیا تھا۔ ایسے بادشاہوں کی مخالفت کرنا خدا کی مخالفت کے مترادف تسلیم کیا جاتا تھا۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- مطلق العنانیت کے مفہوم اور اس کی نوعیت سے واقف ہو جائیں گے۔
- یورپ میں مطلق العنانیت کے عروج کے اسباب کو بیان کر سکیں گے۔
- اہم مطلق العنان بادشاہ اور ان کے کارہائے نمایاں کو بیان کر سکیں گے۔
- فریڈرک اعظم کے طرز حکمرانی سے واقف ہو سکیں گے۔

6.2 پس منظر (The Context)

مطلق العنانیت کے عروج کے کئی اسباب تھے۔ جس میں جاگیرداری نظام کا زوال، مذہبی جنگیں، بالخصوص تیس سالہ جنگ، متوسط طبقہ کی نشوونما اور مالگزاری نظام میں تبدیلی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان سب اسباب نے مل کر یورپی باشندوں کی طرز حیات اور معیشت پر منفی اثرات مرتب کیے، جس کی وجہ سے عوام میں دُکھ درد اور محرومیاں بڑھتی چلی گئیں۔ مذہبی جنگیں جیسے تیس سالہ جنگ مطلق العنان بادشاہت کے عروج میں ایک اہم اور بنیادی سبب ہے۔ اس جنگ کے نتیجہ میں بہت سے معصوم لوگ مارے گئے۔ اس کا ایک سبب پروٹسٹنٹ

تحریک اصلاح تھی۔ صلیبی جنگوں کے سبب یورپ کے پچاس فیصد علاقے ہاتھ سے نکل گئے۔ تیس سالہ جنگ کے اختتام پر ویسٹ فیلیا (Peace of Westphalia) کا معاہدہ ہوا۔ اور اس معاہدہ سے یورپ کے اقتدار کے توازن میں تبدیلیاں آئیں۔ اور بتدریج کتھیولک کلیسا کے اختیارات میں تخفیف ہوئی۔ اس کے علاوہ دوسرے مذہبی طبقات کے اختیارات میں بھی کمی واقع ہوئی۔ کلیسا کے اختیارات اور اثرات میں کمی کی وجہ سے ایک نئے اقتدار اعلیٰ کی راہیں ہموار ہونے لگیں۔ اس کے نتیجہ میں یورپ میں مطلق العنانیت کا غلبہ قائم ہوا۔

مطلق العنانیت کے اس دور کو بہت سے مورخین ابتدائی سرمایہ داری کے نظام سے موسوم کیا ہے، کیونکہ اس دور میں تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ نیز مطلق العنان حکمرانوں کو مضبوط کیا۔ اور معیشت کو مرکزیت بخشی۔ اس کے علاوہ تاجروں سے وصول ہونے والے محصولات سے مطلق العنان بادشاہوں کی دولت میں اضافہ ہوا۔ ریاست کے بنیادی اقتدار میں فوج عدالتی فیصلوں کا نفاذ مطلق العنان بادشاہوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہوگیا۔ اس زمانے میں عہدیداروں اور حکومت کے مختلف عہدوں کو چلانے کے لیے دفاتر قائم کیے گئے۔ عدلیہ کے عروج سے عدالتوں کے عہدیداروں کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوا۔ اور شاہی مشاورتی کونسلس کا دائرہ کار بھی بڑھنے لگا۔ مطلق العنان بادشاہوں کے لیے ورسیلز کے محلات مختص کردیے گئے۔ اور بادشاہوں کا اقتدار اعلیٰ مسلم ہوگیا۔ اس طرح عالیشان محلات اور عدالتوں کے قیام کے بعد مطلق العنان بادشاہوں کے اختیارات لامحدود ہوگئے۔

6.3 مطلق العنانیت کا تصور (The Idea of Absolutism)

مطلق العنان طرز حکومت میں بادشاہ کو ہی کامل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ امراء یا شرفا بادشاہ کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ بادشاہ کو نائب خدا تصور کیا جاتا ہے۔ بادشاہ کے الوہی حقوق کے اختیارات، جنت کا منشور اور شاہی خصوصی اختیارات وغیرہ کو مطلق العنانیت کا مرکزی تصور کیا جاتا ہے۔ براعظم یورپ کے باہر بھی سلطنت عثمانیہ میں سلطان کو مکمل اقتدار حاصل تھا۔ مغل اور صفوی سلطنت میں حکمراں اپنی رعایا (عوام) کی نگاہ میں شہنشاہ (عظیم بادشاہ) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ حکمراں خود کو زمین پر خدا کا نمائندہ، سایہ یا پرتو تصور کرتے تھے۔ یعنی ان کا دعویٰ تھا کہ انہیں خدا کی طرف سے لامحدود اختیارات عطا کیے گئے ہیں۔ قدیم زمانہ میں میسوپوٹامیا (عراق) میں اکاد (Akkad)، بابل (Babylonia) اور اشور (Assyria) کے بادشاہ مطلق العنان تھے۔ یورپی تاریخ میں بادشاہوں کے الوہی حقوق کا تصور موجود تھا، یعنی وہ اپنے کو مطلق العنان سمجھتے تھے۔ کئی یورپی حکمرانوں نے اسی خداداد بادشاہت کے تصور کا سہارا لے کر یہ کہا کہ ان کی رعایا کو بادشاہ کے اختیارات کو محدود کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

6.3.1 مطلق العنانیت کی خصوصیات (Characteristic Features of Absolutism)

قومیت کے ارتقاء عمل جو دیگر تصورات کے ساتھ اُبھرا اور اس کے سبب افواج کی تنظیم عمل میں آئی۔ حکمراں کی خوشنودی پر منحصر شاہی (بیوروکریٹ طبقہ) کلیسا کا ریاست سے انضمام اور تاجرانہ معاشی نظام وغیرہ مطلق العنانیت کی ایک امتیازی خصوصیت رہی ہے۔ مطلق

العنان بادشاہت میں عوام کو فطری حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ بادشاہ کی جانب سے انہیں صرف چند مراعات ہی حاصل ہوتی ہیں۔ سارے قوانین کا اجراء و نفاذ بادشاہوں کی جانب سے ہوتا ہے اور یہ قوانین بادشاہ کے مفادات کی تکمیل کے لیے ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے خلاف ہر شکایت اور احتجاج غداری اور لائق سزا جرم تسلیم کیا جاتا تھا اور اس کی سزا تشدد اور موت ہوتی تھی۔ مطلق العنان بادشاہت کے نظام میں بادشاہ کو داخلی و خارجی پالیسیوں پر پورا اختیار حاصل ہوتا تھا۔ ایک مطلق العنان حکمراں کسی بھی حکومت کے ادارے سے اپنے اختیارات کا اشتراک نہیں کرتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں بادشاہ کو ہر معاملہ میں بالادستی حاصل تھی۔ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں تھا۔ بادشاہ کے خلاف کسی طرح کی عدالتی مذہبی انتخابی فوجی معاشی لغزشوں پر کوئی کارروائی نہیں کی جاتی تھی۔ بادشاہ کے حکم کو حرف آخر تصور کرتے ہوئے عمل کیا جاتا تھا۔ اس کی خلاف ورزی کو خدا کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیا جاتا تھا۔

6.3.2 فلسفیانہ اساس (Philosophical Foundations)

مطلق العنان حکمراں جنہوں نے اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ انہیں اقتدار خدا کے فضل سے حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ اصل مطلق العنانیت کے نظام کو فرانسیسی سیاسی مفکر جین بوڈین (Jean Bodin, 1529–69) نے بادشاہی نظام کی تائید میں لکھی جانے والی کتابوں کے خلاف جواب دیا تھا۔ بوڈین نے سب سے پہلے اقتدار اعلیٰ کا تصور پیش کیا۔ اس کے مطابق اقتدار اعلیٰ جس کی نمائندگی بادشاہ کرتا ہے۔ اس کا کام ہے کہ وہی سینکڑوں خاندانوں کے مفادات کو صحیح سمت میں لے جائے اور اس طرح وہ اپنے اقتدار اعلیٰ کا استعمال کرے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریاست ایک مطلق العنان، ناقابل تقسیم دائمی اور ابدی اقتدار اعلیٰ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی چھ تصانیف جو ریاست (State) پر تحریر کی ہیں اس میں اس نے خود مختاری کے دعوے کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ بادشاہ کو تمام اختیارات حاصل ہیں اور اسی بنیاد پر مطلق العنان حکمرانوں کا تصور تشکیل دیا گیا۔ اور آنے والے زمانے کی مطلق العنان ریاست کی تعمیر اسی تصور پر کی گئی۔ تاہم بوڈین نے مطلق العنان حکمرانوں کو شاہی من مانی کا مطلق حق نہیں دیا۔ اس کے برعکس اس نے اپنی تصانیف میں قدرتی حقوق، الٰہی احکام، خاندان اور جائیداد کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔

6.3.3 روشن خیال مطلق العنانیت (Enlightened Despotism)

مطلق العنان حکمرانوں کے طرز عمل پر پیش کیے گئے مختلف نظریات و فلسفیانہ تصورات کے سبب ان حکمرانوں کے خیالات میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ جس کو روشن خیالی کہا جاتا ہے۔ روشن خیال مطلق العنانیت سے مراد اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں یورپی مطلق العنان بادشاہوں کا وہ طرز عمل اور پالیسیاں ہیں جو روشن خیالی کے نظریات سے متاثر تھے۔ یہ تصور اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ابتداء میں شروع ہوا۔ ایک روشن خیال مطلق العنان حکمران ایک غیر جمہوری یا آمرانہ رہنما ہے جو روشن خیالی کے اصولوں پر مبنی اپنی سیاسی طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ روشن خیال بادشاہوں نے اپنی رعایا کی بھلائی کے لیے حکومت کرنے کا دعویٰ کر کے خود کو عام حکمرانوں سے ممتاز کیا۔ جے۔ ایس۔ مل (J.S. Mill) کہتا ہے کہ جاہلوں سے نمٹنے کے لیے آمریت ایک جائز طریقہ ہے جس کے ذریعہ ان کے اندر بہتری

پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شاہی طاقت کے بارے میں روشن خیال مطلق العنان کے عقائد عام طور پر باقاعدہ غاصبوں کے عقائد سے ملتے جلتے تھے۔ دونوں کا یہ ماننا تھا کہ ان کا مقدر حکومت کرنا ہے جو اس کے لیے خدا کی جانب سے چنے گئے ہیں۔ روشن خیال حکمرانوں نے یورپ میں غلامی کے نظام کو ختم کرنے میں اپنا اہم کردار ادا کیا تھا۔ مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہ جوزف دوم (Joseph-II) نے کچھ اس طرح اظہار خیال کیا تھا۔ 'ہر چیز عوام کے لیے ہے لیکن عوام کے ذریعہ سے کچھ بھی نہیں۔ ('Everything for the People, Nothing by the People')

6.4 یورپ میں مطلق العنانیت کا ظہور اور فروغ

(The Rise and Growth of Absolutism in Europe)

6.4.1 مطلق العنانیت کے عروج کے عوامل (Factors Leading to the Rise of Absolutism)

سولھویں اور سترہویں عیسوی کی صلیبی جنگوں سے مطلق العنانیت کو فروغ حاصل ہوا۔ 1517 تا 1648 میں اصلاح مذہب تحریک (Protestant Reformation) سے مذہبی خونی جنگوں کا پر تشدد سلسلہ شروع ہوا۔ جس کے سبب ہزاروں بے گناہ معصوموں کی موت واقع ہوئی۔ 1618 تا 1648 کے درمیان تیس سالہ جنگ کے سبب جرمنی کی آبادی میں 15 تا 30 فیصد تک کمی واقع ہوئی۔ 1600 میں فرانس کی آبادی 16 تا 18 ملین کے درمیان تھی۔ 98-1562 کے درمیان فرانس کی صلیبی جنگوں کی وجہ سے فرانس کی آبادی میں 2 تا 4 ملین کی کمی واقع ہوئی۔ اسی طرح سوئٹزرلینڈ، آسٹریا، ہالینڈ، انگلینڈ، آئرلینڈ ، اسکاٹ لینڈ، ڈنمارک اور بوہیمیا (Bohemia) میں بھی جنگیں ہوتی رہیں۔ صلیبی جنگوں اور بڑھتی ہوئی غیر مذہبیت کی وجہ سے یورپ پر مذہبی گرفت یا اثر کمزور پڑنے لگا۔ نشاۃ ثانیہ اور سائنسی انقلاب کے پس منظر میں دانشوروں و فلسفیوں نے کلیسا کے نظریہ سے ہٹ کر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ سائنسی انقلاب کے سبب عوام کی معیار زندگی اور دیگر پہلوؤں میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ عوام خوشحال اور معیاری زندگی کی جانب راغب تھے۔ یورپی سماج و معاشرہ بہت زیادہ سیکولر یا حریت پسند ہو چکا تھا۔ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ مطلق العنانیت ہی پر تشدد واقعات کا سبب ہے۔ یورپی اقوام خود مختار یا مقامی باشندوں کے ہاتھوں میں اختیارات سونپنے کے حامی تھے۔ تاکہ سیاسی حقوق کے حصول کے ساتھ ہی امن و امان قائم ہو سکے۔ عہدِ وسطیٰ کے اختتام اور جدید ریاستوں کے وجود کے باعث جاگیرداری نظام کا زوال ہوا۔ قدیم جاگیردارانہ نظام میں کمزور بادشاہت کی خصوصیات ظاہر ہوتی ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے زوال اور کمزور مطلق العنانیت نے مقامی حکومت یا مقامی باشندوں میں حقوق کا شعور بیدار کیا۔ جس کے سبب اشرافیہ یا امراء مقامی قائدین کے ساتھ معاہدے کرتے ہوئے کنٹرول برقرار رکھنے لگے۔ عہد جدید میں یورپ کے چند حصوں میں مطلق العنان حکمران، امراء، شرفا عوام پر کنٹرول کرنے لگے۔ اس لیے بعض مورخین مطلق العنانیت کو عہد جدید کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ فرانس کے حکمران لوئی چہاردہم اور دیگر حکمرانوں میں کم و بیش مطلق العنانیت نظر آتی ہے۔ معاشی اعتبار سے جاگیردارانہ نظام کے زوال کے ساتھ ہی سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کا ظہور ہوا۔ 1800 تک یورپی ممالک میں قائم مزدوروں کی انجمن (Guild) کو تحلیل کرتے ہوئے اس مقام پر آزاد تجارت (Free Trade) (آزاد تجارت ایک معاشی تجارتی طریقہ ہے جس

میں سرمایہ یا سامان کی تجارت سے حاصل منافع کو مالکین میں تقسیم کیا جاتا ہے)وجود میں آئی۔

سرمایہ دارانہ معاشی نظام کا دوسرا پہلو تجارتی تحفظاتی پالیسی تھا۔ مختلف ممالک میں اس نظام کو 'مرکنٹلزم' کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کی بدولت مطلق العنان حکمرانوں کو معیشت میں مرکزی اہمیت حاصل رہی۔ تجارتی تحفظاتی نظریہ (Mercantilism) کے مطابق کسی بھی قوم کی خوشحالی کا دارومدار معیشت میں سرمایہ کی فراہمی، سرمایہ کاری، دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت اور مثبت توازن تجارت(Positive Balance of Trade) یا ادائیگی کے مثبت توازن(Positive Balance of Payment)پر ہوتا ہے۔ حکومت برآمدات (export) کی ہمت افزائی اور درآمدات (import) کی ہمت شکنی کرتے ہوئے مثبت تجارت کو فروغ دیتی ہے۔ اس میں چنگیاں (Tariffs)اور مراعات (subsidies)جیسے طریقوں کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تاجرین کی جانب سے ادائیگی محصول کے سبب حکومت کی آمدنی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی مالی مفاد میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر وارسائی محل کے منصوبہ کے تحت لوئی چہاردہم کے شاہی محل کی تعمیر پر 1.3 ملین یورو کا تخمینہ کیا گیا تھا۔

6.4.2 شاہی مطلق العنانیت کی اساس (The Foundation of Royal Absolutism)

مطلق العنان طرز حکومت میں بادشاہ کو کامل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے مفادات کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ شاہی مطلق العنانیت کے سبب ایسے نظریات وجود میں آئے جس کی بنیاد پر مطلق العنانیت کے طرز عمل، اور بادشاہ کے رویہ وغیرہ کو درست اور جائز قرار دیا گیا۔ مطلق العنان حکمراں خود کو خدا کی طرف سے مقرر کردہ مانتے تھے۔ ان کے سیاسی و مذہبی حقوق و عقائد، خدائی حقوق یا پھر سماجی معاہدات پر مبنی تھے۔ حکمران کے خدائی حقوق بادشاہ کے اس اختیارات کی وضاحت کرتے ہیں کہ بادشاہ کسی بھی زمینی فرد کے تابع نہیں بلکہ بادشاہ کو خدا سے راست حقوق حاصل ہیں۔ اسی لیے بادشاہ عوام یا امراء یا شرفاء پادریوں کے تابع نہیں ہے۔ بادشاہ کے متعلق خدائی حق حاصل ہونے کے اعتبار سے بادشاہ کو کنٹرول کرنے یا اختیارات کو محدود کرنے یا بادشاہ کو بے دخل کرنے کی جو بھی کوشش ہوگی تو اسے خدا کی مرضی کے خلاف تصور کیا جاتا تھا۔ فرانسیسی ماہر قانون اور سیاسی مفکر جین بوڈین(Jean Bodin)1530تا1596پہلے مصنف ہیں جنہوں نے رومی قانون کی بنیاد پر خدائی نظریہ کو پیش کیا۔ انہوں نے بادشاہ کو حاصل شدہ خدائی اختیارات کے متعلق 1576 میں شائع ہونے والی اپنی تصنیف *Six Books of the Commonwealth* میں تفصیلی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty)اور دائمی اختیارات (perpetual power) بادشاہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لیے خود مختار شہزادہ یا بادشاہ صرف خدا کو ہی جوابدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اس خدائی نظریہ کے متعلق برطانوی حکمراں جیمس اول (James-I, 1603–1625) نے 1598 میں *The True Law of Free Monarchies* نامی کتاب میں بادشاہت پر اپنے خیالات کی باضابطہ وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مقدس کتاب بائبل کے مطابق بادشاہ دوسروں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور اسی لیے وہ ممتاز منصب رکھتا ہے۔ اسے خدا کا نائب کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین پر خدا کی جانب سے تخت نشین ہوتا ہے۔ بادشاہ خصوصی حقوق کی وجہ سے سلطنت میں ضرورت کے مطابق نئے قوانین کو نافذ کرتا ہے۔ پارلیمنٹ کی منظوری یا اجازت کے بغیر بادشاہ قوانین کو بنا سکتا ہے اور اسے نافذ بھی کر سکتا

ہے۔ لیکن بادشاہ کو حاصل غیر معمولی اختیارات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بادشاہ حسب منشا بے دریغ اپنے اختیارات کو استعمال کرے۔ جیمس کی کتاب کے مطالعہ سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ایک اچھا اور قابل بادشاہ قانون کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں تبدیل کرتا۔ یعنی ایک قابل بادشاہ قانون کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس سے قانون میں اختیارات کی وضاحت ہوتی ہے۔

فرانس کے لوئی چہاردہم (Louis-XIV) کے دور میں بادشاہ کو حاصل خدائی اختیارات کے نظریہ کو فرانسیسی بشپ اور ماہر دینیات بوسوئٹ (Bossuet, 1627–1704) نے پرزور انداز میں فروغ دیا۔ وہ لوئی چہاردہم کا درباری اور سیاسی مطلق العنانیت کا پرزور حامی تھا۔ لوئی چہاردہم کا سب سے بڑا لڑکا لوئی ڈوفن (Louis Dauphin) تھا جس کی تعلیم و تربیت کے لیے بوسوئٹ کو منتخب کیا گیا۔ بوسوئٹ نے بہت سے تحریریں اور اسکول کے لیے کئی کتابیں لکھیں۔ اس کی تحریروں میں سے ایک نصابی مقالہ *Politics Drawn from the Very Words of Holy Scripture* اس کے سیاسی نظریے کی وضاحت کرتا ہے۔ 1709ء میں بوسوئٹ کے انتقال کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی۔ وہ اس بات کا پرزور حامی تھا کہ خدا نے بادشاہ کو بحیثیت اپنا وزیر یا نائب مقرر کیا جس کے ذریعہ عوام پر حکومت کی جاتی ہے۔ اسی کے سبب بادشاہ کو ایک مقدس فرد کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے اور وہ مطلق العنان ہوتا ہے۔ تاہم بوسوئٹ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ بادشاہ قانون سے بالاتر نہیں ہے اور اسے مذہبی اور وجدانی ضابطوں پر عمل کرنا چاہیے اور عملی طور پر بادشاہ کو اصولوں کا پابند ہونا چاہیے۔ اگر اتفاقاً بادشاہ قانون شکنی کا موجب ہو یا گناہ کرتا ہو تو ایسی صورت میں قوانین تباہ ہو جاتے ہیں۔ 1688 میں برطانیہ میں شاندار انقلاب (Glorious Revolution) کے بعد بادشاہ کو حاصل خدائی حقوق ختم ہو گئے۔ 1776ء کے امریکی انقلاب اور 1789ء میں فرانسیسی انقلاب کے سبب بادشاہ کو حاصل خدائی حقوق کو مکمل طور پر ترک کر دیا گیا۔ بیسویں صدی کے انقلاب نے خدائی حقوق کو مزید کمزور کیا۔ مذکورہ انقلاب اور تبدیلی سے عوام میں سماجی و معاشی شعور پیدا ہونے لگا جس کے سبب حکومت اور عوامی نمائندوں کے درمیان سماجی معاہدے طے ہونے لگے۔ یہ معاہدے دو طرفہ ہوتے تھے جس میں مملکت میں نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لیے نمائندے حکومت کو اختیارات دیتے تھے جس سے اصول و قوانین کی روشنی میں حکومت قائم ہو سکے۔ اس طرز حکمرانی سے سماجی تنظیم کے ساتھ ساتھ امن و امان بھی قائم ہوتا ہے۔ برطانوی مفکر تھامس ہوبز (Thomas Hobbes) پہلا فلسفی تھا جس نے اس قسم کی حکمرانی کے تصورات کو پیش کیا ہے اور اس کی تائید میں بحث کی۔ اپنی کتاب لیوآتھن (*Leviathan*) میں ہابز ایک سماجی معاہدے کے ساتھ مطلق العنان حکومت کی وکالت کرتا ہے۔ ہابز کے مطابق مرکز میں طاقتور حکمرانی کے بغیر افراتفری اور خانہ جنگی پیدا ہوتی ہے۔ بقول ہابز *Bellum Omnium Contra Omnes* یعنی سب کے خلاف سب کی جنگ (شروع ہو جاتی ہے)۔ اس طرح کی صورت حال میں فطری طور پر ہر شخص کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ جو چاہے، کرے۔ اس طرح لوگوں کی زندگی، تنہائی، غربت، پریشان حالی، وحشت اور کمی کا شکار بن جاتی ہے۔ ان حالات سے بچنے کے لیے سماجی معاہدے وجود میں آئے اور سماج قائم ہوا۔ سماجی تحفظ اور خوشحال معاشرے کی تشکیل کے لیے عوام اپنے اختیارات بادشاہ کے سپرد کرتے ہیں۔ نیک سیرت اور لائق بادشاہ کی رہنمائی میں مثبت حالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف غلط حکمرانوں کی صورت میں عوام کو بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ بادشاہ اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرے گا جس کو بہر حال میں

قبول کرنا لازمی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ عوامی اختیارات بادشاہ کے حق میں منتقل ہونے کے بعد انہیں دوبارہ واپس نہیں لیا جا سکتا۔

6.4.3 پرشیا کا عروج (Rise of Prussia)

پرشیا بحر بالٹک کے کنارے ایک چھوٹی سی ریاست (Duchy) تھی۔ اس پر ٹیوٹنی صلیبی جنگجو تنظیم (Order of Teutonic Knights) حکومت کرتی تھی جو کہ پولینڈ کے فرمانرواؤں سے وابستہ تھی۔ جرمنی میں اصلاح مذہب کے دوران ان جنگجوؤں نے پروٹسٹنٹ مذہب قبول کیا، کلیسائی زمینوں پر قبضہ کیا، تنظیم کو تحلیل کیا اور ان زمینوں پر ایک چھوٹی سی ریاست تشکیل دی۔ انہوں نے اس ریاست اپنے آقا ہوہنزولرن خاندان (Hohenzollern) کے حکمراں البرٹ (Albert) کے حوالہ کردیا۔ البرٹ کا تعلق ہوہنزولرن خاندان کی چھوٹی شاخ سے تھا اور اس شاخ کے اختتام کے بعد مشرقی پرشیا (East Prussia) اور کلیوز (Cleves) کے علاقے ہوہنزولرن خاندان کی دوسری شاخ برنڈنبرگ (Brandenburg) کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس طرح 1611 سے 'برنڈن برگ-ہوہنزولرن' حکمرانوں نے مشرقی پرشیا اور کلیوز پر حکومت کی اور انہیں متحد کیا۔ بدقسمتی سے پرشیا ابھی بھی پولینڈ کے ماتحت تھا اور درمیانی پولش علاقہ، طبعی طور پر برنڈن برگ کو پرشیا سے علیحدہ کرتا تھا۔ مشرقی پرشیا اور برنڈن برگ کے اتحاد سے ہوہنزولرن حکمرانوں کا مستقبل درخشاں ہوگیا۔ دریائے رہائن (Rhine) کے نشیبی علاقوں میں واقع کلیوز کی ریاست کو بھی 1618ء میں برنڈن برگ نے اس وقت حاصل کرلیا جب ان دونوں ریاستوں کے حکمرانوں میں شادی بیاہ کے تعلقات استوار ہوئے۔ فریڈرک ولیم اول (Frederick William-I) کی تخت نشینی کے بعد ہی برنڈن برگ اور پرشیا کو بین الاقوامی سیاست میں اہمیت حاصل ہوئی۔ فریڈرک ولیم اول کی وفات 31 مئی 1740ء میں ہوئی۔

6.4.4 فریڈرک اعظم (Frederick-II, the Great, 1740–1786)

1740ء میں تخت نشین ہونے کے بعد فریڈرک ثانی نے یہ ثابت کیا کہ وہ نہ صرف ادب، موسیقی اور فنون کا دلدادہ تھا بلکہ وہ ملک پر بھی نہایت خوش اسلوبی سے حکومت کرسکتا تھا۔ اس کی ابتدائی تربیت اسے آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی۔ وہ مملکتی امور میں ہمہ تن مصروف رہنے لگا۔ اس نے اپنے والد کی طرح سخت محنت و جانفشانی سے کام لیا اور مضبوط قوت ارادی، شجاعت، مہارت، تدبر اور عظیم قائدانہ صلاحیت کا ثبوت دیا۔ اس کی حکمرانی میں پرشیا ایک عظیم طاقت بن کر اُبھرا اور فریڈرک کو اعظم ('The Great') کا خطاب حاصل ہوا۔ فریڈرک کی تخت نشینی کے بعد جدید یورپ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اور اسی کے زمانے میں جدید جرمنی کی عظمت کی بنیاد رکھی گئی۔ پرشیا میں جنگوں اور معاشی ترقی کا سلسلہ ایک ساتھ چلتا رہا۔ فریڈرک اعظم نے آسٹریا کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پرشیا کی سرحدوں کو توسیع کی۔

6.4.4.1 سیاسی کامیابیاں (Political Achievements)

فریڈرک نے اپنی تخت نشینی کے بعد سے ہی اپنے وزراء پر یہ بات واضح کردی کہ وہ اکیلا ہی خارجہ پالیسی طے کریگا۔ چند مہینوں کے

اندر ہی اسے ایسا کرنے کا موقع کچھ اس طرح ملا جس سے بین الاقوامی سطح پر پرشیا کی حیثیت میں انقلابی تبدیلی آئی۔ آسٹریا کے ہیبس برگ (Habsburg)خاندان کے مقدس رومی شہنشاہ چارلس ششم کا 20 اکتوبر 1740 کو انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنے جانشین کے طور پر ماریا تھریسا (Maria Theresa) نامی ایک بیٹی چھوڑی۔ ہیبس برگ کے مختلف علاقوں پر ماریا کے دعووں پر یقیناً جھگڑا کھڑا ہونا تھا۔ اس کے علاوہ میریا کی فوج نہایت کمزور حالت میں تھی، ہیبس برگ سلطنت کی مالی حالت بھی خراب تھی اور اس کے وزرا بھی نااہل تھے۔ اس کے برعکس فریڈرک اپنے باپ کی وجہ سے ایک طاقتور فوج اور عظیم خزانے کا مالک تھا۔ اس لیے اس نے شہنشاہ کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہیبس برگ سلطنت کے صوبہ سلیسیاء (Silesia) پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سلیسیاء نہایت زرخیز علاقہ تھا اور پرشیا کے حکمران خاندان کے لیے یہ فوجی نکتہ نظر سے بہت اہم تھا۔ پرشیا اس پر کمزور ہی سہی خاندانی دعوے بھی رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں پرشیا کو سب سے بڑا خطرہ روس کے ذریعے میریا تھریسا کی حمایت سے تھا جس کو اس نے سینٹ پیٹرس برگ میں حکام کو رشوتیں دے کر اور روسی ملکہ آنا (Anna) کی اچانک موت کے بعد پیٹرس برگ میں جاری خلفشار کے ذریعے ٹالا۔ فریڈرک نے یہ بھی پیشکش کی کہ اگر میریا تھریسا سلیسیاء کے بہت سے علاقوں کو خود ہی اس کے حوالہ کر دے تو وہ میریا تھریسا کے دیگر دشمنوں کے خلاف اس کی حمایت میں میدان جنگ میں اتر پڑے گا، لیکن میریا تھریسا نے فریڈرک کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ جس کے باعث جنگ ناگزیر ہو گئی۔

فریڈرک کو پہلی فوجی فتح، جنگ مالوٹز (Battle of Mollwitz, 1741) میں حاصل ہوئی۔ اکتوبر میں میریا تھریسا کو فرانس، اسپین اور بویریا (Bavaria) کے مخالف اتحاد سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ مجبوراً میریا تھریسا نے پرشیا سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے سیلسیا کے نشیبی علاقے فریڈرک کے حوالے کرنے پڑے۔ تاہم فرانس اور بویریا کے خلاف ہیبس برگ کی کامیابیوں سے چوکنا ہو کر 1742ء کی ابتداء میں فریڈرک نے موراویا (Moravia) پر حملہ کر دیا۔ یہ علاقہ سیلسیاء کے جنوب میں واقع تھا جس پر آسٹریا کی حکومت تھی۔ فریڈرک کی مئی کے مہینہ میں شوٹسز (Chotusitz) کے مقام پر ادھوری کامیابی سے مجبور ہو کر میریا تھرسیا نے جولائی 1742ء کو برلن معاہدہ (The Treaty of Berlin) کے تحت سیلسیاء کا سارا علاقہ فریڈرک کے حوالے کر دیا۔ اس نے ہیبس برگ افواج کو فرانس اور بویریا کے خلاف 1743ء میں متحدہ کاروائی کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کے باعث 1744ء کے ابتدائی مہینوں میں جرمنی میں میریا تھریسا کی حیثیت کافی مضبوط ہو گئی اور وہ واضح طور پر طاقتور ہو گئی۔ فریڈرک نے اس سے چوکنا ہو کر اگست 1744ء میں بوہیمیا (Bohemia) پر حملہ کر دیا اور اس کو تاخت و تاراج کر دیا۔ تاہم اس سال کے اختتام پر فرانسیسی حمایت کے فقدان اور ذرائع حمل و نقل کا راستہ منقطع ہونے کے خوف نے فریڈرک کو اپنی فوج کے ساتھ میدان جنگ سے واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے علاوہ پولینڈ اور سیکسنی (Saxony) کے حکمراں آگسٹس سوم (Augustus-III) نے ملکہ میریا تھرسیا کی حمایت کی اور سیلسیاء کے علاقے میں متحدہ افواج فریڈرک پر حملہ آور ہوئی۔ اس خطرناک صورت حال سے فریڈرک اپنی فوج کی بہادری کی وجہ سے ہی بچ سکا۔ اس کے فوراً بعد پرشیا نے سیکسنی پر حملہ کیا اور 1745ء میں سور (Soor) اور ہوہن فریڈ برگ (Hohenfriedberg) کے مقام پر فتح حاصل کی۔ ڈریسڈن (Dresden) کا معاہدہ 25 دسمبر 1745ء میں ہوا۔ اس کے مطابق سیلسیاء میں پرشیا کا اقتدار مستحکم ہو گیا اور وہ مسلسل

شورشیں جو پانچ سال سے چل رہی تھیں ان کا خاتمہ ہو گیا۔

سیلسیاء ایک قیمتی علاقہ تھا جو معاشی طور ہوہن زولرن کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں معاشی اعتبار سے کافی مستحکم تھا۔ تاہم فوجی فتح و نصرت سے پرشیا ایک نیم عظیم طاقت بن گیا اور فریڈرک یورپ میں ایک کامیاب حکمراں بن گیا۔ تاہم وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی حیثیت اتنی بھی مضبوط و مستحکم نہیں ہے۔ ماریا تھریسا سیلسیاء کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے پرعزم تھی۔ اس نے 1748ء میں ایکس لا چیپل (Aix-La-Chapelle) کے مقام پر فرانس اور اسپین سے امن کا معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کی رو سے میریا تھریسا کو اپنے علاقے میں نظم و نسق کو بہتر بنانے اور اپنی فوج کی بہتر تنظیم میں مدد ملی۔ فریڈرک نے جون 1741 میں فرانس کے ساتھ معاہدہ کیا۔ چونکہ اس کی بنیاد دونوں کی ہیبس برگ سلطنت سے باہمی دشمنی تھی، اس لیے یہ معاہدہ زیادہ دیرپا نہیں ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ روس میں پرشیا کے خلاف مخالف لہر زور پکڑ رہی تھی جہاں ملکہ الزبتھ (Elizabeth) جو 1741ء میں تخت نشین ہوئی تھی اور اس کا چانسلر الیکسی بیسٹوشیف ریومن (Alexey Bestuzhev-Ryumin) دونوں فریڈرک کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جارج دوم (George-II) کے زیر اثر برطانیہ ایک طاقتور برآعظمی رفیق کی تلاش میں تھا جو فرانس کے خلاف ہو اور وہ بتدریج میریا تھریسا اور الزبتھ کے قریب ہوتا چلا گیا۔ ستمبر 1755ء میں برطانیہ نے روس سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے برطانیہ کی مالی امداد کے باعث روس نے دریائے بالٹک کے علاقوں کو تحفظ دینے کا وعدہ کیا اور ضرورت پڑنے پر جارج دوم نے فرانس اور پرشیا کے حملوں کے خلاف انہیں تحفظ دینے کا وعدہ کیا۔ فریڈرک، آسٹریا اور روس کی قربتوں اور معاہدہ سے خوف زدہ ہو گیا جسے اب برطانیہ کی مالی امداد بھی حاصل تھی۔ اس سے تباہی کے گہرے بادل پرشیا پر منڈلانے لگے۔ جنوری 1756ء میں خطرناک صورت حال سے بچنے کے لیے اس نے برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت برطانوی اور فرانسیسی نوآبادیاتی کشمکش میں پرشیا بحری جنگ میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرے گا۔ اس سے لوئی پانزدہم کے جذبات کو بہت ٹھیس پہونچی چونکہ فریڈرک بظاہر رفیق تھا۔ نتیجہ کے طور پر فرانس اور آسٹریا میں ایک مدافعتی معاہدہ ہوا جس سے فریڈرک کو سردست کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اس کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ روس اور آسٹریا اس پر حملہ آور ہو سکتے ہیں اور فرانس ان کی تائید کریگا۔ اس صورتحال کے پیش نظر اپنے دشمنوں کو دور رکھنے کے لیے فریڈرک نے ایک جرات مندانہ اور جارحانہ قدم اٹھاتے ہوئے اگست 1756ء میں سیکسنی حملہ کر دیا اور پرشین فوج بوہیمیا کے اندر داخل ہو گئی۔ اگرچہ فریڈرک نے بہت جارحانہ قدم اٹھایا تھا اور ایک بڑی فوجی جدوجہد کی شروعات کی تھی لیکن 1756ء کے اختتام تک اس کی پوزیشن کو خطرہ لاحق ہو گیا اور وہ اسے محسوس کرنے لگا۔ ادھر روس کی ملکہ الزبتھ نے پرشیا کی طاقت کو تباہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

سات سالہ جنگ جس کی شروعات فریڈرک نے کی تھی وہ موت و حیات کی کشمکش تھی۔ 1757ء میں فرانس، سویڈن، روس اور بہت سی جرمن ریاستیں، فریڈرک کے مخالفین کے کیمپ میں چلی گئیں اور اس سبب سے پرشیا کا بوہیمیا پر حملہ ریت کی دیوار کی طرح ثابت ہوا۔ جون میں کولن (Kolín) کے مقام پر فریڈرک کو شکست فاش ہوئی لیکن برطانیہ کو فرانس اور آسٹریا کی فوجوں پر فتح حاصل ہونے سے نومبر اور دسمبر میں جزوی طور پر فریڈرک کی پوزیشن بحال ہو گئی۔ تاہم وہ اب بھی بہت غیر یقینی حالت میں تھا۔ فریڈرک کو اپنی غیر مستحکم

صورتحال کا اندازہ تھا۔ ملک میں حاصل وسائل کا بے رحمانہ استحصال ہوتا رہا۔ سیکسنی کا علاقہ جو دوران جنگ پرشیا کے قبضے میں تھا، اس کے وسائل بھی ضائع ہونے لگے۔ برطانوی رعایت جو (1762–1758) کے درمیان حاصل ہوئی تھی، اس کے باوجود کرنسی کی غیر یقینی کیفیت رہی اور فریڈرک کو اسے برقرار رکھنے میں دشواری پیدا ہونے لگی لیکن اس کے دشمنوں کی مکمل ناکامی سے فریڈرک کو کوئی خطرہ نہیں رہا۔ فریڈرک نے اکتوبر 1757ء میں ایک کابینی حکم نامہ جاری کیا۔ اس کی رو سے پرشیا کے سیول عہدیداروں، منصفوں، سفارت کاروں کی تنخواہیں اور وظیفہ منسوخ کردیے گئے۔ فریڈرک اب بھی فتوحات حاصل کیے جارہا تھا۔ مثال کے طور پر اگست 1758ء میں اس نے روسی افواج کے خلاف کامیابی حاصل کی۔ آسٹریا کے خلاف بھی اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن اسے اکتوبر 1758ء میں ہوچکرچ (Hochkirch) میں زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اگست 1759ء میں کنرسڈورف (Kunersdorf) کے مقام پر روسی فوج کے ہاتھوں ہزیمت سے دوچار ہوا۔ اس شکست فاش کی وجہ سے فریڈرک اندھیروں میں ڈوب گیا اور اس کے ذہن میں خودکشی کے خیالات آنے لگے۔ وہ مزید جدوجہد کرنے کے پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کی افواج میں بھی کمی ہورہی تھی اور اس کی رعایا بھی اس کی جنگوں اور معرکہ آرائیوں سے تھک چکی تھی کیونکہ ان پر جنگ کے اخراجات کا بے پناہ بوجھ بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ 1760ء میں برنڈبرگ کے زمینداروں نے مزید چندہ دینے یا مالی امداد کرنے سے انکار کردیا۔ اس سے پرشیا کی صورتحال بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی اور 1761ء تک بہت مایوس کن ہوگئی تھی۔ تاہم جنوری 1762ء میں ملکہ الزبتھ کی وفات ہوگئی جو فریڈرک اور اس کے حمایتیوں کی سخت مخالف تھی۔ اس کی وفات سے حالات یکسر تبدیل ہوگئے۔ الزبتھ کا جانشین پیٹر سوم پرشیا اور فریڈرک کا بڑا پرستار تھا۔ اس نے مئی کے مہینہ میں جنگ بندی کا اعلان کیا اور روس اور پرشیا کے درمیان امن کا معاہدہ ہوگیا۔ اس معاہدہ سے تھریسا کی سلیسیا کی بازیابی کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ 15 فروری 1763 میں ہیوبرٹس برگ معاہدہ (The Treaty of Hubertusburg) نے جرمنی کی جنگ کا خاتمہ کردیا۔ مقبوضہ جرمن علاقے، فریڈرک کی دسترس میں رہے۔ اب اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی ساتھ ہی فوج کے اخراجات بھی بے حد بڑھ گئے تھے۔ جنگوں میں پرشیا کے ایک لاکھ اسی ہزار سپاہی مارے گئے اور پرشیا کے چند ایک صوبہ اور علاقے مکمل طور پر تباہ و برباد ہوگئے۔

اسی طرح 1748 میں ایک فرمان کے ذریعہ عہدیداروں کو تاکید کی کہ ان کے افراد یا آدمیوں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہ کریں۔ اس طرح کسانوں کی ابتر زندگی یا حالات زار میں بہتری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ فریڈرک کے مکمل عہد یا دور میں ریاست کے تمام شعبوں میں فوجی اخراجات زیادہ تھے۔ جس کی بھرپائی کے لیے رقومات کو مختلف علاقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ تمام علاقے غریب تھے۔ ان جنگوں کے بعد فریڈرک کسی نئے تنازعہ سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ 1764ء میں روس کے ساتھ جو اتحاد کا معاہدہ کیا تھا، وہ 1780ء تک برقرار رہا۔ وہ جرمنی میں ہیبس برگ کی بڑھتی ہوئی طاقت کے راستے میں رکاوٹ بنا رہا۔ ماریا تھریسا کے بیٹے جوزف دوم (Joseph-II) نے بویریا کے علاقوں کو حاصل کرنے کے لیے جولائی 1778ء میں آسٹریائی-پرشیائی جدوجہد شروع کی۔ بویریائی جانشینی کی یہ جنگ قلیل مدتی تھی اور 1779ء کے معاہدہ ٹیشن (The Treaty of Teschen) کے ذریعے اس کا اختتام ہوگیا جس سے جوزف دوم کے عزائم خاک میں مل گئے اور فریڈرک کو سفارتی کامیابی حاصل ہوئی۔ تاہم اس ابھرتے ہوئے نئے تنازعہ

اور 1740-41 میں پیدا ہونے والے واقعات اور ہیبس برگ کے عزائم سے فریڈرک پریشان رہا۔ اس کی آخری کامیابی جولائی 1785 میں *Fürstenbund* یعنی مجلس حکام (League of Princes) کا قیام تھی جس نے متعدد جرمن ریاستوں کو متحد کیا۔ اہم متحد ریاستیں ہنوور (Hanover)، سیکسنی (Saxony)، مینز (Mainz) اور آرچ بسفرک (Archbishopric) تھیں جنہوں نے جوزف دوم کی کامیابی کے ساتھ مخالفت کی اور آسٹریائی نیدرلینڈ (Austrian Netherlands) کے بدلے پورا بویریا حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

6.4.4.2 نظریہ بادشاہت (Theory of Kingship)

فریڈرک اعظم ،ایک قدامت پسند (conservative) حکمراں تھا۔ اس کی انتظامی، معاشی و سماجی پالیسیوں میں قدامت پسندانہ رویہ نظر آتا ہے۔ روشن خیال مطلق العنانیت (Enlightened Despotism) میں اس کی صرف بیان بازی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ مذہبی اعتبار سے پکا پروٹیسٹنٹ تھا اور اسی پس منظر میں اقدامات کرتا رہا۔ فریڈرک اپنے والد کے ساتھ خود کے کشیدہ تعلقات کے باوجود ان کی تعریف کرتے ہوئے انہیں فرض شناس حکمراں کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ سات سالہ جنگ کے دوران لکھی گئی کتاب *Only His Care* میں اس نے جستجو وکوشش، دیانت داری، منصفانہ پالیسی، قابل ستائش کارنامے، کفایت شعاری، فوج میں نظم وضبط اور اس کی کامیابیوں کا ذکر کیا ہے۔ فریڈرک ولیم اول کی طرح فریڈرک بھی بادشاہ کے فرائض کو تسلیم کرتا ہے کہ ایمانداری و دیانتداری سے فرائض کو ادا کرنا چاہیے۔ عوام کا تحفظ اور انہیں خوشحال بنانا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بہتر نظم وضبط کے لیے سادہ قوانین کو رائج اور نافذ کرنا چاہیے۔ بہتر نظم ونسق اور عوامی فلاح و بہبود کے لیے حکمرانوں کو قربانیاں دینی چاہیے اور عوامی مفادات کے لیے ذاتی مفادات کو قربان کرنا چاہیے۔ "Raison d'état" ریاست کی فلاح و بہبود اور رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے حکمراں موزوں اقدامات کریں۔ حکومت پر کنٹرول برقرار رکھیں۔ حکومت کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں مضبوط رکھیں۔ ریاست میں حکمرانی ذاتی نوعیت (personnel) کی ہونی چاہیے۔ وزراء پر کنٹرول کریں لیکن مکمل طور پر ان پر بھروسہ نہ کریں۔ کیونکہ ان میں ذاتی مفادات حاوی ہوتے ہیں۔ وزراء کو چاہیے کہ وہ اپنے مالک سے حقائق کو بتلائیں۔ ذاتی حکمرانی میں ہی کامیاب پالیسی اور مستقل مزاجی پیدا ہوتی ہے۔ 1740ء میں کتاب *Anti-Machiavel* شائع کی۔ جس میں روایتی طرز حکومت، حکومت کے فطری قانون، بہتر حکمرانی کے طریقے اور اصول وضوابط وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب اس کی وفات سے قبل شائع ہوئی، جس میں فریڈرک لکھتا ہے کہ شہزادوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔ پہلے قسم میں ایسے شہزادے جو شخصی طور پر حکومت کرتے ہوں اور دوسری قسم میں ایسے شہزادے جو ماتحتوں پر انحصار کرتے ہیں۔ اول الذکر قسم کے شہزادوں کے طرز حکومت میں ریاست روح کی طرح ہوتی ہے اور حکومت کا بوجھ خود اٹھاتے ہیں۔ جس طرح اٹلس پر دنیا کا نقشہ ہوتا ہے یعنی اٹلس دنیا کا بوجھ اٹھاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے قسم کے شہزادے پریت (Phantom) نوعیت کے ہوتے ہیں جو جواز کے ساتھ تجاویز کو مسترد کرتے ہیں اور یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ قانون کے حدود میں ہی اختیارات کو استعمال کیا گیا ہے۔ من مانی حکمرانی کے بجائے قوانین واصولوں کی پیروی کرتے ہوئے ذمہ داریوں کو نبھایا گیا ہے۔

6.5 مطلق العنانیت کے مسائل (The Problems of Absolutism)

بادشاہت میں، بادشاہ مطلق حاکم ہوتا ہے۔ بادشاہ کے مضبوط ہونے پر شخصی حکومت کو خطرہ ہوتا ہے۔ فریڈرک کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں ظاہر ہو رہی تھیں۔ وہ ذہنی اعتبار سے پرشین انتظامیہ یا فوجی بندوبست یا اس میں تبدیلی یا نئے خیالات وغیرہ کو قبول کرنے کے خلاف تھا۔ اس لیے اس نے اپنے ماتحتین کو ایمانداری وخوش اسلوبی سے خدمات انجام دینے کی ترغیب دی۔ لیکن ان اقدامات کے علاوہ مزید کچھ کرنے سے قاصر رہا۔ فریڈرک کے دور میں پروشین کا انتظامیہ اہل کار براعظم یورپ میں سب سے ایماندار اور محنتی تھے۔ لیکن کامیابی فریڈرک کی کسی بھی اختراعی کوششوں سے حاصل نہیں ہوئی، بلکہ برسوں سے زیر استعمال بادشاہی نظام کے سبب فریڈرک کو کامیابی حاصل ہوئی۔ 1722ء میں فریڈرک ولیم اول (Frederick William-I) کی علاقائی جنگیں اور اس کے قائم کردہ Domains Chambers کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی تعداد میں 9 سے بڑھ کر 12 ہو گئی تھی۔ فریڈرک ولیم نے جنرل ڈائرکٹری (General Directory) کی دوبارہ تشکیل دی، جو کافی اختیارات کے ساتھ مرکزی حکومت کا حصہ بنی۔ فریڈرک نے مملکت میں کئی محکمے قائم کیے۔ 1740 میں کامرس اور مینوفیکچرنگ شعبہ، 1768 میں کان کنی اور دھات کاری (Mines and Metallurgy) کا شعبہ اور چند سال بعد محکمہ جنگلات قائم کیا۔ لیکن چند سال بعد گزرتے وقت کے ساتھ ہی اس نے سابقہ اپنی اہمیت کو کھو دیا۔ 1740ء میں سلیسیا کو حاصل کرنے کے بعد اس کا انتظامیہ کافی عمدہ اور بہتر ہو گیا۔ اس کے وسائل کے سبب فریڈرک کو سات سالہ جنگ کے مصارف کی بھرپائی اور تاریک دور سے باہر نکلنے میں مدد ملی۔ لیکن جدید ایجادات واختراعات کو اختیار کرنے کے بجائے روایتی طور طریقے اور نظم ونسق، پرشین انتظامیہ کی اہم خصوصیت تھی۔ مملکت میں کئی جدید شعبوں میں خدمات کے لیے ملازمت حاصل کرنے کے لیے ریاستی امتحانات کا طریقہ رائج کیا گیا لیکن یہ بہت متاثر نہیں رہا۔ البتہ کچھ بہتری لانے میں کارآمد ثابت ہوا۔ عدالت عظمیٰ کے نظام میں رائج جدید اختراعی اقدامات سے حقیقی طور پر کامیابی حاصل ہوئی۔ سیموئیل فان کوسیجی (Samuel von Cocceji) کی جانب سے اصلاحی اقدامات کے سبب تمام ججوں کے لیے لازمی تھا کہ متعلقہ امتحان میں کامیابی حاصل کریں۔ 1750ء میں تعلیمی اداروں اور کلیسا پر باقاعدہ نگرانی کے لیے کوسیجی نے قانونی ضابطہ بندی کا آغاز کیا۔ فریڈرک کے انتقال کے بعد 1794ء میں پرشیائی عام قانون *Das Allgemeine Preussische Landrecht* کی شکل میں ظاہر ہوا، جو اٹھارہویں صدی کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ اس کے باوجود فریڈرک اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ فریڈرک کی بڑھتی عمر کے ساتھ سخت اور غیر لچکدار رویہ اختیار کرتا رہا۔ حکومت حالات اور تقاضوں کے اعتبار سے مطابقت پیدا کرنے میں قاصر رہی۔ بادشاہی حکومت کے دور میں حکومت کا سخت رویہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس طرح نپولین کی فوجی پیش قدمی سے قبل 1806ء کو فریڈرک حکومت کا خاتمہ ہوا۔

6.6 فریڈرک دوم کی فوج اور ریاست (Army and the State of Frederick, the Great)

فریڈرک دوم ایک عظیم حکمران گزرا ہے۔ ریاست کو ہر میدان میں مستحکم اور طاقتور بنانا اس کا اہم مقصد تھا۔ اسی مقصد کے تحت

ریاست بھر میں تعلیم و ثقافت کی تیز رفتار ترقی تھی۔ کیونکہ تعلیم و ثقافت کے سبب زندگی میں سنجیدگی پیدا ہوتی ہے۔ انسان کو انسانیت کا سبق ملتا ہے۔ کسی بھی ملک میں فوجی اور معاشی استحکام پیدا کرنے کے مقابلے انسانیت کے مقاصد (humanitarian goal) کو ثانوی اہمیت دی جاتی ہے۔ فوجی اور معاشی استحکام کے لیے مالی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملک کے تحفظ اور اس کے استحکام کے لیے فوج لازمی حصہ ہوتی ہے۔ اسی کے ارد گرد ملک کے معاشی افعال انجام پاتے ہیں۔ ملک کے تمام انتظامی امور، ملازمین کی بھرتی، غذا کی فراہمی، آلات و ہتھیار کی فراہمی، اخراجات کی ادائیگی وغیرہ اہم افعال ہیں۔ فریڈرک دوم کی جانشینی کے وقت مالی وسائل اور اخراجات کے درمیان عدم توازن تھا۔ 1740ء میں فریڈرک کو 83,000 مرد فوج وراثت میں ملی تھی اور فریڈرک کے انتقال کے وقت ان کی تعداد بڑھ کر 1,90,000 ہو گئی تھی۔ اس میں 80,000 فوجی پرشیا سے تعلق رکھتے تھے۔ فوج میں کسانوں اور غیر ملکیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ پرشیا میں ملک کے طول و عرض کے دیہاتوں سے فوجیوں کی بھرتی کی گئی تھی۔ شہروں سے حاصل مالگزاری و ٹیکس کے ذریعہ ان کے اخراجات کو پورا کیا جاتا تھا۔ فریڈرک نے زمینداروں کے مطالبہ کے مقابلے میں کسانوں اور فوجیوں کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی 1749 اور 1764 میں فریڈرک دوم نے حکم جاری کرتے ہوئے کسانوں کو ان کی ذمہ داری سے واقف کراتے ہوئے تاکید کی کہ انہیں بادشاہ یا سلطنت کے لیے خود کو وقف کر دیں۔ اسی طرح 1748 میں ایک فرمان کے ذریعہ عہدیداروں کو تاکید کی کہ ان کے افراد یا آدمیوں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہ کریں۔ کسانوں کی ابتر زندگی یا اُن کی حالات زار میں بہتری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ فریڈرک کے مکمل عہد یا دور میں ریاست کے تمام شعبوں کے مقابلے میں فوجی شعبہ کے اخراجات زیادہ تھے۔ جس کو پورا کرنے کے لیے رقومات کو مختلف علاقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن یہ تمام علاقے غریب تھے۔ بادشاہ نے بھاری مقدار میں رقم محفوظ رکھنے کے بجائے جنگ کے دوران سپاہیوں کی بھرتی کو اہمیت دی۔ بادشاہ اپنی مالی مشکلات اور اس کے دوررس اثرات سے واقف تھا۔ مالی مطالبات سے معیشت میں سنگین خطرات لاحق ہونے کا قوی امکان تھا۔ 1756-62 کے دوران بادشاہ کی جدوجہد سے بادشاہ کے خیالات یا تصورات کی تصدیق ہوتی ہے۔

ملک کے معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے مالگزاری یا محصول کا تخمینہ ایک اہم ذریعہ ہے۔ جو مملکت کا اہم مالی ذریعہ ہے۔ فریڈرک دوم نے ملک کے استحکام کے لیے محصول کے ذرائع کو اختیار کیا۔ ملک میں محصول کا زیادہ تر حصہ خورد و نوشت کے اشیاء پر عائد ٹیکس (food tax) اور ملک بھر سے جائیداد پر عائد ٹیکس آمدنی کے اہم ذرائع تھے۔ شاہی علاقوں کے منافع سے قلیل مقدار میں محصول حاصل ہوئے۔ فریڈرک نے ملک میں محصول تخمینہ کے لیے طور طریقوں پر تجربہ و غور و فکر کرتا رہا۔ 1766ء میں فرانسیسی کاروباری، لی ہائے ڈی لانی (Le Haye de Launay) کی نگرانی میں تمباکو، اور دیگر غیر اہم اشیاء پر ٹیکس کا ایک نیا نظام متعارف کروایا لیکن ٹیکس کے اس نئے نظام سے ملک کی معاشی حالت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اس نے فریڈرک کے مالی پالیسیوں کے اعتبار سے کافی غلط فیصلے کیے۔ مثلاً فریڈرک نے زر کو کافی مقدار میں محفوظ رکھا جس سے بازار میں غریب عوام کے پاس سرمایہ کی قلت کے سبب زر کے بہاؤ یا گردش میں کمی واقع ہوئی۔ زر کے محفوظ ذخائر کے سبب معیشت کے مختلف شعبوں پر منفی اثرات لاحق ہوئے جس سے ملک کی آمدنی میں گراوٹ پیدا ہوئی اور معیشت کے مختلف شعبے بری طرح متاثر ہوئے۔ اس کے ساتھ اخراجات پر سخت کنٹرول اور ناقص محصول پالیسی نے

سماج کو متحرک نہیں کیا۔

فریڈرک نے ملک کی معیشت کے استحکام پر توجہ دی۔ 1752 میں عہد نامہ سیاست (Testament Politique) میں تجارت اور صنعتی پیداوار کی بنیاد *The Foundation of Trade and Manufactures* نامی کتاب لکھی جس میں ملک کی معاشی استحکام میں زر کے بہاؤ کی اہمیت کو بتلاتے ہوئے لکھتا ہے کہ 'اندرون ملک سرمایہ کے بہاؤ کو جاری رکھیں۔ ملک کا پیسہ باہر جانے سے روکا جائے۔' یعنی ملک کی معیشت میں ملک میں زر کا بہاؤ اہمیت رکھتا ہے۔ ملک کے مالی وسائل کو ملک میں رکھا جائے بلکہ ہو سکے تو بیرون ملک کا پیسہ بھی اندرون ملک استعمال پر توجہ دی جائے۔ یہ ایک سادہ اور راست معاشی خیالات ہیں جن کو لاگو کرنے سے معیشت میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ فریڈرک کے 1747ء کے حکم کے مطابق 300 سے زائد Thalers کو ملک سے باہر برآمد کرنے سے روک دیا گیا۔ پرشیا (Prussia) بیرونی ملک کے سامان کی درآمد کرنے سے گریز کرتا رہا۔ ملکی یا دیسی صنعتوں کی ہمت افزائی کے لیے انہیں کافی رعایتیں اور مراعات فراہم کی گئیں۔ بعض اوقات ضروری رقم بھی فراہم کی گئی۔ بیرونی سرمایہ حاصل کرنے کے لیے برآمدات (export) کی ہمت افزائی کی گئی۔ اندرون ملک صنعتوں کے قیام پر توجہ دی گئی۔ خاص کر ریشم کی صنعت (silk industry) کی ترقی پر کافی سرمایہ صرف کیا گیا۔ لیکن اس کے حاصل نتائج حوصلہ افزاء نہیں رہے۔ فریڈرک کے دور حکومت کے اختتام تک ملک میں پرشیا (Prussia) کی تمام صنعتوں کا دو تہائی حصہ پیداوار صرف کپڑا صنعت کا تھا اور (کپڑا) کپڑے کی صنعت میں 90% صنعتی مزدوروں کو روزگار فراہم ہوا۔ اس پس منظر میں فریڈرک کی معاشی پالیسی معیشت میں بہت اصلاح نہیں کر سکی۔ چینی مٹی کے برتن (Porcelain) کی صنعت کی ہمت افزائی کی گئی جو ریشم کی صنعت اٹھارہویں صدی کے حکمرانوں کی ایک علامت تھی۔ وہ صنعت کافی خرچیلی تھی لیکن متاثر کن نہیں تھی۔

1750ء میں David Splitgerber اور Johann Ernst Gotzkowsky جیسے نامور صنعتکاروں نے صنعتی پالیسی سے فائدہ حاصل کیا۔ لیکن مجموعی طور پر پرشیا نے وسائل کا غلط استعمال کیا۔ بیرونی ممالک سے تجارت کو فروغ دینے کے لیے سمندری تجارت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے 1772 میں حکومت نے بحری تجارتی کمپنی (Maritime Trading Company) قائم کی اور 1765ء میں برلن کا شاہی بینک (Royal Bank of Berlin) قائم کیا گیا۔ فریڈرک کی سلطنت کے استحکام میں یہ تمام کوشش حاشیائی سطح یعنی محدود علاقوں پر قائم تھی۔ یہ تمام سیلسیا کے برلن اور مغربی جرمنی کے قرب و جوار کے علاقوں میں زراعت پر مبنی صنعتی ترقی تھی۔ مملکت کے چند معاشی اقدامات سے حقیقی طور پر اونچی لاگت کے باوجود معیشت مستفید ہوئی۔ 1760–1770 کی دہائی میں معیشت کی پائیدار ترقی کے لیے کافی اہم اقدامات کیے گئے۔ جس کے تحت بیرون ممالک کے شہریوں کو رعایت و مراعات دیتے ہوئے اندرون ملک غیر آباد علاقوں میں ان کی باز آبادکاری کی گئی۔ شہریوں کے بندوبست کا یہ طریقہ Re-establishment کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ سات سالہ جنگ کے دوران ہونے والے نقصانات کی بھرپائی یا نقصانات کی بازیابی کی بھرپور کوشش کی گئی۔

فریڈرک کے دور حکومت میں براعظم یورپ کے مختلف علاقوں کے 3,00,000 سے زائد شہریوں کو مراعات و رعایت دیتے ہوئے انہیں پرشیا (Prussia) کے مختلف علاقوں میں آباد کیا گیا۔ 1740ء میں ملک کی آبادی 22,00,000 نفوس پر مشتمل تھی۔ فوجی اور شہریوں کی روزمرہ ضروریات زندگی کے سامان، اونی کپڑے، یونیفارم، اسلحہ وغیرہ کی ضروریات کی تکمیل کے لیے مزید معاشی اقدامات کیے گئے۔ جس کے سبب معیشت مستحکم ہونے لگی۔ امن وامان کے دور میں فوجی یا سپاہی رجمنٹ کے ساتھ صرف چند مہینے رہتے اور باقی ایام میں زراعت اور دیگر سرکاری کام یا شہری ترقی کے کام انجام دیتے۔ اس طرح کے اقدامات سے حکومت کے سرکاری مصارف میں کمی کے ساتھ سرکاری وسائل کا صحیح استعمال ہونے لگا۔ فوج کے سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے ان کی سماجی شمولیت ہونے لگی۔

فریڈرک نے معاشی میدان کے ساتھ ساتھ سماجی استحکام پر توجہ دی۔ فیرڈرک کی معاشی پالیسی کی طرح سماجی پالیسی بھی قدامت پرستی پر مبنی تھی۔ قدامت پسند ایک ایسی پالیسی ہے جس میں روایات، قدیم سماجی طور طریقوں، اقدار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کے سبب سماج میں آپسی تعاون و تعلقات کے بڑھنے سے تہذیب و تمدن کا تحفظ ہوتا ہے۔ مختلف حکومتوں کے ادوار میں امراء یا اشرافیہ کو اعلیٰ مناصب اور مراعات حاصل تھیں۔ اسی طرح فریڈرک نے قدامت پالیسی کے تحت اشرافیہ کو پرشین سماج کا اہم طبقہ سمجھا اور انہیں اہمیت دی۔ فوج کے تمام اہم عہدوں پر امراء یا شرفا فائز تھے۔ جس سے مقامی دیہی علاقوں اور مختلف شعبوں پر ان امراء کا غلبہ رہا۔ فریڈرک کی نظر میں امراء یا شرفا ہی عزت و احترام اور احساس ذمہ داری رکھنے والا اکیلا طبقہ تھا۔ ریاست کی بقاء و استحکام ان ہی امراء کی مرہون منت تھی۔ امراء کے تعاون کے بغیر حکومت کا چلنا محال تھا۔ امراء کے مفادات بقاء و سلامتی اور ان کے تحفظ پر کافی توجہ دی گئی۔ بالخصوص امراء کے عہدے و مراعات عطا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ امراء کی جاگیر و جائیداد کے تحفظ کے اقدامات کیے گئے۔ متوسط درجہ کے دولت مند طبقہ کو بھی امراء کی جاگیر خریدنے سے منع کیا گیا۔ اس طرح ہر اعتبار سے امراء کی جائیداد اور ان کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔ فریڈرک نے 1752 اور 1768 میں عہد نامہ سیاست میں امراء کی اہمیت و تحفظ پر متعدد بار ذکر کیا ہے۔ اس پس منظر میں کسانوں یا کاشتکاروں کے موقف میں معمولی سی بہتری پیدا ہوئی۔ جس میں سے پامرینیا، برنڈن برگ اور مشرقی پرشیا کے مزدور طبقہ ہنر مند مزدور کی طرح امراء کی جاگیروں پر خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ فریڈرک اس طرح کی غلامی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن عملی طور پر اس میدان میں تیز رفتار تبدیلیوں سے خطرہ محسوس کرنے لگا۔ اسے یہ احساس ہوا کہ کسی قسم کی فوری تبدیلی سے پرشیائی زرعی میدان میں عدم استحکام کے ساتھ ساتھ امراء کی بغاوت کے امکانات ہیں۔ اس لیے مملکت کی ترقی و استحکام اور سلطنت کی بقاء کے لیے یا بقاء کے تحت بتدریج آہستہ آہستہ اقدامات کیے گئے۔ جس کے سبب سات سالہ جنگ کے نقصانات کی بازیابی ہونے لگی۔ فریڈرک نے پرشیا میں غلامی کو برخواست کرنے کی کوشش کی۔ سیلسیا (Silesia) علاقے کے اوپری حصے میں کسانوں کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس میدان میں کسی بھی قسم کی عملی تبدیلیاں واقع نہیں ہوئی۔ کیونکہ سماجی تبدیلیوں پر توجہ نہیں دی گئی۔

پرشیا کا شہنشاہ فریڈرک دوم خود کو اعلیٰ تہذیب کی نمائندگی کرنے والا ایک عظیم حکمران ہونے پر فخر کرتا تھا۔ یہ عصری تاریخ اور سیاست پر قابل قدر مصنف تھا۔ اس نے 1746ء میں فرانسیسی زبان میں *Historic Demon Temps* نامی کتاب لکھی۔ اس

نے شاعری اور موسیقی کو بڑے عمدہ انداز میں ترتیب دیا جس سے اس دور کے اہم حقائق اور اقدار کی عکاسی ہوگئی ہے۔ فریڈرک دوم نے اپنے عہد میں معروف و قابل فرانسیسی دانشوروں کو مدعو کیا۔ لیکن ان سے بہت جلد اختلافات پیدا ہوئے۔ یہاں پر فریڈرک کی قدامت پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ فریڈرک دوم فرنچ تہذیب کو ہی ترقی یافتہ تہذیب تصور کرتا تھا۔ وہ فرنچ تہذیب کی اہمیت پر اظہار خیال کیا کرتا تھا۔ جرمن تہذیب پر بہت کم بات کرتا۔ اس نے جرمنی تہذیب میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ فریڈرک دوم کے دور میں برلن کبھی بھی دانشوروں کے طور پر نہیں ابھرا۔ گوٹولڈ افرایئم لیسنگ (Gotthold Ephraim Lessing) اٹھارہویں صدی کا عظیم جرمن ادیب تھا۔ اس نے پرشیا کو براعظم یورپ کا حد درجہ غلامی والا ملک قرار دیا۔ اسی طرح فریڈرک دوم کے درباری موسیقار Carl Philipp Emanuel Bach نے بھی اسی طرح کا نظریہ ظاہر کیا۔ فریڈرک دوم کی مذہبی پالیسی واضح اور حقیقت پر مبنی تھی۔ یہی وہ ممتاز چیز تھی جس کے سبب معاصرین نے فریڈرک دوم کو حقیقی روشن خیال حکمران کے طور پر قبول کیا۔ عدالتی تشدد کا خاتمہ فریڈرک دوم کے دور کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ روشن خیالی کے ساتھ اس نے اصلاحات پر بھی خاص توجہ دی۔ 1763ء میں بنیادی تعلیم کی طرف توجہ دیتے تعلیم کے عمومی اصولوں کو روشناس کروایا اور ملک بھر میں یکساں تعلیمی نظام کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ تعلیم کو بہتر بنانے کی پرجوش کوشش کی جو اس سے قبل براعظم یورپ میں نظر نہیں آتا۔ بعض وسائل کی کمی کے سبب اس میدان میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور علمی کارناموں کو محدود کر دیا۔

6.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مطلق العنان طرز حکومت ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں بادشاہ کو کامل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ براعظم یورپ میں سترہویں اور اٹھارہویں صدی کا دور مطلق العنانیت کا دور تھا۔ جہاں پر کافی طاقتور حکمران بادشاہ گزرے ہیں جو اپنی سلطنت پر مکمل کنٹرول رکھتے تھے۔ اسی لیے یہ دور مطلق العنانیت کا دور کہلاتا ہے۔ یہ مطلق العنان بادشاہ مکمل طاقت اور اختیارات کے ساتھ اپنے ملک پر حکومت کرتے تھے۔ امراء، شرفا و ماتحتین بادشاہ کے حکم پر عمل پیرا ہوتے۔ انہیں بادشاہ کے کسی بھی معاملے میں سوال کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ بادشاہ کے کارناموں پر انگشت نمائی ہرگز نہیں کی جاسکتی تھی۔ عوام بادشاہ کے کارناموں کی جانچ یا چک ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ ملک میں حکمرانی کا کوئی دوسرا ادارہ بھی نہیں تھا جو حکمرانی کے اختیارات رکھیں۔ مطلق العنان حکمران خود کو خدا کی طرف سے بھیجا ہوا نمائندہ سمجھتے تھے۔ بادشاہ کی مخالفت خدا کی مخالفت تصور کیا جاتا تھا۔ 1610 تا 1789ء کے عہد کو تاریخ میں مطلق العنانیت کا عہد مانا جاتا ہے۔ اس دور میں پادری، کلیسا و کلیسا، اشرافیہ، امراء، اسمبلی کے ممبران اور سماجی تنظیموں کے لوگ سب کے سب بادشاہ کے تابع ہوتے تھے۔ یہ بادشاہ کے حکم یا مرضی کے خلاف کوئی عمل نہیں کر سکتے تھے۔ صرف بادشاہ کے حکم پر عمل کرتے تھے۔

6.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

Entrepreneur : کاروباری-ایسا شخص جو اپنا کاروبار شروع کرتا ہے۔ اس سے مراد افراد کی صلاحیت اور مہارت ہے کہ وہ خطرہ مول لیں اور منافع کمانے کے لیے اپنا کاروبار شروع کریں۔

Thalers : جرمنی کا قدیم چاندی کا سکہ

6.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. Mercantilism سے کیا مراد ہے؟
2. مطلق العنایت (Absolutism) سے کیا مراد ہے؟
3. روشن خیال استبداد (Enlightened Despotism) سے کیا مراد ہے؟
4. ماریاٹریسیا (Maria Theresa) کون تھی؟
5. پرشیا کو سامراجیت کس نے بنایا؟
6. سلیسیا (Silesia) کا محل وقوع کیا ہے؟
7. آسٹرین جانشینی کی جنگ میں آسٹریا کے خلاف کس نے جنگ کی؟
8. سات سالہ جنگ کے دوران روس (Russia) کی رانی (Queen) کون تھی؟
9. ماریاٹریسیا (Maria Theresa) کی لڑکی کون تھی؟
10. کس سال میں سات سالہ جنگ شروع ہوئی؟

6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مطلق العنانیت (Absolutism) پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
2. فریڈرک آعظم کی خارجہ پالیسی پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. ماریاٹریسا (Maria Theresa) پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. روشن خیال استبداد (Enlightened Despotism) پر مختصر نوٹ لکھیے۔
5. مطلق العنانیت کی خصوصیات بیان کیجیے۔

6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. روشن خیال استبداد (Enlightened Despotism) کے عروج کے عوامل کیا تھے؟ بحث کیجیے۔
2. سات سالہ آسٹرین جنگ اور اس کے جانشین پر بحث کیجیے۔
3. فریڈرک اعظم کی اصلاحات بیان کیجیے۔

6.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Droz, Jacques, *Europe between Revolutions, 1815–1848*, Fontana Press, London, 1967.
2. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
3. Gottlieb, Anthony, *The Dream of Enlightenment*: *The Rise of Modern Philosophy*, Penguin, UK, 2017.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
6. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.

اکائی 7۔ صنعتی انقلاب

(Industrial Revolution)

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید
7.1 مقاصد
7.2 صنعتی انقلاب کا مفہوم
7.2.1 صنعتی انقلاب کا پس منظر
7.2.2 برطانیہ میں اس کے آغاز کے اسباب
7.3 صنعتی انقلاب کی ترتیب یا مدارج
7.4 صنعتی انقلاب کے اہم علاقے
7.4.1 کپڑے کی صنعت
7.4.2 کان کنی اور دھات کاری
7.4.3 حمل و نقل اور ترسیل
7.5 صنعتی انقلاب کا پھیلاؤ
7.5.1 بلجیم
7.5.2 فرانس
7.5.3 جرمنی
7.6 صنعتی انقلاب کے اثرات
7.6.1 سماجی اثرات
7.6.2 سیاسی اثرات
7.7 اکتسابی نتائج
7.8 کلیدی الفاظ
7.9 نمونہ امتحانی سوالات
7.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید (Introduction)

صنعتی میدان میں ایجادات واختراعات کے سبب عالمی سطح کی مملکتیں بھی صنعتی ایجادات سے مستفید ہونے کے لیے اقدامات کرنے لگے۔ زرعی و کمزور ممالک کو ترقی حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ برطانیہ سے صنعتی ترقی کے آغاز نے بہت جلد عالمی سطح کو متاثر کیا۔ صنعتی انقلاب کے بدولت زرعی ممالک صنعتی ممالک میں تبدیل ہونے لگے۔ مشینوں کے ذریعہ پیداواری مراحل کی تکمیل کی جانے لگی۔ جدید ٹکنالوجی کے سبب پیداواری مراحل کی تبدیلی کے ساتھ ثانوی شعبہ میں بھی تبدیلیاں واقع ہونے لگے۔ جس کے سبب عالمی معیشت میں مثبت و منفی اعتبار سے انقلابی تبدیلیاں ہونے لگے۔ اصطلاح صنعتی انقلاب کو سب سے پہلے فرانسیسی ماہر معاشیات آگسٹ بلانکی (Auguste Blanqui) نے 1837ء میں استعمال کیا جو صنعتوں میں صنعتیانے کے عمل یا ٹکنالوجی کے استعمال اور اس کے اثرات کی وضاحت کرتا ہے۔ مشہور مورخ ارنالڈ ٹوٹن بی (Arnold Toynbee) نے 1882ء میں اصطلاح صنعتی انقلاب کو استعمال کرنے کے سبب یہ اصطلاح کافی مقبول ہوئی۔ جبکہ بعض مورخین اصطلاح انقلاب (Revolution) کی مخالفت کی، کیونکہ انقلاب کے لیے چند مہینے قلیل ہوتے ہیں۔ جبکہ انقلاب کے لیے صوبوں تک جاتے ہیں۔ انقلاب کے لیے اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی دو دہے ایک طویل عرصہ ہوئے۔ صنعتی میدان میں ایجادات واختراعات فوری طور پر وقوع پذیر نہیں ہوتا، بلکہ بتدریج مختلف مراحل میں اور متواتر کوششوں آہستہ آہستہ ایجادات وجود میں آئے۔ یہ عمل انقلاب کے مقابلے میں ارتقائی نظر آتا ہے۔ صنعتی ایجادات کے سبب صنعتوں میں مشینوں کا استعمال کیا جانے لگا۔ دست کاری کے کام مشینوں کے ذریعہ انجام پانے لگے۔ لوہے و فولاد کو خالص اور معیاری بناتے ہوئے استعمال کیے جانے لگے۔ مختلف چیزوں کی پیداوار میں اس کا استعمال کیا جانے لگا۔ صنعتوں میں ایندھن کے لیے کوئلہ، بھاپ کا انجن (Steam Engine) برقی، پٹرولیم وغیرہ کا استعمال کرنے لگے۔ پیداواری مراحل کو آسان بنانے میں جدید مشینوں Spinning Jenny، پاورلوم، فیکٹری سسٹم کا استعمال کیا جانے لگا۔ صنعتی نظام کو بہتر بنانے کے لیے شرائط کار، اوقات کار، تقسیم کار (Division of Labour) جیسے ٹکنیک کا استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ حمل و نقل و مواصلات میں بہتری پیدا ہونے لگی۔ مذکورہ تمام صنعتی انقلاب کے خصوصیات ہیں جو پیداواری وسائل کو انسب سطح (Optimum) پر استعمال کرتے میں کارآمد ہوئے ہیں۔ اس کے سبب پیداوار میں بھاری اضافہ ہونے لگا۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- صنعتی انقلاب کا مفہوم اور اس کے پس منظر کی وضاحت کر سکیں گے۔
- برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے عروج کے اسباب کی وضاحت کر سکیں گے۔
- صنعتی انقلاب کے اہم ممالک یا علاقوں کو بیان کر سکیں گے۔

- براعظم یورپ کے دیگر ممالک میں صنعتی انقلاب کے پھیلاؤ کی وضاحت کر سکیں گے۔
- صنعتی انقلاب کے سماجی وسیاسی اثرات کی وضاحت کر سکیں گے۔

7.2 صنعتی انقلاب کا مفہوم (Meaning of the Industrial Revolution)

7.2.1 صنعتی انقلاب کا پس منظر (Background to the Making of Industrial Revolution)

1750ء کے دہائی کے دور میں یورپی معاشرہ حقیقی یا قدرتی طور پر زرعی نوعیت کی تھی۔ اس علاقے میں جو صنعتیں قائم تھے وہ زیادہ محنت و مزدور مرکز مشینوں پر مبنی تھے۔ ہندوستان کی طرح یورپ بھی زرعی میدان میں خود کفیل تھا۔ ہر مزدور اپنے آپ کو ایک اکائی کے طور پر کام کرتا تھا۔ کام کی تکمیل مزدوروں کی کارکردگی پر منحصر تھی۔ اعلیٰ درجہ کی صنعتی ترقی نہ ہونے کے سبب مزدور ہی کام کی تکمیل کا مرکز تھا۔ لیکن صنعتی میدان میں جدید ایجادات نے صنعتی انقلاب پیدا کیا۔ صنعتی انقلاب کے سبب صنعتوں، پیداواری و تقسیمی شعبوں میں تیز رفتار تبدیلیوں کے ساتھ فرد کے سماجی و معاشی طرز زندگیوں میں تبدیلیاں واقع ہونے لگے۔ عام طور پر خونریز جھڑپوں، اچانک تشدد کے ذریعہ انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس صنعتی انقلاب ان تمام خامیوں سے پاک ہو کر خاموشی سے سماجی و معاشرتی انقلاب پیدا کیا۔ صنعتی انقلاب کے سبب سماجی زرعی میدان سے صنعتی میدان، زرعی سماج سے صنعتی سماج میں تبدیل ہوا۔ ایجادات کے ساتھ ساتھ سماجی تبدیلیاں جاری رہتے ہیں۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جاری وساری رہتا ہے۔

7.2.2 برطانیہ میں اس کے آغاز کے اسباب

(Reasons for and the Beginning of Industrial Revolution in Britain)

صنعتی انقلاب برطانیہ میں پہلے کیوں آیا: عالمی سطح پر صنعتی انقلاب پر نظر ڈالنے سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے اٹھارہویں صدی میں برطانیہ میں صنعتی انقلاب وجود میں آیا جو بتدریج تیزی سے عالمی سطح پر پھیل گیا۔ وہ کونسے اسباب یا وجوہات ہیں جس کے سبب عظیم برطانیہ میں سب سے پہلے صنعتی انقلاب آیا۔ مورخین نے عظیم برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے تین اہم اسباب یا وجوہات کی نشاندہی کی ہے۔ جن کی ذیل میں وضاحت کی گئی ہے۔

سرمایہ داری کا ابھرنا: سرمایہ داری نظام معیشت میں خانگی یا نجی افراد یا دولت مند طبقہ کے کنٹرول میں تجارت و صنعتیں پائے جاتے ہیں۔ دولت مند طبقہ منافع کمانے کے مقصد کے تحت صنعتیں قائم کرتے ہیں۔ دولت مند طبقہ منافع کمانے کے مقصد کے تحت صنعتی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ اور پیداوار اور قیمتوں کے تعین میں آزاد ہوتا ہے۔ اس مقصد کے تحت قیمتوں کا تعین کرتا ہے جس سے اونچا منافع حاصل ہو۔

یورپی سامراجیت: براعظم یورپ ایک طاقتور و مستحکم علاقہ تھا۔ برطانیہ براعظم یورپ کا ایک طاقتور اور معاشی اعتبار سے کافی مستحکم ملک تھا۔ جس نے صنعتی ترقی کو اپناتے ہوئے اپنی معیشت کو مزید استحکام بخشا۔ جس کے سبب براعظم یورپ اور دنیا کے دیگر ممالک کو پیچھے چھوڑ دیا۔

زرعی انقلاب: صنعتی انقلاب کے سبب انیسویں صدی کے دور میں برطانیہ میں خورد ونوشت (کھانے کے اشیاء) اور ضروریات زندگی کے

سازوسامان کی بڑے پیمانے پر پیداوار میں اضافہ ہوا۔ ضروریات زندگی کی پیدداوار میں اضافہ سے بازار وجود میں آئے۔ پیداوار جو برطانیہ کو معاشی استحکام بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

سرمایہ داری: سرمایہ داری (Capitalism) کا سب سے پہلے اثر برطانیہ پر عائد ہوا، جس کے سبب برطانیہ میں سرمایہ داری کو فروغ حاصل ہوا۔ سترہویں صدی کے دور کو مورخین *Laissez-Faire* یا آزاد معیشت قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اس دور میں سرمایہ دار آزاد تھے۔ ان پر حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ سرمایہ دار طبقہ یا دولت مند طبقہ معیشت میں معاشی اقدامات انجام دینے، پیداوار و قیمتوں کے تعین میں آزاد تھے۔ سرمایہ دار طبقہ معاشی معاملات میں بے قید یا آزاد تھے۔ سرمایہ داروں کو کنٹرول کرنے یا ان کو قابو میں رکھنے کے لیے کوئی ضوابط یا قوانین یا قواعد کو عائد نہیں کیا۔ ان پر کسی قسم کی نگرانی نہیں تھی۔ سرمایہ دار طبقہ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معاشی سرگرمیاں انجام دینے لگے۔ سرمایہ داری کا یہ ایک ابتدائی اور نیا طریقہ تھا۔ سرمایہ داری کے وجود سے قبل حکومت صنعت، تجارت پر کنٹرول کرتی تھی۔ جس کو مرکنٹائلزم (Mercantilism) کہتے ہیں۔

سرمایہ دار طبقہ صنعتیانے (Industralisation) پر بھاری سرمایہ لگانے لگا، جس کے سبب صنعتی انقلاب کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ مختلف میدانوں میں ایجادات وجود میں آئیں۔ صنعتوں کے قیام کے لیے حکومت کے بجائے عوام یا عام آدمی سے سرمایہ حاصل کیا گیا۔ اٹھارہویں صدی میں برطانیہ میں دولت مند کار اندازوں (Entrepreneurs) کی کافی تعداد تھی جنھوں نے صنعتی انقلاب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جس کے سبب اٹھارہویں صدی میں برطانیہ میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا۔ برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے فروغ میں یورپی سامراجیت (European Imperialism) نے اہم کردار ادا کیا تھا جو صنعتی انقلاب کا دوسرا اہم سبب ہے۔ یورپی اقوام میں قومیت کے جذبہ نے مختلف میدانوں اور عوام میں صنعتوں میں کام کرنے کا ذوق پیدا ہوا۔ اس دور میں سامراجیت عروج پر تھی۔ اس لیے اس دور کو سامراجی دور کہتے ہیں۔ بھاری مقدار میں اشیاء خدمات کی پیداوار یا فراہمی کے لیے سامراجیت ضروری وسائل کو فراہم کرتے ہیں۔

آخر میں زرعی انقلاب نے صنعتی انقلاب کو عروج پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ زرعی انقلاب کے دوران کوئلے کی کان کنی کو فروغ حاصل ہوا جو صنعتی انقلاب کے لیے مضبوط بنیادیں فراہم کیے۔ عظیم برطانیہ دنیا کا پہلا ملک ہے جس نے کوئلے کی کان کنی کو صنعت کی شکل دی اور بھاری مقدار میں زیر زمین کوئلہ حاصل کیا۔ کوئلہ ایندھن فراہم کرنے کا بنیادی ذریعہ ہے۔ صنعتوں میں ایندھن کی فراہمی، اسٹیم انجن، ریل، جہاز، مشینری وغیرہ کے لیے ایندھن کی فراہمی کے لیے کوئلہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کوئلہ کی کان صنعتی انقلاب میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ تھامس نیوکومن (Thomas Newcomen) نے بھاپ کے انجن (Steam Engine) کو ایجاد کیا۔ اس ایجاد کے سبب برطانیہ میں کوئلے کی کان کنی میں کافی سہولت اور آسانی پیدا کی۔ یہ پمپ کوئلے کی کان سے پانی باہر کھینچنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ صنعتوں کی تعمیر اور کوئلے کے حصول کے لیے زمین کا استعمال کیا گیا۔ صنعتوں کی پائیداری (sustain) کے لیے بھاری مقدار میں کوئلہ کی ضرورت تھی۔ برطانیہ میں بھاری مقدار میں مزدور طبقہ یا محنت کش موجود تھے۔ جو صنعتوں میں کام کرنے کے خواہشمند تھے۔ برطانیہ میں موجود انسانی وسائل نے بھی صنعتی ترقی کو جلا بخشی۔ صنعتوں کے قیام کے سبب رعایتی قیمت یا کم لاگت میں بھاری مقدار میں

خوردونوشت، غذائی اشیاء تیار ہونے لگے۔ صنعتیانے کے ساتھ ساتھ افراد خاندان میں اضافہ ہونے لگا۔ خاندان کی کفالت کے ذرائع ڈھونڈنے لگے۔ مزدور روزگار کے متمنی تھے۔ برطانیہ میں دولت مند کاراندازوں کی کافی تعداد موجود تھی جو برطانیہ میں صنعتیانے، صنعتوں کے قیام وغیرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ جس سے صنعتی انقلاب کو تقویت حاصل ہوئی۔ یورپی ممالک مختلف اسباب کے سبب صنعتی انقلاب میں برطانیہ سے پیچھے ہوچکے ہیں۔ یورپ میں کاریگروں کی موجود جماعتیں (Craftsman Guilds) جو ایجادات و پیداوار میں رکاوٹ بنتے تھے۔ اس کے علاوہ یورپی اقوام پیداوار یا ایجادات کے مقابلے میں ذاتی حفاظت، تحفظ (safety) کو اولین رہمیت دیتے تھے۔ اس کے ساتھ برطانیہ میں کوئلے کے بھاری مقدار میں ذخائر موجود ہیں۔ جس سے برطانیہ کی آسان رسائی ہوتی ہے۔ برطانیہ کے حدود میں موجود ذخائر کے سبب برطانیہ مختلف محصول سے آزاد ہے۔ جبکہ دیگر یورپی ممالک ان کی درآمد پر محصول ادا کرتے ہیں۔

7.3 صنعتی انقلاب: ترتیب یا مدارج (Industrial Revolution: The Timeline)

1760ء کے دہے میں عظیم برطانیہ میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا۔ 1764ء میں جیمس ہار گریوس (James Hargreaves) نے دھاگہ کاتنے کی مشین ایجاد کی جس کو Spinning Jenny کہتے ہیں، جس کو اس نے 1770ء میں پیٹنٹ کروایا تھا۔ ایجادات و اختراع میدان میں جیمس واٹ (James Watt) نے بھاپ کا انجن (Steam Engine) ایجاد کیا۔ 1764ء میں نیوکومن (Newcomen) کے ایجاد کردہ اسٹیم انجن کی درستگی کے دوران جیمس واٹ نے محسوس کیا کہ درستگی کے دوران بھاپ کی کثیر مقدار ضائع ہورہی ہے اور جیمس واٹ نے نیوکومن کی اسٹیم انجن میں بہتری پیدا کرتے ہوئے 1769ء میں اپنے نام پر اسٹیم انجن کا پیٹنٹ کروایا جس کو صنعتی انقلاب کے دوران وسیع پیمانے پر استعمال کیا گیا۔

صنعتی ایجادات کے میدان میں 1770 کی دہائی بھی اہم ہے۔ رچرڈ آرک رائٹ (Richard Arkwright) پہلا شخص ہے جس نے کپڑے کی صنعت میں ایندھن کی فراہمی کے لیے جیمس واٹ کے بھاپ کے انجن کو استعمال کیا۔ 1775ء تک رچرڈ آرک رائٹ نے دھاگہ کاتنے والے صنعت میں بہتری پیدا کی، جس سے دھاگہ کاتنے کے تمام مراحل ایک ہی مشین کے ذریعہ مکمل ہوجاتے تھے۔ اس ضمن میں رچرڈ آرک رائٹ کو جدید صنعتی فیکٹری کا باوا آدم قرار دیا گیا۔ آرک رائٹ اور ہار گریوس کی ایجادات میں 1779ء میں سموئیل کرامپٹن (Samuel Crompton) نے Spinning Mule شامل کیا۔ یہ مشینی چرخا بھاری پیمانے پر اعلیٰ معیار کے دھاگے اور سوت تیار کرتا تھا۔ 1780 میں اڈمنڈ کارٹ رائٹ (Edmund Cartwright) نے خام پاورلوم (Crude Power Loom) کو ایجاد کرکے 1785ء میں پہلی بار پیٹنٹ کروایا۔ یہ جدید پاورلوم کے میدان میں ایجادات و اختراع میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال کارٹ رائٹ (Cartwright) نے برطانیہ میں ڈونکاسٹر (Doncaster) اور یارک شائر (Yorkshire) کے مقام پر بنائی اور کتائی کا کارخانہ قائم کیا۔ اس نے 1793 میں پہلی مرتبہ Wool Combing Machine کا پیٹنٹ کروایا۔ صنعتی ایجادات کے میدان میں اٹھارہویں صدی کا دور اہم مقام رکھتا ہے۔

سمویل سلاٹر (Samuel Slater)جو جیدیدیاہ اسٹرٹ(Jedediah Strutt)کا سابق شاگرد اور آرک رائٹ کا شریک کاروبار تھا، نے آرک رائٹ مشنری کا ماڈل تیار کرتے ہوئے Pawtucket جزیرہ روڈس میں پہلا کامیاب کاٹن مل قائم کیا۔اس طرح جارجیہ میں Eli Whitney نے کپاس سے بیج کو علٰحیدہ کرنے کی مشین Cotton Gin ایجاد کی۔ بعد میں Whitney نے اس مشین کے پرزوں میں تبدیلی کرتے ہوئے بھاری پیمانے پر پیداوار کے قابل مشین بنائی۔اٹھارہویں صدی کے ابتدائی دور میں بھی صنعتی میدان میں کافی ایجادات وجود میں آئے۔ولیم(William)اور جان ککرل(John Cockerill)دو انگریز باشندوں نے 1807 میں Liege میں مشینوں کی دکان قائم کرکے بلجیم میں صنعتی انقلاب برپا کیا۔ بلجیم براعظم یورپ کا پہلا ملک ہے جو معاشی واقتصادی اعتبار کے قابل بنا۔13–1811 میں صنعتی میدان اور سماج میں بدلتی ایجادات کا پتہ چلتا ہے۔صنعتی ترقی نے سرمایہ دار طبقہ کو کافی مستحکم کرنے لگا۔ دوسری جانب صنعتی ترقی سے سماجی عدم استحکام پیدا ہونے لگا جس کے سبب برطانیہ کے لڈائٹ طبقہ (Luddites)نے صنعتیانے کی سخت مخالفت کی اور برطانیہ کے مختلف شہروں میں موجود کپڑا صنعت کو آگ لگادی۔ کپڑا صنعت کے کاریگر جو حملوں اور تشدد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے،ان کاریگروں کو مقامی عوام کی حمایت حاصل تھی۔ جس سے یہ کافی مطمئن تھے۔لڈائٹ ایک اصطلاح ہے جو صنعتی تبدیلیوں کی مخالفت کرنے والے افراد یا جماعت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کا نصف دہا(59–1834)صنعتی تبدیلیوں میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ریاست متحدہ امریکہ میں سائرس میک کارنک(Cyrus Mc Cormick) نے کھیتی باڑی میں قابل استعمال کئی مشینوں کو ایجاد کیا اور ان کو 1834ء میں پیٹنٹ کروایا۔ان انقلابی مشینوں کے سبب کاشتکاری، کٹوائی، تخم ریزی میں تیزی اور آسانیاں پیدا ہوئیں۔Elias Howe کی ایجاد کردہ سلائی مشین (Sewing Machine)کا 1846ء میں پیٹنٹ کرایا گیا۔اس مشین کے سبب کم لاگت میں ملبوسات کی تیاری عمل میں آئی۔ 1859ء میں ایڈون ڈریک (Edwin Drake)نے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ٹیٹسول(Titusville) اور پینسلوانیا (Pennsylvania)میں تیل کے کنویں کھدوائے۔ یہ خام تیل کی پیداوار کا آغاز تھا۔اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف میں صنعتی میدان میں مزید تبدیلیاں ہونے لگیں۔امریکہ کے مشرقی ومغربی ساحل کو جوڑنے کے لیے 1862ء میں ریلوے کی تعمیر شروع کی گئی۔ 1869ء میں اوٹاہ(Utah)اور پروموںٹری (Promontory)میں جنکشن کے ساتھ دونوں جانب کام کا آغاز ہوا۔

7.4 صنعتی انقلاب کے اہم شعبے (Major Spheres of Industrial Revolution)

7.4.1 کپڑے کی صنعت (Textile Industry)

صنعتی انقلاب نے براعظم یورپ کے ساتھ ساتھ عالمی سطح کو متاثر کیا۔یورپ کی صنعتی ترقی نے پیداواری مراحل کو تیز اور آسانی پیدا کی۔ صنعتی انقلاب کے سبب 1760 سے 1820 اور 1840ء کے مدت کے دوران پیداواری مراحل میں کافی تبدیلیاں وجود میں آئیں۔ صنعتوں میں دستی کام مکمل طور پر مشینوں کے ذریعہ انجام پانے لگا۔لوہے کی پیداوار اور کیمیکل کی تیاری کا آغاز ہوا۔ بھاپ کے انجن کے استعمال

میں اضافہ ہوا جس کے سبب آبی طاقت (Water Power) یا پانی کے صنعتی استعمال میں بہتری پیدا ہونے لگی۔ صنعتوں میں زیر استعمال آلات، پرزے وغیرہ میں بہتری پیدا ہونے لگی جس کے سبب صنعتی نظام میں عمدگی پیدا ہونے لگی۔ صنعتی انقلاب کا پہلا اثر کپڑے کی صنعت پر پڑا جس کے سبب عمدہ اور معیاری کپڑے کی پیداوار کے ساتھ ساتھ اس صنعت میں روزگار کے مواقع پیدا ہونے لگے۔ کپڑے کی صنعت پہلی صنعت ہے جس میں پیداوار کے جدید طریقہ کو صنعتی سامان یا مشینریوں کا پہلے استعمال کیا گیا ہے۔ صنعتی انقلاب پیدا کرنے والے موجدین کا تعلق برطانیہ سے تھا جس سے عظیم برطانیہ سے صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا۔ صنعتی انقلاب نے تاریخ کا ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ سماجی و معاشی تبدیلیوں میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ صنعتی انقلاب کی بدولت روزمرہ زندگی کا ہر ایک پہلو متاثر ہوا۔ طرز زندگی میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ روزگار کے مواقع وجود میں آئے۔ جس کے سبب عوام کی اوسط فی کس آمدنی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ شرح آبادی میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ چند اقتصادی ماہرین کے مطابق صنعتی انقلاب کی بدولت عام افراد کی معیار زندگی میں پہلی مرتبہ بہتری پیدا ہوئی اور بعض دیگر اقتصادی ماہرین کے مطابق انیسویں اور بیسویں صدی کے آخر تک عوام کی معایر زندگی میں حقیقی طور پر بہتری پیدا نہیں ہوئی۔ اس دور میں برطانیہ زرعی انقلاب سے گزر رہا تھا۔ صنعتی انقلاب کی بدولت زراعت میں بہتری کے ساتھ ساتھ عوام کی معیار زندگی کو بہتر بنانے میں مدد ملی۔ ساتھ ہی شعبہ زراعت کے فاضل مزدوروں کو صنعتوں میں روزگار کے مواقع فراہم ہوئے۔ کپڑے یا ملبوسات کی مشینری (Textile Machinery) صنعتی انقلاب کے قلیل عرصہ میں کپڑے کی صنعت میں مختلف ایجادات وجود میں آئے۔ جن کا مختصر تذکرہ ذیل میں کیا گیا ہے۔ 1733 میں جان کی (John Kay) نے فلائنگ شٹل (Flying Shuttle) کو ایجاد کیا۔ اس کی بدولت بنکروں کو کپڑے بننے میں تیزی اور بہتری پیدا ہوئی۔ 1742 میں برطانیہ میں پہلی مرتبہ کپاس کی صنعت (Cotton Mill) قائم کی گئی۔ 1764 میں جیمس ہارگریس (James Hargreaves) نے کتائی جینی (Spinning Jenny) کو ایجاد کیا۔ یہ دھاگہ کاٹنے کی پہلی مشین ہے جس سے کتوائی میں بہتری پیدا ہوئی۔ 1764 میں رچرڈ آرک رائٹ (Richard Arkwright) نے آبی فریم (Water Frame) کو ایجاد کیا۔ یہ کپڑے کی صنعت میں استعمال کرنے کی پہلی مشین ہے جو پانی سے چلتی ہے۔ یہ مشین کپاس سے دھاگہ بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔ آبی فریم (Water Frame) کو Spinning Frame بھی کہتے ہیں۔ 1769 میں آرک رائٹ نے Water Frame کا پیٹنٹ کروایا۔ 1770 میں آرک رائٹ (Arkwright) نے مشین Spinning Jenny کو پیٹنٹ کروایا۔ 1773 میں تمام فیکٹریوں میں کپاس کی پیداوار کی گئی۔ 1779 میں کرامپٹن (Crompton) نے Spinning Mule گھومنے والا خچر کو ایجاد کیا۔ یہ دھاگہ کاتنے کے مراحل میں سہولت اور اہم کردار ادا کرتا ہے۔ 1785 میں کارٹ رائٹ (Cartwright) نے Power loom مشین کا پیٹنٹ کروایا۔ اس مشین کو 1813 میں ولیم ہاروک (William Horrocks) نے تبدیلی کرتے ہوئے رفتار کنٹرول کرنے کے لیے Variable Speed Batton کو ایجاد کیا۔ 1787-1770ء سے کپاس پر مبنی سامان کی پیداوار میں 10 گنا اضافہ ہوا۔ 1789 سمویل سلاٹر (Samuel Slater) نے کپڑے کی مشینری کی ساخت کو امریکہ برآمد کیا۔ 1790 میں برطانیہ کے علاقے Nottingham میں آرک رائٹ (Arkwright) نے پہلی مرتبہ بھاپ پر مبنی پہلی کپڑے کی صنعت قائم

کی۔ 1792 میں ایلی وائٹنی (Eli Whitney) نے مشین Cotton Gin کی ایجاد کیا۔ یہ مشین کپاس سے بیجوں کو علٰحیدہ کرتی ہے۔اس سے کپاس کو علٰحیدہ حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ 1804 میں جوزف ماریا جاکوارڈ (Joseph Marie Jacquard) نے عمدہ باریک دھاگہ حاصل کرنے کی مشین ایجاد کی۔ جس کو Jacquard Loom کہتے ہیں۔اس مشین کے ذریعہ پیداوار اور معیار کو کنڑول کرتے ہوئے موزوں رفتار کے ساتھ دھاگہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ریثم کا دھاگہ حاصل کرنے میں مدد ملی۔ 1813ء میں ولیمہارروک (William Horrock) نے دھاگہ کی پیداوار پر کنڑول کے لیے رفتار کو کنڑول کرنے کا بٹن ایجاد کیا۔ 1813 میں ولیم ہارروک نے مشین کی رفتار کو کنڑول کرنے والا بٹن (Variable Speed Button) ایجاد کیا۔اس کی مدد سے دھاگہ کی پیداوار اور معیار میں اضافہ ہوا۔ 1856 میں ولیم پارکن (William Perkin) نے پہلی مرتبہ مصنوعی رنگ (Synthetic Dye) ایجاد کیا۔اس کی مدد سے بھاری مقدار میں دھاگوں کو رنگ دوزی کی جاسکتی ہے۔

7.4.2 کان کنی اور دھات کاری (Mining and Metallurgy)

صنعتی ترقی کے لیے ایندھن کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ کوئلہ قدرتی طور پر ایندھن حاصل کرنے کا آسان اور سستہ ذریعہ ہے۔ جو قدرتی طور پر زیرزمین موجود ہوتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے سبب صنعتوں کے بھاری مقدار میں ایندھن کی ضرورت تھی۔ جس کے سبب کوئلہ کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کی گئی۔ برطانیہ میں صدیوں سے چارکول کے ذریعہ ایندھن حاصل کرتے تھے۔ صنعتوں کے لیے آسان اور سستے ایندھن کی ضرورت تھی۔ 1700 سے قبل کوئلہ کے استعمال کی کوئی صنعت نہیں تھی۔ کوئلہ کی کان سے کوئلہ حاصل کیا جاتا ہے جو زیرزمین مختلف سطحوں میں پایا جاتا ہے۔ دیگر معدنیات کے مقابلہ میں کوئلہ کو حاصل کرنا نہایت آسان ہوتا ہے۔ صنعتی انقلاب نے کوئلہ کی کان پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہوئے صنعتیانے کے رخ کو یکسر بدل دیا۔ صنعتی انقلاب سے قبل Drift Mines اور Bell Pits دو طرح کی صنعتیں موجود تھیں۔ دونوں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں تھیں۔ان سے حاصل کوئلہ کو مقامی طور پر چھوٹے پیمانے کی مقامی صنعتوں اور گھریلو ضروریات کی تکمیل میں استعمال ہوتا تھا۔ برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے سبب صنعتوں کی ضروریات کی تکمیل کے لیے بھاری پیمانے پر کوئلہ کی ضرورت تھی۔اس نے خود کو صنعتی میدان میں مستحکم بنانا شروع کیا۔ آرک رائٹ (Arkwright) کی جانب سے صنعتی ترقی کے اقدامات اور صنعتوں کے قیام سے واٹ (Watt) سے بھاپ کے انجن (Steam Engine) میں بہتری پیدا کرنے سے ملک میں کوئلہ کی ضرورت میں مزید اضافہ ہوا۔ کوئلہ کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کوئلہ کی کان میں گہرائی تک کھدوائی کی جانے لگی۔ کوئلے کی کان گہری سے گہری ہونے لگی۔ جس کے سبب اس میں جوکھم اور خطرات میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ کوئلہ کی کان کو سینکڑوں فٹ کی گہرائی تک کھدوائی کرسکتے ہیں۔ کھدوائی کے دوران Coal Seam کی سطح کے بعد کان میں افقی (Horizontal) کھدوائی کی جاتی ہے۔ کان میں کھدوائی جوکھم سے خالی نہیں ہے۔ واٹ کا ایجاد کردہ بھاپ کا انجن (Steam Engine) استعمال کرنے کے باوجود گہرائی میں آکسیجن یا ہوا کی فراہمی ایک سنگین مسئلہ ہے۔ کھدوائی کے دوران گیسوں کے اخراج سے بھی تحفظ کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ گیسوں کے اخراج اور معمولی چنگاری سے صنعتی علاقہ میں آگ پھیل سکتی ہے۔اس لیے کھدوائی میں پیدا

معمولی چنگاری بھی خطرناک ہو سکتی ہے۔ زہریلی گیس جس کو Blackdamp and Afterdamp کہا جاتا ہے۔ ان کی موجودگی سے بھی مشکلات پیدا ہوتے ہیں۔ کان میں کھدوائی کے دوران گڑھے گرنے، دیواروں کے سرکنے، کھدوائی کے علاقے گر جانے وغیرہ واقعات بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ کان میں کھدوائی گہرائی تک ہوتی ہے۔ اس لیے کھدوائی والے علاقے کے اوپر کافی وزن ہوتا ہے۔ جس کی حفاظت کے لیے مضبوط لکڑی کے کھمبوں (Wooden Beam) سے سہارا دیا جاتا ہے۔ جس کو Props کہتے ہیں۔ کان کنی میں جوکھم و خطرات کے باوجود کوئلہ کی ضرورت کی تکمیل کے لیے برطانیہ میں کوئلہ کی پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہونے لگا۔ برطانیہ کے جنوبی (South) علاقے میں کوئلے کے محدود ذخائر ہیں، جبکہ وسطی علاقہ شمالی اور شمال مشرقی (North–East) علاقے اور اسکاٹ لینڈ کے علاقوں میں کوئلے کے کافی ذخائر موجود ہیں۔ کوئلہ کی دور دراز علاقوں تک منتقلی کافی مشکل اور اخراجاتی تھا۔ اس لیے کوئلہ کے ذخائر کے قریب صنعتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کے سبب ان علاقوں میں مزدور بھی منتقل ہونے لگے۔ صنعتوں کا قیام اور ان علاقوں میں مزدوروں کی منتقلی کسی خاص منصوبہ کے تحت عمل میں نہیں لائی گئی جس کے سبب مسائل پیدا ہونے لگے اور یہاں پر سہولتوں کی اشد ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اٹھارہویں صدی کے ابتداء میں عملی طور پر محدود پیمانے پر لوہے کا استعمال ہوتا تھا۔ لوہے کو پگھلانے کے لیے بھاری مقدار میں کوئلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئلے کی قلت اور اخراجات کے سبب جنگلات کے درمیان میں جنگلاتی لکڑی کے ذریعہ لوہے کو پگھلایا جاتا تھا۔ یہ ایک کافی مشکل اور ناقابل رسائی کام ہے۔ 1709 میں آہنی ماسٹر ابراہم ڈربی (Abraham Darby) نے دریائے سیورن (Severn) کے Coal Brookdale کے مقام پر بھٹی قائم کی اور ایجاد کیا کہ کچے لوہے (Pig Iron) کو پگھلانے کے لیے چارکول کے بجائے کوک (Coke) کو استعمال کیے۔ صنعتی انقلاب کے ابتدائی مراحل میں برطانیہ کا سیورن کا علاقہ لوہے کی پیداوار کا مرکز تھا۔

برطانیہ کے Shropshire علاقے میں 1779 کے چند ماہ کے وقفہ میں دریا سیورن پر 100 فٹ لمبا (30.63 میٹر) دنیا کا پہلا آہنی پل (Iron Bridge) ابراہم ڈربی سوم (Abraham Darby-III) نے تعمیر کروایا۔ یہ برج کول بروک ڈیل (Coal Brookdale) سے نیچے کی جانب دریائے سیورن پر بنایا گیا ہے۔ اس برج کی تعمیر میں وزنی، بھاری لوہے کے منحنی نما، نیم دائری سلاخ و قوس کی شکل میں لوہے کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس برج کی تعمیر میں 378 ٹن لوہا، 10 cwt دھات کا استعمال کیا گیا ہے۔ جان ولکنسن نے اس برج کا نقشہ تیار کیا۔ اس پل کے تعمیری ڈھانچے کو لوہے کے بڑے بڑے سلاخوں سے تعمیر کیا گیا۔ دیکھنے سے لگتا ہے کہ اس برج کے لوہے میں جال ہے۔ برسوں سے برج پر کوئی زخمی یا حادثہ کا شکار نہیں ہوا۔ اس آہنی برج سے صنعتی ترقی کی عظیم نشانی ظاہر ہوتی ہے۔ اس برج کی تعمیر سے صنعتی وادی میں Crystal Palace نظر آتا ہے۔

ہنری کارٹ (Henry Cort) صنعتی انقلاب کے دور کا مشہور موجد ہے جس نے کچے لوہے کو سلاخوں اور پھر انہیں مختلف شکلوں میں ڈھالنے کا طریقہ (Pudding and Rolling) ایجاد کیا۔ خام لوہے کے کچ دھات سے لوہے کے بڑے بڑے سلاخوں کی تیاری کے مراحل کو Pudding کہتے ہیں اور ان سلاخوں کو شکلوں میں ڈھالنا Rolling کہلاتا ہے۔ یہ دھات کاری کے میدان میں

کافی اہمیت رکھتا ہے۔1784ء کو ہنری کارٹ نے کچدھات کو لوہے کے سلاخ بنانے کے تکنیک کو ایجاد کر کے اس کا پیٹنٹ بھی کروایا۔کارٹ نے مل یا بھٹی کو تیار کیا جس میں کچدھات مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ناقص اشیاء علٰحدہ کرتے ہوئے خالص لوہے کے سلاخوں میں بدل جاتا ہے۔اس خالص لوہے کو ضرورت کے مطابق مختلف اشکال میں ڈھالتے ہیں۔خالص لوہے کو صنعتی میدان میں مختلف ساز وسامان کی تیاری میں استعمال کرتے ہیں۔ کورٹ کی ایجاد کردہ رولنگ مشین کا استعمال بعد میں فولاد کی صنعت میں معیاری پیمانے کی صنعتوں کی علامت بن گیا۔صنعتی انقلاب میں ہنری کارٹ نے جوکھم برداشت کرتے ہوئے اپنی مثال قائم کی۔صنعتی ایجادات میں اپنا مکمل ذاتی سرمایہ مشغول کیااور تجربہ کے لیے مزید سرمایہ قرض پر حاصل کیا۔سرمایہ کاری کے سبب کورٹ، منافع کے بجائے دیوالیہ کا شکار ہو چکا تھا۔

7.4.3 نقل وحمل اور مواصلات (Transport and Communication)

صنعتی انقلاب نے سماج کے مختلف پہلوؤں کو متاثر کیا۔ حمل و نقل کی سہولتوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ترسیل کے ذرائع اور سہولتوں میں بھی اضافہ ہوا۔1844 میں امریکی سامو ئیل مورسے (Samuel Morse)نے ٹیلیگراف ایجاد کرتے ہوئے پہلا پیغام (message) روانہ کیا۔ ٹیلیگراف کے تار کے ذریعہ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک آسانی سے پیغام روانہ کیا گیا۔1876 میں الگزانڈر گراہم بیل (Alexander Graham Bell) نے ٹیلی فون کو ایجاد کیا۔ جس کے سبب فرد آسانی سے کسی بھی علاقے میں موجود فرد سے بآسانی بات کر سکتا ہے۔1866 میں سائرس ڈبلیو فیلڈ (Cyrus W. Field)نے براعظم امریکہ کو براعظم یورپ سے جوڑنے کے لیے بحر اوقیانوس(Atlantic Ocean)میں سمندر کے اندر سے کیبل بچھائی۔ 1899ء میں مارکونی (Marconi)نے بغیر وائر (wireless) ربط پیدا کرنے کا آلہ (instrument) ایجاد کیا، جس کے سبب دنیا میں کسی بھی علاقے کو سگنل بھیجنے میں سہولت پیدا ہوئی۔انفارمیشن ٹکنالوجی، ریڈیو نشریات اور ٹیلی ویژن کے نشریات اسی ٹکنالوجی پر ایجاد ہوئے ہیں۔

انیسویں صدی کے دور میں صنعتی انقلاب برطانیہ سے یورپ کے دیگر ممالک میں پھیلنے لگا۔ نپولین بوناپارٹ کی فرانس کی جنگ صنعتی انقلاب کی شاہد ہے۔واٹرلو کی جنگ(Battle of Waterloo) میں نپولین کی شکست کے بعد ہتھیاروں کی جدیدیت پر توجہ دی گئی۔ جرمنی براعظم یورپ کا ایک اہم ملک ہے، جو اس سے متاثر ہوا۔اس کے ساتھ ساتھ نیدرلینڈ اور آسٹریا بھی متاثر ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے مابعد آخری دور میں جرمنی صنعتی میدان میں تیز رفتار ترقی کرتے ہوئے عالمی سطح پر طاقتور ملک کی حیثیت سے ابھرا۔لارڈ ڈلہوزی کی ہندوستان میں آمد کے بعد ہندوستان میں بتدریج ترقی کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں ریلوے اور ٹیلی گراف کے لائن بچھائے گئے۔ اس سے قبل ممبئی اور احمد آباد میں کپاس (کپڑے) کی صنعت قائم تھی۔ حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں صنعتی ترقی پر غور شروع کیا۔ ہندوستان کو خود مکتفی بنانے کے لیے 1907ء میں جمشید جی ٹاٹا نے لوہے اور فولاد کی کمپنی قائم کی۔اس کے ساتھ جوٹ، کاغذ، شیشہ (glass)وغیرہ کی چند صنعتوں کا بھی قیام عمل میں آیا۔ سامراجیت کی ناقص پالیسی نے یہاں کی صنعتی ترقی کو متاثر کیا۔ ہندوستان کو برطانیہ کی سرمایہ کے مقصد کے تحت استعمال کرتا رہا۔

7.5 صنعتی انقلاب کا پھیلاؤ (Spread of Industrial Revolution)

صنعتی انقلاب نے قلیل عرصہ میں یورپ کے مختلف ممالک کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر اثرات مرتب ہونے لگے۔ برطانیہ کی صنعتی ترقی نے یورپی ممالک میں صنعتی ترقی میں تیزی پیدا کی۔ فرانس، آسٹریا، بلجیم، جرمنی، پرتگال وغیرہ براعظم یورپ کے چند اہم ممالک ہیں۔ ان میں چند اہم ممالک پر صنعتی انقلاب کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

7.5.1 بلجیم (Belgium)

بلجیم براعظم یورپ کے مغربی علاقہ کا ایک اہم ملک ہے۔ اٹھارہویں صدی میں بھاپ کے انجن (Steam Engine) کی بلجیم میں آمد کے ساتھ بلجیم میں صنعتی انقلاب وجود میں آیا۔ اس بھاپ کے انجن کو بلجیم کے شہر لیگ (Liege) میں کوئلے کی کان میں استعمال کیا گیا جس کے سبب کوئلے کی پیداوار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ بھاپ کے انجن کے استعمال میں اضافہ ہونے لگا۔ نتیجتاً اگلے سال میں بھاپ کے انجن کی طلب میں اضافہ ہونے لگا۔ 1727ء میں مانس (Mans) اور چارلوری (Charleroi) کے صنعت میں استعمال ہونے لگا۔ بھاپ کے انجن کے استعمال کے سبب بلجیم میں کوئلے کی پیداوار میں اضافہ ہونے لگا۔ پیداوار میں اضافہ صنعتی ترقی اور بلجیم کی اقتصادی موقف کو ظاہر کرتا ہے۔ بلجیم براعظم یورپ کا ایک اہم ملک ہے۔ اس کے حدود فرانس، نیدرلینڈ، جرمنی سے ملتے ہیں۔

نپولین بوناپارٹ فرانس کا حکمران اور طاقتور فوجی جنرل تھا جس نے 1792ء میں بلجیم پر حملہ کرکے بلجیم کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ نپولین کے دور میں بلجیم کی معاشی حالت مسلسل ترقی کرنے لگی۔ بلجیم میں ضبط شدہ زمینات، پیالیس، علاقے، زمینوں کو کرائے پر دینے اور فروخت کرنے سے سرکار اور اشرافیہ کی آمدنی میں اضافہ ہوا۔ جن کو بعد میں صنعتوں کے قیام کے لیے استعمال کیا گیا۔ بلجیم پر فرانس کے قبضہ کے دوران برطانیہ کو صنعتی ترقی کے سامان فراہم ہوتے ہیں۔ 1798ء میں برطانیہ میں معدنیات کی کافی کھوج کی گئی۔ Lieven Bauwens بلجیم کے مشہور کارانداز (Entrepreneur) ہے جنہوں نے برطانیہ میں موجود کپڑا انڈسٹری کی صنعتی معلومات کا راز کا اسمگلنگ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کیونکہ ان کی ٹکنالوجی کے سبب کپڑا انڈسٹری میں عمدہ اور بھاری مقدار میں پیداوار حاصل ہو رہے تھے۔ صنعتی راز کو بلجیم میں استعمال کیے۔ Lieven Bauwens برطانیہ میں قیام کے دوران یہاں کی صنعتی ترقی اور کپڑا صنعت میں استعمال مشینوں اور ان سے حاصل بھاری پیداوار کا بغور مطالعہ کرتا تھا۔ اس نے اس میں اختراعی صلاحیت کو شامل کیا۔ بلجیم کو صنعتیانے کے مقصد کے تحت یہاں کی ٹکنالوجی کی اسمگلنگ کرنا چاہا۔ مشینوں پر مطالعہ اور اس کی اسمگلنگ کے لیے (Spinning Jenny) مشین خرید کر اس کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں محفوظ طریقے سے چھپادیا۔ اور کشتی کے ذریعہ بلجیم کو روانہ کیا۔ برٹش حکومت کو Lieven Bauwens کے اس حرکات کا علم ہونے پر انہیں گرفتار کرنا چاہا، لیکن انہوں نے اپنی گرفتاری سے قبل محفوظ طریقے اختیار کرتے ہوئے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ اور بلجیم میں اپنے مقام Ghent میں آنے کے بعد Spinning Jenny مشین کے پرزوں کو جوڑ کر پیداوار میں استعمال کے بعد میں اس کو وسیع پیمانے کی پیداوار میں استعمال کیے۔ کچھ عرصہ کے بعد Ghan ٹکسٹائیل انڈسٹری کا کامیاب شہر ثابت ہوا۔

کیونکہ Ghant میں پہلے سے کتان (Linen) کپڑے کی تیاری کی صنعت قائم تھی۔ کتان کے خام مال کی آسانی سے فراہمی کی وجہ سے ان کی پیداوار میں سہولت پیدا ہونے لگی۔ Ghant میں کپڑے کی وسیع انداز میں پیداوار کے سبب یہ شہر کافی شہرت حاصل کرنے لگا۔ کارل مارکس نے Ghant شہر کو بلجیم کا مانچسٹر (Manchester of Belgium) قرار دیا۔ Ghant بلجیم کا ایک اہم شہر ہے جو کپڑا انڈسٹری کے سبب یہ شہر کافی شہرت حاصل ہو چکا ہے۔ اس طرح Verviers بلجیم کا دوسرا اہم شہر ہے۔ 1794ء میں Cockerill نے Verviers میں Spinning Jenny قائم کیا۔ 1807 تا 1808 کے درمیان مزید پانچ (5) Wool-Spinning کی سہولتوں میں اضافہ کیا۔ بعد میں قلیل عرصہ میں کتائی مشین Spinning Jenny کو Liege شہر میں قائم کرکے پیداوار میں اضافہ کیا۔ شہر Verviers بھی Ghant شہر پر عمل کرتے ہوئے ترقی کیا۔ نپولین کی جنگ کے سبب بلجیم کو کافی فائدہ حاصل ہوا۔ کیونکہ جنگ کے سبب کپڑا، لوہے کی پیداوار اور طلب میں اضافہ ہوا۔ فرانس میں پیدا کوئلے کی نصف حصہ بلجیم میں پیدا ہوتا ہے۔ بلجیم کے کپڑے کی طلب میں کافی اضافہ ہونے لگا جو نپولین کے شہروں فوجیوں کو ضروری مقدار میں کپڑا فراہم کرنے لگا۔ جس کے سبب Ghant اور Verviers شہروں کو کافی شہرت اور ترقی حاصل ہوئی۔ 1810ء میں Ghant شہر میں 1000 سے 10000 مزدوروں کی بھرتی کیا۔ لوہے کی صنعت بھی جنگ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نپولین کی جنگ میں فوجیوں کو ضروری مقدار میں بلجیم کی صنعت میں تیار بندوقیں فراہم کیے گئے۔ بلجیم میں 1814ء میں 89 بھٹیاں قائم کیے گئے جو لوہے کی طلب میں اضافہ کو ظاہر کرتا ہے۔ نپولین کی جنگ کے خاتمہ پر صنعتی اعتبار سے بلجیم کافی ترقی یافتہ معیشت کی شکل حاصل کر چکا تھا۔ لوہے کی صنعت میں مسلسل ترقی حاصل ہو رہی تھی۔ 1824ء میں Paul Huart Chapel نے 8 لوہے پگھلانے کی بھٹی قائم کی۔ ان کی بھٹی میں اچھے قسم اور عمدہ معیار کے لوہے کی تیاری کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ ساتھ ہی اس پلانٹ کو لوہے کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ 1850ء میں لوہے کی نئی پلانٹ کے سبب تقریباً 200000 (دو لاکھ) ٹن لوہے کی پیداوار کی ہے۔ بلجیم میں لوہے اور کپڑے کی صنعت اور پیداوار میں مسلسل اضافہ سے صنعتوں کی مالی مدد کے لیے مالیاتی ادارے قائم ہونے لگے۔ 1822ء میں Societe Generale de Pays-Bas por Favoriser مالیاتی ادارے میں صنعتوں کے قیام کے لیے ضرورت مند صنعتکاروں کو ضروری مقدار میں قرض فراہم کرتا ہے۔ Nederlandsche Handel-Maatschappij نے برآمدات کو فروغ دینے کے لیے ضروری قرض فراہم کیا ہے۔

1820ء میں جدید صنعتی سہولتوں کے ساتھ صنعتوں کو مزید ترقی حاصل ہونے لگی۔ بلجیم اور اس کے پڑوسی ممالک میں تجارت کو فروغ دینے کے لیے سمندری، دریائی اور زمینی راستوں کو تعمیر کیے گئے، کنال کی تعمیر کی گئی، سڑکیں بنوائے گئے، جس کے سبب شہروں اور ملکوں میں ربط پیدا کرنے میں مدد ملی ہے۔ Ghant شہر Terneuzen ڈچ شہر کے ساتھ اور سمندر سے جڑ گیا۔ Moni اور Charleroi سے کوئلہ کو برآمد کرتے ہوئے شمالی فرانس کو روانہ کیا گیا۔ بلجیم کا صدر مقام بروزلس (Brussels) سے کنال کے ذریعہ کوئلہ کی برآمد ہوتی ہے۔ بلجیم پڑوسی ریاستوں و ممالک فرانس، جرمنی اور نیدرلینڈ سے اچھے تجارتی تعلقات پیدا کیے۔ 1830ء تک بلجیم میں ہزاروں میل کی کنال تعمیر کروائے۔

7.5.2 فرانس (France)

1830ء میں فرانس میں صنعتیانے کا عمل شروع ہوا۔ لوہے اور فولاد کی صنعت کے ساتھ ساتھ کوئلہ اور دیگر دھاتی صنعتیں فرانس کو صنعتیانے میں یا صنعتی ملک بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ برطانوی صنعتوں سے مسابقت کرنے کے لیے فرانس میں بھاری پیمانے کی صنعتیں قائم کرتے ہوئے اختراع اور تکنیکی طریقہ کار کو اختیار کیا۔ 1840–70 کے دور میں لوہے کی پیداوار میں 3 تا 6 فیصد کا اضافہ ہوا۔ فولاد کی پیداوار میں 10 فیصد اضافہ ہوا، اور دیگر دھاتوں میں 20 فیصد کا اضافہ ہوا۔ 1868ء میں فرانس کے دو بڑے پیمانے کی صنعتیں ملک کی ضرورت کی کل پیداوار کا 40 فیصد لوہا اندرون ملک پیدا کیا ہے۔ صنعتوں میں جدید ٹکنالوجی کا استعمال، کوئلہ اینڈھن کی طلب میں اضافہ ہونے لگا۔ جس کے نتیجہ میں دھات کاری کی کان کنی میں کوئلے کی صنعت کی اہمیت بڑھنے لگی۔ کوئلہ اور دھات کاری کی صنعتوں کی طلب میں اضافہ ہونے لگا۔ 1789ء میں فرانس نے 4,50,000 ٹن کوئلہ کی طلب کا اندراج کیا گیا۔ جس میں سے 2,30,000 ٹن کوئلہ کو گھریلو یعنی مقامی طور پر پیدا کیا گیا۔ 1830ء میں فرانس میں کوئلہ کی طلب میں 2.5 ملین ٹن کا اضافہ ہوا۔ جس میں سے 1.5 ملین کوئلہ فرانسیسی صنعتوں سے حاصل کیا گیا۔ 1850ء میں کوئلہ کی طلب میں اضافہ ہوکر 7.2 ملین ٹن کا اضافہ ہوا۔ جس میں سے 4.4 ملین ٹن کوئلہ فرانسیسی صنعتوں سے حاصل ہوا۔ 1850ء میں کوئلہ کی پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ 14 ملین ٹن کوئلہ کو فرانس کی صنعتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ 8.3 ملین ٹن کوئلہ فرانس میں پیدا ہوتا ہے، یعنی 1850 کے پیداوار کے مقابلے میں دوگنا اضافہ ہوا ہے۔ 1880 میں کوئلے کی طلب 28.8 ملین ٹن تھی اور پیداوار 19.3 ملین ٹن تھی۔ بھاری صنعتوں کے قیام کے ساتھ ہی صنعتی ساز و سامان مشنریوں ٹکنالوجی کی طلب میں اضافہ ہونے لگا۔ 1830ء میں فرانسیسی معیشت میں 625 مشینوں میں 10,000 ہارس پاور اینڈھن استعمال کیا گیا اور 1850 تک 4,114 سے زائد مشینوں میں 50,000 ہارس پاور اینڈھن استعمال کیا گیا۔ 1862 میں 17000 مشینوں میں 2,05,000 ہارس پاور اینڈھن استعمال کیا گیا۔ 1875ء میں 32000 مشینوں میں 4,00,000 ہارس پاور اینڈھن استعمال کیا گیا۔ فرانس کی معیشت میں تیز رفتار تبدیلیاں واقع ہونے لگے۔ 1830 اور 1840 کے دور میں ریلوے کی وسعت سے معیشت میں مزید استحکام پیدا ہوا۔ ریلوے کا تجارتی مقصد کے تحت استعمال کیا جانے لگا۔ برطانیہ نے فرانس سے تجارتی تعلقات قائم کیے اور فرانس کے ہر علاقے کی متوازن ترقی کے ایجنڈے سے برطانیہ متاثر ہوا اور فرانس کے بادشاہ لوئی فلپ (Louis Philippe) ریلوے کی ترقی کے اقدامات کیے۔ ریلوے کی ترقی کے اقدامات کے ساتھ ہی طویل مدتی مسائل بتدریج حل ہونے لگے۔ 1835 تا 1844 کے دوران ریلوے کی ترقی کے لیے 34 ملین فرانک (Francs) مشغول کیے گئے۔ 1845 میں 903 ریلوے فرانس میں چلائی گی۔ 1852 تک فرانس کے مختلف علاقوں میں 1852 تک بڑھ گئی۔ 1845 تا 1854 کے درمیان ریلوے کی سرمایہ کاری میں 175 ملین فرنک تک اضافہ کیا گیا۔ 1855-64 کے درمیان ریلوے میں سرمایہ کاری کو 487 ملین فرنک کا مزید اضافہ کیا گیا۔ 1840 تک جدید ایجادات فرانسیسی معیشت میں سدھار پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی، بلکہ جرمنی اور برطانیہ کی صنعتی ترقی کی طرح فرانس میں صنعتیانے کا عمل کا آغاز ہوا۔ یہ بات درست ہے کہ فرانس میں صنعتکاروں کی اکثریت صنعتیانے کے روایتی طریقہ کار پر عمل پیرا تھے۔ دیہی بنیاد پر Proto–Industry ان کی صنعتی ترقی کی بنیاد تھی، یعنی دیہی صنعتیں معیشت کے ستون تھے۔ جس کا اہم سبب یہاں کے بوربون (Bourbon) خاندان کے

بھاری صنعتکار تھے۔ تمام بھاری پیمانے کی صنعتوں کے قیام کے لیے حکومت کی منظوری لازمی تھی۔ حکومت سے صنعتوں کے قیام کے لیے منظوری حاصل کرنا کافی آسان نہیں تھا۔ یہاں کے صنعتکاروں کی رضامندی سے صنعتوں کے قیام کی منظوری دی جاتی تھی۔ 1815-42 کے دوران ملک میں 342 صنعتی مراکز کو حکومت کے اجازت نامے جاری کی تھی۔ فرانس میں ریلوے کی ترقی کے ایجنڈے کے باوجود فرانس کے شہنشاہ چھوٹے دیہی صنعتوں کی ہمت افزائی کے حامی تھے۔ فرانس کے شاہی حکمران فرانس کی صنعتی پسماندگی کے اہم اسباب میں شامل ہیں۔ صنعتوں کے قیام کے سخت قوانین، بنک کے اصول، بوربن خاندان اور لوئی فلپ کے رویہ کے سبب بازار سے سرمایہ حاصل کرنا کافی دشوار تھا۔ فرانسیسی حکومت کا خیال تھا کہ اگر فرانس میں فینانشیل مارکٹ کے آغاز سے فرانس کا مرکزی بنک (Bank of France) بری طرح سے متاثر ہوگا۔ 1817–18ء میں نجی یا خانگی شعبہ کے تحت فرانس میں چند خانگی بنکRoven، Bordeaux، Nantesوغیرہ شہروں میں قائم کیے گئے۔ سرکاری طور پر سرمایہ کا حصول کافی مشکل مرحلہ رہا۔ صنعتوں کی ترقی کے لیے صنعتی بنک (Industrial Bank)کے قیام پر Lafitte کے مشوروں (Proposals)کو حکومت مسترد کرتی ہے۔اس کے باوجود Lafitteنے مایوس نہیں کیا ہے۔ اس نے فرانس میں مالیاتی نظام میں اختراعی انداز کو اختیار کیا اور 1815-45 کے دور میں Commandite Bankکی بنیاد رکھی۔اس نے Caisse General du Commerce et Industrie کو قائم کرکے صنعتوں میں سرمایہ کاروں کے افعال کو شروع کیا۔1848 میں فرانسیسی حکومت نےاس ادارے کو Bank of France میں ضم کیا۔اس وقت برطانیہ کی طرح فرانس میں صنعتی ترقی حاصل نہیں تھی۔ سرکاری ناقص پالیسیوں کے سبب صنعتی میدان میں خاطر خواہ ترقی حاصل نہیں کرسکی۔ 1840ء کے دور میں فرانس کی صنعتی ترقی بند ہوئی۔ مختلف مورخین کے مطابق1829، 1831، 1837اور 1846-47 کے دور میں زرعی بحران کے سبب فرانس میں صنعتی ترقی میں انحطاط پیدا ہوا۔ زراعت کی ناکامی کے سبب کاشتکار متبادل روزگار کی تلاش میں شہروں کو نقل مکانی کرنے لگے جس کے سبب شہری آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ 1846 میں فرانس کی ملک کی آبادی کا 75 فیصد آبادی ملک میں قیام کرتی تھی۔ 1872 تک آبادی گھٹ کر 69 فیصد ہوئی اور 1901 میں آبادی میں مزید گھٹ کر 59 فیصد ہوئی۔ 1850-72 کے دور میں پیرس کی آبادی میں40 فیصد اور de Calais کی آبادی میں20 فیصد کا اضافہ ہوا۔

7.5.3 جرمنی (Germany)

عالمی سطح پر صنعتی انقلاب نے جرمنی کی معیشت کو بھی متاثر کیا۔ 1815–1835 کے درمیان جرمنی میں صنعتی ترقی کا آغاز ہوا۔ اس دور کو جرمنی کی صنعتی ترقی کا ابتدائی دور کہلاتا ہے۔ 1830 اور 1873 کے درمیان کا دہا صنعتی ترقی کا عروج کا دور ہوتا ہے۔اس کے بعد جرمنی کو تیز رفتار صنعتی ترقی حاصل ہوئی۔ جرمنی کی صنعتی ترقی برطانیہ کی صنعتی ترقی سے مختلف ہے۔ برطانیہ کی طرح کپڑے کوئلہ تک محدود نہیں ہے بلکہ جرمنی کی صنعتی ترقی کوئلہ، فولاد، ریلوے و سڑکوں کی تعمیر سے جڑی ہوئی ہے۔

ریلوے کی تعمیر: حمل و نقل کی سہولتیں ملک کی معیشت کے مختلف شعبوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ حمل و نقل کی سہولتوں میں اضافہ سے دیگر صنعتوں کو ترقی کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ جرمنی نے صنعتی ترقی کے لیے حمل و نقل کی ترقی کو اہمیت دی۔ 1834-35 میں

Ludwigseisenbahn-Gesellschaft نے جرمنی کے دو شہروں Nuremberg اور Furth کے درمیان 6 کلو میٹر سڑک کی تعمیر سے ریل روڈ کی ترقی کا آغاز ہوتا ہے۔ 1837ء میں Friedrich List نے Leipzig-Dresden کے درمیان 115 کلو میٹر طویل سڑک کی تعمیر کی جو جرمنی کی معاشی میدان میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ 1840ء میں ریلوے کی تعمیر کا پہلا تجربہ رہا۔ 1840 میں 580 کلو میٹر طویل لائن بچھائی گئی۔ 1850 میں 7000 کلو میٹر سے زائد اور 1870ء میں 25000 کلو میٹر پٹڑی بچھائی گئی۔ 1840ء میں ریل روڈ کی تعمیر میں 42000 سے زائد مزدوروں کو روزگار فراہم ہوا، جو کوئلہ کی کان میں مشغول مزدوروں کی تعداد سے زائد ہے۔ اگلے چند سال میں مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ 1846ء میں 180000 مزدوروں کو روزگار فراہم ہوا۔ صرف 26000 مزدور مستقل روزگار پر تھے اور باقی تعمیراتی صنعت میں شامل تھے۔

دھات کاری: معدنیات قدرتی طور پر زیر زمین پائے جاتے ہیں۔ جن کے حصول کے لیے صنعتیں قائم کی جاتی ہیں۔ دھات سے خالص دھات حاصل کرنے کا عمل دھات کاری (Metal Processing) کہلاتا ہے۔ جرمنی میں بھاپ کا انجن یعنی اسٹیم انجن کو پہلے استعمال کیا گیا۔ 1807 میں فرانز (Franz) اور جان دینندال (Johann Dinnandahl) دونوں بھائیوں نے Essen شہر میں پہلی مرتبہ بھاپ کے انجن کو بنایا۔ اس انجن کو Ruhr علاقہ کے کان (صنعت) سے پانی کو کھینچنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ 1817ء میں فرڈرچ ہرکارٹ (Friedrich Harkort) نے Wetter علاقے میں میکانیکل ورک شاپ قائم کیا۔ 1836ء تک Aachen علاقے میں میکانیکلا نجنیرنگ کمپنی تھے۔ جس میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں۔ میں Prussia میں جملہ 210 بھاپ کے انجن تھے۔ 1835ء میں Kingdom of Hanover میں پہلی مرتبہ شروع کیا گیا۔ 1835ء تک ریل سڑک میں بہتری کی گئی۔ ریل سڑک اور انجن کے کارخانے (Locomotives) کی مانگ میں اضافہ ہونے لگا۔ 1830ء سے بھاپ کے انجن (Steam Engine) اور Locomotives کی پیداوار میں اضافہ ہونے لگا۔ 1841ء میں Borsing Company نے پہلا Locomotive کی تیاری کی اور 1858ء تک ہزاروں Locomotives کی پیداوار کی ہے۔ اور 1858 میں عالمی سطح کی تیسری بڑی Locomotive تیار کرنے کی فیکٹری رہی۔ جس میں 1100 ملازمین برسر روزگار تھے۔ ان صنعتوں کی ترقی کے سبب کوئلہ اور اسٹیل کی صنعتوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

لوہے اور اسٹیل کی پیداوار: صنعتی ترقی نے بھاری پیمانے کی صنعتوں کے ساتھ ان کی مددگار صنعتوں کو بھی ترقی حاصل رہی۔ صنعتیانے کے ابتدائی ادوار میں بھاری پیمانے کی صنعتوں کو بھی ترقی حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ 1827ء میں Saar, Carl Ferdinand von Stumm-Halberg اور ان کے خاندان نے صنعتوں کی ترقی و اضافہ میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ Gutehoffnungshutte نے 1810 میں Oberhausen کے قریب Sterkrade میں مختلف صنعتوں کو قائم کیا۔ 1830ء میں کمپنی میں 340 ملازمین کام کرتے تھے، جبکہ 1840 میں 2000 ملازمین کام کرتے رہے۔ 1811 میں Friedrich Krupp نے Essen علاقے میں اسٹیل کی پیداوار کو شروع کیا۔ لیکن ان کے فرزند الفرڈ (Alfred) 1826ء میں کمپنی کو بھاری

قرض میں چھوڑا۔1840تک ریل روڈ کی تعمیر تک کمپنی مختلف مسائل سے دوچار رہی۔انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں تکنیکی میدان میں اختراعی وایجادات وجود میں آئے۔ جس سے Puddling Mills کی تعمیر ہو۔ جس کو چار کول کے مقابلے میں اچھے قسم کے معیاری کوئلے کی پیداوار کے لیے استعمال کیا گیا۔

7.6 صنعتی انقلاب کے اثرات (Impact of Industrial Revolution)

صنعتی انقلاب نے عالمی سطح پر مختلف شعبوں کو متاثر کیا ہے۔ جس کے سبب سماجی و معاشی معاملات میں بتدریج تبدیلیاں واقع ہوئے ہیں۔ صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی وتہذیب و تمدن میں بھی تبدیلیاں واقع ہوئے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ممالک کو بھی ترقی حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔ صنعتی انقلاب کے سبب صنعتوں کے قیام کے ساتھ ساتھ اچھے اور خراب دونوں نوعیت کے سامان کی پیداوار ہوئی ہے۔اشیائے صارفین،اشیائے اصل کی پیداوار ہونے لگی۔اشیائے صارفین کی بھاری مقدار میں پیداوار کے ساتھ رعایتی قیمتوں میں فراہم ہوئے۔صنعتوں کے قیام کے سبب بھاری مقدار میں روزگار کے مواقع فراہم ہیں۔عوام کی آمدنی کی سطح میں اضافہ سے معیار زندگی بھی بلند ہونے لگی۔ان تمام اچھے اوصاف کے ساتھ سماج میں چند ناقص معاملات بھی وجود میں آئے۔ سرمایہ دار طبقہ اور کارانداز بھی صنعتکار خام مال کی خریدی صنعتی مشینوں کی خریدی، فیکٹریوں کے قیام اورانہیں جاری کرنے کے لیے کافی سرمایہ مشغول کیے ہیں۔مزدوروں کو معمولی اجرت ادا کرتے ہوئے اونچا منافع حاصل کرتے ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ نے سرمایہ کاری کے سبب بھاری مقدار مین مالی فوائد حاصل کیے جس کے سبب اس طبقہ کی زندگی عیش و عشرت میں قائم رہی۔ جبکہ ان کے ملازمین کی طرز زندگی عدم توجہ کا شکار رہی۔بچے،خواتین و مرد صنعتوں میں ضرورت سے زائد اوقات پر کام کرتے رہے۔ صنعتوں میں ان کے لیے حفاظتی انتظام نہ ہونے پر صنعتوں میں کام کرنا کافی مشکل ہے۔مزدوراپنی ملازمت سے ڈرتے ہوئے صنعتی انتظامیہ کو شکایات نہیں کر سکتے۔اس لئے مزدور طبقہ عدم اطمینان میں زندگی گزار رہا ہے۔ چارلس ڈکنس(Charles Dickens)نے صنعتی انقلاب کے سبب پیدا ہونے والے امتیازات کو عیاں کیا ہے۔صنعتوں کے قیام کے سبب دیہی و مقامی صنعتوں کو مسابقت کے ساتھ مختلف میدانوں مشکلات میں اضافہ ہونے لگا۔ جس سے کافی بیروزگاری کا شکار ہیں اور روزگار کی تلاش میں شہروں کو نقل مکان کرتے ہیں۔درمیانی طبقے کے لوگ کاروبار میں سرمایہ لگانے سے ان کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے،اس لیے حکومت ان عوام کی بات کو قبول کرتی تھی۔اس طبقہ کی ووٹوں میں اکثریت تھی۔ یہ اختیارات رکھتے تھے۔ یہ اپنے مفادات کے مطابق قوانین میں ترمیم کرتے اور اپنے مفادات میں استعمال کرتے۔ مزدوروں کو اپنی تجارتی انجمن بنانے کا اختیار نہیں تھے۔ ان حالات میں یورپ میں اشتراکیت کو فروغ حاصل ہوا، جس کے سبب امیری اور غریبی کے فرق کو دور کیا جاسکے۔یعنی ملک کی عاملین پیداوار پر عوام کا قبضہ ہوگا۔ جرمن مفکر کارل مارکس کے نظریات واضح کے ساتھ Bourgeoisie کے خلاف عوام متحد ہوئے۔

7.6.1 سماجی اثرات (Social Impact)

صنعتی انقلاب نے ہر ملک کی سماجی و معاشی حالت کو متاثر کیا۔ صنعتی انقلاب کے سبب صنعتکاروں، کاراندازوں و سرمایہ داروں کو

معاشی فوائد حاصل ہوئے اور انہیں امیر بنادیا۔ لاکھوں مزدوروں کو صنعتوں میں روزگار کے مواقع حاصل ہوئیں۔ صنعتی ترقی یا صنعتی دور میں غریب اور ان کی زندگی کے شرائط کو مشکل بنادیا۔ یورپ اور امریکہ کی صنعتوں میں بہتری کے لیے صنعتی اصلاحات قائم کیے گئے۔ صنعتیانے کے سبب عوام کی معیار زندگی میں اضافہ ہونے لگا۔ مزدور طبقہ صنعتوں میں غیر محفوظ علاقع خطرناک مشینوں کا ماحول سخت شرائط کار، آبادی کی گنجانیت وغیرہ کے سبب مزدور طبقہ مشکلات سے دوچار ہے۔

عوام کی نئے صنعتی شہروں کو منتقلی (Migration of People to New Industrial Cities)

صنعتی انقلاب نے نئے صنعتوں، دیہاتوں کو ترقی کے ساتھ ساتھ جدید شہروں کو آباد کیا۔ روزگار کی تلاش میں دیہاتوں سے شہروں کو نقل مکانی کرنے لگے۔ جن علاقوں میں صنعتیں قائم تھیں اس کے اطراف واکناف میں آبادی منتقل ہونے لگی، جس کے سبب یہ علاقے بتدریج شہروں میں تبدیل ہوئے۔ صنعتوں میں مزدوروں کی مانگ میں اضافہ کے ساتھ کاشتکاری کے شعبہ میں مزدور صنعتوں میں منتقل ہونے لگے۔ کوئلہ، فولاد کے صنعتی علاقے قلیل عرصہ میں شہروں میں تبدیل ہوئے۔ دیگر شہروں کی ترقی کے ساتھ ساتھ کارانداز وں نے ٹاون و بازار کی بھی تعمیر کی۔ 1750ء میں برطانیہ کے مانچسٹر (Manchester) شہر میں 17000 افراد تھے۔ بہت ہی قلیل عرصہ میں یہ علاقہ کپڑا صنعت کا مرکز بن گیا۔ 1780ء میں اس کی آبادی 40,000 تھی اور 1801ء میں 70,000 ہوگئی۔ سیاحوں کی آمد سے "Cloud of coal vapor" کوئلہ کی ابر سے آسمان ہوا اور آلودگی میں اضافہ ہوا۔

نئے سماجی طبقوں کا ظہور (Emergence of New Social Classes)

صنعتی انقلاب نے سماج میں وسطی طبقہ کے ساتھ ساتھ ایک جدید طبقہ کو عروج حاصل ہوا۔ وسطی طبقہ جو مزدوروں پر مشتمل تھا ایسے وسط درجہ کے افراد جو صنعتوں، ریل روڈ و دیگر صنعتوں کے مالک تھے ان کی انداز زندگی آرائش و پر تعش تھی۔ جیسے ہی کاشتکار یا مزدور نئے صنعتی شہروں کو منتقل ہوئے تب یہ لوگ فیکٹری میں کام کرنے لگے۔ یہ پریشاں اور مختلف مسائل سے دوچار ہوئے۔ یہ کام کے مشکل شرائط اور غیر کارکرد ماحول سے پریشان تھے۔ ان حالات میں مزدوروں نے صنعت میں کام کرنے کے موافق ماحول اور حالات کو پیش کیا۔ صنعت کے اوقات کار کو موافق بنائے۔ جس سے صنعتوں میں کام کے اوقات اور شرائط کار میں بہتری پیدا ہونے لگی۔

صنعتی وسطی طبقہ (The Industrial Middle Class)

صنعتی انقلاب کے سبب کارانداز وں یا صنعتکاروں کو کافی مالی فوائد حاصل ہوئے۔ صنعتی انقلاب کے ذریعہ سماج میں وسطی طبقہ یا Bourgeoisie وجود میں آیا۔ اس طبقہ کے افراد مختلف حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض لوگ تاجرین جو صنعتوں میں سرمایہ مشغول کیے تھے وہ فوائد حاصل کیے ہیں اور دیگر موجدین یا اختراعی صلاحیت کے حامل تھے۔ انہوں نے جدید ٹکنالوجی کو ایجاد کیے۔ چند لوگ 'Rag to Riches' میں ترقی کیے۔ 15 وسطی طبقہ کے خاندانوں نے پر تعش مکانات، پانی و دیگر سہولتوں میں زندگی گزارنے لگے۔ یہ قیمتی لباس زیب تن کرتے اور اچھی غذا کھاتے تھے۔ یہ جدید درمیانی طبقہ سخت محنت سے اپنے آپ کو آگے بڑھاتے۔ ان میں سے صرف چند افراد کو غربا

سے محبت اور انسانیت و ہمدردی تھی۔ درمیانی طبقہ کے خواتین کام کرنے کے لیے صنعتوں کو نہیں جاتے بلکہ گھر میں بچوں کی پرورش کرتے تھے۔ یہ اپنی دولت اور اپنے بچوں پر توجہ دیتے، مزدور طبقہ کام کرتا اوران کے بچے بھی صنعتی مزدور کا حصہ بن جاتے تھے۔

صنعتی مزدور طبقہ (The Industrial Working Class)

سرمایہ و دولت مند طبقہ کے پڑوس کے قریبی علاقوں میں کثیر مقدار میں مزدور رہا کرتے تھے۔ ان کے علاقے انتہائی گندے اور غیر محفوظ رہتے تھے۔ یہ لوگ چھوٹے ٹین کے روم یا پھر ہمہ منزلہ عمارتوں میں مقیم تھے۔ ان علاقوں میں پانی کی کوئی سہولت نہیں تھی۔ صرف کمیونٹی پمپ سے ہی پانی حاصل کرتے تھے۔ گندے پانی کی نکاسی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ گلیوں میں گندے پانی ٹھہرا رہتا جس سے تعفن پھیلتا تھا۔ گندے نالے بھی دریا میں جا ملتے تھے جو پینے کے پانی کو ناقابل استعمال بناتے تھے۔ جس سے ہیضہ و بخار پھیلنے لگا۔

مزدوروں کا بے سود احتجاج (Workers Stage Futile Protests)

صنعتی انقلاب کے ابتدائی دور میں مزدوروں کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے تجارتی انجمن بنانے کی ممانعت تھی۔ انہیں انجمن بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ سرمایہ دار طبقہ مزدوروں کے حقوق کو پامال کرتے تھے۔ سرمایہ دار طبقہ کے ظلم، کم اجرت اور غیر صحت مند صنعتی کام کے سبب مزدور بدظن ہو چکے تھے۔ ان میں ذہنی طور پر سرمایہ داروں کے خلاف انقلابی خیالات ابھرنے لگے۔ برطانیہ کے صنعتی ملازمین نے خفیہ طور پر اپنی انجمن بنائی۔ یہ مزدور انجمن اپنے حقوق کے تحفظ کی جدوجہد شروع کیے۔ انہوں نے مزدوروں کے لیے اصلاحی اقدامات کی مانگ کی۔ پھر شرح اجرت میں اضافہ اور صنعتی کام میں بہتری کی مانگ کی۔ چونکہ مزدوروں کو کوئی سیاسی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ اسی لیے ان کو مالک نظر انداز کرنے لگے۔ شکست سے دوچار مزدوروں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ 1811 تا 1813 کے دوران برطانیہ میں پہلی مرتبہ صنعتی تشدد واقع ہوا۔ کپڑا صنعتوں میں کام کرنے والے Luddites نے صنعتوں میں جدید مشینوں کی روک لگائی، کیونکہ ان سے بے روزگاری، روزگاری بڑھنے کے امکانات تھے۔ کپڑا صنعت میں موجود مشینوں کو ضائع کرکے جلادے اور اور مشینوں کو ناکارہ بنادے۔ یہ مزدور عام طور پر رات میں نقاب پہن کر کام کرتے تھے۔ Luddite گروپ کی حمایت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ صنعتوں اور فیکٹری میں ان کی تائید ہونے لگی۔ فیکٹری صنعتی شہر کا قلب کہلانے لگا۔ ٹکنالوجی کی ترقی اور تیز رفتار صنعتی ترقی نے مزدوروں کی زندگی کو نئی جہد عطا کی۔

فیکٹری میں مزدوروں پر سخت شرائط (Factory Workers Face Harsh Conditions)

صنعتی انقلاب نے صنعتوں کے قیام کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے استحصال کا سبب بنی۔ مزدور اپنے استحصال کے خلاف متحدہ کوششیں کرنے لگے۔ سرمایہ دار طبقہ اونچا منافع حاصل کرنے کے لیے مزدوروں سے سخت کام لیتے ہوئے سخت شرائط کار مقرر کیے تھے۔ مزدور کو محنت کے مطابق مزدوری حاصل نہیں ہوتی تھی۔ فیکٹری اور فارم یا میں شرائط کار میں کافی فرق پایا جاتا تھا۔ دیہی علاقوں میں عوام سخت محنت کے عادی ہوتے ہیں۔ موسم کے اعتبار سے محنت کیا کرتے تھے۔ دیہی عوام کی زندگی بھی کافی سخت ہوا کرتی تھی۔ یہ لوگ اپنے ذاتی

معاملات اپنی صلاحیت و قوت کے اعتبار سے کام کرتے تھے۔اپنی صلاحیت اور کام میں توازن برقرار رکھتے تھے۔ صنعتوں میں مزدوروں کے لیے سخت اوقات کار مقرر کیے تھے۔مزدوروں کی آمد اور رخصتی کے لیے سیٹی کا انتظام تھا۔وقت پر سیٹی بجتی۔اوقات کار کافی طویل ہوا کرتے تھے۔ شفٹ کے ساتھ ساتھ 12 تا 16 گھنٹے کام کرنا ہوتا تھا۔ ہفتہ میں 6 یا 7 دن کام کرتے تھے۔ صنعتی مالکین کی اجازت پر ہی مزدوروں کو آرام کا موقع ملتا۔دوران کام مزدوروں کو آرام کا موقع بھی فراہم نہیں تھا۔ مسلسل کام کے سبب ملازمین کے تحفظ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ مشینوں کے حادثات واقع ہونے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔حادثات کے سبب مزدور انگلیوں، ہاتھ اور بعض اوقات اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔ کپڑا صنعتوں میں آلودگی کے سبب سانس کے مسائل بھی پیدا ہونے لگے۔ایسے مزدور جو مسلسل بیمار اور حادثات کا شکار ہوتے ہیں انہیں ملازمت سے برخواست کیا جاتا تھا۔ پہلے فیکٹری میں مردوں کے مقابلے میں خواتین مزدوروں کی اکثریت پائی جاتی تھی۔مالکین خواتین مزدوروں کو تقرر کرنا ہی بہتر محسوس کرتے تھے۔کیونکہ خاتون مزدوروں کو آسانی سے کام پر مشغول کر سکتے ہیں۔خاتون مزدوروں کی اجرت مرد مزدوروں کے مقابلے کافی کم بلکہ ان کی مزدوری کا نصف مقرر ہوتا تھا۔اس طرح صنعتوں میں کام کرنے سے خاتون مزدوروں پر دوہرا بوجھ عائد ہونے لگا۔ایک جانب یومیہ 12 گھنٹے کام پر مشغول رہتے اور دوسری جانب وہ کافی تھکے ماندے ہوتے تھے۔ایک کمرے کے گھر میں ایک ہی رہا کرتے تھے۔ مکانات مختصر تھے۔ جس میں تمام افراد خاندان رہتے۔گھر کی صاف صفائی، دھلوائی، بیماری وغیرہ کے سبب ذخمی بھی ہو جاتے تھے۔ فیکٹری میں کئی لڑکے اور لڑکیوں کو بھی ملازمت رکھتے تھے۔یہ کم عمر بلکہ 7 یا 8 سال کی عمر میں مزدوری میں شامل ہوتے تھے اور بعض 5 سال کی عمر میں فیکٹری میں داخل ہوتے تھے۔ کم عمر کے سبب ان لڑکے لڑکیوں کے کمزور ہاتھ انگلیوں سے سخت مشقت کرنے سے ان کی صحت کے مسائل پیدا ہوتے۔ صنعت آلودگی سے ان کے آنکھ کی روشنی بھی متاثر ہونے لگی۔ان کم عمر مزدور بعض اوقات مشینوں کے نیچے ٹوٹے ہوئے دھاگوں کو جوڑنے کا کام لیا جاتا تھا۔

کان کنی کے سخت شرائط (Miners Face Worse Conditions)

صنعتوں یا کان (mine) میں زیر زمین گہرے علاقے میں کام کرنے والے مزدوروں کو کان کن کہتے ہیں۔ صنعتی انقلاب کی بدولت صنعتوں کے قیام کے ساتھ ہی کوئلہ اور لوہے کی مانگ یا طلب میں اضافہ ہونے لگا۔ صنعتوں کے قیام کی ضرورت ہونے لگی۔ طلب کی تکمیل کے لیے کوئلہ ولوہے کی زیادہ پیداوار کے لیے مزدوروں کو کام کے زیادہ گھنٹے مقرر کرنے لگے اور سخت کام کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ زیرزمین گڑھوں میں بغیر تکنیکی سہولتوں کے مزدور کوئلہ نکالتے تھے۔ جس کے سبب مزدوروں کو تنفس مسائل پیدا ہونے لگے۔اس کے ساتھ ساتھ زیرزمین علاقوں میں سرنگ میں دھاکہ ہونے، مٹی کے تودے گرنے اور ہوا کی عدم فراہمی سے سانس رکنے کے مسائل کے خطرات بھی پائے جاتے تھے۔لڑکے وخواتین پر ان کی صلاحیت سے زیادہ وزن کے سامان اٹھانے پر مجبور کرتے تھے۔ بعض اوقات کم علاقہ یا جگہ پر محنت کرواتے تھے۔اوپری منزل تک سیڑھی کے ذریعہ وزنی سامان کو منتقل کرواتے تھے۔بچوں کو کانوں میں کام کرنے کے بھی سخت شرائط تھے۔ بعض اوقات اندھیرے یا کم روشنی میں بھی کام کروایا جاتا تھا۔ہوا کے داخل ہونے کے چھوٹے راستوں کے ذریعہ روشنی حاصل کرتے، شدید گرمی کے موسم میں بھی کوئلہ کی گاڑیوں کو ڈھکیلتے تھے، جس جگہ پر بچے والدین کے ساتھ فارم ہاوس میں کام کیے تھے۔اسی لیے

والدین بھی فیکٹری میں بچوں کو کام کرنے کے لیے بچہ مزدوروں (child labour) کے نظریہ کو قبول کیا۔ بچوں سے حاصل اجرت سے ان کی زندگی کو سہارا ملتا تھا۔ 1800ء میں بچہ مزدوری میں اصلاحات کا قانون "Factory Acts" پاس ہوا۔ اس قانون کے مطابق بچوں کے اوقات 12 گھنٹے مقرر کرتے ہوئے 8 اور 9 سال سے کم عمر کے بچوں کو فیکٹری میں کام کروانے پر پابندی عائد کی گئی۔ 1830، 1840 میں فیکٹری ایکٹ کی عمل آوری کی نگرانی کے لیے فیکٹری میں انسپکٹر کو مقرر کیا گیا۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ہی فیکٹری ایکٹ میں تبدیلی لائی گئی۔

7.6.2 سیاسی اثرات (Political Impact)

صنعتی انقلاب سیاست پر بھی اثرانداز ہونے لگی۔ علاقائی اور عالمی سطح پر سیاسی تبدیلیاں واقع ہونے لگے۔ صنعتی انقلاب کے سبب آفریقہ اور ایشیاء میں نو آبادیات وجود میں آئے۔ یورپ میں صنعتوں کے قیام کے سبب انہیں خام مال کی فراہمی اور تیار مال کی فروخت کے لیے بازار کی تلاش تھی۔ اسی مقصد کے تحت صنعتی ممالک نے انیسویں صدی میں عالمی سطح پر نو آبادیات قائم کیے۔ صنعتی ممالک نے عالمی سطح پر نو آبادیات قائم کیے۔ جس کے سبب حقیقت میں صنعتی ممالک نے عالمی سطح پر اپنے آپ کو وسعت دینے لگے۔ نو آبادیاتی نظام کے متعلق ایک مورخ لکھتے ہیں کہ 'The greatest land grab movement in the history of the world' عالمی سطح پر یہ ایک بڑی یا وسیع زمین پر قبضہ کرنے کی تحریک ہے"۔ نو آبادیاتی نظام نے مقامی عوام پر بالعکس اثرات مرتب کیے۔ جس کے نتیجہ میں مقامی عوام کا استحصال کیا گیا۔ ان علاقوں میں یورپی نو آبادیات قائم کیے گئے۔ دوسرے اعتبار سے صنعتی انقلاب نے عالمی سطح پر ممالک کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا۔ صنعتی اعتبار سے طاقتور خود مکتفی ممالک، زرعی و کمزور ممالک سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی فاضل رقومات اور ٹکنالوجی کے ذریعہ ایسے ممالک میں صنعتیں قائم کرنے لگے۔ وہاں کے قدرتی وسائل کا استحصال کرنے لگے۔ اس پس منظر میں عالمی سطح پر دنیا ترقی یافتہ (Developed) اور ترقی پذیر (Under Developed) دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ جس کے سبب ہر دونوں گروپ میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ نتیجتاً تیسرے مرحلے میں صنعتی انقلاب کے سبب کئی یورپی اقوام سمندر پار کرتے ہوئے امریکہ اور آسٹریلیا میں مقیم ہونے لگے اور ان ممالک میں اپنی یورپی تہذیب کو پھیلایا۔ 1820 میں 1,45,000 اور 1900 اور 1910 کے دوران 9 ملین افراد نے یورپ سے نقل مکانی کی۔

چوتھے درجہ میں صنعتی انقلاب کے سبب برطانیہ میں اصلاحی اقدامات کے خلاء کو پر کیا۔ 1833-45 کے درمیان مزدوروں کی فلاح و بہبودی اور کام کے اوقات میں بہتری پیدا کرنے کے لیے کئی فیکٹری قوانین بنانے لگے، جس کے ذریعہ 11 سال سے کم عمر بچوں کے صنعتی اوقات کو یومیہ 9 گھنٹے مقرر کیے گئے اور خواتین کو یومیہ 12 گھنٹے کام کے مقرر کیے گئے۔ یہ قانون بچوں پر مزدوری پر پابندی کے ساتھ ساتھ مزدوروں کی صحت اور حفاظت پر بھی توجہ دی ہے۔ شمال برطانیہ میں صنعتوں کے قیام کے سبب جنوبی برطانیہ سے عوام شمال کی جانب ہجرت کرنے لگے۔ جنوب میں گھٹتی آبادی اور شمال میں بڑتی آبادی کے باوجود پارلمنٹ میں قدیم اصول کے مطابق اراکین کو روانہ کیا گیا۔ نئے قائم ہونے والے صنعتی علاقوں کی جانب سے کوئی رکن کو نامزد نہیں کیا گیا۔ جس کے سبب جدید طرز پر اراکین کو نامزد کرنے کا مطالبہ کیا

گیا۔ پانچویں مرحلے میں مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے 'Chartist Movement' شروع کی گئی۔ مزدوروں کے لیے یکساں اصول، مساوی اجرت، ووٹ میں رازداری، انتخابی حلقے، اراکین کے لیے کوئی قابلیت لازمی نہیں۔ رکنیت کی ادائیگی اور سالانہ انتخابات وغیرہ مطالبات رکھے گئے۔ ان مطالبات کے تعلق سے حکومت نے کسی قسم کا تعاون نہیں کیا۔ لیکن اگلے دور میں بتدریج مطالبات زیر بحث آتے رہے۔ اس طرح صنعتی انقلاب کی بدولت برطانیہ میں جمہوریت کو فروغ حاصل ہوا۔

سیاسی اعتبار سے صنعتی انقلاب کے سبب مضبوط تجارتی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا۔ مزدور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے مختلف زمروں کے مزدوروں نے اپنی تجارتی انجمن قائم کرنے لگے۔ ابتداء میں انگریزی قانون انجمنوں کو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن 1824ء میں بتدریج تسلیم کیا گیا۔ تجارتی انجمنوں کے درمیان اتحاد کا فقدان تھا، جس کے سبب یہ اپنی طاقت کو ظاہر کرنے سے قاصر رہے۔ انیسویں صدی میں General Federation of British Trade Union کا قیام عمل میں آیا جو یورپی ممالک اور انجمنوں سے بہتر تعلقات قائم کیے۔ انیسویں صدی کے آخر میں تجارتی انجمن کو مضبوط سیاسی موقف حاصل ہوا اور سماج میں اپنی اہمیت کو اجاگر کیا۔ بالآخر صنعتی انقلاب نے نئے سماجی و معاشی ترقی کے لیے راہیں ہموار کیے۔ سرمایہ دار کے قائل فلاسفوں جیسے مالتھس، ریکارڈو اور جیمس مل چاہتے تھے کہ حکومت سماجی و معاشی معاملات میں دخل اندازی سے پرہیز کریں۔ دوسری جانب رابرٹ اوون(Robert Owen)، کارل مارکس، ولیم گاڈون (William Godwin)، پرودھن (Proudhon) وغیرہ مفکروں نے اشتراکیت نظریہ کی وکالت کی، تاکہ سماج کا ہر فرد ترقی کر سکے۔ اس سماجی اخلاقی اقدام کے فروغ کے ساتھ معیار زندگی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ رابرٹ اوون نے سماجی امداد کے لیے ایک صنعت قائم کی۔ جس میں خاندان کے افراد صنعتی کام میں حصہ لیتے ہوئے صنعتی پیداوار سے مستعفید ہوتے ہیں۔ کارل مارکس کے نظریہ کے سبب اشتراکیت کو ترقی حاصل ہوئی۔ انہوں نے صنعتی انقلاب کے سبب پارلمنٹ کی رپورٹ کے ذریعہ وضاحت کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے بجائے اشتراکیت کی بدولت سماجی ترقی حاصل ہوتی ہے۔

7.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اٹھارہویں صدی میں صنعتی انقلاب کے سبب نبی نوع دنیا کے دور میں داخل ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف دور میں برطانیہ میں جدید مشینوں کی اختراع و ایجادات نے طریقہ بند اور -- میں جدیدیت اپنانے لگے۔ صنعتوں میں جدید مشینوں کو اختیار کرنے سے کم وقت اور کم لاگت میں معیاری اشیائے صارفین کی پیداوار ہونے لگی۔ جدید مشین یا اختراعی صلاحیت انسان کی ایجاد کردہ ہیں۔ ایجادات مسلسل و متواتر وجود میں آنے لگے۔ مشنریوں کی جدید ایجادات کو صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔ صنعتی انقلاب کے سابقہ دودہوں میں صنعتی انقلاب مختلف مراحل سے گزرا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف حصے میں برطانیہ میں صنعتی انقلاب وجود میں آیا۔ یہ صنعتی انقلاب و ایجادات کا نیا دور تھا۔ جس نے اپنی تاریخ بنائی ہے۔ مادی ترقی کے ساتھ ساتھ مزدوروں کی فلاح و بہبودی و انسانیت کو بھی جلا بخشی اور زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔ خاص کر اوسط آمدنی والے طبقہ میں پائیدار ترقی اور آبادی میں اضافہ جیسے اشارے ملتے ہیں۔ بعض مورخین کے مطابق صنعتی انقلاب کے

سبب مغربی دنیا میں پہلی بار عام عوام کی معیار زندگی میں مسلسل بہتری پیدا ہونے لگی۔ اور بعض کے مطابق انیسویں اور بیسویں صدی تک معیار زندگی میں منخی خیز تبدیلیاں وجود میں نہیں آئے۔ انقلابات فرد کی زندگی کے ہر پہلو کے ساتھ ساتھ ملک کے و عالمی سطح پر تہذیب و تمدنی تبدیلیاں واقع ہوتے ہیں۔

صنعتی ترقی نے صنعتیانے کے عمل کو تیزی سے ترقی راہ پر گامزن کیا۔ صنعتوں کے قیام اور اس کے استحکام کی کوشش کی گئی۔ صنعتوں کے قیام کے سبب سماج کے مختلف اثرات مرتب ہونے لگے۔ صنعتکاروں کو سرمایہ کاری کا ایک بہترین ذریعہ حاصل ہوا اور مزدوروں کو اپنے استحصال کے سبب مشکلات سے دوچار ہیں۔ 1800ء میں صنعتیانے کا عمل یا صنعت کاری سے عوام اور مختلف مرحلوں میں زیر بحث موضوع بنا ہوا ہے۔ آیا صنعتیانے نے سماج پر مثبت اثرات عائد کیے ہیں یا پھر اس سے منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ صنعتیانے کے ابتدائی مراحل میں کافی سخت مشکلات سے گزرنا پڑا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اصلاح کاروں نے صنعتی کام میں اصلاح کرنے لگے۔ صنعتی قوانین کے ساتھ ایام کار مزدوروں کے اوقات کار، شرائط کار وغیرہ متعین کیے گئے۔ صنعتی کام کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے صنعتی قوانین کی ترمیم کی گئی۔ مزدوروں کو اپنی مزدور انجمن بنانے کے حقوق حاصل ہوئے۔ انجمن کے ذریعہ آجروں (مالکین) سے گفت و شنید کے ذریعہ سودے بازی کرنے کا حق حاصل ہوا۔ مزدور انجمن مزدوروں کی فلاح و بہبودی، بہتر اجرت کی شرح، شرائط کار، کام کے گھنٹے، ووٹ کا حق وغیرہ معاملات میں مزدوروں کو حقوق حاصل ہوئے۔ جس کے سبب مزدور انجمن کو سیاسی طاقت حاصل ہوئی۔ صنعتی انقلاب کے سبب سماجی مسائل کے پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ کم اجرت مزدوروں کے ساتھ امتیاز ناقص شرائط جیسے مسائل پیدا ہونے لگے۔ صنعتی ترقی یا صنعتیانے کے عمل سے کچھ مثبت اثرات بھی عائد ہونے لگے۔ پیداوار کو بڑھانے کے لیے جدید صنعتیں قائم ہونے لگے۔ جس کے سبب مزدوروں کو روزگار کے نئے مواقع حاصل ہوئے۔ شرح اجرت میں اضافہ کے ساتھ مزدوروں کی آمدنی میں اضافہ اور معیار زندگی میں بہتری پیدا ہونے لگی۔ گھریلو غذائی ضروریات کے اخراجات ادا کرنے کے ساتھ ساتھ گھر کا کرایہ ادا کرنے لگے، اخبار خریدنے لگے، ساتھ ہی ذہنی سکون کے لیے میوزک ہال کو جانے لگے۔ سفری مصارف میں کفایت کے ساتھ افراد خاندان سے ملاقات کے لیے سفر کرنے لگے۔ مزدوروں کو ترقی کے موزوں مواقع حاصل ہوئے۔

7.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

صنعتی انقلاب	:	ایسا انقلاب جس میں حیوانی محنت کی جگہ ایندھن سے چلنے والی مشینوں سے کام لیا جائے۔
بورژوازی	:	(Bourgeoisie) سماج کا متوسط یا درمیانی طبقہ
صنعتی مزدوری	:	کسی صنعت میں کارخانے میں ایک مالک کے تحت کام کرکے کچے مال کو پیداوار میں تبدیل کرنا۔
بچہ مزدوری	:	بچوں سے کارخانہ یا فیکٹری میں کام کرانا۔

7.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. عالمی سطح پر صنعتی انقلاب کی اصلاح کو کس نے استعمال کیا؟
2. عالمی سطح پر پہلی بار صنعتی انقلاب کہاں پر وجود میں آیا؟
3. Yarn Spinning Machine کا موجد کون ہے؟
4. بھاپ کا انجن (Steam Engine) کا موجد کون ہے؟
5. Crude Power Loom کا موجد کون ہے؟
6. آرک رائٹ (Arkwright) کون ہے؟
7. صنعتی انقلاب سے قبل صنعت کاری کے کون سے دو طریقے رائج تھے؟
8. ابراہم ڈربائی کون ہے؟
9. ٹیلی فون کا موجد کون ہے؟
10. Bourgeoisie سے کیا مراد ہے؟

7.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. کپڑے کی صنعت میں صنعتی انقلاب پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. کان کنی پر صنعتی انقلاب کے اثرات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. کپڑے کی صنعت میں نئے ایجادات کی وضاحت کیجیے۔
4. حمل و نقل پر صنعتی انقلاب کے اثرات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
5. صنعتی انقلاب کے سبب مواصلاتی نظام میں تبدیلیوں کی وضاحت کیجیے۔

7.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے اسباب کی وضاحت کیجیے۔
2. صنعتی انقلاب کے اثرات کی وضاحت کیجیے۔
3. براعظم یورپ کے دیگر ممالک میں صنعتی انقلاب کے پھیلاؤ کی وضاحت کیجیے۔

7.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Droz, Jacques, *Europe between Revolutions, 1815–1848*, Fontana Press, London, 1967.
2. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
3. Gottlieb, Anthony, *The Dream of Enlightenment*: *The Rise of Modern Philosophy*, Penguin, UK, 2017.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
6. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.

اکائی 8۔ جمہوری تصور اور آئینی ارتقاء

(Democratic Concept and Constitutional Developments)

اکائی کے اجزاء

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 پس منظر

8.2.1 قدیم دنیا میں جمہوریت

8.2.2 عہدِ وسطیٰ کی دنیا میں جمہوریت

8.2.3 جدید آئین

8.3 برطانیہ میں جدید جمہوریت کی نشوونما

8.3.1 شاندار انقلاب: اسباب اور اثرات

8.3.2 دستوری بادشاہت کا قیام

8.4 جدید سیاسی تصورات کی نشوونما

8.4.1 جان لاک

8.4.2 جان اسٹورٹ مل

8.4.3 بنجامن کانسٹنٹ

8.4.4 تھامس ہابس

8.4.5 روسو

8.5 یورپ کے دیگر ممالک میں جمہوریت

8.5.1 فرانس

8.5.2 جرمن

8.5.3 اطالیہ

8.6 جدید سیاسی یورپ کے اثرات
8.7 اکتسابی نتائج
8.8 کلیدی الفاظ
8.9 نمونہ امتحانی سوالات
8.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید(Introduction)

جمہوریت کا لفظ یونانی زبان ڈیماس(Demos) سے ماخوذ ہے، جس کے معنی عوام (People) اور Kratos کے معنی اصول(Rule) کے ہیں، یعنی جمہوریت ایک ایسی طرز حکومت ہوتی ہے جس میں اقتدار اعلیٰ عوام اور اُن سے منسلک کمیونٹی کے ہاتھوں میں مرکوز ہوتا ہے۔ جمہوریت ایک ایسا سیاسی نظام ہے جہاں پر عوامی فیصلہ ادارے، تنظیم اور ریاست کے لیے کیے جاتے ہیں۔ جدید جمہوریت ابتدائی زمانے کی طرز حکومت سے مختلف ہیں۔ عوام ہی اپنے سماج کے حق میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اور عالمی سطح پر بھی ایسے ہی جمہوری ریاستوں کی تشکیل دیتے ہیں۔ موجودہ جمہوریتیں اشرفیاء اور بادشاہی نظام سے مختلف ہوتیں ہیں۔ کیونکہ بادشاہت میں اقلتیں برسراقتدار ہوتی ہیں۔ اور بادشاہ ہی حکومت کرتا ہے۔ جمہوریت کی نشوونما کے لیے قدیم عہد کے یونانیوں نے بہت کوششیں کیں اور اٹھارہویں صدی کے دانشوروں نے بھی اس کو قدیم یونانیوں کے نظریے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ جمہوریت پچھلے ادوار کی بادشاہی نظام سے مختلف رہی۔ اٹھارہویں صدی میں سیاسی کشمکش کے نتیجہ میں جمہوریت پسندوں نے جمہوری تصورات کو قدیم یونانیوں کے تصورات سے ہم آہنگ کیا اور اسے غلبہ حاصل ہوا۔ تین سو سال تک اس نظام پر بحث ومباحثہ ہوتا رہا۔ آخری میں جمہوری تصورات اور اداروں کو قائم کرنے میں عوام کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اور بادشاہت کے نظریہ کو شکست ہوئی۔ یہ تبدیلی خاص کر دوسری جنگ عظیم کے بعد رونما ہوئی۔ جدید جمہوری بردار دانشوروں نے جمہوریت کے نظریہ کو ''فطری ریاست'' اور ''آمریت کی گرفت'' کے نظریوگں کے اندر مطالعہ کیا۔ انہوں نے بادشاہت کے اختیارات کو کم اور عوامی اختیارات کو زیادہ اہم قرار دیا۔ انہوں نے عوام کو اس بات کا اختیار دیا کہ وہ اپنے نمائندوں کا ووٹ کے ذریعہ سے انتخاب کریں۔

اصطلاح 'Constitution' لاطینی لفظ 'Constitutio' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ترتیب دینے کے ہیں۔ اس اصلاح کو شاہی قوانین کی طرح اصولوں، ضابطوں اور احکامات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ Principles یہ اصطلاح رومی زبان میں دستور یا آئینی اصولوں کو ظاہر کرتی ہے۔ Edicta ایک رومی لفظ ہے جس کے معنی حکمنامہ یا تحریری احکامات کے ہیں۔ اہم معاملات میں سرکاری اعلان جس کو حکمران جاری کرتا ہے۔ Mandata رومی لفظ ہے جس کے معنی ہدایت کے ہیں، جو بادشاہ یا حکمران اپنے ماتحتین یا گورنروں کو وقتاً فوقتاً دیتا ہے۔ Decreta ایک رومی لفظ ہے جس کے معنی فیصلہ ہے جس میں حکمران یا بادشاہ بحیثیت جج کے حتمی فیصلہ لینے کا اختیار رکھتا

ہے۔ Rescripta ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی تحریری شکل میں ماتحتین سے جوابات طلب کرنا ہے۔ بعد میں اس اصطلاح کی قانونی اور کلیسائی تصدیق کی جاتی ہے۔اسی وجہ سے ان تحریروں کو 'حواریانہ تحریریں' یا 'رسولی آئین' کا نام دیا گیا۔ لفظ Apostolic عیسائی مذہب کے قائد یعنی پوپ (Pope) کے لیے استعمال ہوا ہے اور Apostolic Constitution اُن کی تصدیق شدہ تحریروں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مختصراً آئین اُن تمام بنیادی اصولوں اور طریقوں کا مجموعہ ہے جن کو قانون اور کلیسا نے درست مانا ہے۔ برطانیہ (United Kingdom) کا دستور اس لیے غیر ترمیمی (Uncodified Constitution) مانا جاتا ہے کیونکہ یہ کلیسائی تحریروں کے بدلے میں پارلیمانی فیصلوں، عدالتی فیصلوں یا معاہدوں کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ دستور یا آئین مختلف اداروں، درجوں، سطحوں یا مراحل پر مشتمل ہوتا ہے، جس کو مختلف ممالک اور خود مختار تنظیمیں رائج قوانین کی روشنی میں تیار کرتے ہیں۔ بین الاقوامی تنظیموں کا بھی اپنا آئین ہوتا ہے اور مختلف ممالک کا بھی ایک تحریر شدہ دستور ہوتا ہے۔ ان ممالک میں رائج اصول صرف اندرون مملکت کے متعلق ہی درج ہوتے ہیں۔ چند اصول ان ممالک کی کارکردگی پر پابندیاں بھی عائد کرتے ہیں تاکہ حدود کو تجاوز نہ کیا جائے۔ مثلاً شہریوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ پر ترمیم ممکن نہیں، اس پر حکومتیں تبدیلیاں نہیں لاسکتی۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- جمہوریت اور دستور کا مفہوم اور اس کا پس منظر سمجھ سکیں گے۔
- برطانیہ میں دستوری بادشاہت کی نشوونما کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- یورپ کے مختلف ممالک میں دستوری حکومتوں کے قیام سے واقف ہو سکیں گے۔
- جدید سیاسی تصورات اور اداروں کے نشوونما کو جان سکیں گے۔

8.2 پس منظر (The Context)

عالمی سطح پر جمہوریت کے عروج اور اس کے مدارج پر مطالعہ کے لیے اس کے آغاز وارتقاء پر روشنی ضروری ہے۔ ذیل میں مختلف طرز کی جمہوری عملوں کے ارتقاء کے بارے میں ذکر موجود ہے۔

8.2.1 قدیم دنیا میں جمہوریت (Democracy in the Ancient World)

اصطلاح Democracy قدیم یونانی عہد میں سیاسی وفلسفیانہ فکر کے تحت ایتھنس (Athens) میں وجود میں آیا۔ یہ عمل کلائس تھنیس (Cleisthenes) کے زیر نگرانی 508 تا 501 قبل مسیح میں شروع ہوا۔ کلائس تھنیس کو ایتھنس کی جمہوریت (Athenian Democracy) کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ وہ جمہوری اصلاحات کی بدولت ہی مشہور ہوا۔ اُس نے ہی شرفا

(Nobles)کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ لفظ Democracy کو پہلی مرتبہ 430 قبل مسیح میں اولین مورخ ہیروڈٹس (Herodotus)کی کتاب تاریخ *Histories* میں استعمال کیا گیا تھا۔ وہ ایک مشہور مورخ یا تاریخ داں تھا۔

یونانی جمہوری نمونہ: ایتھنس (Athens) میں رائج جمہوریت راست جمہوریت تھی۔ کیونکہ یہاں پر اہم سرکاری اور عدالتی عہدوں پر فائز افراد کا انتخاب پڑیوں کی اتفاق رائے سے ہوتا تھا۔ اور قانون ساز اسمبلیوں کے ارکان کا انتخاب حق رائے دہی سے ہوتا تھا۔ شہریت کا حق رکھنے والے ملکی مسائل اسمبلیوں کے اندر اور باہر کر سکتے تھے۔ بھلے ہی عورتیں، غلام اور غیر ملکی باشندے ان حقوق سے محروم تھے اور یہ کہ ہر 4 ایتھنس کے باشندوں میں خالی شہری کو شہریت کا حق حاصل تھا، کیونکہ شہریت کا اعزاز جنگی ذمہ داریوں سے منسلک تھا۔ اس کے لیے زمین یا مکان کی ملکیت بے معنی تھی۔ بہر حال ایتھنس کی جمہوریت اس لحاظ سے اہم تھی، کیونکہ یہاں پر شہری اپنی نمائندہ اسمبلیوں کے ذریعہ سارے ملک کے سیاسی، عدالتی، اقتصادی اور سماجی ڈھانچوں کو کنٹرول کرتے تھے۔ قدیم یونانی میں لفظ "Right" کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ لیکن ایتھنس شہری آزادی کے حقوق سے مستفید ہوتے۔ بھلے ہی اُن کو حکومت کی مخالفت بلکہ تائید کرنے کی رواداری تھی۔

اسپارٹن جمہوری نمونہ: اسپارٹا (Sparta) ایک یونانی شہر ہے جو ضلع Locania کی راجدھانی ہے۔ یہ علاقہ جزیرہ نمائے پیلوپونیز (Peloponnese) کا جنوبی علاقہ رہا ہے۔ یہاں پر بقول Sinslevoting ساتویں صدی قبل مسیح میں انتخابات کا طریقہ رائج تھا۔ اور یہاں کی عوامی قانون ساز اسمبلی کو Spartan Ecodesia کے نام سے جانا جاتا تھا، جس کی میٹنگ ہر مہینے میں ہوا کرتی تھی اور جس کے اراکین کا انتخاب ہر 20 سالہ شہری حق رائے دہی سے کرتا تھا۔ اس کے انتخاب کا طریقہ کار رائج تھا، یعنی وہ دوسرے شہری ووٹروں سے مل کر قانون ساز اسمبلی میں ایک مخصوص امیدوار کے حق میں چلا چلا کر حمایت کرتا تھا، جس سے اسمبلی کے اندر زبردست شور و غل ہوتا تھا اور جس کو مشہور مفکر ارسطو (Aristotle) ایک 'بچکانہ' حرکت سے تعبیر کرتا ہے۔ اس اسپارٹائی انتخابی عمل کے مقابلے ارسطو ایتھنس کے انتخابی عمل کو زیادہ مناسب سمجھتا تھا، کیونکہ ایتھنس میں اسٹون بیلٹنگ (BallotingStone) کے طریقہ کار سے ایک امیدوار کا انتخاب کیا جاتا تھا، یعنی یہاں پر قیمتی پتھروں کی گنتی، شور و غل کا متبادل تھا۔

رومی جمہوری نمونہ: اگرچہ رومی حکومت کا جمہوریت کے فروغ و نشو و نما میں اہم کردار رہا ہے۔ تاہم وہاں کا اقلیتی طبقہ ہی ووٹ ڈالنے کا حق رکھتا تھا۔ ان کے ووٹ کی طاقت اس لیے کافی زیادہ تھی، کیونکہ یہ کافی بااثر طبقہ تھا۔ یہ زیادہ تر اعلیٰ عہدیداروں، سینٹ (Senate) کے اراکین، امراء اور شرفاء سے بنا ہوا تھا۔ بھلے ہی رومی بادشاہت کا نظام مغربی ممالک کو ناپسند تھا، تب بھی مغربی دانشوروں پر رومی مفکروں کا بہت اثر تھا۔ مختلف مغربی ممالک میں یونانی نمونہ کے مقابلے میں رومن جمہوری عمل کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا، کیونکہ رومن نظام میں عوام اور منتخبہ نمائندوں کو حکومت سازی کا پورا اختیار تھا۔

دیگر جمہوری نمونہ: ویشالی (Vaishali) ہندوستانی وجیکا (Vajjika) کا صدر مقام تھا۔ یہ بھی ساتویں صدی ق م کے جمہوری طرز عمل کا نمونہ تھا۔ اسی طرح سے امریکاس (Americas) کا اروکیوس نیشن (Iroquois Nation) بارہویں صدی کا ایک جمہوری

نمونہ تھا۔ جبکہ امریکیوں کے مغرب سے قطعی کوئی روابط نہیں تھے۔ براعظم شمالی امریکہ میں پانچ چھوٹے ریاستوں کے مجموعہ کو Iroquois Nation یا Haudenosaunee کے نام سے بلایا جاتا ہے۔ان پانچ ریاستوں کا منجملہ ایک ہی قانون تھا۔1450 تا1660 کے دور میں امریکہ میں اروکیوس قوم نے جمہوری طرز حکومت قائم کی جو آج تک باقی ہے۔یہ جمہوری طرز کی قدیم ریاستیں یہ ظاہر کرتی ہے کہ دنیا کے مختلف تہذیبوں یا سوسائٹیوں نے جمہوریت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

8.2.2 عہدِ وسطیٰ کی دنیا میں جمہوریت (Democracy in the Medieval World)

عہد وسطیٰ کے دور میں یورپ کے بیشتر علاقوں میں کلیسائی(Clerical) یا جاگیر داری(Feudal) حکومتیں قائم تھیں، جن میں مختلف طرز کی حکومتوں کا نظام رائج تھا۔ انتخابات اور اسمبلی بھی وجود میں تھیں، حالانکہ ان لوگوں کی آبادی بہت کم تھی۔ اسکنڈی نیویا (Scandinavia) براعظم یورپ کا علاقہ ہے۔یہ ناروے، سویڈن اور فن لینڈ پر مشتمل ہے۔اس علاقے میں مختلف اداروں پر سرکاری عہدیدار فائز تھے اور یہاں پر سوچ بچار کے لیے باضابطہ ادارے بنے تھے تاکہ پیچیدہ سیاسی مسائل کا حل اتفاق رائے سے نکالا جائے۔اس جیسے ادارے آئس لینڈ، فیرو آئی لینڈ اور مشرقی یورپ کے علاقوں میں بھی کارفرما تھے۔کیتھولک کلیسا میں 1059ء سے پوپ کا انتخاب پاپائی کنکلیو (Papal Conclave) کی مدد سے کیا جاتا تھا۔کارڈینلس(Cardinals) یورپ کے کونسلرس ہوتے تھے۔کیتھولک کلیسا میں پوپ کو اونچا مقام حاصل تھا۔ یورپ کی پہلی پارلیمانی باڈی کو Cortes of Leon کے نام سے جانا جاتا تھا۔ Leon اسپینی حکمراں تھا اور Cortes پارلیمنٹ کا سرکاری نام تھا۔اس کے دو ایوان تھے۔Cortes کا اختیار کافی وسیع تھا۔ محصول کا حصول، وزرائے خارجہ، اسمبلی کا انعقاد وغیرہ، لیکن پارلیمنٹ کے اختیارات کی قطعیت پر اختلاف رائے ہے۔

1358ء میں Republic of Ragusa کا قیام عمل میں آیا۔ جو شہر Dubrovnik کے اطراف میں واقع ہے۔اس میں خالی مرد اشرافیہ کو ووٹ کا حق حاصل تھا۔ مختلف اطالوی ریاستوں میں بھی عوامی جمہوریہ حکومتیں قائم تھیں جیسے کہ جمہوریہ فلورنس (Republic of Florance) جس کا قیام 1115ء میں ہوا اور جس کی پارلیمانی باڈی کے اراکین کو قرعہ اندازی (Signoria) کے ذریعہ Sortition کی بنیادوں پر منتخب کیا جاتا تھا۔ اطالوی ریاستوں میں حکمرانی کے اداروں کو Signoria کہتے ہیں۔یہ ایک اطالوی لفظ ہے۔ دسویں تا پندرہویں صدی عیسوی میں Frisia میں غیر جاگیر دارانہ نظام تھا۔ یہاں پر حق رائے دہی کی بنیاد زمین کی ملکیت پر تھی۔ ان مالکان کو مقامی و ملکی معاملات میں ووٹ کا حق حاصل تھا۔ جنوبی افریقہ کی مملکت مالی (Mali) ایک طاقتور ریاست تھی۔ یہاں کے حکمراں Kouroukan Fouga نے سلطنت کو حکمران قبیلوں میں تقسیم کیا تھا جن کے منتخبہ نمائندے اسمبلی یعنی 'Graba' میں نمائندگی کرتے تھے۔مالی کا چارٹر دستور بادشاہی دستور سے مشابہت رکھتا تھا۔

برطانیہ کی حکومت پہلے سے جمہوری قدروں کو مانتی تھی۔ انسانی حقوق کے تحفظ اور آزادی کے لیے 1215ء میں یہاں کے بادشاہ جان نے ایک تاریخی منشور Magna Carta Libertatum کے نام سے اپنایا، جس میں انہوں نے عوامی حقوق و اختیارات کو ایک

قانونی شکل دے دی۔ اس کو Royal Charter بھی کہتے ہیں اور اس میں عام لوگوں کے ساتھ جیل میں بند قیدیوں کے حقوق آزادی اور اپیل کا بھی ذکر موجود ہے۔ 1265 میں برطانیہ کی پہلی قومی اسمبلی کو Simon de Montfort کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس قومی اسمبلی کو انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے بطور پلیٹ فارم استعمال کیا گیا۔ بھلے ہی پارلیمنٹ کو طلب کرنے کا اختیار بادشاہ کو ہوتا تھا۔ عہد وسطیٰ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ میں پارلیمانی اور جمہوری اداروں کا قیام اور عام شہریوں کے حقوق کے تحفظ کا ارتقاء نئے سماجی طبقوں کے وجود سے عمل میں آیا، جن میں آرٹسٹ، فن کار، کاریگر، امراء اور مذہبی دانشوروں اور اسکالرس موجود تھے۔ اس کا یورپی سیاسی تقسیم کاری کے ساتھ بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ تعرلق رہا ہے۔ اس ضمن میں ماہر سیاسیات David Stasavage کا عقیدہ برمحل لگ رہا ہے کہ یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی تقسیم کاری نے جمہوری عمل کو فروغ دیا ہے۔

وسیع رومی سلطنت کو جرمنی کے مختلف قبائلی گروپس نے فتح کیا۔ جس کے سبب چھوٹی چھوٹی ریاست اس براعظم میں محدود علاقوں پر نمودار ہوئیں۔ یہ سیاسی اعتبار سے غیر مستحکم اور کمزور تھیں۔ ان کی استحکام کے لیے رومی بادشاہوں کی حمایت لازمی تھی۔ پولینڈ ایک جمہوری ریاست تھی، جس کے چلانے میں متوسط امراء کا اہم کردار تھا اور جو بڑے آرمیوں (Magnets) کے سیاسی اقتدار کو کمزور کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کیونکہ Magnets سارے اہم اداروں کو کنٹرول میں کیے تھے، جن میں Senate ایک اہم جمہوری ادارہ تھا۔ بہر حال متوسط امراء کی بدولت ہی لوکل اسمبلی (Sejmir) کا قیام وجود میں آیا تھا۔ جس کے اختیارات میں وقت گذرنے کے ساتھ کافی پھیلاؤ ہوا۔ پندرہویں اور سولہویں صدی کے بیچ میں Sejmirs ایک علاقائی طاقت کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ 1454 میں پولینڈ کے حکمراں نے ان کے اختیارات اتنے وسیع کیے تھے کہ کوئی بھی قانون ان کی رضامندی کے بغیر چلایا نہیں جا سکتا تھا۔

8.2.3 جدید آئین (Modern Constitution)

1934ء میں سویڈن کی شاہی حکومت نے Instrument of Government کو اختیار کیا جو سویڈن کا پہلا تحریر شدہ دستور ہے، جس کو سویڈن کے لارڈ ہائی چانسلر Axel Oxenstierna نے بادشاہ Gustavus Adolphus کے انتقال کے بعد مرتب کیا تھا۔ اس کو بہت ساری جدید مملکتوں نے بھی اپنایا۔ یہ شمالی امریکہ کے دستور کا پہلا حصہ تھا اور امریکی ریاست کنکٹی کٹ میں 1639ء سے رائج تھا۔ اس کے لیے برطانوی حکمراں Oliver Cromwell نے پہلا تحریری آئین بنوایا، جس کو Instrument of Government کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس دستور سے کرام ویل کو کنکٹی کٹ پر حکومت کرنے کا ایک قانونی جواز مل گیا اور وہ اس دستور اور پارلیمانی کامیابی کی وجہ سے کافی مشہور ہوا۔ اس دستور کو مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے 1657–1653 کے عرصے میں بتدریج اختیار کیا۔ اس کی وجہ سے یورپ میں بہت ساری جمہوری قدریں جنم پائی۔ 1653ء میں میجر جنرل جان لمبر (Major General John Lambert) نے Instrument of Government کو انگلش پارلیمنٹ سے پہلی بار تصدیق یا پاس کرایا۔ لیکن 1657ء میں پارلیمنٹ نے اس کے بدلے میں ایک نیا دستور اختیار کیا۔ اس نئے دستور نے کرام ویل کو ایک موروثی بادشاہ کے طور پر تسلیم تو کیا، لیکن ملک کے مختلف امور پر پارلیمان کا پورا اختیار رہا۔ اس کے اراکین بادشاہ کو تجویز بھی دے سکتے تھے اور پارلیمانی میٹنگ

کے لیے بھی استدعا کر سکتے تھے۔ بہر حال اس دستور کا خاتمہ کرام ویل کے انتقال کے ساتھ ہی ہوا۔ جبکہ برطانیہ میں بادشاہت کا دور دورہ دوبارہ شروع ہوا۔

8.3 جمہوریت کی نشوونما: برطانیہ کی کہانی (Growth of Democracy: The Story of England)

8.3.1 شاندار انقلاب (The Glorious Revolution)

1688ء میں برطانیہ میں ایک شاندار انقلاب(Glorious Revolution) آیا۔اس کی اصلاح کے بارے میں مورخین دو الگ رائے رکھتے ہیں۔کچھ اس کو Whig Revolution کا نام دیتے ہیں۔اس سے برطانیہ میں ایک محدود جمہوری بادشاہت کا آغاز ہوا۔بذات خود حکمران ولیم(William)اس کے حق میں نہیں تھا لیکن اُس نے اس قسم کے جمہوری نمونے کو باہری خطرات کی وجہ سے قبول کیا، جس کی وجہ سے اُس نے فرانس سے روابط منقطع کیے اور ہالینڈ سے رشتہ جوڑا۔1688ء کے انقلاب نے جیمس دوم کی حکومت کا خاتمہ کیا اور اُس کے بدلے میں اُس کی بیٹی میری دوم تخت نشین ہوئی، جس کا شوہر ولیم سوم ہالینڈ کے ملحقہ علاقوں کا شہزادہ تھا۔1687ء میں برطانوی بادشاہ جیمس دوم(James-II)نے بہت سی شہری مراعات کو Declaration of Indulgence کے تحت معطل کیا، تاکہ حکومتی مخالفین کو قانونی طور پر دبایا جائے اور حق آزادی کو نکارا جائے۔ بہت سارے کلیسا کے لوگوں نے اس کو مسترد کیا لیکن اُن کو دبایا گیا۔اُلٹااُن کے مذہبی حقوق پر پابندی عائد کی گئی۔آرچ بشپ William Sancroft نے اپنے دوسرے مذہبی ساتھیوں کے ساتھ مل کر مذہبی آزادی پر پابندی کے خلاف درخواست کیے۔ جس پر اُن کو بغاوت کے الزام پر مقدمہ چلایا گیا، حالانکہ بعد میں اُن کو ان الزامات سے بری کر دیا گیا۔اس عہد کے ساتھ کہ وہ آئندہ ریاستی مخالفت سے پرہیز کریں گے۔آزادی حقوق کی پامالی ملکی بدحالی کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ بہت سے جانے مانے انگریزوں اور پادریوں نے ولیم سوم آف اورینج(Willaim-III of Orange) کو برطانیہ کی حکومت کو سنبھالنے کی دعوت دی۔ وہ جیمس دوم کا بھتیجہ اور داماد تھا۔ وہ ایک طرح سے برطانیہ کی ملکی کمزوریوں کی وجہ سے پریشان تھا اور دوسری جانب فرانس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ تھا۔تاہم اُس نے دعوت نامہ قبول کیا۔ برطانیہ پر دھاوا بولا اور بادشاہ جیمس دوم کو فرانس فرار ہونے پر مجبور کیا اور خود برطانیہ کی حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ حکومت سنبھالتے ہی ولیم نے پارلیمنٹ کی میٹنگ 29ڈسمبر تا22 جنوری1689 کو طلب کی، جس میں میری(Marry)اور اُس کے شوہر ولیم کو مشترکہ طور پر بادشاہت کا تاج پہنایا گیا۔ بہت سارے انسانی حقوق پر مبنی بلس (Bills)کو پارلیمنٹ میں پاس کیا گیا۔ قوانین کو معطل کرنے کے ولی عہد کے اختیارات کو ختم کیا گیا۔ جیسا کہ فرار حکمراں جیمس(James) کے عہد حکومت میں ہوا تھا۔اسی طرح سے امن کے دور میں کھڑی فوج کا ہونا غیر قانونی قرار دیا گیا۔ غرض کہ 1688ء کے انقلاب نے جان لاک John) Locke)کے اُس نظریے کی ترجمانی کی، جس میں پارلیمنٹ و حکومت اور لوگوں کے سماجی معاہدے کی عکاسی کرتا ہے۔

8.3.2 آئینی بادشاہت کا قیام (Establishment of Constitutional Monarchy)

برطانیہ میں آئینی بادشاہت کا قیام پارلیمانی اعمال، عدالتی فیصلوں، تاریخی دستاویزات اور قانونی قرار دادوں کی بنیادوں پر ہوا ہے۔اس

کی شروعات 15 جون 1215ء میں ہوئی۔ جب برطانوی حکمران جان (John) نے ایک عظیم جمہوری منشور پر دستخط کیا۔ یہ منشور عوامی حقوق کی پاسداری کرتا ہے۔ بادشاہت تو حسبِ دستور قائم رہی، لیکن بادشاہ کے حقوق اور اختیارات کو محدود کیا گیا۔ اس کو پارلیمانی قرار دادوں کا ماتحت بنادیا۔ اس دستور نے عوام حقوق کا تحفظ فراہم کیا اور آئندہ ہونے والی آئینی اصلاحات کے لیے راہیں فراہم کی، جس وجہ سے حکمران جان کا دور برطانیہ کی تاریخ میں ایک پُرآشوب دور مانا جاتا ہے۔

نتیجتاً 1628ء کے Petition of Rights نے عوامی حقوق کی باضابطہ وضاحت کی اور اُن کے بلاجواز قید و بند پر قدغن لگایا۔ 1689ء کے Bill of Rights نے آزادانہ انتخابات، آزادیٔ گفتار، پارلیمانی برتری اور مخصوص عوامی حقوق جیسے دفاع کے لیے ہتھیار کو رکھنے کی رضامندی دے دی۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی قانون بنانا یا ٹیکس لگانا غیر آئینی قرار دیا گیا۔ 1701ء کے Act of Settlement نے عدلیہ اور سلسلہ بادشاہت سے متعلق قواعد کی نشاندہی کی۔ 1832ء اور 1928ء کے Great Reform Act اور People's Act نے 21 سال عمر سے اوپر مردوں اور عورتوں کو ووٹ کا حقدار بنادیا۔ ان آئینی ترمیموں کی وجہ موجودہ برطانیہ کے پارلیمنٹ کے تین اہم جز ہیں۔ بادشاہ (Monarch)، دارالعوام (House of Commons) اور دارالعمراء (House of Lords)۔ ان ترامیم نے بادشاہ کو پارلیمنٹ کی بالادستی کا پابند بنادیا اور پرائم منسٹر اور خزانہ چانسلر کو پارلیمنٹ کا رکن ہونا لازمی بنادیا۔

8.4 جدید سیاسی نظریات کی نشوونما (Growth of Modern Political Ideas)

براعظم یورپ میں ایک صدی کے بعد نشاۃ ثانیہ کے دور میں سیکولر سیاسی نظریات ابھرنے لگے۔ اس دوران میکاولی (Machiavelli) نے اپنی کتاب *The Prince* لکھی جو اُن کی موت کے بعد 1532 میں شائع ہوئی۔ اُس نے ایک اور کتاب *The Discourses* بھی شائع کی، جس میں کلاسیکی دور (اسنادی دور) کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے جس نے مغربی ممالک میں جدید سیاسی فکر کو متاثر کیا۔ روسو (Jean Jacques Rousseau) عالمی سطح کا ایک عظیم فلسفی مفکر گزرا ہے جو براعظم یورپ کے ملک سوئٹزرلینڈ (Switzer Land) سے تعلق رکھتا تھا۔ انہوں نے میکاولی کی کتاب *The Prince* پر طنز کیا اور میکاولی کو فلورنس (Florance) سے شہر بدر کروایا۔ اس لیے کہ اس نے Medici بادشاہی خاندان کی پالیسیوں سے اختلاف کیا تھا اور Florance کو ایک جمہوری شہر کی حیثیت سے رکھنے کی تائید کی تھی۔

انگریز مفکر تھامس ہابس (Thomas Hobbes) نے 'Social Contract' یا سماجی معاہدے کے نظریہ کو پیش کیا اور کافی مقبولیت حاصل کی۔ انہوں نے سترہویں صدی کے آغاز میں انگریزی نشاۃ ثانیہ (English Renaissance) کی وسعت و توسیع میں اپنا کردار نبھایا۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں روشن خیالی (Enlightment) کے دور کا آغاز ہوا۔ بہت سے عالمی مفکرین اور مفکروں نے نئے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور دیگر خیالات اور نظریوں کو منظر عام پر لایا۔ عالمی مفکرین و مفکروں جیسے روسو (Rousseau)،

مانٹیسکو(Montesquieu)، جان لاک(John Locke) وغیرہ اس نئی تحریک روشن خیالی کے علمبردار تھے۔ انہوں نے دو اہم نقطوں کو عوام کے لیے پر کشش بنا دیا کہ ریاستوں کا ارتقاء اور اُن کا سیاسی ڈھانچہ کیسے اور کن حالات میں وجود میں آیا۔ انہوں نے اپنے خیالات میں ریاست (state) اور حکومت (government) کے درمیان فرق ظاہر کیا۔ یہ بتایا کہ ریاست (state) چند بنیادی اداروں کا مجموعہ ہے جنہیں حاصل اختیارات کو انصاف کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ ایسے ہی حکومت (government) بھی چند مخصوص افراد پر مبنی جماعت ہے جو قوانین واُصولوں کی تشکیل کرتے ہیں جس کو عمل میں لانے میں حکومت پابند ہوتی ہے۔ ان منفرد سیاسی قائدین، مفکروں اور ماہرین تاریخ و تہذیب اور بشریات(anthropologist) نے دلیل دی کہ کسی بھی معاشرے میں سیاسی عمل زیادہ تر ریاست کے باہر سے اثر انداز ہوتی ہے اور ریاست سے باہر بھی کچھ غیر منظم جماعتیں بھی اپنا ایک سیاسی کردار رکھتی ہیں۔

ان روشن خیالی کے نظریات نے سماجی، سیاسی و معاشی تعلقات پر گہرے اثرات ڈالے، جس کے سبب مختلف انجمنیں(Guilds) وجود میں آئیں، جن کو آزاد تجارت کے ماتحت سمجھا گیا، کیونکہ اُن کی مخالفت میں پروٹسٹنٹ کلیسا کے پادری پیش پیش رہے اور سخت الفاظ میں رد کیا۔ اس قسم کے روشنائی تصورات بہت عرصے کے بعد براعظم یورپ میں پھیل گئے۔ آزاد تجارتی پالیسی میں تجارت کا مطلب بلا روک ٹوک علاقائی اور عالمی درآمدات اور برآمدات کا لین دین ہے۔ عام طور پر سیاسی جماعتیں آزاد تجارت کے حامی ہیں، لیکن قوم پرست اور بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں تجارت میں تحفظ پسندی(Protectionism) کی ترجمانی کرتے ہیں۔ دوسری طرف سے روشنائی عیسائیت اور اس سے جڑی تجارتی نظریات کی بھرپور مخالفت کرتے تھے۔ فرانسیسی مفکر اور تاریخ داں Francois Marie Arouet de Voltaire کلیسا کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ وہ خداوندی کے حق میں اور کلیسائی تقلید پسندی کے خلاف تھا۔ اُس نے عیسائیت کی تاریخ کو ایک مضحکہ خیز پروپگنڈا یا تشہیر قرار دیا تھا۔ وہ مانتا ہے کہ عیسائیت میں قدامت پسندی پوپ کے غیر آزادانہ خیالات کی وجہ سے ہے۔ Tertullian نے بھی اپنے مذہبی تصورات کو Voltaire کے نظریہ کے اندر ہی سمیٹا۔

8.4.1 جان لاک (John Locke)

جان لاک(John Locke) سترہویں صدی کا برطانوی روشن خیال مفکر تھا جو 'Father of Liberalism' نام سے کافی مقبول ہوا۔ وہ مختلف مشہور کتابوں کا مصنف رہا ہے اور اُس نے دور حاضر کے نئے سیاسی حالات میں کافی کارآمد نظریات پیش کیے ہیں۔ اُس کی کتاب *Two Treaties of Government* 1689 میں شائع ہوئی۔ اس میں اس نے حکومت کے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ ایک یہ کہ شہری ایک سماجی معاہدے('Social Contract') کے تحت سرکار یا حکومت تشکیل دیتے ہیں، اس لیے اُن کو ہی حکومت چلانے کا اختیار ہونا چاہیے۔ اُس نے الوہی نظریہ بادشاہت 'Divine Kingship Theory' کی مخالفت کی اور حکومت چلانے کے لیے بادشاہ کو ہر اعتبار سے ذمہ دار ٹھہرایا۔ جان لاک فطری یا قدرتی نظام کا حامی تھا۔ اس نے سر رابرٹ فلمر(Sir Robert Filmer) کے والد کے قائم کردہ سیاسی نظریہ (Theory Political) کی تردید کی اور اُس نے بادشاہوں کو حاصل الوہی حق (Divine Right) کے نظریہ کو رد کیا۔ میکاولی (Machiavelli) اور ہابس (Hobbes) کے نظریہ کے برعکس اُس نے

ایکوناس(Aquinas) کے قول کی تائید کی کہ 'انسان ایک سماجی حیوان ہے، اس لیے انسان سماج میں ہم آہنگی کے ذریعہ خوش رہتا ہے' وہ ہابز کے مطلق العنانی کے نظریہ کے خلاف تھا اور قدرتی قوانین کی اس لیے تائید کرتا تھا، کیونکہ یہ 'وجہ' اور سماجی ہم آہنگی پر مبنی ہیں۔ وہ Tabula Rasa کے عقیدے کی بھی حمایت میں تھا کہ انسان دنیا میں خالی ذہن کے ساتھ آتا ہے۔ اُس میں جنم سے اچھائی یا برائی کا کوئی ذہن نہیں ہوتا ہے۔ بدلتے ہوئے دنیاوی حالات کی وجہ سے اُس کے ذہن میں برائی کے خیالات جنم لیتے ہیں۔ جان لاک کے مطابق ایک انسان کے معلومات فطری نہیں بلکہ حالات، تجربات، برداشت کی صلاحیت، غور و فکر، حکمت عملی وغیرہ کے سبب حاصل ہوتے ہیں اور یہی فطری قوانین یا اصول ہی امن کو قائم کرنے اور انسانی خدمت کے لیے کافی ہیں۔

8.4.2 جان اسٹارٹ مل (John Stuart Mill)

جان اسٹارٹ مل انیسویں صدی کا عالمی سطح کا برطانوی مفکر گزرا ہے۔ انہوں نے 1859ء میں *On Liberty* کتاب شائع کی، جس میں اس نے انسانی آزادی (Liberty) اور سیاسی اختیارات (Authority) کے درمیان تعلقات کو اجاگر کیا۔ اُس کا سیاسی فلسفہ (Political Philosophy) کافی مقبول ہوا۔ اُس کا قول ہے کہ روایتی سماج یا معاشرے اس لیے خطرات سے دوچار ہیں کیونکہ اُن میں قدیم بادشاہوں کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ جنہیں انسانی آزادی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں تھا۔ اُن کو نظریہ اخلاقیات اور نظریہ انصاف میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عوامی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کرتے تھے۔ بقول مل (Mill) کے یہ ساری سماجی' ریاستی اور منصفانہ عمل کے لیے اہم تھیں۔ اسی طرح عورتوں کی آزادی اور مساوات قوموں کے بنانے میں لازم و ملزوم تھی۔ مردوں کے برابر ہونے کے لیے عورتوں کو اپنی دانشورانہ صلاحیتوں کو بڑھانا ضروری ہے۔

8.4.3 بنجامن کانسٹنٹ (Benjamin Constant)

ہنری بنجامن کانسٹنٹ براعظم یورپ کے سوئٹزرلینڈ کا ساکن اٹھارہویں صدی عیسوی کا صحافی، ادیب، فلسفی اور سیاستداں گزرا ہے۔ اُس نے انسانی آزادی کو اپنی استطاعت کا محور بنایا تھا۔ اور قدیمی اور جدیدی آزادی میں ایک نمایاں فرق کو اُجاگر کیا ہے۔ اُس نے انسانی آزادی کے لیے قدیم روم کو نہیں بلکہ جدید برطانیہ کو مثالی نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ بقول Constant کے جمہوری آزادی کے لیے شہریوں کے حقوق، رائے دہی اور ریاست کے چلانے میں کافی ضروری ہے، جبکہ قدیم انسانی آزادی عملاً کافی محدود تھی جبکہ جدید آزادی قانون اور حکومتی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس میں حکومتی مداخلت کافی کم ہے۔ جدید دور کے مقابلے میں لوگ کوئی بھی اور کہیں بھی زندہ رہنے کے لیے پیشہ اختیار کر سکتے ہیں اور اپنے عوامی نمائندے کا انتخاب کرتے ہیں اور روزمرہ کی سیاسی شمولیت میں ان کی شرکت کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ جدید تجارتی رسہ کشی کو عصر جدید کے جنگوں سے افضل سمجھتے ہیں۔ وہ نپولین کی جنگی کارکردگی کے خلاف تھا کیونکہ یہ تجارتی اور سماجی معاشرے کے لیے غیر موزوں تھا۔

8.4.4 تھامس ہابز (Thomas Hobbes)

تھامس ہابس سولہویں صدی کا ایک عظیم برطانوی مفکر رہا ہے۔ اُس نے اپنی تصنیف لیوآتھن (*Leviathan*) میں حکومت کی ذمہ داری اور شہریوں کے حقوق کے متعلق اپنا سیاسی نظریہ بیان کیا ہے۔ بقول اُس کے کوئی بھی معاشرہ تب تک محفوظ نہیں رہ سکتا ہے جب تک کہ اُس کا حکمراں آزادانہ طبیعت نہیں رکھتا ہو۔ اسی وجہ سے وہ مطلق العنان (Absolute Sovereign) کے خلاف تھا جو قطعی اختیارات کا مالک تھا۔ اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں تھا۔ اور کسی بھی ردعمل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اپنی تصنیف میں ہابس نے ریاستی، حکومتی، اخلاقی ڈھانچوں اور اُن سے وابستہ محرکات کو قلمبند کیا ہے۔ مجموعی امن اور ترقی کے لیے وہ ایک مضبوط مرکزی حکومت کا ہونا لازمی سمجھتا ہے۔

8.4.5 جین جیک روسو (Jean-Jacques Rousseau)

روسو اٹھارہویں صدی کا عظیم مفکر گزرا ہے۔ سماجی معاہدہ (Social Contract) اُس کی ایک اہم تصنیف رہی ہے، جس میں وہ ایک جائز اور کلاسیکی جمہوری حکومت پر کافی زور دیتا ہے۔ 1762ء میں شائع ہوئی یہ تصنیف مغرب میں کافی مقبول ہوئی۔ پرانی تصانیف اور دستاویزات سے متاثر ہو کر روسو نے اس حقیقت کو کافی سراہا کہ 'انسان آزاد پیدا ہوا ہے، لیکن ہر طرف زنجیروں میں جکڑا یا باندھا ہوا ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو دوسروں کا آقا تصور کرتے ہیں، حقیقت میں وہ ان سے بڑے غلام ہیں۔'

"Man is born free, and everywhere he is in chains. Those who think themselves the masters of others are indeed greater slaves than they."

اُس کا دعویٰ ہے کہ فطرت، ابتدائی یا قدرتی حالت ہے جس کے لیے قانون یا اخلاقیات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس میں سماج کی ضرورتوں کی تکمیل قدرتی طور پر ہوتی ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فطری سماج یا معاشرہ میں بھی تبدیلیاں آتی ہے، جس سے تقسیم محنت (Division of Labour)، آپسی رسہ کشی اور جائیداد کی تقسیم سے متعلق جھگڑے وجود میں آگئے ہیں، جن کو حل کرنے کے لیے عدالتی اور قانونی ادارے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نہیں تو انسانی آزادی اور بقا ناممکن بن جاتی ہے۔

8.5 یورپ میں جمہوریت (Democracy in Europe)

8.5.1 فرانس (France)

فرانس پر 800 سال تک شاہی حکومت رہی۔ 1789ء کو فرانس میں انقلاب رونما ہوا اور 1792ء میں فرانس پہلا جمہوری ملک بنا۔ برطانیہ (برطانیہ) کی طرح Girondists نے فرانس میں آئینی شاہی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بعد میں Jacobins نے شاہی حکومت کی جگہ ملک کو پہلا جمہوری ریاست بنایا۔ فرانسی انقلاب کے نامور قائدین بھی آزادی (Freedom) اور مساوات (Equality) کے اصولوں پر متحد تھے۔ انہوں نے فرانس میں بادشاہت کے خاتمہ اور جمہوریت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عوام

یا شہریوں اور اُن کے جان و مال کی حفاظت کے لیے بنائی گئی کمیٹیوں کو از سر نو زندہ کیا گیا، کیونکہ Jacobins کی حکومت کے دور میں 2500 پارسی (Persians) اور 14,500 فرانسیسیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور رائج تحفظاتی کمیٹی کے ارکان کو پھانسی دی گئی تھی۔ انقلاب فرانس کے بعد Jacobins نے شاہی حکومت کو رد کیا تھا۔ اس کی جگہ انہوں نے ایک آئینی حکومت کا آغاز کیا تھا جو انسانی حقوق کی زبردست پاسدار تھی۔ انہوں نے انسانی مسلک کو مذہبی مسلک پر فوقیت دی۔ لیکن 1799ء میں نپولین بوناپارٹ جیکوبنوں کی حکومت کو برخواست کر کے خود بادشاہ بن گیا۔ وہ ایک مطلق العنان حکمران تھا جس کو 1813ء میں حکومت سے مستعفی ہونے کے لیے کہا گیا اور آخر کار 1815ء میں واٹرلو (Waterloo) کی جنگ میں شکست سے دوچار ہوا۔ اُن کے بعد بوربن شاہی خاندان (Bourbon Family) کے لوئی ہشت دہم (Louis-XVIII) کو فرانس کا شہنشاہ منتخب کیا گیا۔ اُس نے 1814-1824 تک فرانس پر حکومت کی۔ چارلس دہم (Charles-X) کو لوئی ہشت دہم کا جانشین مقرر کیا گیا۔ اُس نے قدیم شاہی حکومت کے اہداف اور طریقہ کار کو سختی سے رائج کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال 1830ء میں وہ لوئی فلپ (Louis Philippe) کے حق میں تخت شاہی سے دستبردار ہوا۔ فلپ نے بادشاہت کے قیام میں دانشمندانہ اقدامات اُٹھائے، لیکن 1848ء میں ناکام ہوا اور اس کو تخت سے بے دخل کیا گیا۔

فرانس میں جمہوریت کے قیام کے لیے دوسری جمہوریہ (Second Republic) کا باضابطہ انتخابات ہوا، جس میں نپولین بوناپارٹ (Napoleon Bonaparte) کا بھتیجا لوئی نپولین (Louis Napoleon) جو کافی مقبول جنرل تھا، فرانس کا صدر (President) منتخب ہوا۔ یہ فرانس کا پہلا صدر تھا، جس نے 1848 تا 1852 کے دور میں حکومت کی اور پھر یہ نپولین سوم کے نام سے شہنشاہ بن بیٹھا۔ اُس نے بھی مطلق العنانیت کے طرز پر فرانس کی حکومت چلائی، جس کے سبب فرانس کی پارلیمنٹ تعطل کا شکار ہوئی اور اُس کی مطلق العنانیت کا دور برابر 1870ء تک قائم رہا۔ 1870ء میں فرانس کو پرشیائی جرمن ریاست جنگ میں شکست ہوئی۔ اسی کے ساتھ ایک نئی حکومت انتخاب کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ یہ فرانس کا شہری دور تصور کیا جاتا ہے۔

8.5.2 جرمنی (Germany)

جرمنی براعظم یورپ کا ایک عظیم ملک رہا ہے۔ شمال میں ڈنمارک، مشرق میں پولینڈ، جنوب میں آسٹریا اور جنوب مغربی جانب فرانس واقع ہے۔ تقریباً 9 ممالک کے سرحدیں جرمنی سے ملتے ہیں۔ قیصر ولیم (Kaiser Wilhelm) نے 1888 تا 1918 تک جرمنی پر حکومت کی۔ پہلی جنگ عظیم (1918) کے اختتام تک قیصر ولیم جرمنی کا حکمران رہا۔ اُس کے دور میں جرمن پارلیمنٹ (Reichstag) کا ادارہ وجود میں تو تھا، لیکن قیصر ولیم نے ہمیشہ پارلیمانی مشوروں کو نظرانداز کیا۔ پہلی جنگ عظیم کی شکست کے بعد پورا جرمنی بکھر گیا اور آئینی قدریں پامال ہو گئیں۔ بہرحال قیصر ولیم کی جلاوطنی کے بعد جرمن پارلیمنٹ (Reichstag) متحرک ہو گئی۔ اس نے فاتح ممالک سے امن معاہدوں کی تکمیل اور دستخط کی ذمہ داری تو لی لیکن پورا ملک ملاحوں، فوجیوں، کاریگروں یا مزدوروں کی شورش سے جوجھ رہا تھا۔ مقامی حکومتی کونسلوں نے روس کے طرز پر کمیونزم کے قیام کا مطالبہ کیا۔ جرمن افواج نے بالآخر بغاوت کی اور مقامی حکومتی کونسلوں کو دبالیا اور جرمن عوام کو نئی پُرامن جمہوری حکومت کے قیام کا یقین دلایا، جس کا آغاز جنوری 1919ء کے انتخابات سے ہوا جس میں

83 فیصد ووٹنگ ہوئی۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ انتخابات کا اہم مقصد فوجی اسمبلی کا قیام اور ملک کے جدید آئین کی تیاری تھی۔ ساتھ ہی مختلف فاتح ممالک کے ساتھ امن معاہدوں کی تعمیل تھی۔

ویمر کا آئین (The Weimar Constitution)

ویمر (Weimar) جرمنی کا ایک دیہاتی علاقہ ہے جو جرمنی سے 100 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ جرمنی کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں ویمر کے علاقے کو کافی محفوظ تصور کیا جاتا تھا۔ اس علاقے میں آئین کی تیاری کے لیے اجلاس کو اختیار دیا گیا، جس اعتبار سے اس جرمن دستور کو Weimar Constitution کا نام دیا گیا۔ جرمنی کے دستور کی تکمیل کے لیے مختلف قانون ساز کونسل کے اراکین و مندوبین نے اس دیہات میں کئی مہینے بحث و مباحثے کیے اور بالآخر جرمنی کے دستور پر اتفاق ہوا اور ملک کو جمہوری شکل دی گئی۔ اس کو ویمر جمہوریہ (Weimar Republic) قرار دیا گیا۔ اس کے لیے ایوان بالا اور ایوان زیریں مقرر ہوئے۔ علاقائی حکومتیں آبادی کے تناسب سے ایوان زیریں کے اراکین کا انتخابات کرتے ہیں اور اُن کو بعد میں ایوان بالا کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ ایوان زیریں کے پاس کیے ہوئے قوانین کو ایوان بالا مسترد یا قبول کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔

جرمنی جیسی جمہوری طرز کی حکومتیں براعظم یورپ کے دیگر ممالک میں بھی رائج تھیں۔ ویمر عوامی جمہوریہ میں کسی پارٹی کو اکثریت حاصل نہ ہونے پر مختلف دو یا زائد سیاسی پارٹیاں مل کر متفقہ طور پر حکومت تشکیل دیتی تھیں۔ اس صورتحال میں ویمر عوامی جمہوریہ کا صدر، حکومت تشکیل دینے کے لیے متحدہ سیاسی پارٹی کے صدر کو بحیثیت چانسلر یا وزیر اعظم منتخب کرتا ہے جو اپنی حکومت تشکیل دیتا ہے۔ صدر کا انتخاب 7 سال کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ عارضی طور پر دستوری حقوق کو معطل کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ ملک کے ناخوشگوار حالات یا ایمرجنسی کے دور میں چانسلر حکم یا ہدایت (Rule by Decree) کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ جرمنی کا ویمر آئین شہری آزادی کو یقینی بناتا ہے۔ اس میں حقوق اظہار اور صحافت (Freedom of Speech and Press) موجود ہے۔ یہ جرمن شہریوں کو سماجی و معاشی اختیارات بھی دیتا ہے۔ بیروزگاری کی صورت میں معاشی فوائد کے ساتھ ساتھ جرمن آئین جنس، مذہب یا سیاسی بنیاد پر ملازمتوں میں امتیازی سلوک پر روک لگادی ہے۔ ریفرنڈم کے لیے قانونی حق بھی فراہم کرتا ہے۔ علاوہ ازیں جرمن آئین ملک میں امن وضبط کو برقرار رکھنے کی ضمانت دیتا ہے۔ لیکن ویمر عوامی جمہوریہ (جرمنی) کی کارکردگی مختلف میدانوں میں ناکام ثابت ہوئی جس کے سبب ہٹلر (Hitler) کا وجود ناقابل عمل ہو گیا۔

8.5.3 اٹلی (Italy)

اٹلی براعظم یورپ کا ایک اہم ملک ہے۔ اٹلی میں فاشزم کا دور کا خاتمہ اور دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد اٹلی میں کرسچین جمہوریہ (Christian Democracy) کا غلبہ پیدا ہوا۔ 1946 تا 1994 تک کرسچین سیاسی پارٹی کو وسیع مواقع حاصل ہوئے۔ 1940 سے 1991 تک اپوزیشن نے اٹالین کمیونسٹ پارٹی (ICP) کا قیام عمل میں لایا۔ کرسچین جمہوریہ (Christian

Democracy) نے بغیر کسی رکاوٹ کے حکومت کیے اور یہ کیبنٹ اور وزیراعظم کے ساتھ بہتر تعلقات رکھتے تھے۔ مرکزی حکومت نے دائیں اور بائیں بازو کی چھوٹی بڑی پارٹیوں کی حمایت سے حکومت چلائی، جس میں اٹالین سوشلسٹ پارٹی (ISP)، اٹالین ڈیموکریٹک سوشلسٹ پارٹی (IDSP)، اٹالین ریپبلکن پارٹی (IRP) اور اٹالین لیبرل پارٹی (ILP) وغیرہ مختلف سیاسی جماعتیں شامل تھیں۔ سیاسی عدم استحکام کے سبب 1993 میں اٹلی میں ریفرنڈم کے ساتھ انتخابی نظام میں اصلاحات لائے گئے، جس کے سبب حقیقی تناسب (Pure Proportional) کے بجائے اکثریتی (Majoritarian) کا عمل قائم ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری مراحل میں اٹلی کا بادشاہ وکٹر ایمانیول سوم (Victor Emmanuel-III) سابقہ فاشسٹ پارٹیوں سے بدظن تھا۔ اس نے اٹلی میں شاہی حکومت کو بچانے کے لیے اپنے بیٹے اور وارث امبرٹو (Umberto) کو مملکت کا جنرل لفٹیننٹ (General Lieutenant) مقرر کیا۔ اس نے عوام سے وعدہ کیا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد عوامی ریفرنڈم کے تحت منتخبہ حکومت کی باگ ڈور جمہوری ہاتھوں میں دینے کی ضمانت دی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اتحادی ممالک نے اٹلی میں مسولینی کی فاشسٹ حکومت کا خاتمہ کیا، جس سے ملکی معیشت تباہ اور ملکی حالات خراب ہو گئے۔ بہر حال 2 جون 1946 کو اٹلی میں استصواب رائے کروایا گیا، جس میں ریپبلکن پارٹی کو 54 فیصد ووٹ حاصل ہوئے اور اٹلی قانونی طور پر جمہوری (Republican) ملک بن گیا۔ اٹلی میں شاہی حکومت ختم ہو گئی۔ اٹلی میں منعقدہ ریفرنڈم سے ملک نااتفاقی اور جھگڑے کا شکار ہوا۔ اٹلی کے شمالی علاقے میں جمہوریت پسندوں نے اکثریت کے ساتھ جمہوریت کے لیے ووٹ دیا، جبکہ اٹلی کے جنوبی علاقے کے لوگوں نے شاہی حکومت کی طرفداری میں کی۔ 1946 تا 1948 کے درمیان دستور ساز کونسل تشکیل دی گئی جس نے اٹلی کا آئین تیار کیا اور یکم جنوری 1948ء سے اٹلی میں رائج ہوا۔

8.6 جدید سیاسی یورپ کے اثرات (Impact of Modern Political Europe)

اٹھارہویں صدی کے دور میں یورپ میں عہد معقولیت (Age of Reason) کے طور پر جانا جاتا ہے۔ سترہویں صدی کے آخر میں اسحاق نیوٹن (Isaac Newton) اور جان لاک (John Locke) جیسے ادیبوں و ماہرین سماجیات نے قدیم روایات کو چنوتی دی۔ اسحاق نیوٹن کے کشش ثقل Law of Gravity) اور قوانین حرکت (Law of Motion) نے دنیا کو روحانی طرز کے مقابلے میں قدرتی اصولوں پر دیکھنے کی وکالت کی۔ اسی طرح عظیم مفکر جان لاک نے برطانیہ میں سیاسی شعور بیدار کیا۔ اس نے عوامی حقوق جیسے آزادی (Liberty)، حق ملکیت (Property) وغیرہ کے تحفظ پر زور دیا۔

یورپ کے بدلتے حالات نے امریکہ کو بھی متاثر کیا۔ امریکہ میں مقیم دانشور طبقہ یورپ میں دانشور خیالات کا مطالعہ کرنے لگا۔ امریکہ میں دانشورانہ خیالات، آزادی، انصاف، مساوات وغیرہ کو بغیر کسی رکاوٹ کے پھلنے پھولنے کا موقع حاصل ہوا۔ مذہبی رہنماؤں نے اپنے قدیم روایتی موقف میں تبدیلی لانا شروع کی۔ انہوں نے اختلافات کو کم کرتے ہوئے برطانوی کلیسا (Church of England) اور پیورٹن (Puritan) دونوں کے درمیان مشترکہ روایات، رسومات یا مماثلت پر زور دیا۔ امریکی علاقہ میسا چوسٹس

(Massachusetts) کے وزیر کاٹن ماتھر نے سائنسی باتوں کی وکالت کی اور چیچک سے بچاؤ کے لیے ٹیکہ پر زور دیا۔ ہارورڈ کے ارباب کافی آزاد خیال ثابت ہوئے اور 1707ء میں پرانے کالونی (Calvinist) خیالات کو برقرار رکھنے کے لیے ییل کالج کی بنیاد رکھی لیکن یہ کوشش ناکام ہوئی۔ 1722ء میں ہارورڈ کا سارا عملہ برطانوی کلیسا کا پیروکار بن گیا۔ برطانیہ کے کئی وزرا وحدت پسند ہونے لگے اور عیسیٰ مسیحؑ پر شک کرنے لگے۔ نئے ابھرتے ہوئے خیالات نے سیاسی رجحانات میں بھی تبدیلیاں پیدا کیں۔ جان لاک نے ایسے بادشاہ کی معزولی کا دفاع کیا، جو انگریزی عوام کی جان ومال، عزت اور جائیداد کا تحفظ نہ کر سکے۔

روسو (Rousseau) کے مطابق سماج میں عوام کی خواہش یا رائے عامہ (General Will) کے مطابق حکومت ہونی چاہیے۔ مانٹیسکو (Montesquieu) کے مطابق تمام اختیارات کسی ایک فرد یا بادشاہ کے ہاتھوں میں مرکوز نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اختیارات منقسم ہونے چاہیے۔ اُس نے عاملہ (Executive)، قانون ساز (Legislature) اور عدلیہ (Judicial) میں اختیارات کو تقسیم کرنے کی پُرزور سفارش کی۔ برطانیہ سے آزادی کے حامیوں نے مذکورہ دلائل کا بھرپور استقبال کیا۔ یہ امریکی آزادی کا پیش خیمہ تھا۔ تھامس جیفرسن (Thomas Jefferson) کا آزادی کا اعلامیہ، دراصل لاک کے دانشورانہ خیالات سے متاثر تھا۔ اسی طرح ان دانشورانہ نظریات نے یورپ کے ساتھ ساتھ عالمی اور براعظم ایشیا میں بھی آزادی کے جدوجہد کو فروغ دیا۔

8.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس مطالعہ کے بعد ہمیں جمہوریت کی ابتداء، اسباب اور آئین کی تدوین وغیرہ کے متعلق جانکاری حاصل ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ آزادی، مساوات، اخوت جیسے خیالات سے بھی آگاہی ہوئی۔ جان لاک، جان اسٹورٹ مل جیسے عالمی مفکرین کے جدید سیاسی افکار سے بھی روشناس ہوئے۔ مزید برطانیہ میں شاندار انقلاب اور بغیر خون خرابہ کے بادشاہت سے آئینی بادشاہت میں تبدیلی سے بھی واقف ہوئے۔ فرانس، جرمنی، اٹلی میں جمہوری حکومتوں کا قیام اور عالمی سطح پر اس کے اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا۔

8.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

Democracy	:	جمہوریت، جہاں اپنی حکومت چننے کا حق عوام کے پاس ہو۔
Constitution	:	آئین، دستور، کسی ملک پر حکمرانی کے لیے مجموعہ قوانین
Liberty	:	آزادی، آزاد خیالی، حریت پسندی
Equality	:	مساوات، سب کی برابری
Fraternity	:	اخوت، بھائی چارہ
Human Rights	:	انسانی حقوق، فطری طور سے ہر انسان کو حاصل حقوق

8.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exam Questions)

8.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. لفظ Democracy کن س دو یونانی الفاظ سے ماخوذ ہے؟
2. جمہوریت (Democracy) سے کیا مراد ہے؟
3. یونان کی دو شہری ریاستوں کا نام بتایئے۔
4. آئین کیا ہے؟
5. 'Lord, the Protector' کسے کہا جاتا تھا؟
6. شاندار انقلاب (Glorious Revolution) کس سال رونما ہوا؟
7. کس پارلیمنٹ کو تمام پارلیمنٹ کی ماں کہا جاتا ہے؟
8. شاندار انقلاب کے بعد برطانیہ کا حکمراں کون بنا؟
9. کتاب 'The Prince' کس نے لکھی؟
10. تھامس ہوبز کی تصنیف کا نام بتایئے۔

8.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. 'جمہوریت' پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. جان لاک کے خیالات پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. قدیم یونانی جمہوریت پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. فرانس میں جمہوریت کیسے ابھری؟ بتایئے۔
5. جین جیکس روسو پر ایک نوٹ لکھیے۔

8.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. شاندار انقلاب کے بارے میں تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. یورپی مفکرین کے جدید سیاسی نظریات پر بحث کیجیے۔
3. فرانس اور جرمنی میں جمہوریت کو کیسے عروج حاصل ہوا، تفصیلی وضاحت کیجیے۔

8.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Droz, Jacques, *Europe between Revolutions, 1815–1848*, Fontana Press, London, 1967.
2. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
3. Gottlieb, Anthony, *The Dream of Enlightenment*: *The Rise of Modern Philosophy*, Penguin, UK, 2017.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
6. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994.
10. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.

اکائی 9۔امریکی انقلاب

(The American Revolution)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 تاریخی پس منظر

9.3 امریکی نوآبادیاتی سماج

9.4 برطانیہ کے ساتھ جدوجہد

9.4.1 جہازرانی قوانین

9.4.2 اسٹامپ ایکٹ

9.4.3 ٹاؤن شینڈ قوانین

9.4.4 بوسٹن قتل عام

9.4.5 بوسٹن ٹی پارٹی

9.4.6 فلاڈلفیا کی پہلی کانگریس

9.5 امریکی انقلاب

9.5.1 امریکہ کا اعلان آزادی

9.5.2 امریکہ میں انقلابی جنگ کا آغاز

9.5.3 بین الاقوامی جنگ

9.5.4 پیرس معاہدہ امن اور صلحنامہ ورسائی

9.6 امریکی انقلاب کے نتائج اور اہمیت

9.6.1 امریکی سیاسی اختراعات

9.6.2 برطانیہ اور فرانس پر انقلاب کے اثرات

9.7 اکتسابی نتائج
9.8 کلیدی الفاظ
9.9 نمونہ امتحانی سوالات
9.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید (Introduction)

اٹھارویں صدی کا آخری نصف مغربی دنیا یعنی امریکہ اور یورپ میں انقلاب کا دور تھا۔ اسی صدی میں رونما ہونے والے فکری انقلاب یا روشن خیالی کا اظہار امریکی انقلاب اور فرانسیسی انقلاب میں ہوا اور اس کا اختتام نپولین کے کارناموں پر ہوا۔ عہد روشن خیالی کے سیاسی اور سماجی نظریات کا پہلا امتحان اور پہلا تجربہ ایک غیر متوقع مقام یعنی برطانوی امریکی نو آبادیات میں ہوا۔ یورپ میں پندرہویں صدی عیسوی سے چلی آرہی مطلق العنانیت کو چنوتی دینے کے سلسلے میں امریکی انقلاب ایک نہایت اہم پیش رفت تھا جس نے مغربی یورپ کے سیاسی ڈھانچے کو بیحد متاثر کیا۔ اپنی بغاوت کو جائز ثابت کرنے اور نئے سیاسی اداروں کے قیام کے سلسلے میں امریکیوں کے دلیرانہ تجربات دوسرے ممالک کے لیے مشعل راہ اور نمونہ عمل ثابت ہوئے۔ صحیح معنی میں، امریکی انقلاب، جدید عالمی تاریخ کے عظیم واقعات میں سے ایک تھا۔ اس اکائی میں ہم امریکہ میں ہوئے برطانوی نو آبادیات کے خلاف سیاسی انقلاب کا ذکر کریں گے۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- امریکی انقلاب کے تاریخی پس منظر اور امریکی نوآبادیاتی سماج کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- امریکی انقلاب کے اسباب اور نوآبادیوں کی بغاوت کی وجوہات جان سکیں گے۔
- امریکی انقلاب کے اہم واقعات اور اس کے نتائج اور اہمیت پر روشنی ڈال سکیں گے۔

9.2 تاریخی پس منظر (The Historical Context)

سترھویں صدی کے آغاز سے انگریز نسل کے باشندے شمالی امریکہ کے مشرقی ساحل پر جا کر بسنے لگے تھے۔ بعد میں اسکاٹش (Scottish) اور آئرش (Irish) بھی تارکان وطن کے اس کاروان میں شریک ہو گئے۔ نو آباد کاری کا یہ سلسلہ اٹھارویں صدی کے درمیانی دور تک جاری رہا۔ اگرچہ ان نو آبادیات کو بسانے والوں میں اکثریت برطانوی نژاد باشندوں کی تھی مگر ان میں کچھ عناصر غیر قوموں کے بھی داخل ہو گئے تھے۔ فرانسیسی ہیونوؤں (Huguenots) نے بھی یہاں آکر پناہ لی تھی۔ ولندیزی (Dutch)، جرمن (German) اور سوس (Swiss) پروٹسٹنٹوں کی قابل لحاظ تعداد بھی رفتہ رفتہ یہاں آن کر بس گئی تھی۔ یہ سب اپنا اپنا وطن چھوڑ کر

یہاں ایک نئی دنیا بسانے کے لیے آباد ہوئے تھے۔ انہوں نے ضمیر کی آزادی کی تلاش میں وطن چھوڑا تھا۔ وہ اپنے مذہبی عقائد میں حکومت کی ناجائز مداخلت نہیں چاہتے تھے۔ ان میں سبقت واولیت ان کو حاصل تھی جو مشہور جہاز 'مے فلور' (May Flower) کے ذریعہ اپنے وطن کو چھوڑ کر نکلے تھے کیوں کہ وہ اسٹوورٹوں (Stuarto) کے کلیسائی نظام کے تحت اپنی زندگی گزارنا نہیں چاہتے تھے۔ بعد کے آنے والوں میں بہت سے ایسے تھے جو ان ہی کی پیروی میں یہاں پہونچے تھے۔ بعض دوسروں نے تجارت اور مہم پسندانہ زندگی کے شوق میں یہاں اپنا گھر بسایا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے نئی دنیا کی دریافت میں اپنی جان جوکھم میں ڈالی تھی۔ غرض ان نوآبادیات میں ایک ایسی چھوٹی سی دنیا آباد تھی جو زندگی سے لبریز، ترقی اور توسیع کے لیے بے چین تھی۔ ان انسانی گروہوں میں جو چیز قدر مشترک تھی، وہ ان کا جذبہ آزادی تھا۔ وہ پرانی دنیا کی رجعت پسندیوں سے دور ایک آزاد معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے جس میں فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی رہتی اور ریاست کی کم سے کم مداخلت رہتی۔ اگرچہ عملی طور پر اُن کا یہ نصب العین کافی دور تھا۔ مگر ان کا ارتقائی رجحان برطانوی سامراجیات کے خلاف تھا۔

اٹھارویں صدی کے نصف تک شمالی امریکہ کے اوقیانوسی ساحل پر انگریزوں کی 13 نوآبادیات (colonies) آباد ہو چکی تھیں جو نیو ہیمپشایر (New Hampshire) سے جارجیا (Georgia) تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان نوآبادیات میں انگریزی بولنے والوں کی تعداد تیرہ لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔ دوسری نسلوں اور قومیتوں سے وابستہ لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ انگریز جب یہاں آئے تو اپنی روایات بھی ساتھ لے آئے۔ انہوں نے غیر منظم (Uncodified) برطانوی قانون اور جیوری نظام (Jury System) یہاں بھی رائج کیا۔ غرض ہر نوآبادی اپنے آپ میں ایک چھوٹا سا برطانیہ تھی جس میں شاہی اختیارات کی حد بندی اور منتخبہ نمائندوں کے ذریعہ حکمرانی کے تصورات رچے ہوئے تھے لیکن معاشی اور مالی نقطہ نظر سے یہ نوآبادیات ابھی کمزور تھیں۔ وہ تمام اہم معاملات بالخصوص غیر قوموں سے تعلقات اور دفاع کے لیے اپنے وطن برطانیہ کی حکومت کی تائید اور امداد پر منحصر تھیں۔ اپنے آبائی وطن سے ان کو محبت تھی اور جذباتی وابستگی تقریباً تمام نوآبادیات میں موجود تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ نوآبادیات ابھی اپنے پیر پر کھڑے رہنے کی سکت نہیں رکھتی تھیں۔ ان میں کوئی اتحاد نہیں تھا بلکہ باہمی رقابتیں موجود تھیں۔ ان رقابتوں کی وجہ سے وہ اپنے کسی دشمن کا متحد ہو کر مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں، جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت یعنی اٹھارویں صدی میں ایک طاقتور دشمن ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ فرانسیسیوں نے شمال میں تقریباً پورے کناڈا (Canada) اور جنوب میں لوئی یانا (Louisiana) پر قبضہ جمایا تھا۔ لوئی یانا بہت وسیع علاقہ تھا جو انگریزی نوآبادیات کے جنوب اور مغرب میں پھیلا ہوا تھا۔ امریکہ میں اس فرانسیسی قبضے کی وجہ سے انگریزی نوآبادیات صرف مشرقی ساحل سے چپکی ہوئی تھیں۔ ان کے مغرب یا شمال میں پھیلنے کے دروازے بند تھے۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں فرانسیسیوں نے دریائے اوہائیو (Ohio) کی وادی پر پہلی بار قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ یہ کناڈا اور لوئی یانا کے درمیان واقع تھا۔ فرانسیسیوں (French) نے اس وادی میں شمال اور جنوب میں قلعے تعمیر کئے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کناڈا کو لوئی یانا سے ملا دیا جائے تاکہ ان کے مقبوضہ علاقے ایک دوسرے سے جڑ جائیں اور درمیان میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ دوسری طرف وہ یہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کو مغرب میں مزید پھیلنے کا موقع نہ ملے۔ انگریز نوآبادکار بھی اس خطرہ سے باخبر تھے۔ چنانچہ انہوں نے جوابی کاروائی

کے طور پر 'اوہائیو' کی وادی میں اپنی فوجی مداخلت سے اپنی طاقت میں اضافہ کیا۔ چنانچہ وادی اوہائیو میں 1754 سے دونوں قوموں کے درمیان جھڑپیں ہورہی تھیں۔ یورپ میں جب 'ہفت سالہ جنگ' شروع ہوئی تو برطانیہ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ کسی طرح اپنی نوآبادیات کو آئندہ فرانسیسیوں کی دستبرد سے بچا سکے۔ ہفت سالہ جنگ میں برطانوی وزیراعظم ولیم پٹ کی پالیسی یہی تھی کہ شمالی امریکہ سے فرانسیسیوں کو نکال باہر کیا جائے۔ وہ کناڈا سے فرانسیسیوں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب بھی ہوگیا۔ جہاں تک لوئی یانا کا تعلق ہے اس کا دریائے مسی سپی (Mississippi) کے مشرق میں واقع نصف حصہ انگریزوں کو مل گیا اور مغربی لوئی یانا فرانس نے اسپین کے حوالے کر دیا۔ اس طرح ہفت سالہ جنگ کے نتیجہ میں شمالی امریکہ میں فرانسیسیوں کا عمل دخل پوری طرح ختم ہوگیا اور اس کی وسیع نوآبادیاتی سلطنت میں سے صرف چند منتشر جزائر اس کے قبضہ میں رہ گئے۔ امریکہ میں فرانسیسی عزائم کا یوں خاک میں مل جانا انگریزی نوآبادیات کے لیے خوش آئند عمل تھا۔ ان کے سروں پر جو تلوار لٹک رہی تھی وہ اب ٹوٹ چکی تھی۔ انہیں اب کسی بیرونی دشمن کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ اسپین سے بھی اب کوئی خطرہ باقی نہیں تھا چونکہ انگریزوں نے فلوریڈا کو بھی اپنے قبضے میں لیا تھا۔

9.3 امریکی نوآبادیاتی سماج (The Colonial Society of America)

امریکی انقلاب کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے اس دور کے امریکی نوآبادیاتی سماج کو سمجھنا ہوگا جو کہ ایک پیچیدہ عمل ہے۔ 1776 سے ڈیڑھ سو سالوں کے دوران امریکی سماج برطانوی اور یورپی معاشروں سے الگ اور منفرد ہو چکا تھا۔ امریکہ میں آزادی عمل انقلاب سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا، انقلاب تو بس اس عمل کی انتہا تھی۔ 1776 میں یورپ سے مختلف دوسری دنیا میں رہنے والے امریکیوں کی سب سے واضح نشانی ان کی متحرک معیشت تھی جس کی ترقی امریکہ کے جنگلوں اور غیر کاشت شدہ میدانوں میں ہوئی۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی جس کا سہرا نوآبادکاروں کی سخت محنت اور ذہانت کو دیا جاتا ہے اور کسی برطانوی شہری کی مرہون منت نہیں ہے۔ نوآبادیاتی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ایک متنوع زرعی نظام تھا۔ نیو برطانیہ اور درمیانی نوآبادیات میں چھوٹے اور انفرادی کھیت تھے، تو جنوب میں بڑے بڑے فارم، جن کی کاشت غلاموں کے ذریعے کروائی جاتی تھی۔ دونوں خطوں کے درمیان امریکی عوام مختلف قسم کی فصلیں اگاتے تھے جیسے اناج، تمباکو، چاول، نیل، سبزیاں، پھل اور بہت سی دوسری چیزیں۔ اس نظام نے نہ صرف تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کو خوراک فراہم کیا بلکہ برآمدات کے لیے فاضل پیداوار بھی فراہم کی۔ مغرب میں وسیع سرزمینیں خالی پڑی تھیں جو ابھی تک زیر استعمال نہیں آئی تھیں اور اس نے وہاں کے لوگوں کو عظیم معاشی مواقع فراہم کیے۔

نیو برطانیہ اور درمیانی نوآبادیوں کے تاجروں نے امریکہ میں کامیاب کاروبار کو بھی فروغ دیا۔ انہوں نے سمندر پار برطانیہ، ویسٹ انڈیز اور یورپی ممالک کے ساتھ بھی تجارت کی۔ برآمد شدہ سامان کی اکثریت نوآبادیاتی کچا مال تھی، جیسے تمباکو اور عمارتی لکڑی، جو تیار شدہ مال اور غلاموں کے بدلے برطانیہ اور یورپ بھیجے جاتے تھے۔ حالانکہ 1776 تک نوآبادیات، اندرون برطانوی مخالفت کے باوجود مصنوعات تیار کرنے لگے تھے۔ نیو برطانیہ میں، لاتعداد تاجروں نے ویسٹ انڈین شیرے سے رم بنا کر بے پناہ دولت کمائی۔ ایک فروغ پزیر جہازرانی صنعت

بھی قائم ہو چکی تھی۔ بلاشبہ، نو آبادیات 1776 تک خود کفیل نہیں تھے، لیکن وہ اب برطانیہ اور یورپ پر بھی مکمل طور پر تابع نہیں تھے۔ امریکی کاروباری افراد اپنے مفادات کے تحفظ اور توسیع کے لیے پر عزم تھے۔ زیادہ تر امریکی معاشی طور پر خوش تھے اور انہیں یقین تھا کہ اگر وہ اپنے معاشی مفادات کے حصول کے لیے آزاد رہے تو ان کا مستقبل روشن ہے۔

1776 میں، امریکہ کی آبادی تقریباً پچیس لاکھ کے قریب پہنچ چکی تھی جو کہ برطانوی سماج کی طرح طبقاتی ڈھانچے میں منظم تھی۔ معیشت، سیاست، مذہب اور سماجی طور طریقوں پر غلبہ رکھنے والے مالدار تاجروں اور باغان مالکوں کا اشرافیہ طبقہ اپنی حیثیت سے باخبر تھا اور اسے برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ آزاد کسانوں، دکانداروں، کاریگروں اور کاروباری لوگوں کا ایک بڑا گروہ مقام اشرافیہ سے نیچے تھا۔ کچھ یومیہ اجرت والے مزدور، کرایہ دار کسان اور بندھوا نوکر بھی تھے جو معاشرے میں نچلے مقام پر تھے جن کے نیچے پھر حبشی غلام بھی تھے۔ یہ سماجی ڈھانچہ یورپ کی طرح بے لچک نہیں تھا۔ یورپ کے کسی اعلیٰ طبقے نے امریکہ میں ہجرت نہیں کی۔ نو آبادیاتی اشرافیہ خاندانوں کے نسب کی جڑیں یورپ میں نہیں ملتی تھی۔ امریکہ میں اشرافیہ کی بنیاد خون پر نہیں بلکہ دولت پر تھی۔ نچلے طبقے کے کاروباری اور خوش قسمت لوگوں کے لیے محنت سے کمائی گئی دولت کے ذریعے اشرافیہ کا درجہ حاصل کرنا ممکن تھا۔ نچلے طبقے کے لوگ، جو اعلیٰ طبقے کے غلبے کی مخالفت کرتے تھے، سرحدی علاقوں میں آباد تھے۔ اس طرح، نو آبادیاتی حالات نے اشرافیہ سماج کے بندھنوں کو ڈھیلا کر دیا اور کم حیثیت اور کم آمدنی والے لوگوں کو زیادہ آزادی فراہم کی۔

نئی اور پرانی دنیا میں شاید سب سے زیادہ فرق سیاسی زندگی میں تھا۔ اگرچہ ہر امریکی نو آبادی کی اپنی علیحدہ حکومت تھی، لیکن 1776 عیسوی تک ایک عمومی طرز تیار ہو چکا تھا۔ ہر نو آبادی میں ایک گورنر ہوتا تھا، جو تاج برطانیہ کے اختیار کی نمائندگی کرتا تھا اور جسے عام طور پر برطانوی حکمران منتخب کرتا تھا۔ اصولی طور پر گورنر کو نو آبادیاتی امور سنبھالنے اور سیاسی آزادی کو دبانے کے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ پنسلوانیا کے علاوہ ہر نو آبادی میں دو ایوانوں والی مقننہ یا اسمبلی تھی۔ ایوان زیریں کا انتخاب دولت مند افراد کرتے تھے جبکہ ایوان بالا کے ارکان کو برطانوی بادشاہ یا گورنر نامزد کرتے تھے۔ نو آبادیاتی قانون ساز اسمبلیوں کے اختیارات مکمل طور پر واضح نہیں تھے لیکن عام طور پر مقامی اور ٹیکس کے معاملات میں ان کے اختیارات وسیع تھے۔ ان معاملات پر گورنر کے پاس تقریباً لا محدود اختیار (Veto Power) تھا، لیکن چونکہ وہ تنخواہوں اور بھتوں کے لیے اسمبلی کے رحم و کرم پر تھے، اس لیے عموماً وہ ان حقوق کو استعمال کرنے کی حالت میں نہیں تھے برطانوی عدالتوں کے طرز پر نو آبادیوں کا اپنا عدالتی نظام تھا اور وہ برطانوی شہریوں کی طرح قانونی حقوق کا استعمال کرتے تھے۔

در حقیقت، نو آبادیاتی سرکاریں وسیع پیمانے پر آزادی کی عادی ہو چکی تھیں اور نو آبادیات کے لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ انہیں اپنی سیاسی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ 1776 سے پہلے وہ مانتے تھے کہ وہ برطانوی کے زیر حکمرانی تھے، لیکن جب مخصوص معاملات کی بات آتی تھی تو وہ یہ دلیل دیتے تھے کہ فیصلے کرنے میں ان کی اپنی حکومتوں سے بھی مشورہ لیا جانا چاہیے۔ نو آبادیات میں یہ احساس گھر کرتا جا رہا تھا کہ نو آبادیاتی سرکاروں کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی خود برطانوی حکومت کی ہے۔ ایک سو پچاس سالہ خود

حکمرانی (self-rule) کے تجربے نے برطانیہ اور نوآبادیوں کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی تھی۔

نوآبادیات کی مذہبی زندگی منفرد تھی۔ اگرچہ وہ ایسے کلیسا کے اخراجات کے لیے ٹیکس دیتے تھے جو اکثر عدم رواداراور آمرانہ ہوتے تھے، لیکن ان نوآبادیوں میں یورپی ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ مذہبی آزادی تھی۔ پیوریٹن (Puritan) اور اینگلیکن (Anglican) فرقوں کے ساتھ پریسبیٹیرین (Presbyterian)، لوتھرن (Lutheran)، ڈچ ریفارمڈ (Dutsch Reformed)، رومن کیتھولک (Roman Catholic) اور یہودیوں (Jews) اور دوسرے مذہبی افکار کے لوگ بھی یہاں رہتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے فکری انقلاب کے دوران اناجیلی (Evangelicalism) یا میتھوڈزم (Methodism) جیسے مذہبی عقائد کا بھی آغاز ہوا تھا۔ 1776 عیسوی سے پہلے، نوآبادیات، ثقافتی سرگرمیوں میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے۔ امریکیوں نے نوآبادیاتی سماج کو ہنرمند بنانے کے لیے کالج اور اسکول ضرور قائم کیے تھے، کئی علاقوں میں اخبارات کی اشاعت بھی شروع کی تھی، امریکی طرز تعمیر کی بنیاد بھی ڈالی گئی تھی۔ لیکن ادب و فن کے شعبوں میں کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہوئی تھی۔ مختصر یہ کہ نوآبادیات کی ثقافتی زندگی اب بھی یورپ سے منسلک تھی۔ نوآبادیاتی امریکہ کے بارے میں شاید سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے لوگوں نے یورپ کے اہم ثقافتی رجحانات سے جڑے رہنے کی صلاحیت پیدا کی۔ نہ سمندر کی رکاوٹ، نہ زبان، اور نہ ہی نوآبادیات کی سخت زندگی امریکیوں کو روشن خیالی کے اصولوں اور جدید سائنس کے ماحصل کو اپنانے سے روک سکی۔

اگرچہ 1776 تک، امریکی اور برطانوی سماجوں کے درمیان بہت سے اختلافات پیدا ہو چکے تھے، لیکن یہ اختلافات انقلاب کا باعث نہیں بنے۔ زیادہ تر امریکی اب بھی انگریز تھے اور یورپی روایت سے قریب سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی معاشی فکر، ان کا سیاسی نظام، ان کا مذہب اور ان کا سماجی نظریہ بنیادی طور پر یورپی تھا۔ اگرچہ وہ نئے ماحول میں گھل مل گئے تھے، لیکن وہ نئی شکل میں تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ ان کی بغاوت اس یقین سے متاثر تھی کہ برطانیہ ان روایات کی خلاف ورزی کر رہا ہے جو نوآبادیات نے اسی سے وراثت میں حاصل کی تھیں۔ امریکی انقلاب امریکیوں کے یورپ سے تعلق توڑنے کی مثال نہیں تھی، بلکہ یہ امریکیوں کے ذریعے یورپ کے سب سے قیمتی اور بلند ترین نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی ایک مثال تھی، تاکہ وہ اس امریکی سماج کے لیے اٹھائے گئے حلف کو پورا کر سکیں جس کی انہوں نے بنیاد ڈالی اور پرورش و پرداخت کی تھی۔

9.4 برطانیہ کے ساتھ کشمکش (Conflict with Britain)

نوآبادیاتی سماج کی پریشانیوں کی جتنی کم سمجھ اٹھارویں صدی کے برطانیہ میں تھیں اتنی شاید ہی کہیں اور نہیں تھی۔ عظیم برطانیہ ایک تنگ نظر طبقہ اشراف کے زیر اثر تھا وہ سترہویں صدی میں سیاسی اصلاحات کے مخالف تھے۔ سمندر پار نوآبادیوں میں برطانوی دلچسپی بنیادی طور پر اقتصادی تھی۔ حقیقی کاروباری نظریہ برطانوی حکمرانوں کو یقین تھا کہ برطانوی خوشحالی اور طاقت کا انحصار نوآبادیاتی وسائل کے استحصال پر ہے۔ نوآبادیاتی تعلقات میں شامل انسانی عناصر پر بہت کم توجہ تھی۔ اپنی نوآبادیات کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی، جہازرانی

قوانین(Navigation Acts)کے ایک سلسلے سے واضح ہوتی ہے، جس کے مطابق نوآبادیات میں پیدا ہونے والے کچھ سامان صرف برطانیہ کو ہی فروخت کیے جاتے تھے۔ نوآبادیات کے باشندے صرف برطانوی تیار کردہ سامان کو ہی خرید سکتے تھے اور تمام سامان برطانوی یا نوآبادیاتی جہازوں میں ہی ڈھویا جاتا تھا۔ برطانیہ کا مقصد ایک بند اور خود کفیل معیشت بنانا تھا تاکہ ان کے مفادات کو نوآبادیاتی مفادات پر ترجیح دی جا سکے۔

9.4.1 جہازرانی قوانین (The Navigation Acts)

جہازرانی قوانین کی ابتدا برطانیہ کی ساحلی تجارت کے لیے قاعدہ قوانین طے کرنے سے ہوئی، جسے بعد میں زیر اقتدار برطانوی نوآبادیات پر بھی لاگو کر دیا گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے پہلا جہازرانی قانون 1660 میں نافذ کیا، حالانکہ اس قانون میں کچھ نیا نہیں تھا۔ سترہویں صدی کے اختتام تک، پارلیمنٹ نے دوسرے جہازرانی قوانین بھی نافذ کر دیے اور نوآبادیاتی حکام کو انہیں بحری عدالتوں کے نظام (Maritime Courts)کے ذریعے نافذ کرنے کے لیے لگا دیا۔ان عدالتوں کا دائرہ اختیار تجارتی قوانین سے متعلق معاملات تک تھا۔ جہازرانی قوانین کا مقصد دوہرا تھا؛ برطانوی جہازرانی صنعت کو ڈچ اور دیگر غیر ملکی طاقتوں کے مقابلے سے بچانا اور برطانوی تاجروں کو تمباکو اور چینی جیسی نوآبادیاتی اشیاء پر اجارہ داری قائم کرنا تھا۔ جہازرانی قوانین تجارتی تحفظاتی پالیسی(Mercantile Policy)کے پس منظر میں وجود میں آئی۔ جو یورپی طاقتوں کے درمیان اس وقت غالب تھی۔ اس پالیسی کے مطابق، کوئی قوم اپنی دولت کو بلین(Bullion) میں یا اس کو ہونے والی سونے کی سپلائی میں ناپ سکتی ہے۔ روایتی نظریے کے مطابق، چونکہ دنیا میں سونے کی صرف ایک محدود مقدار موجود تھی اور دولت کی فراہمی بھی محدود تھی۔ ایک سامراجی طاقت اپنی دولت کو بڑھانے کے لیے نوآبادیوں میں سونے کے ذخائر کو کھوجنے اور لوٹنے میں لگے ہوئے تھے اور ساتھ ہی وہاں کی قدرتی وسائل کی پیداوار کو اپنے ملک میں صنعت کاری کیلئے استعمال کرتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ کھلی تجارت کا نظام صرف دولت کے نقصان کا باعث بن سکتا تھا اس لیے انہوں نے نوآبادیاتی مادی دولت کو سامراجی حدود کے اندر ہی رکھنے کو فائدہ مند سمجھا اور جہازرانی کے مختلف قوانین کو نافذ کیا۔

ان قوانین کے تحت ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں برطانوی نوآبادیات صرف برطانوی جہازوں میں سامان درآمد اور برآمد کر سکتی تھیں اور ہر جہاز کا عملہ تین چوتھائی انگریز ہوتا تھا۔ اس طرح سے برطانیہ، ایشیا، افریقہ یا امریکہ میں اپنی نوآبادیات سے انگریزی جہازوں پر مصنوعات درآمد کر سکتا تھا اور یہ کہ بیرونی ممالک سے سامان صرف برطانوی جہازوں پر یا اُن نوآبادیاتی جہازوں سے آ سکتا تھا جہاں سے اصلی سامان پیدا ہوا تھا۔ درحقیقت، جہازرانی قوانین نے برطانوی رعایا (برطانوی اقتدار میں رہنے والا ہر فرد) اور انگریزی جہازوں کو مختلف نوآبادیاتی بندرگاہوں کی تمام تجارت کی قانونی اجارہ داری دے۔ یہاں تک کہ نوآبادیاتی بندرگاہوں اور بیرونی ممالک کے درمیان تجارت صرف برطانوی جہازوں سے کی جا سکتی تھی۔ اس طرح، غیر ملکی جہازوں کو نوآبادیاتی بندرگاہوں سے مکمل طور پر دور رکھا گیا۔

قانون سازی کا ایک اور میدان اشیاء سے متعلق تھا۔ جہازرانی قوانین نے کچھ نوآبادیاتی مصنوعات کی نشاندہی کی، جنہیں صرف

برطانیہ کو برآمد کیا جاسکتا تھا۔ابتدائی طور پر فہرست میں تمباکو، چینی، نیل، روئی، اون، ادرک اور فاسٹک (fustic) اور دوسری رنگنے والی لکڑیاں شامل تھیں۔ بعد میں، شاہی پارلیمنٹ نے بحریہ کے ذخائر، بھانگ، چاول، شیرا، اودبلاؤ کی کھالیں، سمور، تانبا، لوہا اور لکڑی کو بھی برآمدات کی فہرست میں شامل کیا۔مزید برآں، نوآبادیات ایشیائی اشیا اور یورپی مصنوعات صرف برطانیہ سے درآمد کرسکتی تھیں، اگرچیکہ ایزورس(Azeros) یامادیرا(Madeira) جزیروں سے نمک اور شراب اور آئرلینڈ یا اسکاٹ لینڈ سے اشیاء خوردنی کے معاملے میں چھوٹ دی گئی تھی۔ پارلیمنٹ نے جہازرانی قوانین کے تحت مذکورہ اشیاء کی تجارت کو نافذ کرنے کے لیے بانڈز(bonds) کا ایک نظام نافذ کیا۔جن کے لیے جہاز کے مالک کو قوانین کی دفعات پر عمل کرنا ضروری تھا۔یہ انتظامات کچھ اس طرح عمل میں لائے گئے تاکہ امریکی جہازوں کے مالکان کو براعظمی اور ویسٹ انڈین نوآبادیات کے تجارت پر ایک عملی اجارہ داری حاصل ہو۔اس میں برطانیہ کے باشندوں کی نوآبادیات سے برطانوی جزیروں تک مذکورہ بھاری سامان لے جانے کی عمومی اجارہ داری تھی۔نوآبادیات بڑی حد تک برطانوی مصنوعات کو خریدنے کی پابند تھی۔اس برآمدی تصادم کے دائرے میں نوآبادیات میں برطانوی سامان سستا تھا۔انقلاب سے پہلے کے دس سالوں میں یہ امداد اوسطاً £38,000 سالانہ سے زیادہ تھی۔ برطانوی مالیاتی رپورٹوں کے مطابق 1757 سے 1770 تک نوآبادیات کو برآمد کی گئی برطانوی کتان(Linen) پر امداد £346,232 تھی۔اس کے علاوہ، نوآبادیات کو برآمد کیے جانے والے یورپی سامان پر ڈیوٹی کی چھوٹ تھی۔اس امداد اور چھوٹ سے بڑی رقم بنتی تھی۔صرف ویسٹ انڈیز کے 1774 میں 34,000 پونڈ بنتے تھے۔اور 1764 میں برطانیہ کی اوسط ادائیگی £250,000 سالانہ بنتی تھی۔

جہازرانی جیسے ایک اور سلسلہ تھا جسے تجارتی قوانین (Trade Acts) کہا جاتا ہے اور جنکو غلطی سے جہازرانی قوانین سے منسوب کیا جاتا ہے اور جو 1700 کے بعد نافذ کیے گیے تھے اور جو آہستہ آہستہ تجارتی تسلط اور حوصلہ افزائی کے ایک پیچیدہ نظام میں تبدیل ہو گئے تھے۔اس عمومی منصوبہ سازی میں پوری برطانوی سلطنت کو خوشحال بنانا تھا۔ تجارتی قوانین نے برطانیہ میں مطلوبہ اشیا کی نوآبادیاتی پیداوار کی حوصلہ افزائی کے لیے متعدد اقدامات کیے ۔ ان قوانین نے نوآبادیاتی تمباکو کے مقابلے میں ہسپانوی تمباکو پر بھاری درآمدی محصولات عائد کی۔اسی طرح سے دیگر نوآبادیاتی سامان کی پیداوار کی حوصلہ افزائی کی گئی۔اس قانون سازی نے کچھ نوآبادیاتی اجناس کے لیے بھی چھوٹ دی جس کی پیداوار برطانوی مانگ سے زیادہ تھی۔پارلیمنٹ نے برطانیہ پہنچنے پر نوآبادیاتی مصنوعات جیسے بھانگ، نیل، لکڑی اور ریشم پر براہ راست نقد امداد کی اجازت دی۔ جس کی رقم 1771 سے 1775 تک مجموعی طور پر £82,000 سے زیادہ بنتی تھی۔ بحریہ ذخائر کو بھی کھلی امداد ملی، جو 1706 سے 1774 تک کل £1,438,762 بنتی تھی، اور جو انقلاب کے وقت اوسطاً £25,000 تھی۔

کئی سالوں تک برطانیہ کی نوآبادیاتی پالیسی سخت تھی۔ نوآبادیاتی مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی موثر ادارہ موجود نہیں تھا اور گورنروں کو قواعد وضوابط کو نافذ کرنے میں برطانیہ سے بہت کم تعاون حاصل ہوتا تھا۔ 1756 سے 1763 تک چلنے والی یورپی 'سات سالہ جنگ'(Seven-Year-War) نے سالوں کی غفلت کو درست کرنے کے لیے اصلاحاتی پروگراموں کے نفاذ کی ترغیب دی۔ برطانیہ

کو اس جنگ میں کافی مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اگرچہ اس جنگ سے امریکی نو آبادیات کے لیے فوری خطرہ ٹل گیا مگر ان کے دفاع کا سوال ابھی بھی باقی تھا۔ ہسپانویوں، فرانسیسیوں اور سرخ ہندیوں (Red Indians) کی جانب سے اب بھی کسی جارحیت کے امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہفت سالہ جنگ کے نتیجہ میں وادیِ مسی سپی کے وسیع علاقے انگریزوں کے قبضہ میں آ گئے تھے۔ ان وسیع تر ذمہ داریوں کی وجہ سے دفاع کا بوجھ قدرے بڑھتا ہی نظر آتا تھا۔ 1763 کے بعد، برطانیہ کے لیے تشویش کے اہم شعبے، نو آبادیات کی حفاظت، جنگی قرضے اور نو آبادیات میں ان معاشی قوانین کا نفاذ تھا۔ جنہیں برسوں سے نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں برطانیہ خاص طور پر امریکیوں سے ناراض تھا کیونکہ انہوں نے سات سالہ جنگ کے دوران جنگ میں شامل ہونے اور اس کے لیے رقم مہیا کرنے سے انکار کر دیا تھا، دشمنوں کے ساتھ تجارت کی تھی اور فرانسیسیوں کے مقابلے میں برطانوی حکام کی نافرمانی کی تھی۔ ان وجوہات کی بناء پر برطانوی حکومت یہ چاہتی تھی کہ امریکی نو آبادیات کے دفاع پر خرچ ہونے والی رقم کا کم از کم نصف بوجھ خود نو آبادیات برداشت کریں۔ اسی کے ساتھ ہی برطانیہ اور نو آبادیات کے درمیان 1763 سے 1773 کے درمیان اصل کھینچ تان شروع ہوئی۔

9.4.2 اسٹامپ ایکٹ (The Stamp Act)

اس غرض سے برطانوی وزیر اعظم گرینویل (Grenville) کی کابینہ نے قانونِ اسٹامپ اور دیگر کئی قوانین پاس کیے تاکہ اس محصول سے امریکی نو آبادیات میں دفاعی خرچ کو پورا کیا جا سکے۔ ان کا مقصد پیسہ اکٹھا کرنا اور نو آبادیاتی انتظامیہ کو باقاعدہ بنانا تھا۔ مزید برآں برطانوی حکومت نے ایلیگھنی پہاڑ (Allegheny Mountains) کے دوسری طرف کے علاقوں میں نوآبادکاروں کے بسنے پر پابندی لگا دی۔ بہت سے درآمدی سامان اور تجارتی دستاویزات پر ٹیکس عائد کیا گیا اور برطانوی کاروبار کو نو آبادیاتی کاروبار پر ترجیح دی گئی۔ ان تمام اقدامات میں سب سے زیادہ قابل نفرت اسٹامپ قانون (Stamp Act, 1765) تھا۔ اس قانون کے مطابق، دستاویز، اخبار اور اشتہار کو خصوصی مہر والے ایسے کاغذ پر چھاپا جاتا تھا جس پر پہلے ہی محصول دیا جا چکا تھا۔

لیکن تمام نو آبادیات میں Stamp Act کی شدت سے مخالفت ہو گئی جس کا اظہار انہوں نے بائیکاٹ، اشتعال انگیز تقاریر، تشدد اور احتجاجی میٹنگوں کے ذریعہ سے کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ بھی انگریز ہیں اور برطانوی شاہی پارلیمنٹ کو ان پر ٹیکس عائد کرنے کا حق نہیں ہے ۔ برطانیہ کی دستوری روایات کے اس بنیادی اصول پر اصرار کیا جانے لگا کہ برطانوی مقننہ (پارلیمنٹ) میں نمائندگی کے بغیر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا دعوی تھا کہ یہ ٹیکس اسلئے غیر قانونی تھا۔ کیونکہ اُن کی برطانوی پارلیمنٹ میں کوئی نمائندگی نہیں تھی اور اُن کے لیے یہ ٹیکس نسلی اختیارات سے کم نہیں تھا۔

9.4.2.1 اسٹامپ ایکٹ کانگریس (The Stamp Act Congress)

پیش نظر صورت حال میں کسی بڑے انقلاب کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ حالات نے اس وقت پلٹا کھایا جب برطانوی پارلیمنٹ نے 'راست محصول اندازی' (direct taxation) ٹیکس کو عاید کیا۔ جس کو نو آبادیاتی لوگوں نے مختلف وجوہات کی بنا پر مخالفت کی۔ کے

سوال پر پیدا ہوا۔ان کا عقیدہ تھا کہ انگریزوں کو ہمیشہ سب سے زیادہ فکر اپنی ذاتی آمدنی کی تھی۔ پارلیمنٹ اصل میں اسی غرض سے وجود میں آیا تھا تاکہ وہ بادشاہوں کی دست درازی اور ذاتی خرچوں پر قدغن لگا سکیں۔اُلٹا اس نے نوآبادیاتی لوگوں پر غیر جائیز ٹیکس عاید کیے۔اسکے رد عمل میں انہوں نے یہ زریں اصول ایجاد کیا تھا کہ 'No Taxation without Representation' (بغیر نمائندگی کے کوئی محصول ادائیگی نہیں۔) جس کی عمل داری نے جنگ کے اسباب پیدا کئے۔ 1765 میں نوآبادیات کے نمائندوں نے نیویارک میں ایک کانگریس منعقد کی جسے اسٹامپ قانون کانگریس(The Stamp Act Congress) کہا گیا۔اس کانگریس نے اپنے ایک حقوق اور شکایات کا اعلامیہ جاری کیا جس میں دعویٰ کیا گیا کہ امریکی نوآبادکار دیگر تمام برطانوی شہریوں کے برابر ہیں اور اس لیے نمائندگی کے بغیر ٹیکس لگانے پر احتجاج کیا اور کہا کہ برطانوی پارلیمنٹ میں نوآبادیاتی نمائندگی کے بغیر پارلیمنٹ،نوآبادیات پر ٹیکس نہیں لگاسکتی۔

9.4.2.2 حقوق اور شکایات کا اعلامیہ (Declaration of Rights and Grievances)

'حقوق اور شکایات کا اعلامیہ' اسٹامپ اور تجارتی پابندیوں کے رد عمل کے طور پر سامنے آیا تھا جسے 14 اکتوبر 1765 کو اپنایا گیا۔امریکی نوآبادکاروں نے اس میں مندرجہ بالا قوانین کی مخالفت کی حالانکہ 1765 کے اسٹامپ ایکٹ کے بارے میں خصوصی طور پر کوئی اشارہ نہیں کیا گیا تھا۔اسٹامپ ایکٹ ٹیکس کے مخصوص احتجاج کے علاوہ،اس نے مندرجہ ذیل دعوے کیے:

- امریکی نوآبادیات،تاج برطانیہ سے وہی تعلق رکھتے ہیں جو برطانوی سلطنت کے اندر پیدا ہونے والی دوسری رعایا رکھتی ہے۔
- نوآبادیات،پارلیمنٹ کے واجب ماتحت ہیں۔
- نوآبادکار،ایک برطانوی شہری کے تمام حقوق رکھتے ہیں۔
- جیوری کے ذریعہ مقدمہ ان کا حق ہے۔
- بحریہ عدالتیں (Admiralty Courts) ناروا ہیں۔
- ووٹنگ کے حقوق کے بغیر پارلیمنٹ،نوآبادیوں کی نمائندگی نہیں کرسکتی۔
- نمائندگی کے بغیر کوئی ٹیکس نہیں ہونا چاہیے۔
- نوآبادیات پر ٹیکس لگانے کا حق صرف نوآبادیاتی اسمبلیوں کو حاصل ہے۔

لیکن اُس وقت کی برطانوی حکومت ان ساری چیزوں سے غیر سنجیدہ تھی۔ جارج سوم اور اس کے وزراء اس مسئلہ کو خالص قانونی نقطہ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاہی پارلیمنٹ کو نوآبادیات پر ٹیکس عائد کرنے کا ناقابل تنسیخ حق حاصل ہے اور نوآبادیاتی رد عمل تو یہ ایک باغیانہ سرگرمی ہے جس کا کچلنا حکومت کا اولین فرض ہے۔اس میں شک نہیں کہ اُس وقت برطانیہ میں چارلس جیمس فاکس(Charles James Fox)،مشہور سیاسی مفکر ایڈمنڈ برک(Edmund Burke) اور چیتھم کے پہلے ارل ولیم پٹ(William Pitt) جنہوں نے ہندوستان کے لیے پٹس انڈیا ایکٹ تجویز کیا، جیسی شخصیتیں موجود تھیں جن کی دور رس نگاہیں اس مسئلہ کے خطرناک نتائج کو تاڑ چکی تھیں۔اس لیے وہ شروع سے ہی اس سلسلے میں نوآبادیات سے مصالحت کی روش پر زور دے رہے تھے اور نو

آبادیات کے خلاف دباؤاور طاقت کی پالیسی کے مخالف تھے۔تاہم، جارج سوم ایک تنگ نظر آدمی تھا۔اس کی ریشہ دوانیوں کی بدولت حکومت بڑی حد تک اس کے قبضے میں آچکی تھی۔ برطانیہ میں شاہی اقتدار کی بحالی کے عمل نے امریکی مسئلہ کو بری طرح الجھادیا۔جب اس نے پارلیمنٹ اور سنیٹ کو پوری طرح اپنے قابو میں کرلیا تو امریکی نو آبادیات کے تعلق سے جو بھی پالیسی اختیار کی گئی وہ برطانیہ کے ذی ہوش عوام کی مرتب کردہ نہیں تھی بلکہ وہ ایک "نیم پاگل، بدتدبیر اور اقتدار کے بھوکے حکمران جارج سوم کی تھی"۔ برطانیہ کی داخلی سیاست کی اس صورت حال نے پٹ، برک اور فاکس کے رد عمل کو زایل کردیا۔

9.4.3 ٹاؤن شینڈ قوانین (The Townshend Acts)

نو آبادیات نے حقوق اور شکایات کا اعلامیہ جاری کرنے کے ساتھ ساتھ برطانوی مال کا بائیکاٹ شروع کردیا تھا۔ان حالات میں 1766ء میں بر سر اقتدار آنے والی وزیر اعظم راکنگھم (Rockingham) کی کابینہ نے نوآبادیاتی احتجاج کے چلتے اسٹامپ ایکٹ کو تو منسوخ کردیا مگر اس کے ساتھ ہی یہ حماقت کی کہ ایک قانون وضاحت یعنی ڈکلیریٹری ایکٹ (Declaratory Act) پاس کیا جس کی رو سے شاہی پارلیمنٹ کو نو آبادیات پر محصول عائد کرنے کا پورا پورا حق دیا گیا اور 1767ء میں ٹاؤن شینڈ نے وزیر خزانہ کی حیثیت سے نو آبادیات کے متعدد اشیاء مثلاً چائے، کاغذ اور گلاس پر درآمد محصول عائد کیا۔ جس سے مالی بحران کو اور برطانوی حق محصول اور سیاسی تسلط کو برقرار رکھا۔نوآبادیات انگریزی مال کے بائیکاٹ کو اور زیادہ موثر کردیا۔ایک ہی سال کے عرصہ میں برطانیہ کا درآمدی محصول گھٹ کر سات لاکھ پونڈ سے سولہ ہزار پونڈ ہو گیا۔انگریز کمشنروں کو اس ٹیکس کا وصول کرنا دشوار ہو گیا تھا۔نو آبادیات میں بددلی برانگیختگی اور بغاوت کی فضا پیدا ہونے لگی تھی۔ان خطرناک آثار و علامات کے باوجود جارج سوم اپنی ضد پر اڑا رہا۔وہ نو آبادیات سے اس مسئلہ پر کسی مصالحت کے لیے تیار نہیں تھا۔1770ء میں جب لارڈ نارتھ (Lord North) وزیر اعظم ہوا تو کابینہ نے صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے یہ فیصلہ کیا کہ چائے پر درآمدی محصول بہر حال برقرار رہے گا۔ جبکہ دیگر درآمدی اشیاء پر ہٹایا۔اسکے باوجود نوآبادیاتی لوگ ناخوش تھے۔اُن کو ٹیکس کے بوجھ پر اعتراض نہیں تھا بلکہ پارلیمنٹ میں ان کی غیر موجودگی اور غیر نمائندگی پر اعتراض تھا۔

9.4.4 بوسٹن قتل عام (The Boston Massacres)

نوآبادیاتی مخالفت کے چلتے، برطانیہ نے کچھ قوانین کو منسوخ کردیا، لیکن نوآبادیات پر گرفت مضبوط کرنے کی اپنی عام پالیسی کو جاری رکھا۔1768 تک برطانیہ نے امریکہ میں فوج بھی بھیج دی اور اپنے افسران کو حکم دیا کہ وہ ایسی امریکی املاک کو ضبط کرلیں جو برطانوی قانون کے دائرے میں نہیں آتے تھے۔دھیرے دھیرے امریکیوں نے برطانوی اقتدار کو ٹیکس سے کہیں زیادہ وسیع بنیادوں پر چیلنج کرنا شروع کردیا۔اُن کو لگا کہ برطانوی حکومت ٹیکس کے ذریعے ان کی جائیداد چوری کررہی ہے اور انہیں تمام روایتی برطانوی آزادیوں سے محروم کررہی ہے۔5 مارچ 1770 کو بوسٹن میں ایک تصادم ہوا جس میں 9 برطانوی فوجیوں نے بہت سارے امریکی باغیوں کو ہلاک کردیا۔اس حادثے کو مشہور محبان وطن جیسے پال ریور اور سیموئل ایڈمز نے 'بوسٹن قتل عام' کا نام دیا۔ برطانوی فوجیوں کو 1768 سے

میساچوسٹس میں اس لئے تعینات کیا گیا۔ تاکہ وہ برطانوی نظام کی حمایت کریں اور غیر مقبول پارلیمانی قوانین کو نافذ کریں۔ اس سے عام شہریوں اور فوجیوں کے درمیان کشیدہ تعلقات ہو گئے۔ ایک ہجوم نے برطانوی شہریوں کا گھیرا کر کے انہیں پتھروں اور برف کے گولوں سے نشانہ بنایا۔ جس دوران ایک سپاہی نے گولی چلائی جس سے تین افراد ہلاک اور آٹھ زخمی ہوئے، جن میں سے دو بعد میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسے۔ قائم مقام گورنر تھامس ہچنسن نے انکوائری کا وعدہ کیا جس سے ہجوم منتشر ہو گیا۔ اگلے دن آٹھ فوجیوں، ایک افسر اور چار شہریوں کو گرفتار کیا گیا اور ان پر قتل کا الزام لگایا گیا۔ شہریوں کا دفاع مستقبل کے امریکی صدر جان ایڈمز نے کیا۔ چھ فوجیوں کو بری کر دیا گیا۔ دیگر دو کو قتل عام کا مجرم قرار دیا گیا مگر انہیں کم سزائیں سنائی گئیں۔ قتل کے مجرم پائے جانے والے دونوں برطانوی شہریوں کو ان کے ہاتھ پر نشان لگانے کی سزا دی گئی۔

9.4.5 بوسٹن ٹی پارٹی (The Boston Tea Party)

1773 عیسوی کے بعد مسلسل کشمکش تیزی سے بحران کی طرف بڑھی۔ لارڈ نارتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ سستے داموں پر امریکہ میں چائے کی درآمد کا انتظام کیا تھا مگر اس کے باوجود امریکیوں نے اس چائے کو خریدنے سے انکار کر دیا۔ جب چائے سے لدے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز بوسٹن (Boston) کی بندرگاہ پر پہنچے تو سرخ ہندیوں (Red Indians) کے بھیس میں بوسٹن کے نوجوانوں نے ان جہازوں پر چڑھ کر چائے کی تمام 340 پیٹیاں سمندر میں پھینک دیں۔ دسمبر 1773ء کا یہ واقعہ 'بوسٹن چائے پارٹی' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ برطانوی حکومت اس مراقبہ سے کافی بدظن ہوگئی اور اس نے بوسٹن والوں کو سزا دینے کے لیے انٹولریبل قانون (Intolerable Act) پاس کیا۔ جس وجہ سے بوسٹن کی بندرگاہ کو بند کر دیا گیا اور بوسٹن میں بہت سارے برطانوی فوجیوں کو جمع کیا۔ میساچوسٹس (Massachusetts) کو نوآبادیاتی حکومت کی خود اختیاری کو ختم کر دیا۔ اسے ایک فوجی کمانڈر کے ماتحت کر دیا گیا اور بڑے جرائم میں مشتبہ افراد کو برطانیہ بھیجنے اور برطانوی قانون کے مطابق سزا دینے کی دھمکی دی گئی۔ اسکے علاوہ برطانوی حکومت نے کیوبیک ایکٹ (Quebec Act) پاس کیا جس نے صوبہ کیوبیک کے حدود اراضی کو جنوب میں دریائے اوہائیو تک وسیع کر دیا اور دریائے اوہائیو کے شمال اور الیگھنی کے مغرب کے تمام علاقوں کو اس سے منسلک کر دیا، تاکہ یہ تمام علاقہ میساچوسٹس، کنکٹی کٹ، ورجینیا کو نہ مل سکیں جس کے وہ کچھ عرصہ سے دعویدار تھے ۔ میساچوسٹس کی عدالتوں کے اختیارات میں تخفیف کی گئی اور فرانسیسی کیتھولکوں کو رواداری فراہم کی گئی۔ امریکیوں کو اب پہلے سے کہیں زیادہ یقین ہو گیا کہ برطانیہ ان کو دوسرے درجے کا شہری مانتا ہے۔

9.4.6 فلاڈلفیا کی پہلی کانگریس (The First Congress of Philadelphia)

پارلیمنٹ کی میساچوسٹ کے خلاف اس کاروائی نے نوآبادیات میں ایک نئی آگ بھڑکائی۔ مخالفانہ اور باغیانہ فضا، ہر سو پھیلنے لگی۔ اس صورت حال میں تشدد پسندوں جن کی قیادت سیموئیل ایڈمز کر رہا تھا، کے ساتھ بہت سے نوجوان بھرتی ہو گئے۔ اس پریشان کن صورتحال پر غور کرنے کے لیے جارجیا کو چھوڑ کر دیگر 12 نوآبادیات کے نمائندے 1774 میں فلاڈلفیا میں اس عزم کے ساتھ اکٹھا ہوئے کہ وہ سب

متحدہ طور پر اپنے بنیادی حقوق کی حفاظت کے لیے ضروری اقدامات کریں گے۔اس پہلی کانٹی نینٹل کانگریس (Continental Congress) یا براعظمی کانفرنس نے 1774ء میں ایک جرات مندانہ قرارداد منظور کرکے ایک نیا رجحان ظاہر کیا۔اس نے انٹوریبل ایکٹ کو غیر قانونی قرار دیا اور کہا کہ برطانوی پارلیمنٹ نے فرد کے فطری حقوق (Natural Rights) کی خلاف ورزی کی۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے نوآبادیات والے، قدرتی قانون کو انگریزی قانون سے برتر مانتے تھے اور ان کے مطابق اگر انگریزی قانون، قدرتی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو انہیں ایسے انگریزی قانون کے خلاف بغاوت کرنے کا حق ہے۔انہوں نے آپس میں ایک پختہ معاہدہ کے ذریعہ سے اپنے آپ کو ایک امریکی اتحاد کی تنظیم میں منسلک کرلیا جس کا بنیادی مقصد برطانوی مال کا بائیکاٹ تھا۔نوآبادیوں کے اس طرز عمل سے برطانیہ میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔نوآبادیات اپنے اختیار کردہ موقف سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔دوسری طرف، برطانیہ نوآبادیات کو کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔برطانیہ میں عام خیال یہ تھا کہ نوآبادیات بغاوت کے راستہ پر گامزن ہیں۔جسکا کچلنا لازمی ہے۔اس لیے برطانیہ اور نوآبادیات آہستہ آہستہ جنگ کی طرف بڑھتی گئیں۔

یاد رہے کہ کچھ نوآبادیات کے لوگوں میں برطانیہ سے متعلق وفاداری اور ہمدردی تھی۔اُن میں بہت سے برطانیہ سے مصالحت کا خواہاں تھے وہ اپنے آبائی وطن کے خیر خواہ اور طرفدار تھے۔مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو بہر حال برطانیہ سے اپنی شرطیں منوانا چاہتے تھے اور اس مقصد میں ناکامی کی صورت میں وہ کامل آزادی کو ترجیح دیتے تھے۔یہ لوگ محبان وطن (patriots) کہلاتے تھے۔غرض رائے عامہ نوآبادیات میں ان دودھاروں میں بٹی ہوئی تھی۔موخرالذکر طبقہ میں زیادہ جوش و خروش پایا جاتا تھا اور ان ہی کی پرجوش سرگرمیوں کی وجہ سے لیکسنگٹن کے مقام پر برطانوی اور نوآبادیاتی سپاہیوں میں پہلا فوجی تصادم ہوا۔

حالیہ زمانے کے بیشتر مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ اگر اس وقت برطانیہ تدبر سے کام لینے کے قابل ہوتا تو شاید امریکی نوآبادیات کو علیحدگی اور قطع تعلق کے راستہ سے ہٹالیا جاسکتا تھا لیکن بدقسمتی سے برطانیہ کے حکمران حلقہ میں تدبر کا فقدان تھا۔جارج سوم حکومت پر پوری طرح چھایا ہوا تھا اور اس کی ہٹ دھرمی ملک کو تباہی کے راستہ پر لے جارہی تھی۔جو لوگ مدبر تھے ان کا حکومت پر اثر نہیں تھا۔اس مسئلہ کا جارج سوم کے پاس صرف ایک ہی حل تھا۔وہ یہ کہ طاقت کے ذریعہ سے نوآبادیات کی اس بغاوت کو کچل دیا جائے۔اس نے اس وسیع اور بااثر رائے عامہ سے فائدہ اٹھانے کی مطلق کوشش نہیں کی جواب بھی نوآبادیات میں برطانیہ کے موافق تھی۔ان سے نہ ربط پیدا کیا گیا اور نہ ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔اُس نے خالی کھپہ سرخ ہندیوں سے اتحاد کیا جس سے برطانیہ کے دوست بھی اس کے دشمن ہوگئے۔غرض جو عناصر برطانیہ کے مدد و معاون ہوسکتے تھے ان کو بھی اس اندھی حکمت عملی نے دشمن کیمپ میں دکیل دیا۔جرمنوں اور ہنوویریوں کی فوج جنرل باوے (General Howe) کی سرکردگی میں امریکہ پر مسلط کردی گئی۔جس نے ایک طرف سرخ ہندیوں سے تعاون کیا اور دوسری طرح امریکی باغیوں پر سختی سے ٹوٹ پڑے۔

9.5 امریکی انقلاب (The American Revolution)

9.5.1 امریکہ کا اعلان آزادی (America's Declaration of Independence)

اپریل 1775 میں لیکسنگٹن(Lexington)اور کنکورڈ(Concord) میں جھڑپوں کے ساتھ جنگ شروع ہوگئی۔ مئی 1775 میں آزادی کے اعلان کے لیے تیار لوگوں کی قیادت میں دوسری براعظمی کانگریس منعقد ہوئی جس میں جارج واشنگٹن (George Washington)کوامریکی فوج کی کمان سونپی گئی۔ شروع میں رہنماؤں کو نوآبادیاتی رائے عامہ کی مکمل حمایت حاصل نہیں تھی لیکن بعد میں انہوں نے انقلابی تحریک کی پوری حمایت کی۔ پورا امریکہ آزادی کے نعروں سے گونج اٹھا۔ آزادی کے لیے سب سے زیادہ اثر انگیز بیان تھامس پین (Thomas Paine)نے اپنے کامن سینس(*Common Sense*) نامی پمفلٹ میں دیا تھا جو 1776 کے اوائل میں شائع ہوا تھا۔ بادشاہت اور اس کی برائیوں پر اس کے اشتعال انگیز حملے اور برطانوی لالچ پر اس کی شدید تنقید نے لاتعداد امریکیوں کو آخری قدم اٹھانے پر اکسایا۔ نوآبادیات میں اس وقت تک محبان وطن کا گروہ بہت طاقتور ہو چکا تھا۔ برطانیہ کے خیر خواہ تو اپنی جگہ خاموش تماشائی بنے رہے۔ ادھر سیاسی اقتدار کی باگ ڈور عملاً محبان وطن کے ہاتھ میں آچکی تھی جو نوآبادیات اور برطانیہ کو ایک رشتہ میں وابستہ کئے ہوئے تھا۔ وہ آزادی سے کم کسی چیز سے متفق نہیں تھے۔ جو لڑائی محصول اندازی کے معمولی مسئلہ پر شروع ہوئی تھی، وہ سیاسی نظریات اور سیاسی نصب العین کی لڑائی بن گئی۔ اقتدار اعلیٰ اور حکومت کی اخلاقی بنیادوں کے جدید ترین نظریات کی بناء پر امریکہ کی آزادی کی جدوجہد کو جائز قرار دیا گیا۔

آزادی کی حمایت میں بہت سی نوآبادیات نے 4/جولائی 1776 کی دوسری کانٹی نینٹل کانگریس میں اپنے وفود کو برطانیہ سے تعلقات منقطع کرنے کی ہدایت کی۔ اس کانگریس نے بہر حال ایک فیصلہ کن اقدام اُٹھایا۔ اس نے ایک شدید اصلاح پسند رہنما تھامس جیفرسن(Thomas Jefferson)کے تخلیق کردہ اعلان آزادی (Declaration of Independence)کو جاری کیا۔ جان لاک اور روشن خیالی کے یورپی شاگردوں کے سیاسی فلسفے پر مبنی تھا۔ اس کا عظیم الشان تعارف "فطری حقوق اور حکومتی معاہدے" کی بنیاد پر کیا گیا۔ اس میں کہا گیا کہ انسانوں کو ان کے خالق نے بعض ایسے حقوق عطا کئے ہیں جو کسی حالت میں بھی ان سے چھینے نہیں جا سکتے۔ ہر شخص کو زندگی، آزادی اور شخصی راحت کے لیے تگ ودو کا قدرتی حق حاصل ہے۔ اس بات کا دعویٰ کیا گیا کہ اقتدار جو حکومت کا سرچشمہ ہے عوام کی مرضی پر منحصر ہے۔ جس حکومت کی بنیاد عوام کی مرضی پر نہ ہو وہ جابرانہ حکومت ہوگی۔ عوام اس بات کے مجاز ہیں کہ ایسی جابرانہ حکومت کے خلاف بغاوت کر کے اس کا تختہ الٹ دیں اور ان کی جگہ اپنی مرضی کی حکومت قائم کر لیں۔ انسانی گروہوں کے یہ حقوق ناقابل انکار ہیں۔ برطانوی حکومت نے ان حقوق کو نظر انداز کر دیا تھا اور اس طرح وہ عوام کی وفاداری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔ ان حقوق کے تحفظ کے لیے عوام کو نیا معاہدہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ان اصولوں کی روشنی اور ان بنیادی حقوق کی بنیاد پر یہ اعلان کیا گیا کہ متحدہ امریکی نوآبادیات اب ایک آزاد اور جداگانہ مملکت 'متحدہ ریاستہائے امریکہ' (United States of America) ہیں جس پر کسی کی کوئی بالادستی نہیں ہے۔ آزادی کے اعلان نے اس جدوجہد کو قانونی طور پر قائم اقتدار کے خلاف محض ایک بغاوت سے اوپر اٹھا دیا۔ اس نے امریکیوں کی جدوجہد کو تمام روشن خیال لوگوں کی جدوجہد بنا دیا۔ اس نے نہ صرف 1776 کے سوالات کو واضح کیا بلکہ آنے والی نسلوں کو اُن بنیادی حقوق اور آزادیوں

کے لیے جدوجہد کرنے کی بھی تحریک دی جو کسی بھی حکومت کے اختیار سے باہر تھی۔

9.5.2 امریکہ میں انقلابی جنگ کا آغاز (Beginning of the Revolutionary War in America)

1775 میں جب جنگ شروع ہوئی تو برطانیہ اس جدوجہد کے لیے تیار نہیں تھا اور اسے کمک حاصل کرنے کے لیے بوسٹن سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ امریکیوں نے اس واقعے کو اپنی فتح سمجھا۔ ابتدائی کامیابی کی بنیاد پر، امریکیوں نے 1775 کے آخر میں کینیڈا کے خلاف ایک ناکام مہم چلائی۔ جولائی 1776 تک، نیویارک (New York) کو جنگی مستقر بنا کر برطانیہ حملہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اگلا مہینہ انقلابیوں کے لیے سب سے مشکل تھا۔ خوراک اور جنگی ساز و سامان کی کمی کی وجہ سے تباہ حال واشنگٹن کی چھوٹی فوج کو نیو جرسی (New Jersey) اور ڈیلاویئر (Delaware) سے باہر کھدیڑ دیا گیا۔ صرف برطانوی کمانڈر ولیم ہووے (William Howe) کے محتاط رویہ نے انہیں تباہی سے بچا لیا۔ سال کے آخر میں واشنگٹن ٹرینٹن (Trenton) اور پرنسٹن (Princeton) پر حملہ کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ کامیابیاں امریکی حوصلے کو برقرار رکھنے میں اہم ثابت ہوئیں۔ اصل موڑ 1777 میں آیا جب برطانیہ نے وادی ہڈسن (Hudson Valley) پر قبضہ کر کے نو آبادیات کو دو ٹکڑوں میں منقسم کرنے کی کوشش کی۔ اس کی جنگی حکمت عملی شمال میں کناڈا اور جنوب میں نیویارک سے امریکی فوجیوں کو نکال باہر کرنا تھی۔ کناڈا میں جنرل جان برگوئین (John Burgoyne) نے برطانوی فوجیوں کی قیادت کی، لیکن، امریکیوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے وہ کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ جنوب سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکی کیونکہ ہووے فلاڈیلفیا پر بے نتیجہ قبضہ کی مہم میں الجھا رہا۔ ہووے نے کامیابی تو حاصل کر لی مگر تب تک بہت دیر ہو گئی اور شمال میں برگوئین بری طرح گھر چکا تھا اور اسے بالآخر اکتوبر 1777 میں سارا ٹوگا (Saratoga) میں ہتھیار ڈالنا پڑے۔

اس کامیابی کے نتیجے میں امریکیوں کے حوصلے نمایاں طور پر بلند ہوئے۔ اس کا بنیادی نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس امریکہ کا حامی بن گیا۔ برطانیہ کی شکست ہوتے دیکھنے کی خواہش اور امریکہ والوں کی خیر خواہی کے جذبے سے متاثر ہو کر، فرانس 1775 کے اوائل سے ہی نو آبادیات کی غیر رسمی مدد کر رہا تھا۔ تاہم، اس نے اس خوف سے اپنے آپ کو جنگ میں مکمل طور پر شامل نہیں کیا کہ شاید امریکی، برطانیہ کے ساتھ اپنا تنازعہ طے کر لیں یا امریکیوں کو شکست ہو جائے۔ سارا ٹوگا کی کامیابی نے فرانس کو یہ اعتماد دیا کہ امریکیوں کی کامیابی کا امکان ہے۔ 1778 میں فرانس اور امریکیوں کے درمیان ایک باقاعدہ معاہدہ ہوا اور فرانس نے امریکیوں کو ضروری رقم، بحری جہاز اور فوج بھیجی۔ سارا ٹوگا کے واقعے اور فرانس کے عزم سے متاثر ہو کر دیگر یورپی طاقتوں نے بھی امریکہ سے دوستی اور برطانیہ سے دشمنی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ یہ طاقتیں پہلے ہی برطانیہ کی بالادستی سے پریشان تھیں۔ آخر کار برطانیہ کے پرانے رقیب اسپین اور ہالینڈ نے بھی برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ برطانیہ کو اب کئی ممالک کے خلاف جنگ کا سامنا تھا۔ امریکہ پر دباؤ کافی حد تک کم ہو گیا۔

1777 کے بعد امریکہ کی جنگ ایک بڑے علاقے پر پھیل گئی۔ برطانوی فلاڈیلفیا سے پیچھے ہٹ گئے اور نیویارک میں اکثر فوجیں تعینات کر دیں۔ واشنگٹن کی فوج، بنیادی طور پر ان فوجیوں پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ برطانوی فوجیوں نے کیرولینا (Carolina) اور

ورجینیا (Virginia) کو حاصل کرنے کی کوشش میں 1780–81 میں جنوب میں جارحانہ کارروائی کی۔ یہ فوجی مہم اکتوبر 1781 میں ورجینیا کے یارک ٹاؤن، میں ایک تباہ کن شکست پر اختتام پذیر ہوئی جہاں برطانوی فوجیوں نے کارنوالس کی کمان میں اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کامیابی کا سہرا امریکیوں اور فرانسیسیوں دونوں کو جاتا ہے۔ یہ امریکی جنگ آزادی کی آخری بڑی جنگ تھی، حالانکہ رسمی طور پر یہ جنگ 1783ء تک جاری رہی۔ 1781 تک برطانیہ اس جنگ کو ختم کرنے کے لیے فکر مند ہو گیا تھا جس نے پوری دنیا میں اس کی طاقت کو چنوتی دے رکھی تھی۔

9.5.3 بین الاقوامی جنگ (International War)

اعلان آزادی نے امریکہ میں بڑا زبردست جوش خروش پیدا کر دیا۔ برطانیہ میں اس منزل پر بھی اس کو چند فسادی عناصر کی باغیانہ کاروائی سمجھا گیا اور اس بات کو محسوس نہیں کیا گیا کہ بحر اوقیانوس کے اس پار جو کچھ ہو رہا ہے وہ دراصل کوئی معمولی فساد اور بغاوت نہیں بلکہ ایک آزادی کی لڑائی تھی۔ اس اعلان کے بعد ہی جارج سوم نے لارڈ ہاوے کی جرمن فوج امریکہ بھیجی تھی۔ نوآبادیاتی لیڈروں کا نظریاتی موقف پہلے ہی مستحکم ہی مگر میدان جنگ میں وہ ابھی بھی کمزور تھے۔ جارج واشنگٹن کو کانگریس نے سپہ سالار اعلی مقرر کیا تھا مگر اس سے بھی معجزات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ہر چند کہ اس نے انتہائی غیر معمولی فوجی مہارت کا ثبوت دیا، پھر بھی وسائل کی کمی، اتحاد میں بعض ناگزیر رخنوں کی موجودگی، تربیت یافتہ اور ضابطہ بند فوجوں کا فقدان۔ یہ سب چیزیں نہ صرف اس کے کام میں مشکلات پیدا کر رہی تھیں بلکہ انگریزوں کے مقابلہ میں کامیابی کو مشکل بنا رہی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر لڑائی صرف ان دو فریقوں میں جاری رہتی تو برطانیہ اس بغاوت کو آسانی سے کچل دیتا مگر رفتہ رفتہ اس جنگ نے ایک بین الاقوامی رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ یورپی قومیں برطانیہ کی اس کشمکش کا دلچسپی سے مطالعہ کر رہی تھیں۔ 1763ء کے صلحنامہ پیرس کے بعد سے فرانس اپنے عظیم نقصانات کی وجہ سے برطانیہ پر خار کھائے بیٹھا تھا۔ اسپین کو بھی جو کچھ اس نے کھویا تھا اس کی بازیافت نہ سہی مگر برطانیہ سے بدلہ لینے کی آرزو تھی۔

ان حالات میں بنجامن فرینکلن (Benjamin Franklin) کو امریکی کانگریس نے پیرس روانہ کیا تھا تاکہ فرانس سے اس جنگ کیلئے مدد حاصل کر سکے۔ اگرچہ فرینکلن نے اپنی پر اثر شخصیت کے زور پر پیرس کے اعلی سیاسی اور تہذیبی حلقوں میں بہت اچھا اثر پیدا کیا مگر فرانس فوراً جنگ میں کودنے سے بدک رہا تھا۔ اس نے جنگ ہفت سالہ کی شکستوں کو بھلایا نہیں تھا۔ فرانس صحیح موقع کی تلاش میں تھا۔ اس لیے فرینکلن کی کوششوں کے باوجود لوئی پانزدہم اور اس کے مشیر جن میں شرکت سے احتراز کرتے رہے لیکن جب اکتوبر 1777 میں انگریز کمانڈر جنرل برگوئن (General Burgoyne) کو سارا ٹوگا (Saratoga) کے مقام پر چھ ہزار فوج کے ساتھ ہتھیار ڈالنے پڑے تو فرانس نے محسوس کیا کہ اب مداخلت کا وقت آ گیا ہے۔ فرانس نے فوراً ریاستہائے متحدہ سے اتحاد کر لیا اور 1778ء میں برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ حق تو یہ ہے کہ فرانس کا یہ اقدام آئندہ اس کے لیے بہت تباہ کن ثابت ہوا۔ مطلق العنان بادشاہت کی گرتی ہوئی عمارت کے لیے یہ ایک ایسا دھکا تھا جس سے وہ سر بہ آور نہ ہو سکی۔ فرانس نے اپنی مدد سے اوقیانوس کے اس پار ایک ایسے سیاسی نظام کا خاتمہ کیا جس کی بنیاد بادشاہت (Monarchy) پر تھی اور اس کی جگہ جمہوری حکومت کے قیام میں ہاتھ بٹایا۔ امریکہ میں بادشاہت

کے خاتمہ اور جمہوریت کے رواج نے فرانس کے جمہوریت پسند عناصر کے دلوں میں امید کی ایک نئی کرن پیدا کی۔ان امکانی نتائج سے بے خبر انگریزوں سے بدلہ لینے کے لیے لوئی پانزدھم کی حکومت نے خوشی خوشی اعلان جنگ کر دیا۔

اگلے سال 1779 میں اسپین بھی جنگ میں شریک ہو گیا۔وہ برطانیہ سے اپنے پرانے حساب بیباق کرنا چاہتے تھے۔اسی کے ساتھ ہالینڈ نے بھی برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔اس کو اپنی تجارت کے ہاتھ سے جانے کا دکھ تھا۔ان تینوں طاقتوں کا بیک وقت برطانیہ کے خلاف صف آراء ہونا ایک پریشان کن عمل تھا۔طرہ یہ کہ روس نے بھی 1780ء میں سوئیڈن اور ڈنمارک کے ساتھ اتحاد کر کے 'شمالی طاقتوں کی مسلح غیر جانبداری' کا اعلان کیا۔دشمن کو ممنوعہ مال کی فراہمی کو روکنے کے لیے برطانوی بحریہ غیر جانب دار ممالک کے جہازوں کی تلاشی لینے کے عمل پر آغاز جنگ سے کاربند تھا۔ان ملکوں نے اب یہ اعلان کیا کہ وہ اس عمل کے خلاف ضرورت پڑنے پر مسلح مداخلت کریں گے۔ مسلح غیر جانبداری کے اتحاد میں رفتہ رفتہ پرشیا، پرتگال اور شہنشاہیت روما کی جانشین سلطنت بھی شریک ہو گئیں۔ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پورا یورپ برطانیہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس مشکل لمحہ میں اس کے تمام دشمن ہر گوشہ سے اس پر ٹوٹ پڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ برطانیہ کو اپنی پچھلی کامیابیوں کی قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی۔امریکی نو آبادیات کی بغاوت ایک بین الاقوامی جنگ کی صورت اختیار کر چکی تھی ۔یوں تو یورپ کی سب ہی بڑی طاقتیں برطانیہ کو آنکھیں دکھا رہی تھیں مگر فی الواقعی مقابلہ فرانس، اسپین اور ہالینڈ سے جاری رہا۔اب لڑائی صرف امریکہ کے میدانوں میں مقید نہیں رہی بلکہ سمندروں پر، ویسٹ انڈیز میں اور ہندوستان کے ساحلوں تک پھیل چکی تھی۔1781 میں جب کارنوالس کو یارک ٹاؤن کے مقام پر اپنی سات ہزار برطانوی فوجیوں کے ساتھ واشنگٹن میں ہتھیار ڈال پڑے مختصراً سوائے کناڈا کے برطانیہ نے امریکہ میں اپنی وسیع اور عریض سلطنت کھو دی تھی۔

9.5.4 پیرس معاہدہ امن اور صلحنامہ ورسائی (Paris Peace and the Treaty of Versailles, 1783)

ادھر فرانس اور اسپین کے خلاف جنگ جاری رہی۔جنوبی ہندوستانی جنگ کے ابتدائی مرحلوں میں انگریزوں کا موقف کچھ بہتر رہا۔ انہوں نے فرانسیسیوں کے اہم قلعوں پر قبضہ کر لیا۔1781ء میں فرانسیسیوں کے حلیف حیدر علی کو شکست دے کر دشمن پر بھاری ضرب لگائی اور فرانسیسیوں پر برتری حاصل کر لی مگر یہ برتری کچھ ہی عرصے میں ہاتھ سے نکل گئی۔اگلے سال فرانسیسی امیر البحر آندرے دی سفرن (André de Suffren) نے ساحل کارومنڈل کے قریب انگریزی بیڑے کو شکست دے کر سمندر پر دوبارہ برتری حاصل کر لی۔ اس کے برعکس مشرق سے بہت دور بحیرہ کریبین (Caribbean Sea) میں انگریزوں نے 1782ء میں فرانسیسی بحریہ کو شکست دی۔ اس کامیابی نے ویسٹ انڈیز میں برطانیہ کے موقف کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔غرض بعض کامیابیوں کے باوجود جنگ کے آخری دو سال برطانیہ کے لیے پریشان کن رہے۔اس جنگ کو جاری رکھنے سے بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ہر طرف ناکامیوں کا گھٹاٹوپ اندھیرا تھا۔برطانیہ کی رائے عامہ اس جنگ کو ختم کرنے پر مائل تھی۔انگریزوں نے امریکی نو آبادیات کھو دی تھیں۔جزیرہ منورکا (Minorca) سے انہیں باہر نکال دیا گیا تھا۔جنوبی ہند میں ان کا موقف متزلزل تھا۔ان ناکامیوں نے جارج سوم کی عزت خاک میں ملا دی۔اس جنگ اور اس سے منسلک تباہ کن پالیسی کا وہی معمار تھا۔بحر حال، اقتدار اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔پارلیمنٹ اور کیبنٹ اب بادشاہ کی بجائے رائے عامہ کے تابع ہو گئے تھے۔

چنانچہ 1783ء میں پیرس معاہدہ امن اور صلحنامہ ورسائی کے ذریعہ برطانیہ نے صلح کر لی۔

امن مذاکرات کا اختتام پیرس میں ہوا۔ بینجمن فرینکلن(Benjamin Franklin) کی قیادت میں بھیجے گئے امریکی وفد کو فرانسیسی قیادت نے برطانیہ کے ساتھ علیحدہ معاہدہ کرنے سے روکا۔ لیکن، برطانیہ کو کچھ زیادہ ہی نقصان پہنچانے کی غرض سے فرانس، جنگ ختم کرنے کی جلد بازی میں نہیں تھا۔ مزید برآں، وہ 1763 میں کھوئے ہوئے امریکی علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، کیونکہ نئی امریکی ریاست کا ابھی تک ان علاقوں پر کوئی قانونی دعویٰ نہیں تھا۔ فرانسیسی نیت کو بھانپ کر، امریکی نمائندوں نے مذکورہ ہدایات کو نظر انداز کیا اور سابقہ امریکی نوآبادیات کی طرف سے برطانیہ کے ساتھ ایک علیحدہ معاہدہ کر لیا جو پیرس معاہدہ امن (Paris Peace) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس معاہدے کے مطابق، برطانیہ نے اس نئی مملکت 'ریاستہائے متحدہ امریکہ' کی مکمل آزادی کو تسلیم کر لیا اور اور اپنے تمام بالادستی کے حقوق سے دستبرداری اختیار کی۔ ساتھ ہی مسی سپی(Mississippi) کے مشرق میں واقع گریٹ لیکس (Great Lakes) سے لے کر ہسپانوی فلوریڈا (Spanish Florida) تک کا پورا علاقہ امریکیوں کے حوالے کر دیا۔ امریکیوں نے برطانوی حکومت کو واجب الادا تمام قرضوں کو تسلیم کیا۔ فرانس نے بھی ان تمام شرائط کو منظوری دے دی۔ امریکی قوم نے ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے شاندار فتح حاصل کی۔ صلحنامہ ورسائی(The Treaty of Versailles) فرانس اور اسپین کے ساتھ کیا گیا۔ ورسائی کے معاہدے کے مطابق فرانس نے ویسٹ انڈیز میں ٹوباگو (Tobago) اور افریقہ میں سینیگال (Senegal) کے علاقے حاصل کر لیے جو اس نے 1763ء میں کھو دیے تھے۔ اسپین نے مینورکا جزیرہ (Minorka Island) اور فلوریڈا کا امریکی علاقہ دوبارہ حاصل کر لیا۔ نیدرلینڈ کو برطانیہ کے ہاتھوں ہندوستان میں اپنے کچھ تجارتی مفادات اور ایسٹ انڈین جزائر کے ساتھ تجارت کے کچھ حصے حاصل ہوئے۔

امریکہ کی جنگ آزادی کے ساتھ ہی برطانیہ کی عظمت کا آفتاب غروب ہو گیا۔ یورپ کے بڑے بڑے حکمران، روس کی کیتھرین دوم، پرشیا کا فریڈرک اعظم، آسٹریا کا جوزف دوم وغیرہ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ برطانیہ اب پھر نہ اٹھ سکے گا۔ 1763ء میں اس نے جو مقام یورپی ریاستوں میں حاصل کیا تھا وہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ فرانس کا حکمران طبقہ اپنی کامیابی پر نازاں تھا مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ خواب وخیال کی جس حسین دنیا میں وہ گم ہیں وہ محض ایک سراب ہے۔ عام نظروں سے اوجھل فرانس میں جو لاوا پک رہا تھا وہ کسی وقت بھی پھٹ پڑ سکتا تھا۔ امریکی انقلاب کی اہمیت یہ نہیں کہ بعض قوموں کو اس میں فتح حاصل ہوئی اور بعض کو ناکامی۔ اس کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس سے ان نظریات اور تصورات کی حوصلہ افزائی ہوئی جو سیاسی نظام میں فرد کے وقار اور عوامی اقتدار کے لیے مصروف پیکار تھے۔ زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ جمہوری اقدار کی نوزائیدہ قوتوں سے یورپ میں ملوکیت اور اشرافیت کا دامن جگہ جگہ سے چاک ہونے لگا۔ مطلق العنان بادشاہت اور اشرافیائی امتیازات کے کھوکھلے نظریوں کی بناء پر جو معاشرے قائم تھے ان کا تار و پود بکھرنے لگا۔ امریکہ کی آزادی عوام کیلئے ایک نیا درس اور ایک نیا حوصلہ لے کر آیا۔

9.6 امریکی انقلاب کے نتائج اور اہمیت

(Consequences and Importance of the American Revolution)

پیرس معاہدہ اور صلحنامہ ورسائی نے تیرہ نوآبادیات کو مقتدر اعلی اور خود مختار ریاستہائے متحدہ امریکہ (The United States of America) کے طور پر تسلیم کیا۔ امریکی آزادی کی اہمیت کئی نقطہ نظر سے تھی۔

1. برطانیہ نے اپنی سب سے گھنی آبادی والی نوآبادیات کھودیں اور بحر اوقیانوس کے اس پار مستقبل کا ایک عظیم یورپی نژاد آزاد ملک ابھرا۔
2. چونکہ امریکی انقلاب، ایک طرح سے، تجارتی پابندیوں کے خلاف بغاوت تھی، اس لیے اس نے ایڈم سمتھ (Adam Smith) کے آزاد تجارت (Laissez-faire) کے اصول کو تقویت بخشی اور تجارتی تحفظاتی (Mercantile) نظریے کو گہرا دھچکا پہنچایا۔ اس انقلاب نے واضح کر دیا کہ جب دوسری نوآبادیاں آنے والے وقت میں خود مختار ہو جائیں گی۔ امریکہ کی آزادی کے فوراً بعد، برطانیہ نے آزاد ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ خوشحال تجارت کو ترقی دی۔
3. فرانس نے سات سالہ جنگ میں اپنی شکست کا جزوی بدلہ لیا، پہلے ہی اس کیلئے اُس کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ امریکہ کی جنگ آزادی کے بھاری اخراجات کی وجہ سے اس کی پہلے سے ہی متزلزل معیشت مزید کمزور ہو گئی۔
4. برطانیہ کی شکست کا الزام حکمران جارج سوم اور اس کے وزراء پر ڈال دیا گیا۔ امریکی کامیابی نے بڑی حد تک، برطانیہ میں محدود بادشاہت اور سیاسی آزادی کو برقرار رکھنے میں مدد کی۔
5. امریکی انقلاب نے سیاسی اختراعات کا ایک سلسلہ شروع کیا جو آنے والے سالوں میں بہت اہم ثابت ہوا۔
6. امریکی انقلاب کے نظریات اور تجربات نے دیگر ممالک کو بھی متاثر کیا۔ اسکے اثرات فرانس پر فوراً نمایاں ہوئیں۔ آخری دو نکات اتنے اہم ہیں کہ ان پر الگ الگ تفصیل سے بات کرنا ضروری ہے۔

9.6.1 امریکی سیاسی اختراعات (American Political Innovations)

آزاد امریکہ کی بنیاد عوامی خود مختاری اور کامیاب انقلاب پر تھی۔ اس نے امریکہ میں مطلق العنان بادشاہت کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ خوفناک مثال اور مزید برآں، انقلاب کے دوران اور اس کے بعد، امریکی ریاستوں نے اہم سیاسی نظریات کا ایک سلسلہ تشکیل دیا۔ جس کا خلاصہ چار الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے: عوامیت (Republicanism)، جمہوریت (Democracy)، وفاقیت (Federalism) اور آئین پرستی (Constitutionalism)۔

قدیم یونان اور روم، اطالوی شہری ریاستوں اور سوئٹزرلینڈ میں بھی اس سے قبل جمہوریہ تھے، لیکن، امریکہ کی مثال ان سے کہیں بڑی تھی۔ اتنی بڑی کہ اسے نمائندہ حکومت کا ایک پیچیدہ نظام تیار کرنا پڑا۔ مزید برآں، یہ اپنے جمہوری نظام کے بارے میں کافی حد تک باشعور (self-conscious) تھا۔ تھامس پین کے بادشاہت مخالف نعرے اور جارج سوم پر اس کے اعتراضات نے زیادہ تر امریکیوں کو

متاثر کیا تھا۔ تاہم، کچھ لوگ واشنگٹن میں بادشاہت کے حق میں تھے اور کچھ لوگ اسٹوارٹ خاندان کے کسی شہزادے کو بادشاہ بنانے کے حق میں تھے۔ لیکن، نیا آئین مکمل طور پر عوامی تھا۔ ہر ریاست میں بھی عوامی حکومت قائم کی گئی۔ ابتدائی طور پر ریاستی نظام جس نے نوآبادیاتی نظام کی جگہ لی تھی، زیادہ جمہوری نہیں تھا۔ حق رائے دہی صرف مردوں اور عام طور پر زمینداروں اور زیادہ مالدار طبقوں تک محدود تھا۔ کیتھولک اور بعض قسم کے پروٹسٹنٹ بھی بعض مذہبی لیاقتوں کی وجہ سے حق رائے دہی سے محروم تھے۔ تاہم، کوئی پیدائشی اشرافیہ طبقہ نہیں تھا اور اس ترقی پذیر اور ابھرتے ہوئے ملک میں نئے آنے والوں نے بھی دولت حاصل کی تھی۔ شروع میں عہدے صرف امیر لوگوں کیلئے مخصوص تھے اور بالواسطہ انتخابات کی حدیں محدود تھیں۔ لیکن جلد ہی امریکہ میں چند ہی دنوں میں عوام کا عروج شروع ہو گیا۔ ہر ایک کے بعد ایک ریاست میں حق رائے دہی اور عہدے کے لیے جائیداد اور مذہبی اہلیتوں کو ختم کر دی گئیں۔

عوامی ریاستوں کے ساتھ ساتھ پہلے وفاقی حکومت بھی امریکہ میں قائم ہو گئی تھی۔ درحقیقت، 1774 میں، برطانوی سلطنت ایک قسم کا وفاق یا گٹھ بندھن ہی تھی، کیونکہ بہت سی نوآبادیات کے پاس مخصوص اختیارات کے حامل مقننہ تھے۔ لیکن امریکہ جامع، محتاط اور سوچ سمجھ کر بنائے گئے وفاقی نظام کی پہلی مثال تھا۔ 'مقتدر ریاستوں' سے بنا یہ خود مختار ملک اپنے آپ میں ایک تضاد تھا۔ اس نے مقامی اور قومی مفادات کو ہم آہنگ کرنے کا راستہ دکھایا۔ اس نے ظاہر کیا کہ کس طرح متضاد لوگوں اور مختلف مفادات کو مشترکہ بھلائی کے لیے حکومت کے اندر اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ امریکی وفاقیت کی مثال نے لاطینی امریکی جمہوریتوں (برازیل یا کولمبیا) سے لے کر سابق برطانوی نوآبادیات (کینیڈا، آسٹریلیا، ہندوستان) اور یہاں تک کہ سوویت سوشلسٹ جمہوریہ پر بھی دور رس اثرات مرتب کیے۔

جب مئی 1787 میں فلاڈیلفیا میں جارج واشنگٹن کی صدارت میں پرانی وفاقی نظام کی دفعات سے پیدا ہونے والے بین الریاستی تنازعات کو حل کرنے اور ایک طاقتور مرکزی حکومت کے قیام کے ذرائع وضع کرنے کے لیے ایک اجلاس بلایا گیا تو لوگ ایک آئین کے نظریات سے واقف تھے۔ کرام ویل دور کی برطانوی حکومت کا انسٹرومنٹ آف گورنمنٹ، برطانوی حکومت کی غیر تحریری روایتیں، نوآبادیاتی منشور، نئے ریاستی آئین، وفاقی حکومت کی دفعات وغیرہ آئین کی ہی مختلف مثالیں تھیں۔ لیکن، وفاقی آئین پوری قوم کے لیے منتخب نمائندوں کے ذریعے بنایا اور نافذ کیا ہوا پہلا آئین تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی اپنی حکومتیں بنانے میں مختلف ممالک کے تجربات اور سینکڑوں مفکرین کی تحریروں کی بنیادوں پر ایک تحریری آئین میں مرتکز اور مجتمع کیا۔

1789 میں نافذ ہونے والے امریکی آئین نے نہ صرف بہت سے اہم سیاسی نظریات مثلاً جمہوریت، محدود حکمرانی، اختیارات کی علیحدگی، تسلط اور توازن، نمائندہ انتظامیہ کو متعارف کیا، بلکہ یہ اپنے آپ میں بھی نہایت اہمیت کا حامل نمونہ عمل ہے۔ اس کے بعد تقریباً ہر قوم نے انقلاب کے ذریعے یا بصورت دیگر آئین بنانے کی کوشش کی اور پھر عوام سے اس کی منظوری حاصل کی۔ 1789 کے فوراً بعد امریکی آئین میں امریکی نوعیت کی دوسری اہم تبدیلی ہوئی، کیونکہ دسمبر 1791 میں پہلی دس ترامیم کا اعلان کیا گیا تھا۔ کل ملا کر، اس نے ہر شہری کو حکومت سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایک بل آف رائٹس' منظور کیا۔ اس نے قانون کی حکمرانی، کلیسا اور ریاست کی علیحدگی، تقریر،

صحافت، درخواست اور مقننہ کی ضمانت فراہم کی۔امریکہ کی مثال کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ گئی کہ ابتدا ہی سے اس حکومت نے موثر انداز میں کام کرنا شروع کیا اور مذکورہ نمونہ عمل کو عملی جامہ پہنایا۔ سچ تو یہ ہے کہ ابتدائی صدور واشنگٹن، جان ایڈمز، جیفرسن اور میڈیسن اور ان کی کابینہ کے عہدہ دار اس قدر غیر معمولی قابلیت اور صلاحیت کے حامل تھے کہ انہوں نے آئینی ڈھانچے کو کسی بھی خرابی سے بچانے کے لیے نئی روایات کی بنیاد رکھی۔ شروع سے ہی یہ واضح ہو گیا کہ جرات مندانہ امریکی تجربے میں غیر معمولی قوت ہے۔

9.6.2 برطانیہ اور فرانس پر انقلاب کے اثرات (Impact of the Revolution on Britain and France)

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ امن معاہدے سے پہلے ہی جارج سوم کو لارڈ نارتھ اور اس کی کابینہ کو برخاست کر کے ایک زیادہ آزاد خیال کابینہ کا تقرر کرنا پڑا۔ فوری طور پر متعدد اصلاحات نافذ کی گئیں۔ 1782ء میں آئرش پارلیمنٹ تقریباً آزاد ہو گئی اور 1793ء تک کیتھولک آئرش لوگوں کو ووٹ کا حق بھی مل گیا۔ 1800 میں، آئرش پارلیمنٹ کو ویسٹ منسٹر پارلیمنٹ کے ساتھ ملا دیا گیا اور ایک صدی سے زیادہ عرصے تک برطانوی مجمع الجزائر کو یونائیٹڈ کنگڈم آف برطانیہ اینڈ آئرلینڈ (United Kingdom of Britain and Ireland) کہا جاتا رہا۔ لیکن، اس سے بھی زیادہ اہم بعد میں 1839 سے 49 کے درمیان اٹھائے گئے اقدامات تھے جن کے ذریعے پرانی نو آبادیات کو آہستہ آہستہ خود مختار ڈومینین میں تبدیل کر دیا گیا۔

امریکی انقلاب نے فرانس پر اس سے بھی زیادہ فوری اور زیادہ ڈرامائی اثر ڈالا۔ فرانس میں آزادی، مساوات اور انسانی حقوق کے نعرے گونجنے لگے۔ امریکہ کی جدوجہد میں بہت سارے فرانسیسی فوج افسران نے اُن کا ساتھ دیا تھا۔ مشہور سائنسدان بنجامن فرینکلن نئے نظریات کا زبردست حامی تھا۔ فرانسیسی فری میسن اپنے امریکی بھائیوں کے ساتھ قریبی رابطے میں تھے۔ جب آزاد امریکی ریاستوں نے نئے آئین کا مسودہ تیار کیا تو فرانس کے دانشور طبقے میں اس پر بہت بحث کی گئی۔ یہ عملی طور پر لاگو جمہوریہ کی ایک مثال تھی۔ یہاں انسانی مساوات کو قانونی شکل دی گئی۔ سچ میں امریکی انقلاب، فرانس کی خداداد بادشاہت اور اشرافیہ کے خصوصی اختیارات کے لیے ایک فیصلہ کن دھچکا تھا۔ امریکی جنگ میں فرانس کی شمولیت معاشی دیوالیہ پن کا باعث بنی۔ اس نے بادشاہت کی کمزوری کو بے نقاب کیا اور اس کے مخالفین کو بہت سے مواقع فراہم کیے۔ فرانس کے لوگ امریکی انقلاب کے نظریات سے متاثر ہوئے اور انہوں نے تبدیلی کا مطالبہ بھی شروع کر دیا۔ فکری انقلاب کے روشن خیالوں سے تیار کردہ فرانس کی سرزمین پر امریکی انقلاب نے فرانسیسی انقلاب کے بیج بوئے۔

9.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

امریکہ کی آزادی کی جنگ، اٹھارویں صدی کا ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ برطانیہ اور اس کی امریکی نو آبادیات کی یہ لڑائی ابتداءً ایک گھریلو جھگڑے کے طور پر شروع ہوئی اور بعد میں اس نے ایک بین الاقوامی کی نوعیت اختیار کی۔ امریکہ آئندہ حریت پسند تحریکات اور ترقی پسند آرزوؤں کا سرچشمہ بن گیا اور نوع انسانی کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ ہفت سالہ جنگ کے اختتام نے امریکی نو آبادیوں میں ایک نیا ذہنی تاثر پیدا کر دیا تھا۔ فرانسیسیوں کی بے دخلی نے ان میں ایک مضبوط خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ 13 نو آبادیات اپنے اختلافات

کے باوجود بعض اہم معاملات میں مشترک مفاد رکھتی تھیں اور اپنے جمہوری اقدار کی حفاظت کے لیے کسی حد تک جاسکتی تھیں۔ان کے باشندے ان تمام حقوق کا مطالبہ کرتی تھیں جو ایک برطانوی شہری کو حاصل تھے۔ان میں حق رائے دہندگی کا نظریہ بھی شامل تھا۔جب برطانیہ نے ان پر اسٹامپ اور دیگر محصول نافذ کیے تو انہوں نے بغاوت کردی۔امریکیوں کی یہ بہادرانہ جدوجہد طاقتور برطانیہ کے سامنے کامیاب ثابت ہوئی۔امریکہ کو اس بغاوت میں بین الاقوامی حمایت حاصل ہوئی اور برطانیہ کے تمام دشمن ممالک نے اسپین، ہالینڈ جو اس کو نیچا دکھانا چاہتے تھے، اس جنگ میں امریکہ کے حق میں شمولیت کی۔ نتیجتاً جنگ نے بین الاقوامی شکل اختیار کرلی جس سے برطانیہ بہت ہی کمزور ہوگیا۔ بالآخر پیرس امن معاہدے اور ورسائی کے صلحنامے سے جنگ کا خاتمہ ہوا اور برطانیہ نے نوآبادیات کی آزادی تسلیم کرلی اور ایک آزاد متحدہ ریاستہائے امریکہ وجود میں آیا۔امریکی انقلاب کے دوررس نتائج عالمی سیاست پر پڑے کیونکہ اس نے ملوکیت اور بادشاہت کے زوال کی راہ ہموار کی۔

9.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

کمک	:	مدد خصوصاً فوجی مدد
رائلسٹ	:	شاہ پرست یا بطور خاص تاج برطانیہ کے وفادار
ٹوری	:	برطانیہ کا قدامت پرست اشرافیائی اور شاہ پرست گروہ
ہیونوؤں	:	(Huguenots) فرانس میں پروٹسلفنٹوں کو ہیونو کہتے تھے۔
جیوری کا نظام	:	جیوری کا نظام ایک قانونی عمل ہے جہاں شہریوں کا ایک گروہ، جو جیوررس کے نام سے جانا جاتا ہے، ثبوت سنتا ہے، حقائق کا پتہ لگاتا ہے اور فیصلہ سناتا ہے۔ جیوری نظام برطانوی عام قانونی نظام کی ایک پہچان ہے اور عام طور پر ان ممالک میں استعمال ہوتا ہے جو برطانوی سلطنت سے منسلک رہے ہیں، جیسے کہ برطانیہ، ریاستہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور آئرلینڈ۔
ہفت سالہ جنگ	:	سات سال کی جنگ (1756–1763) ایک عالمی تنازعہ تھا جس میں اس وقت کی اکثر بڑی یورپی طاقتیں شامل تھیں، اور اسے اصل 'عالمی جنگ' سمجھا جاسکتا ہے۔ بنیادی طور پر فرانس اور برطانیہ کے درمیان شمالی امریکہ میں تسلط کے دعووں پر تنازعہ کے طور پر شروع ہوئی اور بالآخر یورپ، افریقہ اور ایشیا تک پھیل گئی۔
مادر وطن	:	اصل سرزمین جس سے نوآبادیاں جڑی ہوتی ہیں۔
فاسٹک	:	(fustic) پیلے رنگ کا ایک رنگنے کا مواد
بانڈز	:	(bonds) ایک طرح کا قرض کا رقعہ جسے سرمایہ کار کسی کمپنی یا سرکار کو دیتا ہے۔

9.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

9.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. برطانوی پارلیمنٹ نے امریکی نوآبادیات پر اسٹامپ محصول کب عائد کیا؟
2. امریکی جنگ آزادی میں کسے امریکی افواج کا کمانڈر مقرر کیا گیا؟
3. بوسٹن ٹی پارٹی میں امریکیوں نے کس چیز کو سمندر میں پھینک دیا؟
4. امریکی انقلاب کس برطانوی حکمراں کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ تھا؟
5. امریکیوں نے کسے اپنا سفیر بنا کر مدد مانگنے کے لیے فرانس بھیجا؟
6. فرانس کس واقعے کے بعد جنگ میں کھلے عام شریک ہوا؟
7. ایڈمرالٹی یا بحری عدالتیں کس چیز سے متعلق تھیں؟
8. رائلسٹ کون تھے؟
9. امریکی نوآبادیات نے اپنی آزادی کا اعلان کب کیا؟
10. کس معاہدے کے ذریعے برطانیہ نے امریکی نوآبادیات کی آزادی تسلیم کی؟

9.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. امریکی انقلاب کا تاریخی پس منظر بیان کیجیے۔
2. اسٹامپ ایکٹ کانگریس پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. فلاڈلفیہ کی پہلی کانگریس پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. ٹاؤن شینڈ قوانین پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. بین الاقوامی جنگ پر ایک نوٹ لکھیے۔

9.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. امریکی نوآبادیاتی سماج کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. امریکہ کے اعلان آزادی اور انقلاب کے آغاز پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. امریکی انقلاب کے نتائج اور اہمیت پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔

9.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Allison, David, and Larrie D. Ferreiro eds., *The American Revolution*: *A World War*, Smithsonian, 2018.
2. Allison, Robert, *The American Revolution*: *A Concise History,* Oxford University Press, New York, 2011.
3. Coupland, R., *The American Revolution and the British Empire*, Russell & Russell, New York, 1965.
4. Franklin, Benjamin, *The Autobiography of Benjamin Franklin with an Introduction by Lewis Leary,* Simon & Schuster, New York and London, 2004.
5. Griffin, Patrick, *America's Revolution,* Oxford University Press, New York, 2012.
6. Harman, Chris, *A People's History of the World,* Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
7. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
8. Namier, Lewis, *England in the Age of the American Independence*, Macmillan, New Delhi, 2004.
9. Nester, William R., *The Frontier War for American Independence*, Stackpole Books, 2004.
10. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
11. Scott, H. M., "British Foreign Policy in the Age of the American Revolution," *The International History Review*, vol. 6, no. 1, 1984, pp. 113–25.
12. Ward, Christopher, and John Richard Alden eds., *The War of the Revolution*, Skyhorse Publishing, New York, 2011.
13. Wood, Gordon S., *The American Revolution*: *A History*, The Modern Library, New York, 2002.

اکائی 10۔ فرانسیسی انقلاب

(The French Revolution)

اکائی کے اجزاء

10.0 تمہید
10.1 مقاصد
10.2 فرانسیسی انقلاب کے اسباب
10.2.1 سیاسی اسباب
10.2.2 سماجی اسباب
10.2.3 معاشی اسباب
10.2.4 فکری بیداری
10.2.5 فرانسیسی انقلاب کے فوری اسباب
10.3 فرانس ہی میں انقلاب کیوں؟
10.4 انقلاب کی ابتداء اور اہم واقعات
10.5 آئین ساز اسمبلی کے افعال
10.6 انقلاب کا جائزہ
10.7 انقلاب کی اہم شخصیات
10.8 انقلاب فرانس کی اہمیت اور اس کے اثرات
10.9 اکتسابی نتائج
10.10 کلیدی الفاظ
10.11 نمونہ امتحانی سوالات
10.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید (Introduction)

فرانسیسی انقلاب تاریخ کا صرف ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک زندہ روایت بھی ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جو کئی بار لڑی گئی۔ تاریخ کے کسی اور عہد کے بارے میں اتنا کچھ نہیں لکھا گیا جتنا انقلاب فرانس کے بارے میں لکھا گیا۔ اتنی ہمدردی یا اس قدر غصہ شاید دنیا کے کسی اور واقعہ پر ظاہر نہیں کیا گیا، جہاں 'کانٹ'، 'ہیگل'، اور 'ورڈس ورتھ' نے اس انقلاب پر خوشی کا اظہار کیا، وہیں 'ایڈمنڈ ورک' نے غصے کا اظہار کیا۔ فرانسیسی انقلاب جدید عہد کے انقلابات میں اس لحاظ سے منفرد تھا کہ اس کے وسیع اثرات مرتب ہوئے۔ انیسویں صدی کے تمام بڑے واقعات جو یورپ میں رونما ہوئے وہ کسی نہ کسی طرح انقلاب فرانس سے متاثر تھے۔ انقلاب فرانس نے یورپ میں ایسی صورتحال پیدا کردی کہ پرانا سیاسی نظام منہدم ہوگیا۔ 1789 سے 1815 تک کے دور کو عام طور پر چار الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

1۔ انقلاب　　2۔ جنگ　　3۔ آمریت　　4۔ سلطنت

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ انقلاب 1789ء میں شروع ہوا تھا۔ بعض مورخین 5 مئی 1789ء کو انقلاب کے آغاز کی تاریخ مانتے ہیں کیونکہ اس دن اسٹیٹس جنرل کا اجلاس شروع ہوا تھا۔ مورخین کا ایک طبقہ انقلاب کی تاریخ 14 جولائی 1789ء مانتا ہے کیونکہ اس دن باسٹیل کا قلعہ منہدم ہوا۔ 1787 سے 1799 تک کے واقعات نے انقلاب کے آغاز اور اس کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا۔ انقلاب کی وجوہات اسی معاشرے اور نظام میں پوشیدہ ہیں جسے قدیم نظام یا فرانسیسی انقلاب سے پہلے کا نظام کہا جاتا ہے۔ قدیم نظام کا مطالعہ کرنے سے ہی یہ واضح ہو جائے گا کہ فرانس انقلاب کے دہانے پر کیسے پہنچا؟ کیا 1789ء کا انقلاب آمریت سے زیادہ عدم مساوات کے خلاف تھا؟ کیا انقلاب قدیم اور بوسیدہ نظام حکمرانی کے خلاف متوسط طبقے کی تحریک تھی؟ کیا فکری بیداری کے بغیر انقلاب نہ آتا؟ ان ہی سوالات کا جواب اگلے صفحات میں دینے کی کوشش کی جائے گی۔ یوں تو ہر ایک انقلاب اپنے اندر چند خصوصیات رکھتا ہے۔ لیکن فرانسیسی انقلاب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے انسانوں کو ایک دھاگے میں باندھنے کے لیے نئے نظریات عطا کیے۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- فرانس ہی میں انقلاب کیوں ہوا؟ اس کی معلومات حاصل کر سکیں گے۔
- انقلاب کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی اور کون سے اہم واقعات رونما ہوئے ان کے بارے میں جان سکیں گے۔
- آئین ساز اسمبلی کے افعال کیسے تھے اس کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں گے۔
- انقلاب کی محرک بننے والی اہم شخصیات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- عالمی تاریخ میں انقلاب فرانس کی اہمیت اور اس کے اثرات کا پتہ لگا سکیں گے۔

10.2 انقلاب فرانس کے اسباب (Causes of the French Revolution)

10.2.1 سیاسی اسباب (Political Causes)

فرانس میں موروثی مطلق العنان بادشاہت تھی۔ بادشاہ لوئی چہاردہم (1715–1643) اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی مطلق العنان طاقت کا یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ 'میں ریاست ہوں۔' بادشاہ کو لامحدود اختیار حاصل تھے۔ اس کے لامحدود حقوق پر کسی قسم کی قدغن لگانے کے لیے کوئی عوامی نمائندہ اسمبلی یا پارلیمنٹ نہیں تھی۔ لوئی شانزدہم (1793–1774) کہا کرتا تھا کہ 'یہ چیز اس لیے قانونی ہے کہ میں چاہتا ہوں۔' فرانس میں 'اسٹیٹس جنرل' کے نام سے ایک نمائندہ اسمبلی ضرور تھی، لیکن 1614ء کے بعد اس کا کوئی اجلاس نہیں بلایا گیا تھا۔ ایسے میں فرانس میں اگر کوئی ادارہ تھا جو بادشاہ کے من مانی طرز عمل کو روک سکتا تو وہ پارلیمنٹ تھی۔ پارلیمنٹ کوئی نمائندہ اسمبلی نہیں تھی بلکہ اس کی حیثیت عدالت عالیہ (High Court) جیسی تھی۔ انصاف کے کاموں کے علاوہ پارلیمنٹ کے اہم کاموں میں سے ایک بادشاہ کے احکامات کو قانون کے طور پر درج کرنا تھا۔ انقلاب سے پہلے کے سالوں میں پارلیمنٹ نے غیر منصفانہ قوانین کو رجسٹر کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ دیگر اداروں کی غیر موجودگی میں پارلیمنٹ نے کبھی کبھار حکومتی پالیسیوں کی طرف عوام کو توجہ مبذول کرائی اور لوگوں کو آگاہ کیا کہ ملک کے بنیادی قانون کو من مانی طور پر تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ پارلیمنٹ کے جج وہ لوگ تھے جنھوں نے عہدے خرید کر امراء (Nobility) کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور وہ اب موروثی ہو چکے تھے۔

لوئی چہاردہم کا جانشین لوئی پانزدہم (1774–1715) قابل اور باصلاحیت نہیں تھا۔ وہ عیش و عشرت میں مگن رہا اور اس نے موجودہ نظام میں کسی طرح کی اصلاح نہیں کی۔ اس طرح فرانس اندرون و بیرون ملک سیاسی حیثیت سے کمزور سا ہوا۔ لوئی شانزدہم میں بھی قائدانہ صلاحیت کا فقدان تھا۔ اسے ریاست کے مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس پر اس کی بیوی ملکہ میری اینٹونیٹ (Marie Antoinette) کا بہت اثر تھا۔ اسے بھی شاہی امور کو سنبھالنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ریاستی معاملات میں اس کی غیر ضروری مداخلت کی وجہ سے حکمرانی کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ مورخ فشر (Fisher) نے اینونیٹ کے بارے میں لکھا ہے کہ 'ناقدین کے نزدیک وہ ایک سائرن کی طرح دکھائی دیتی تھی جو ریاست کے جہاز کو چٹانوں کی طرف لے جا رہی تھی۔' مشہور مورخ ویسنٹ کرونن (Vincente Cronin) کی رائے میں 'لوئی نے اپنی اہلیہ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اسے کسی بھی حالت میں سیاست میں مداخلت کی اجازت نہیں دے گا۔' کرونن مزید لکھتا ہے کہ 'لوئی ایک انقلابی مصلح تھا اور وہ فرانس کو جدید بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور میری اینٹونیٹ ایک بہت ہی عقیدت مند، سماجی کارکن اور خوبصورت خاتون تھیں۔' کرونن نے اپنی کتاب *Louis and Antoinette* میں فرانس کے انقلاب کی درج ذیل وجوہات بتائی ہیں:

> دوستوں اور درباریوں کی دھوکہ دہی، جھوٹی افواہیں، لوئی کی مذہبی آزادی، لوئی پندرہویں کی غلط حکمرانی، پادریوں کے ساتھ اس کا سخت رویہ، شرارتی لوگوں کے ذریعے ہجوم کو بھڑکانا، غیر مطمئن سیاست دانوں کی کارروائی، وکیلوں کا کردار، لوئی شانزدہم میں حاضر جوابی اور عوام پر کنٹرول رکھنے کی عدم صلاحیت، فرانس کا معاشی دیوالیہ پن، فرانس کو خسارے سے نکالنے کی لوئی کی کوششوں کی مخالفت، لوئی کی

غلطیاں اور سماجی عدم مساوات نے مل کر فرانس میں انقلاب کی راہ ہموار کی۔

انقلاب کی وجہ فرانس کے بادشاہوں کی شان وشوکت بھی تھی۔ بادشاہ ورسائی کے بڑے محلات میں رہا کرتے تھے۔ جہاں عوام کی کمائی پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ایک اندازے کے مطابق ورسائی میں سالانہ 200لاکھ ڈالر خرچ ہوتے تھے۔ حد سے زیادہ خرچ کی وجہ سے 'دربار کو قوم کا مقبرہ' کہا جانے لگا تھا۔ انقلاب سے پہلے فرانس کا نظام حکومت ناکارہ، غیر منظم، بدعنوان اور مہنگا تھا۔ نظامِ حکومت میں یکسانیت کا فقدان تھا۔ بادشاہ کی مدد کے لیے پانچ کمیٹیاں بنی تھیں، جو قانون بناتی تھیں اور بادشاہ کی جانب سے احکامات جاری کرتی تھیں اور ریاست کے ملکی و غیر ملکی معاملات دیکھتی تھیں۔ صوبائی حکومت کے لیے پورے ملک کو دو قسم کے صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ 1۔ ایک صوبہ کی قسم گورنمنٹ کہلاتی تھی جس کی تعداد 40 تھی، ان کے گورنر اعلیٰ طبقہ کے اشرافیہ تھے اور ریاست سے تنخواہوں کے عوض میں بہت زیادہ رقم وصول کرتے تھے۔ 2۔ حکومت کا اصل کام دوسری طرح 34 صوبوں میں ہوتا تھا ان صوبوں کو 'Generality' کہا جاتا تھا۔ حکمرانی بادشاہ کی طرف سے مقرر کردہ انٹنڈنٹ (Intendent) کرتے تھے۔ یہی بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھے۔ پارلیمنٹ کے علاوہ باقی عدالتوں کی صدارت انٹنڈنٹ ہی کرتے تھے۔ عملاً انٹنڈنٹ کے اختیارات پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ یہ بادشاہ کے حکم پر عمل کرتے تھے۔ اپنے صوبہ میں ان کی طاقت لامحدود تھی۔

فرانس میں مقامی خود مختاری کا کوئی وجود نہ تھا۔ مقامی انتظامیہ بھی ورسائی کے محل سے چلائی جاتی تھی۔ مقامی ملازمین کو چھوٹے چھوٹے معاملات میں دارالحکومت سے آڈر لینے پڑتے تھے۔ انتظامیہ میں عوام کی شمولیت بالکل نہیں تھی۔ قانون اور انصاف کے میدان میں بھی بدعنوانی تھی۔ ملک میں کوئی مستند ضابطہ قانون نہ تھا۔ پورے ملک میں تقریباً 385 قسم کے عدالتی قوانین رائج تھے۔ جو چیز ایک قصبہ میں قانونی سمجھی جاتی تھی وہی چیز پانچ میل دور کے قصبہ میں غیر قانونی سمجھی جاتی تھی۔ فرانس میں رائج مختلف قوانین کے بارے میں مشہور مفکر 'والٹیر' نے کہا تھا کہ 'جب کوئی شخص فرانس میں سفر کرتا ہے تو اسے حکومتی قوانین اسی طرح بدلتے نظر آتے ہیں، جس طرح اس کی گاڑی کے گھوڑے بدلتے ہیں۔' کون سا قانون کب اور کہاں نافذ ہوگا کوئی نہیں جانتا تھا۔ ملک میں کئی طرح کی عدالتیں تھیں لیکن ان کا دائرہ اختیار واضح نہیں تھا۔ عدالتی عہدے فروخت کرنے کی روایت عام تھی، جس کی وجہ سے عدالتی نظام بدتر ہو چکا تھا۔ تیسرے درجہ کے لوگ تو انصاف کی توقع ہی نہیں کر سکتے تھے۔ بادشاہ کی خاص مہر والے خطوط کے ذریعہ کسی بھی شخص کو بغیر کسی الزام کے جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔ دیدرو (Diderot) اور والیٹر (Voltaire) جیسے مفکرین کو 'باسٹیل' کے قلعہ میں قید کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔ تعزیرات کا نظام سخت اور متعصب تھا۔ اشرافیہ طبقہ کے لوگوں کو بعض جرائم کی کوئی سزا نہیں ملتی تھی۔ کچھ معاملات میں جاگیردار جج کا کام کرنے کے ساتھ ہی مدعی اور مدعا علیہ کے طور پر بھی کام کر سکتا تھا۔ نظام عدل کی ایک برائی یہ بھی تھی کہ عدالتوں کی زبان لاطینی تھی، جسے فرانسیسی زبان جاننے والے عام لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ فرانس کی پارلیمنٹ برائے نام تھی۔ اس کی نشست 175 برسوں سے طلب نہیں کی گئی تھی۔ ایسے ناخوشگوار اور بدترین حالات نے انقلاب کی راہ ہموار کی۔

10.2.2 سماجی اسباب (Social Causes)

فرانسیسی سماج تین طبقوں میں منقسم تھا۔(1) امراء، (2)کلیسا، (3)عوام۔ ان میں اول الذکر دو طبقات کو کئی طرح کی معاشی و سیاسی مراعات حاصل تھیں، جبکہ تیسرا طبقہ تمام طرح کی مراعات سے محروم تھا۔انہیں نہ تو معاشی خوشحالی نصیب تھی اور نہ ہی سیاسی آزادی۔ وہ امراءاور کلیسا کے ہاتھوں ظلم کا شکار تھے اور یہ وہی طبقہ ہے جو فرانسیسی انقلاب کا ذمہ دار تھا۔

امراء:

انہیں کئی طرح کی مراعات حاصل تھیں۔ تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی۔ان کی تعداد تقریباً چار لاکھ تھی۔ یہ مقامی انتظامیہ میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ریاست' کلیسا اور فوج کے تمام بڑے عہدوں پر اسی طبقے کا قبضہ تھا اور فرانس کی تمام زمین کا پانچواں حصہ بھی انہیں کے ہاتھ میں تھا۔اٹھارہویں صدی کے امرا طبقہ کی یہ خصوصیت تھی کہ ان میں اتحاد و یکسانیت کا فقدان تھا۔انہیں کئی ذیلی طبقات میں تقسیم کیا گیا تھا۔اس کے باوجود بھی امراء طبقہ کے افراد اس لحاظ سے ایک جیسے تھے کہ انہیں معاشرے میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ یہ پوزیشن اس یقین پر مبنی تھی کہ وہ جاگیردار زمین دار تھے جو حکومت کے کام میں مدد کرتے تھے۔ جنگوں میں بادشاہ کی مدد کرتے اور دیہی علاقوں میں امن وامان برقرار رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ایسی خصوصی حیثیت کی وجہ سے امراء طبقے کے ارکان ٹیکس سے آزاد تھے اور ریاست میں مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ معاشی نکتۂ نظر سے تمام جاگیردار برابر نہیں تھے۔امیر اور درمیانی دونوں طرح کے جاگیردار تھے، لیکن دونوں میں ایک چیز مشترک تھی۔ دونوں کسانوں کا استحصال کرتے تھے۔ فرانس کی آبادی میں کسانوں کی اکثریت تھی۔ زمین کی خرید و فروخت پر کل قیمت پانچواں حصہ زمین دارے لیتے تھے۔انہیں انصاف سے متعلق حقوق بھی حاصل تھے۔ وہ اپنے تحت کسانوں کے تنازعات کا فیصلہ کرتے تھے اور جرمانہ لگا کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرتے تھے۔ان کو شکار کرنے کا خصوصی حق حاصل تھا۔اس کے لیے کافی زمین محفوظ رکھی جاتی تھی تا کہ اس میں جنگلی جانور پل سکیں۔ یہ جانور کسانوں کی کھڑی فصل تباہ کر دیتے تھے لیکن وہ مجبور تھے۔اس طرح امراء طبقہ کئی طرح کے خصوصی حقوق کا استعمال کرتے ہوئے نچلے طبقے پر ظلم کرتا تھا۔ان سب وجوہات کی بناء پر نچلے طبقے میں عدم اطمینان میں اضافہ ہوا۔اس حوالے سے فرانسیسی سیاست دان ''تھییئر زم'' کی رائے قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ 'بغاوت شاہی تخت کے خلاف کم اور امراء طبقہ کے ظلم واستحصال کے خلاف زیادہ تھی۔' سیاسی طور پر اٹھارہویں صدی فرانس میں طبقہ امراء کے احیاء کا دور تھا۔ سماجی میدان میں اپنی الگ اہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے سیاسی میدان میں اس کا مقصد حکومت کے تمام اداروں میں داخل ہونا اور ایک بار پھر حقیقی اقتدار حاصل کرنا تھا جسے ''بوربون'' خاندان کے سابق حکمرانوں نے ختم کر دیا تھا۔اس طرح ایک طرف جہاں جاگیردارانہ مراعات اور جبر نے معاشرے کے نچلے طبقے کو انقلابی بنا دیا تو دوسری طرف اسی طبقہ کے سیاسی عزائم نے اسے مطلق العنان بادشاہت کے خلاف لڑنے کی تحریک بھی دی۔ بادشاہ کے خلاف جاگیرداروں کی یہ جدوجہد لوئی چہاردہم کی وفات سے شروع ہوئی۔ لوئی پانزدہم کے عہد میں بڑھی اور لوئی شانزدہم کے عہد میں اپنے عروج کو پہنچی۔ اصلاحات کے سوال پر یہ جدوجہد لوئی شانزدہم کے عہد میں انقلاب کا پہلا مرحلہ بن گئی۔

کلیسا:

فرانس اکثریت رومن کیتھولک کی پیروکار تھی۔اس لیے کیتھولک کلیسا کا بہت اثر تھا۔اس کی اپنی ملک گیر تنظیم اور بے پناہ دولت تھی۔پر وہ ریاستی ٹیکس سے آزاد تھا۔تمام طرح کی رسم ورواج سماجی و مذہبی رسومات' شادی بیاہ' موت وحیات کے اعداد وشمار وغیرہ کی اجارہ داری تھی۔اسے کتابوں اور رسالوں کو سنسر کرنے کا حق حاصل تھا۔کلیسا کی الگ الگ عدالتیں اور قوانین تھے۔اپنے وسیع حقوق اور اثر و رسوخ کی وجہ سے فرانس کا کلیسا 'ریاست کے اندر ریاست تھا۔' فرانس کی پوری اراضی کا بیس فیصد کلیسا کے کنڑول میں تھا۔اس کے علاوہ کلیسا ہر قسم کی فصلوں پر عشر (Tith) نامی ٹایکس وصولتا تھا، جس کی وجہ سے اس کی آمدنی میں اضافہ ہو رہا تھا۔بڑھتی ہوئی دولت کے ساتھ پادری اپنے مذہبی فرائض سے غفلت برت رہے تھے۔اس طرح کلیسا کی مقبولیت میں کمی آرہی تھی۔کسانوں اور متوسط طبقہ دونوں کلیسا کی بدعنوانی مذہبی فرائض سے غفلت اور جاگیر دارانہ حقوق کا سختی سے نفاذ کے باعث متنفر ہوئے اور ان میں عدم اطمینان پیدا ہونا شروع ہوا۔پادریوں میں بھی دو طبقے تھے(i) اعلیٰ پادری (ii) عام پادری

اعلیٰ پادری: آرک بشپ جیسے عہدے اعلیٰ پادریوں میں ہوتے تھے۔یہ امراء طبقہ کے لوگ ہوتے تھے۔ان کی آمدنی بہت زیادہ تھی۔یہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔مذہبی سرگرمیوں میں ان کی دلچسپی بہت کم تھی۔ان میں سے اکثر نے اپنے مذہبی شعبوں کو چھوڑ دیا تھا اور شاہی دربار میں رہ کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔وہ خدا کے وجود کے بھی منکر تھے۔ایک بار لوئی شانزدہم نے آرک بشپ مقرر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''کم سے کم پیرس میں ہمارے پاس ایک آرک بشپ ہونا چاہیے جو خدا کے وجود پر یقین رکھتا ہو''اس زمرے کے لوگ عام پادریوں کو کمتر سمجھتے تھ۔مذہب کے نظریات کو بھلا کر یہ اعلیٰ پادری طبقہ کرپٹ اور پُر تعیش زندگی بسر کر رہا تھا جس کی وجہ سے لوگوں میں ان کی عزت کے بجائے بے اطمینانی اور مخالفت کے جذبات بڑھتے جارہے تھے۔

عام پادری: عام پادری مقامی گرجا گھروں کے رہائشی تھے جو اکثر نچلے طبقے یا کسانوں سے آتے تھے۔وہ عام لوگوں کے تمام مذہبی کام انجام دیتے تھے اور ان کی خوشی و غم میں شریک ہوتے تھے، لیکن ان کی آمدنی اتنی کم تھی کہ اکثر ان کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا تھا۔یہ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے تھے۔ان کے ذہن میں کلیسا کے اعلیٰ عہدیداروں کے خلاف نفرت اور غصہ پیدا ہونا فطری بات تھی۔درحقیقت اس طبقہ کے پادری عام لوگوں کے زیادہ قریب تھے اور مروجہ ظالمانہ نظام کے نقائص سے واقف تھے۔اسی وجہ سے انہوں نے انقلاب کے دوران عوام کا ساتھ دیا اور اسے کامیاب بنانے میں بہت مدد کی۔

عوام:

یہ معاشرہ کا سب سے ادنیٰ طبقہ تھا۔ان پر محصول کا بوجھ سب سے زیادہ تھا۔انہیں نہ تو معاشی آزادی اور مراعات حاصل تھیں اور نہ ہی سیاسی آزادی۔یوں تو وہ اسٹیٹس جنرل (فرانسیسی پارلیمنٹ) کے رکن تھے لیکن ان کی حیثیت برائے نام تھی۔یہ طبقہ مصائب و مشکلات کا شکار تھا۔وہ معاشی اعتبار سے کمزور اور مراعات سے محروم اور سماجی اعتبار سے ادنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ایسی زیادتیوں اور ناانصافی نے ان کو حکومت کے

خلاف بغاوت کا پرچم بلند کرنے پر مجبور کیا۔ ملک کی تقریباً 94 فیصد آبادی اسی طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس سماجی طبقہ میں (i) متوسط طبقہ (ٹیچر، وکیل، تاجر، ڈاکٹر، مصنف، فنکار، سرکاری ملازمین وغیرہ شامل تھے)(ii) دست کار اور مزدور (iii) کسان وغیرہ شامل تھے۔

متوسط طبقہ: اس طبقہ کے لوگ تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدوں کے علاوہ باقی تمام عہدے ان لوگوں کے ہاتھ میں تھے۔ اس طبقہ کے لوگ قدیم نظام کے سخت مخالف تھے کیونکہ پادریوں اور امراء کا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ اس طبقے کو کوئی سیاسی حقوق حاصل نہیں تھے، اس لیے یہ طبقہ سماجی نظام میں انقلاب کے ساتھ سیاسی نظام میں بھی تبدیلی چاہتا تھا۔ یہ طبقہ تہذیب یافتہ ہونے کے ساتھ ہی دانشور بھی تھا۔ والٹیئر، روسو، مونٹیسکو اور بہت سے مفکرین کے نظریات سے یہ طبقہ متاثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی انقلاب میں متوسط طبقہ کا بڑا اہم کردار تھا۔

دست کار اور مزدور: اس طبقہ کی حالت اچھی نہیں تھی۔ انہیں کام زیادہ کرنا ہوتا تھا اور معاوضہ کم دیا جاتا تھا۔ یہ متوسط طبقہ کے سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر تھے، جو اپنے طبقوں اور کارپوریشنوں کے ذریعے صنعت و تجارت کو کنٹرول کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر شہروں میں رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کا تعلق شہروں کے پڑھے لکھے اور روشن خیال طبقے سے تھا اس لیے وہ سیاسی شعور رکھتے تھے۔

کسان: کسانوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ یہ کل آبادی کا 80 فیصد تھے۔ ان کی حالت پست اور افسوسناک تھی۔ فرانس میں کسانوں کے دو طبقے تھے۔ (1) آزاد کسان (2) نیم غلام کسان۔ آزاد کسان اپنی زمین کا مالک تھا لیکن نیم غلام کسان اپنے جاگیردار کی زمین اپنی مرضی سے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کسانوں کے دونوں طبقے امراء کے استحصال کے شکار تھے۔ انہیں ریاست، کلیسا اور جاگیرداروں کو طرح طرح کے ٹیکس اور خراج ادا کرنا پڑتا تھا۔ کسانوں کی آمدنی کا 80 فیصد ٹیکس میں چلا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کسانوں کو جاگیردار کی گندم پیسنے کی چکی، شراب کی ڈسٹلری، روٹی پکانے کے لیے تندور کے لیے ایک مقررہ فیس ادا کرنی پڑتی تھی۔ مذکورہ ظلم و جبر اور استحصال کی وجہ سے اٹھارہویں صدی میں کسانوں میں عدم اطمینان تھا۔ کسان اس قدر ناخوش ہو گئے تھے کہ وہ خود ایک انقلاب عنصر میں تبدیل ہو گئے تھے۔ انہیں انقلاب برپا کرنے کے لیے صرف ایک اشارے کی ضرورت تھی۔ ان ہی کسانوں کے اہم کردار نے 1789ء کے انقلاب کو کامیاب بنایا تھا۔

10.2.3 معاشی اسباب (Economical Causes)

فرانس کا عام آدمی معاشی طور پر کمزور اور پسماندہ تھا۔ ملک کے اثاثے پر یا تو امراء بشمول حکمراں یا کلیسا کا مکمل کنٹرول تھا۔ ان کو مخصوص معاشی مراعات حاصل تھیں، مثلاً وہ محصول سے مستثنیٰ تھے جبکہ عوام پر محصول کا بوجھ بڑھا دیا گیا تھا۔ عوام کئی اقسام کے محاصل حکومت اور کلیسا دونوں کو ادا کرتے تھے کیونکہ ملک کی زیادہ تر زمین یا تو امراء اور کلیسا کے ہاتھوں میں تھی جنہوں نے غیر مناسب اور بے جا محصول عائد کر رکھے تھے۔ لوئی چہاردہم نے اپنے جانشین کو جنگ میں نہ جانے کا مشورہ دیا تھا، لیکن لوئی پانزدہم نے آسٹریا کی جانشینی اور سات سالہ جنگ میں حصہ لے کر فرانس کی معاشی حالت کو بہت خراب کیا۔ فرانس نے برطانیہ کے خلاف امریکہ کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ ان سب کی وجہ سے فرانس کی معاشی حالت ابتر ہو گئی۔ انقلاب سے پہلے فرانس کو ہر سال تقریباً 25 ملین ڈالر کا نقصان ہو رہا تھا جس کی تلافی بھاری

سود پر قرض لے کر کی جارہی تھی۔ انقلاب سے پہلے ملک کی کل آمدنی کا نصف حصہ صرف سود ادا کرنے میں خرچ ہونے لگا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ لوگ حکومت کو قرض دینے سے گریز کرنے لگے۔ عوام پر ٹیکس کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ خصوصاً نمک ٹیکس سے عوام پریشان تھی۔ ایک مقررہ مقدار میں تمام لوگوں کو نمک خریدنا لازم تھا۔ سات سال سے زائد کی عمر کے تمام لوگوں کو سال میں سات پونڈ نمک ضرور خریدنا پڑتا تھا۔ ایسا نہ کرنے پر سزادی جاتی تھی۔ نمک ٹیکس نہ دینے پر ایک تخمینہ کے مطابق ہر سال 30,000 لوگوں کو قید وبند کی سزا جھیلنی پڑتی تھی۔ غیر قانونی طور پر نمک کا کاروبار کرنے والے کو سزائے موت دی جاتی تھی۔ ٹیکس کے علاوہ کسانوں کو وقتاً فوقتاً تحائف بھی دینے پڑتے تھے۔

انقلاب سے پہلے فرانس کی معاشی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے تجارت کو ترغیب دے کر بہتر کیا جاسکتا تھا، لیکن حکومت کی تجارت اور کامرس کی پالیسی خامیوں سے پُر تھی جس کی وجہ سے ریاست میں پیداوار اور تجارت کی ترقی ممکن نہیں تھی۔ ملک کے اندر پیدا ہونے والی اشیاء پر ہر صوبے کی سرحد پر چنگی (ٹیکس) ادا کرنا پڑتی تھی جس کی وجہ سے وہ بازار میں مہنگے داموں فروخت ہوتی تھی۔ انقلاب فرانس سے پہلے فرانس کا معاشی نظام غیر منظم اور غیر منصفانہ تھا۔ یہ کہاوت سچ ثابت ہوئی کہ ''جاگیر دار لڑتا ہے، پجاری پوجا کرتا ہے اور عام آدمی ٹیکس دیتا ہے'' عام لوگوں پر ٹیکسوں کا بوجھ ڈالا گیا۔ ریاست کی مالی حالت بحران کا شکار تھی۔ ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے معاشی نظام کو ایسے دہنے پر چھوڑ دیا کہ اس کی بہتری کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لوئی شانز دہم نے مالی بحران کو دور کرنے کے لیے 'ٹرگو' (Turgo)، ٹیکر (Necker) اور کولون (Colone) جیسے ماہرین معاشیات کا تقرر کیا تاکہ ملک کی معاشی حالت کو سدھارا جاسکے، لیکن وہ ناکام رہا، کیونکہ اس انتظام سے امراء اور کلیسا کے مفادات اور مراعات پر ضرب لگ رہی تھی۔ انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس طرح اس کی تمام کوشش ناکام رہیں اور ملک انقلاب سے نہیں بچ سکا۔

10.2.4 فکری بیداری (Intellectual Awakening)

دنیا میں کسی بھی انقلاب کی کامیابی کے لیے دانشوروں کے اقوال اور ان کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے اقوال اور نظریات انسانی ذہن کو جلا بخشتے ہوئے ذہنی بیداری پیدا کرتے ہیں۔ ایسے عظیم فلسفی اور مفکر فرانس میں پیدا ہوئے جنہوں نے فرانسیسی انقلاب کو کامیاب بنانے میں عوام کی رہنمائی کی۔ ان میں والٹیئر، مانٹیسکو اور روسو ایسے مفکرین تھے جن کی تعلیمات اور رہنمائی نے انقلاب فرانس کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ان مفکرین کی ذہنی کاوشیں انقلابیوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ انقلاب فرانس جن مفکرین کے انقلاب آفرین افکار کا رہین منت ہے ان سب کا یہاں ذکر کرنا تو ممکن نہیں ہے البتہ وہ مفکرین جو بجا طور پر اس انقلاب کے خالق ہیں ان کا مختصر ذکر درج سطور میں کیا جانا ضروری ہے۔

والٹیر (Voltaire, 1694–1778)

والٹیر روشن خیال تھا۔ صرف 23 سال کی عمر میں یورپ کی ایک معروف شخصیت بن گیا تھا۔ ادب، تاریخ اور فلسفہ پر اس کی بے شمار

تصانیف ہیں۔ اسی نے طنز ومزاح کے نشتروں سے سماجی لعنتوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سیاسی اور سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لیے عمر بھر جنگ کی۔ یہ مذہبی تنگ نظری اور تعصب کا بدترین دشمن تھا۔ کلیسائی ادارہ کو وہ موجب عذاب سمجھتا تھا۔ رجعت پسندی اور اوہام پرستی نے جہاں جہاں تقدس کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، اس کو اس نے بے نقاب کیا۔ فریڈرک اعظم کے دربار سے وہ ایک زمانہ تک وابستہ رہا۔ وہ فرانس کے لیے کسی ایسے روشن خیال بادشاہ کا خواہاں تھا جو قوم میں زندگی پیدا کرسکے۔ والٹیر بلاشبہ انقلاب کے بڑے نقیبوں میں سے ہے۔ اس نے انسانوں کو اپنے حق کے لیے لڑنا سکھایا۔

مانٹیسکو (Montesquieu, 1755–1869)

انقلاب کے نقیبوں میں ایک بڑا نام مانٹیسکو کا ہے۔ یہ قانون دان تھا۔ اس نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعہ سے اس نے بعض سیاسی نتائج اخذ کیے ان کو اس نے اپنی مشہور کتاب ''روح قوانین'' (*The Spirit of Laws*) میں پیش کیا۔ یہ کتاب مانٹیسکو کے سیاسی افکار پر مشتمل تھی۔ مانٹیسکو نے کھلے طور پر ملوکیت کی مخالفت نہیں کی، مگر وہ محدود اور دستوری ملوکیت کا خواہاں تھا۔ اس نے برطانیہ کے دستور کی بہت تعریف کی ہے جہاں ملوکیت تو تھی مگر مطلق العنانی کو متعدد پابندیوں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ جہاں فرد کو آزادی حاصل تھی اور اس کی آزادی کی محافظ ایک طاقت ور عوامی مجلس تھی جس کو پارلیمنٹ کہتے ہیں۔ مانٹیسکو کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک جدید سیاسی نظریہ قائم کیا۔ اس نظریہ کو ''تفریقِ اختیارات'' کہتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ حکومت بنیادی طور پر تین اعضاء پر مشتمل ہوتی ہے۔ (۱) عاملہ (۲) مقننہ (۳) عدلیہ۔ یہ تینوں اعضاء علیحدہ اور ایک دوسرے سے آزاد ہو تو شخصی آزادی کی ضمانت حاصل ہوسکتی ہے۔ فرانس میں یہ تینوں اختیارات صرف بادشاہ کی ذات میں مرکوز تھے، اسی وجہ سے وہاں مطلق العنانی بے لگام اور شخصی آزادی ناپید اور مفقود تھی۔ اس نے کہا کہ ایک آزاد معاشرہ اسی وقت وجود پذیر ہوسکتا ہے جبکہ ان اعضاء حکومت میں مکمل تفریقِ اختیارات ہو۔ مانٹیسکو کے نظریہ کا اٹھارویں صدی کے سیاسی افکار پر بہت اثر پڑا۔ چنانچہ جب امریکہ نے اپنا دستور مدون کیا تو اسی نظریہ کے زیر اثر اس نے صدارتی طرز کا دستور اختیار کیا جس میں عاملہ، مقننہ اور عدلیہ کو ایک دوسرے سے بالکل آزاد رکھا گیا۔ فرانس جب میں کرم خوردہ مطلق العنانی کی عمارت منہدم ہوئی تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کے انہدام میں مانٹیسکو کے نظریات کا بڑا دخل تھا۔

روسو (J.J. Rousseau, 1712–1787)

اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی مفکروں میں سب سے بڑی شخصیت 'روسو' (Rousseau) کی ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی مسرت اور مفلسی میں گزری۔ اس کی کوئی باضابطہ تعلیم نہیں ہوئی۔ وہ کسی بڑی یونیورسٹی کی پیداوار نہیں تھا۔ اس کو جو کچھ کمال حاصل ہوا وہ اس کی خلقی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا۔ ادبیات سے اسے شروع سے دلچسپی تھی۔ اس نے متعدد کتابیں لکھیں۔ وہ فرانس کے اعلیٰ ترین علمی اور سماجی صلاحیتوں میں مقبول تھا۔ اس میں انسان پرستی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ پیدائشی باغی تھا۔ وہ والٹیر اور مانٹیسکو کی طرح صرف اصلاح کا طالب نہیں تھا۔ وہ سرے سے پوری تہذیب کو مٹادینا چاہتا تھا تاکہ ماضی کے اثرات سے یکسر پاک ایک نیا معاشرہ وجود میں آئے۔ اس نے

'فطرت کی طرف لوٹنے کا نعرہ لگایا۔ اس کا خیال تھا کہ ماقبل تہذیب دور میں انسانی زندگی مسرتوں اور شادمانیوں سے ہمکنار تھی۔ اس میں انصاف، آزادی، ایمانداری اور صداقت تھی۔ روسو کے مطابق جب انسان نے تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی، وہیں سے اس کی بربادی شروع ہوئی۔ وہ پابند سلاسل ہو گیا۔ اس کی مشہور کتاب 'سوشل کنٹریکٹ' ('Social Contract') کا پہلا جملہ اس کے اس خیال کو اچھی طرح واضح کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ 'انسان آزاد پیدا ہوا لیکن آج ہر جگہ اس کو زنجیریں پہنادی گئی ہیں، ان زنجیروں کو توڑنا انسان کا ایک مقدس فریضہ ہے۔' وہ مذہب، سیاست اور سماج کے کسی ادارہ کا احترام نہیں کرتا۔ یہ سب ادارے اس کے نزدیک دریابرد کرنے کے قابل ہیں۔ وہ عیسائیت اور مروجہ کلیسا کا کٹر دشمن تھا۔ روسو کے سیاسی خیالات اس کی مذکورہ کتاب میں تفصیل سے ملتے ہیں۔ اس نے مشیت عامہ (General Will) کا ایک انقلابی نظریہ پیش کیا۔ اقتدارِ اعلیٰ اس کے نزدیک کسی کی ملک نہیں۔ اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ عوام ہیں۔ بادشاہوں کی جانب سے پیش کردہ آسمانی حقوق کے دعوے بے حقیقت' باطل اور بے بنیاد ہیں۔ چونکہ عوام حکومت کے بانی مبانی اور اس کی تشکیل کے ذمہ دار ہیں۔ اس لیے اختیارات مفوضہ سے تجاوز یا ان پر غاصبانہ قبضہ کی صورت میں حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا بھی ان کو حق حاصل ہے۔ روسو نے اس طرح انقلاب اور بغاوت (Revolution) کو عوام کا ایک بنیادی حق ثابت کیا۔ وہ راست جمہوریت (Direct Democracy) کا حامی تھا۔ اس کے سیاسی نظریہ میں اقلیتوں کے تحفظ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ان کو اکثریت کے تابع اور محکوم کر دیا گیا تھا۔ روسو کے خیالات نے فرانس میں ذہنی ہلچل پیدا کر دی اور ایک ایسی فضا پیدا کر دی، جس میں پسماندہ اور دبے کچلے طبقات کو حکومت وقت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

اس کے علاوہ Diderot (دیدرو) جیسے مفکر نے لوگوں کو آزادانہ سوچ کی تحریک دی۔ ان مفکرین کے نظریات کی بنیادی خصوصیت ایک حریت پسند' ترقی پسند اور مثالی معاشرے کا قیام تھا۔ یہ مفکرین جن کا تعلق اشرافیہ اور متوسط طبقہ دونوں سے تھا، موجودہ برائیوں پر گفتگو کرتے تھے۔ یہ آزادانہ تجارت کی حمایت کرتے تھے۔ انہوں نے ٹیکسوں میں رائج عدم مساوات، استحصال، مظالم، مذہبی عدم برداشت، بدعنوان اور مطلق العنان بادشاہت، معاشی کنٹرول، پسماندہ طبقہ کی غربت، انتظامی اور عدالتی نقائص کو بے نقاب کیا۔ انہوں نے مراعات اور ناانصافی پر مبنی مذہبی، سماجی، معاشی اور سیاسی اداروں پر کئی سوالات اٹھائے۔ یہ مفکرین انسانی ذہن کو پرانے خیالات سے آزاد کرنے پر زور دیتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کی فکری بیداری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس زمانے کی فکر و سوچ کا مرکز انسان تھا۔ انسانی فلاح و بہبود کو حتمی مقصد کے طور پر قبول کیا گیا۔ یہ بھی مان لیا گیا کہ ریاست، کلیسا اور دیگر اداروں کو صرف انسان کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ انقلاب کا سہرا مذکورہ مفکرین کو دیا جاتا ہے۔ نیپولین نے خود کہا تھا کہ 'اگر روسو موجود نہ ہوتا تو فرانس کا انقلاب ممکن نہ ہوتا۔'

10.2.5 انقلاب فرانس کے فوری اسباب (Immediate Causes of the French Revolution)

فرانس کے حکمراں لوئی شانزدہم کی پالیسی نے انقلاب کو ناگزیر بنا دیا۔ اگر وہ دانش مندی سے کام لیتا تو انقلاب کو ٹالا جا سکتا تھا۔ لوئی میں حکمرانی کے پیچیدہ حالات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ لوئی پر اس کی بیوی 'اینٹونیٹ' کا بہت زیادہ اثر تھا۔ حکومت کے کاموں میں بے جا مداخلت کی وجہ سے وہ فرانس میں عوامی مذمت کا نشانہ بن گئی۔ فرانس کی عوام اس سے نفرت کرنے لگی۔ فرانس کے انقلاب کی ایک وجہ ملک

کی مخدوش معاشی حالت تھی۔ 'ارنیٹلا بروس' نے اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی معاشی نظام پر دو کتابیں تحریر کی ہیں، جن میں انقلاب فرانس کی ایک بڑی وجہ مالیاتی پالیسی اور معاشی بحران بتایا ہے، جس کی وجہ سے تیسرے طبقہ کے تمام لوگ مشکلات کا شکار تھے۔ D.W. Brogan نے *The Price of Revolution* میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ 1789ء میں فرانس میں سیاسی طاقت کے میدان میں ایسا خلا تھا جیسا کہ 1917ء میں روس میں، 1922ء میں اٹلی میں اور 1932ء میں جرمنی میں ہوا۔

لوئی چہاردہم کے عہد سے ملک کی معاشی حالت ابتر ہونا شروع ہو گئی تھی اور لوئی شانزدہم کے دور حکومت تک معاشی بحران گہرا ہو گیا۔ فرانس کی امریکی جنگ آزادی میں شرکت سے معیشت پر دباؤ بڑھ گیا۔ فرانس کا قرضہ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ لوئی شانزدہم نے ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بہت سی اسکیمیں شروع کیں، لیکن ان کی تکمیل سے پہلے ہی انہیں ترک کر دیا، جس کی وجہ سے عوام میں عدم اطمینان بڑھتا گیا۔ لوئی نے یکے بعد دیگرے معیشت کے وزراء کو تبدیل کیا۔ ٹور گو' نیکر اور کالون کو بالترتیب وزیر خزانہ بنایا گیا۔ مگر وہ دو سال سے زیادہ کام نہ کر سکا۔ اس نے جب اصلاحات شروع کیں، مفادات حاصل کرنے والے پر اس کی زد پڑی؛ تجارت کو از کار رفتہ قیود و بند سے آزاد کیا تو تجارتی گلڈس نے اس کی مخالفت کی۔ اخراجات میں کمی کرنی شروع کی تو بادشاہ کے مصاحب اور درباری چیخ اُٹھے۔ سب سے پہلے بادشاہ کی بیوی ''میری انتوائنٹ'' اس کی دشمن ہو گئی۔ امراء اور کلیسا پر جب ٹیکس عائد کرنے کی تدبیر سوچی گئی تو وہ فریادی بن کر بادشاہ کے پاس آئے اور اس طرح ٹر گو کو اس کے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا۔ اور نیکر (Necker) کو وزیر خزانہ بنایا گیا۔ اس نے محاصل کی تحصیل میں سختی کی اور ایک گوشوارہ شائع کیا جس میں آمد و صرف کی مکمل تفصیل درج تھی۔ یہ جدت شاہی دربار میں ناپسند کی گئی۔ نیکر 1776 سے 1781 تک وزارت خزانہ کے عہدہ پر مامور رہا۔ نیکر نے ٹیکس سے مستثنیٰ طبقات پر بھی قوی محاصل کا بار ڈالنے کی کوشش کی۔ امراء اور اہل کلیسا' درباری اور دیگر ایسے تمام طبقات جو استثناء کی رعایت حاصل کیے ہوئے تھے سب کے سب نیکر کے دشمن ہو گئے اور نیکر کو بھی برطرف کر دیا گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک ''کالن'' (Colonne) وزیر مالیات رہا۔ یہ امراء اور اہل دربار کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے بھاری شرحوں پر قرضے لے کر آمد و خرچ کو متوازن کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے فرانس کی مالیاتی ساکھ خاک میں مل گئی۔ حکومت کو اب کوئی قرضہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ اب ''کالن'' نے بھی وہی تجویز پیش کی جو اس کے پیش روؤں نے کی تھی۔ یہ کہ ٹیکس سے مستثنیٰ طبقات پر ٹیکس عائد کیا جائے۔ اس کی تجویز پر عمل نہیں ہوا بلکہ اسے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔

کولون کے بعد 'برین' (Brienne) کو 1787ء میں وزیر مالیات بنایا گیا۔ اس نے معاشی صورتحال کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس نے بادشاہ سے تمام طبقات پر یکساں زمینی ٹیکس اور ایک نیا ٹیکس 'اسٹامپ ٹیکس' لگانے کو کہا۔ معززین کی اسمبلی نے برین کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ بادشاہ نے اس اسمبلی کو تحلیل کر دیا اور 'برین' نے رجسٹریشن کے لیے تجاویز کو پیرس کی پارلیمنٹ کو بھیج دیا۔ پارلیمنٹ نے نئے ٹیکس لگانے سے انکار کر دیا۔ عوام نے پارلیمنٹ کے اعلان کا خیر مقدم کیا۔ بادشاہ نے پارلیمنٹ کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اس کے ارکان کو قید کرنے کا حکم دیا۔ عوام نے پارلیمنٹ کا ساتھ دیا۔ فوجیوں نے ارکان پارلیمنٹ کو گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔ پیرس اور دیگر مقامات پر اسٹیٹس جنرل کا اجلاس بلانے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس سے بادشاہ اور اس کے وزراء خوف زدہ ہو گئے۔ آخر کار بادشاہ کو اسٹیٹس جنرل کا اجلاس بلانے

پر مجبور ہونا پڑا۔ اسٹیٹس جنرل کا اجلاس 5 مئی 1789ء کو منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ نیکر کو وسیع تر اختیارات دے کر دوبارہ وزیر خزانہ بنایا گیا۔

اسٹیٹس جنرل فرانس کی ایک پرانی نمائندہ اسمبلی تھی۔ گزشتہ 175 سالوں سے اجلاس ہونا بند ہو گیا تھا۔ اسٹیٹس کے عام انتخابات 1788ء میں ہوئے۔ اس میں تین طرح کے ارکان تھے۔ (۱) جاگیر دار (۲) پادری (۳) عوام (عام لوگوں کے نمائندے)۔ اس انتخاب کی پہلی خصوصیت یہ تھی کہ بادشاہ نے تیسرے ارکان کے ممبروں کی تعداد پہلے سے دوگنا کر دی تھی۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس موقع پر ووٹروں نے شکایات، مشکلات اور مشوروں سے متعلق اپنے نمائندوں کو یادداشت (Chaiers) دیے تھے۔ ان کی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ تھی۔ یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ عوام کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت سے متعلق ان کی کیا شکایتیں تھیں اور وہ کس طرح کی اصلاحات چاہتے تھے؟ ان میں قانونی حکمرانی کے قیام، شہری آزادی کی فراہمی، قانون کے سامنے سب کی برابری اور مساوی ٹیکس کے مطالبات کیے گئے تھے۔ مذکورہ باتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انقلاب فرانس کے بہت سے اسباب تھے۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ فوری اسباب میں دو وجوہات اہم تھیں۔ ایک طرف فرانسیسی حکومت معاشی اور سیاسی طور پر دیوالیہ ہو چکی تھی اور دوسری طرف نئے خیالات' ادبی پروپیگنڈے' سماجی بے اطمینانی اور سیاسی رنجشوں نے انقلاب کی راہ ہموار کی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ دیوالیہ پن اور عدم اطمینان کے دباؤ کی وجہ سے انقلاب ناگزیر ہو گیا۔

10.3 فرانس ہی میں انقلاب کیوں؟ (Why Revolution Only in France?)

ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ انقلاب فرانس میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہی کیوں شروع ہوا؟ اس سوال کا پیدا ہونا فطری ہے، کیونکہ بہت سی یورپی اقوام فرانس سے بھی بدتر حالت میں تھیں۔ آمرانہ بادشاہت اور ٹیکسوں کا عام طبقہ پر ناقابل برداشت دباؤ تھا۔ فرانس کا کسان جرمنی' اٹلی اور روس کے غلاموں سے زیادہ آزاد تھا۔ پرشیا کے کسانوں کی حالت فرانس کے کسانوں سے بھی بدتر تھی کیونکہ وہاں کے کسانوں کو جاگیرداری کے ساتھ بادشاہت کے مظالم بھی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ لیکن معلوم ہے کہ انقلاب کسی ایک وجہ سے نہیں آتا، بلکہ ایسی جامع تبدیلی کے پیچھے بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ یورپی اقوام میں صرف فرانس میں برپا ہونے والے انقلاب کے حوالے سے درج ذیل باتیں قابل غور ہیں:

1۔ فرانس میں بہت پہلے ہی قومی ریاست قائم ہو چکی تھی اور پوری قوم ایک سیاسی فارمولے کی پابند تھی۔ سیاسی اتحاد نے ملک گیر رائے عامہ' تحریک اور پالیسی کو اپنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ فرانس کا انقلاب اگرچہ جاگیردارانہ نظام کا تھا، لیکن اس کی شکل اتنی مسخ نہیں تھی جتنی کہ آسٹریا' پرشیا' روس اور اٹلی میں تھی۔ فرانس میں سولہویں صدی کے آخر میں جاگیردارانہ نظام کی سیاسی شکل کے خاتمہ کے ساتھ بدنظمی کا خاتمہ ہوا۔ لوئی تیرہواں کے دور میں رچیلو نے مرکزی حکومت کو مضبوط کیا۔ لوئی چہاردہم نے امراء سے تمام اہم حقوق چھین لیے تھے اور نظم و نسق کو مرکزی شکل دینے اور منظم کرنے کے لیے اس نے صوبوں کو تقسیم کرنے کے ان میں (Intendent) مقرر کیے

تھے۔

2۔ فرانسیسی کسان باشعور تھے۔ یہاں کے کسان اپنی دلت حیثیت سے غیر مطمئن تھے اور اسے ختم کرنا چاہتے تھے۔ دیگر یورپی نیم غلام کسانوں کے برعکس فرانسیسی کسان زیادہ تر آزاد ہوگئے تھے۔ لیکن جاگیردارانہ ٹیکسوں اور دیگر خدمات کو ختم نہیں کیا گیا تھا جو انہیں برداشت نہیں تھا۔ فرانس کے کسانوں میں مزید زمین حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ جبکہ دوسرے ممالک میں نیم غلام کسان زمین کے مالک کہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

3۔ لوئی سیزدہم کے عہد میں جاگیردار بہت سے حقوق سے محروم تھے۔ لوئی شانزدہم کے عہد میں اس نے اپنا کھویا ہوا سیاسی وقار دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے، اسی لیے انہوں نے اسٹیٹس جنرل کا اجلاس بلانے کی حمایت کی۔

4۔ اٹھارہویں صدی کے ماہر ادیب و مفکرین کے نظریات سے متاثر ہوکر بہت سے یورپی ریاستوں کے حکمراں خود مختار ہوچکے تھے۔ اور روشن الخیال، مطلق العنان حکمرانوں نے عوامی فلاح کے بہت سے کام اور کاروبار کی ترقی کے لیے کوششیں کیں۔ فرانس میں یہ نہیں ہوسکا۔ فرانس کے حکمراں لوئی پانزدہم اور سولہواں دونوں نااہل حکمراں ثابت ہوئے۔

5۔ روشن خیال مفکرین نے فرانسیسی معاشرہ میں رائج عدم مساوات، بدعنوانی اور مذہبی توہم پرستی کو بے نقاب کیا اور اشرافیہ کی پُر تعیش زندگی کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ والٹیر، مانٹیسکو اور روسو نے اپنی تحریروں کے ذریعے فرانسیسیوں کے ذہنوں میں فکری ہلچل پیدا کی اور انقلاب کی نفسیاتی بنیاد تیار کی۔

6۔ فرانس کا متوسط طبقہ روشن خیال مفکرین سے بہت متاثر تھا۔ متوسط طبقہ کا یہ عقیدہ ''ہم اشرافیہ سے برتر ہیں'' انقلاب کی بنیادی وجہ بنا۔ یہ طبقہ فرانس کے سیاسی اور معاشی نظام میں تبدیلی چاہتا تھا۔ اسی متوسط طبقہ نے کسانوں کو انقلاب کا راستہ دکھایا۔ فرانسیسی انقلاب میں سب سے اہم کردار متوسط طبقہ نے ادا کیا۔ یورپ کے دیگر ممالک میں عوام کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے ان ممالک میں انقلاب برپا نہیں ہوسکا۔

7۔ فرانس کا دارالحکومت پیرس قوم کی سیاسی اور انتظامی زندگی کا مرکز بن چکا تھا۔ جب انقلابی قوتوں نے اس پر قبضہ کیا تو پوری قوم ان کے ساتھ شامل ہوگئی۔ یورپ کے دیگر ممالک میں اس وقت انتظامی مرکزیت نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو بہت محدود تھی۔ پیرس میں حکومت کی مرکزیت کی وجہ سے وہاں کے ہنگامے نے پوری ریاست کو متاثر کیا۔

8۔ فرانس میں دیہی علاقوں سے ساری دولت بہہ کر چند شہروں میں جمع ہوگئی۔ اس لیے جب قحط پڑتا تو محنتی کسان شہر میں رہنے والے امیر جاگیردار کے پاس بھاگتے تھے۔ جبکہ یورپ کے دیگر ممالک میں دولت دیہی علاقوں سے شہروں میں نہیں آتی تھی۔ عموماً جاگیردار اپنے ماتحت کسانوں کے درمیان رہتے تھے۔ دیہات کی غربت اور بدحالی اور شہروں کی دولت اور تماشے نے انقلاب کو بھڑکانے میں اپنا کردار ادا کیا۔

9۔ فرانسیسی فوج جب امریکہ کی جنگ سے واپس فرانس لوٹے تو انہوں نے یہ سوچا کہ ہمیں فرانس کی حالت بدلنی چاہیے۔ یہ خیال دوسری ریاستوں کی فوجوں کے ذہن میں نہیں تھا۔ فرانسیسی فوجیوں نے امریکی انقلاب سے سیکھا کہ ''مزاحمت ایک مقدس فریضہ ہے''

فرانسیسیوں نے امریکیوں سے یہ بھی سیکھا کہ 'حکومت کا سب سے بڑا خاتمہ آزادی ہے۔' اس طرح امریکی جنگ آزادی نے فرانس میں ایک نیا سیاسی شعور بیدار کیا۔ فرانسیسی فوج بھی حکمرانی سے غیر مطمئن تھی۔ ان کی تنخواہیں کئی ماہ سے التواء میں تھیں۔ دوسرے ممالک کی فوجیں اچھی حالت میں تھیں۔ فرانس میں فوجیں اپنی سرکار سے بہت زیادہ بد دل اور غیر مطمئن تھیں، اس لیے انقلاب کے وقت فوجیوں نے انقلابیوں کا ساتھ دیا۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ باشعور متوسط طبقہ' جاگیردارانہ نظام کی بگڑتی ہوئی صورت حال' جاگیرداروں کی سیاسی طاقت حاصل کرنے کی خواہش' دانشوروں اور فلسفیوں کا اثر ورسوخ' قابل حکمراں کا فقدان' لوگوں کے ذہنوں میں اصلاحات کی خواہش' پیرس کی اہمیت' امریکہ کی جدوجہد آزادی سے تعلق اور فوجیوں میں عدم اطمینان وغیرہ کے باعث فرانس میں انقلاب کی شروعات ہوئی۔

10.4 انقلاب کی ابتداء اور اہم واقعات (Origin of and Important Events in the Revolution)

5 مئی 1789ء کو اسٹیٹس جنرل کا اجلاس ورسائی کے شاندار محل میں شروع ہوا۔ لوئی شانزدہم نے باقاعدہ اس کا افتتاح کیا۔ اسٹیٹس جنرل کے کل ارکان کی تعداد تقریباً 1200 تھی، جن میں 600 سے زیادہ تیسرے ایوان کے ارکان تھے۔ ایوان زیریں میں 'مرابو' اور 'ابے سیئیس' کے علاوہ اور بہت سے اشخاص موجود تھے، جن کو اپنے مرتبے کے اعتبار سے کسی بالائی ایوان میں ہونا چاہیے تھا، مگر وہ اپنی ترقی پسندی اور قومی ہمدردی کے جذبہ کے تحت اپنی امتیازی حیثیت کو خیر باد کہہ کر عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے تھے۔ ان ہی میں ایک اور ممتاز فرد 'لفایت' (Lafayette) تھا، جس نے جنگ آزادی امریکہ میں فرانسیسی فوجوں کی قیادت کی تھی اور بڑا نام پیدا کیا تھا۔ یہ لوگ ملک کی نجات اسی میں سمجھتے تھے کہ عوام کے دیرینہ مطالبات کو تسلیم کر کے فرانس میں ایک ترقی پسند اور مبنی بر انصاف معاشرہ وجود میں لایا جائے۔ اسٹیٹس جنرل (قومی اسمبلی) کی طلبی کے بعد بھی حکومت نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ اس میں رائے دہی کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ایوان زیریں چاہتا تھا کہ تینوں ایوان ایک متحدہ اسمبلی کی شکل اختیار کر لیں اور تمام اُمور کا فیصلہ کثرت آراء کی بناء پر کیا جائے۔ اگر یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تو ایک خاردار مسئلہ حل ہو جاتا اور قومی اسمبلی کے تمام فیصلے بجا طور پر رائے عامہ کے آئینہ دار ہو جاتے۔ دونوں بالائی ایوانوں میں ایسے امراء اور پادری موجود تھے جو اصلاح کو ناگزیر سمجھتے تھے اور اس کام میں ایوان زیریں کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔ مگر اس دشوار مسئلے کو حل کرنے کے لیے حکومت کی جانب سے کوئی پہل نہیں کی گئی۔ تاخیر کی وجہ سے حالات بگڑنے لگے۔ ملک کے مسائل فوری حل طلب تھے، غذائی صورت حال ابتر ہو رہی تھی، مگر کسی فیصلہ کن اقدام کی نہ تو بادشاہ میں صلاحیت تھی اور نہ اس کے وزیر 'نیکر' (Necker) میں۔ ان دونوں پر رجعت پسند امراء اور پادریوں کا دباؤ تھا۔

غرض حکومت ابھی گومگو کی حالت میں تھی کہ ایوان زیریں کے جوشیلے اراکین نے 17 جون 1789ء کو اپنی ایک قرارداد کے ذریعے سے اس ایوان کو قومی اسمبلی میں تبدیل کر دیا۔ نیز دونوں بالائی ایوانوں کے اراکین کو دعوت دی کہ وہ سب قومی تعمیر جدید کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے اس 'قومی اسمبلی' میں شریک ہو جائیں۔ اس واقعہ نے درباری حلقوں میں بوکھلاہٹ پیدا کر دی۔ وہ اس نوزائیدہ اسمبلی کے

کام میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ قرار داد کی منظوری کے بعد تیسرے دن (20 جون 1789ء) جب اراکین اجلاس میں شرکت کے لیے ورسائی محل پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی نشست گاہ کو مقفل کر کے اس پر پہرہ بٹھا دیا گیا ہے اور عمارت پر 'زیر ترمیم' کا ایک نوٹس بھی آویزاں کر دیا گیا ہے۔ عوام میں غصہ تھا وہ غیظ و غضب میں بھرے قریب ہی ایک دوسری عمارت میں جا پہنچے۔ یہ عمارت 'ٹینس کورٹ' (Tennis Court) کے نام سے موسوم تھی۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اپنا اجلاس کیا اور اتفاق آراء کے ساتھ انہوں نے 'قومی اسمبلی' کے اراکین کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور اعلان کیا کہ نئے دستور کی تدوین تک وہ اپنے اجلاس ملتوی نہیں کریں گے۔ اس واقعہ کو 'حلف ٹینس کورٹ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ حلف حاکمان وقت کے خلاف ایک اعلانِ جنگ تھا۔ اس اعلان کے ذریعے قومی اسمبلی نے اپنے آپ کو ایک دستور ساز اسمبلی میں تبدیل کر لیا تھا۔ اس پر لوئی نے مداخلت کی۔

لوئی نے 23 جون 1789ء کو اسٹیٹس جنرل (قومی اسمبلی) کا مکمل اجلاس طلب کیا۔ اس کارروائی کے پیچھے امراء اور کلیسا کے سربراہوں کا ہاتھ تھا۔ بادشاہ نے خود اس اجلاس کو مخاطب کیا اور شکایتوں کو دور کرنے نیز ضروری اصلاحات کا وعدہ کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ اسٹیٹس جنرل کی سابقہ تنظیم و ترتیب برقرار رہے گی اور تمام اُمور کے فیصلے کثرت آراء کے بجائے ایوانی اکثریت پر ہوں گے۔ تیسرے ایوان نے جواب قومی اسمبلی بن چکا تھا اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر 'مرابو' نے یہ اعلان کیا کہ قومی اسمبلی بدستور برقرار رہے گی اور کوئی اس کو اس کے اختیار کردہ راستے سے ہٹا نہ سکے گا۔ لوئی شانز دہم کے مشیروں نے اسمبلی کے خلاف طاقت کے استعمال کا مشورہ دیا۔ مگر لوئی کسی طرح کا خون خرابہ نہیں چاہتا تھا، لہٰذا اس نے خاموشی اختیار کی اور بعد میں اس بات کی اجازت دے دی کہ امراء اور اہلِ کلیسا بھی دستور سازی کے کام میں ایوان زیریں کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ لوئی نے 27 جون کو تینوں ایوانوں کو ایک ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح قومی اسمبلی کو قانونی حیثیت مل گئی۔ یہ عام طبقے کی پہلی اہم فتح تھی۔ اسی دوران اقتدار بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر قومی اسمبلی کے ہاتھ میں چلا گیا۔ تینوں ایوانوں کے ایک ساتھ بیٹھنے سے قومی جنرل اسمبلی کی اہمیت بڑھ گئی۔ انہوں نے آئین بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ 9 جولائی 1789ء کو قومی اسمبلی نے خود کو آئین ساز اسمبلی قرار دیا۔ اس طرح ایک نیا سماجی نظام قائم کرنا اور اس کی آئینی بنیاد تیار کرنا فرض قرار دیا گیا۔ بادشاہ کو قومی اسمبلی کا یہ فیصلہ ماننا پڑا۔

فرانس میں قحط، بے روزگاری اور مفکرین کی اشتعال انگیز تقاریر سے حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ بادشاہ پر امراء اور ملکہ کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس طرح بادشاہ نے آئین ساز اسمبلی کو دبانے کی کوشش کی۔ یہ بادشاہ کی کوتاہ اندیشی کا ثبوت تھا۔ فوجیوں کے بڑھتے ہوئے دباؤ کو دیکھ کر آئین ساز اسمبلی کے اراکین نے محسوس کیا کہ ان کے لیے آزادانہ طور پر کام کرنا ممکن نہیں ہو گا۔ 'میرابو' کے ذریعے لوئی کو یہ پیغام بھیجا گیا کہ وہ فوجیوں کو واپس بھیج دیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اگر نمائندے فوجیوں سے خوف زدہ ہیں تو پیرس چھوڑ دیں۔ لیکن نمائندے بادشاہ کی دھمکی کے سامنے نہیں جھکے۔ 11 جولائی کو وزیر خزانہ 'نیکر' کو برطرف کر دیا گیا اور انہیں فوری طور پر ملک چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ یہ خبر پورے پیرس میں پھیل گئی اور لوگوں میں بے چینی بڑھ گئی۔ 13 جولائی کو روٹی اور شراب کی دوکانوں کو لوٹا گیا۔ یہ افواہ بھی گرم ہوئی کہ فوجیوں کو پیرس بھیجا جا رہا ہے۔ لوگوں نے یہ سن کر ہتھیار جمع کرنے کا فیصلہ لیا۔ شہر میں جہاں بھی اسلحہ مل سکتا تھا ہجوم نے وہاں لوٹ مار کی

اور ہتھیار چھین لیے۔ 14 جولائی کی صبح سے پیرس کا ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔ شہر میں انتظامیہ ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی۔ لوگ صبح سے ہی اسلحہ کی تلاش میں دندناتے پھر رہے تھے۔ کسی نے یہ افواہ گرم کی کہ "باسٹیل" کے قلعہ میں اسلحے کا ذخیرہ ہے۔ یہ جان کر لوگ وہاں جمع ہو گئے۔

قلعہ باسٹیل پر عوام کا حملہ:

باسٹیل کا قلعہ ایک بدنام ترین شاہی قید خانہ تھا جہاں ان لوگوں کو نظر بند کیا جاتا تھا جو بادشاہ یا حکومت کے معتوب ہوتے۔ ایک مرتبہ حراست میں آجانے کے بعد ان کی پھر کوئی شنوائی نہ ہوتی۔ ان کی لاشیں ہی باسٹیل سے باہر نکلتی تھیں۔ باسٹیل حکومت کے جبر و ظلم کی علامت تھا۔ اس لیے عوام کے جم غفیر نے اس پر حملہ کر دیا۔ باسٹیل کے محافظ دستہ نے اپنے کچھ سپاہیوں کی مدد سے ہجوم پر قابو پانے کی کوشش کی، لیکن آخر کار انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہجوم قلعہ میں داخل ہوا۔ تمام قیدیوں کو رہا کرا لیا اور قلعہ کو تباہ کر دیا۔ باسٹیل کے زوال سے پیرس میں بے پناہ خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جب بادشاہ کو باسٹیل کے تباہ و برباد ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے کہا 'ارے یہ تو بغاوت ہے۔' پاس کھڑے درباری نے کہا کہ بادشاہ یہ تو انقلاب ہے۔ باسٹیل کے واقعے کی اہمیت کے بارے میں اس کے وقت کے برطانوی سفیر ڈورسیٹ نے لکھا 'اسی لمحے سے ہم فرانس کو ایک آزاد ملک اور بادشاہ کو محدود اختیارات کے ساتھ بادشاہ تصور کر سکتے ہیں۔' باسٹیل صرف ایک قلعہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک اصول اور علامت بھی تھا۔ اس کا زوال اصول اور روایت کا زوال تھا۔ انقلاب کے پورے دور میں باسٹیل کے زوال جیسا اہم کوئی دوسرا واقعہ نہیں تھا، جس کے نتائج گہرے اور ہمہ جہت تھے۔ اس قلعہ کا زوال نہ صرف فرانس بلکہ پوری دنیا میں آزادی کے احیاء کی علامت تسلیم کیا گیا۔

14 جولائی کا یہ واقعہ فرانس کی رجعت پسند طاقتوں کی شکست کی علامت بن گیا۔ بوربون استبداد کی گرتی ہوئی عمارت کا یہ پہلا برج تھا جو زمین پر آرہا۔ 14 جولائی فرانسیسیوں کی جدوجہد آزادی کا ایک مقدس اور قومی دن بن گیا۔ یورپ میں جہاں جہاں آزادی کی تڑپ تھی، اس دن کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا۔ پرانے پرچم کی جگہ ایک سرخ، سفید اور نیلے رنگ کا نیا ترنگا جھنڈا اپنایا گیا۔ پیرس میں لوگوں نے قدیم ریاستی نظم و نسق کو ختم کر کے ایک نئی شہری حکومت تشکیل دی اور 'کمیون آف پیرس' کے نام سے مشہور ہوئی۔ شہر کی حفاظت کے لیے ایک مقامی فوج بنائی گئی جسے قومی محافظین کا نام دیا گیا۔ اس کی کمان لفایت (Lafayette) کے سپرد کی گئی۔ بیلی کو پیرس کا میئر بنایا گیا۔ بادشاہ سے کہا گیا کہ وہ ان تبدیلیوں کو قبول کرے۔ بادشاہ نے نیکر اور غیر ملکی فوجوں کو واپس بلانا قبول کر لیا۔ لوئی، 17 جولائی کو قومی اسمبلی کے تین چوتھائی اراکین کے ساتھ پیرس پہنچا۔ ہجوم نے بادشاہ کا زندہ باد کے نعرے سے استقبال کیا۔ 'بیلی' نے اپنی تقریر میں کہا '1589ء میں ایک دن ہنری چہارم نے پیرس کے لوگوں کو جیت لیا تھا۔ آج پیرس کے لوگوں نے اپنے بادشاہ کو جیت لیا ہے۔' بادشاہ نے تمام تبدیلیوں کو قبول کیا اور ان پر اپنی منظوری کی مہر لگا دی۔ پیرس کے اس واقعے نے پورے فرانس پر فوری اثر ڈالا۔ پیرس کے طرز پر مختلف مقامات پر کمیون اور قومی محافظ دستے قائم کیے گئے۔ فرانس کے دیہی علاقے بھی اس تبدیلی میں پیچھے نہیں رہے۔ دیہاتیوں نے اپنے ظالموں پر حملہ کیا اور جاگیردارانہ ٹیکسوں کے ریکارڈ کو آگ لگا دی۔ قلعوں کو تباہ کیا گیا۔ تباہی کا یہ سلسلہ جولائی کے آخری ہفتے تک بلا تعطل جاری رہا۔ اس سب کے دوران سماج دشمن عناصر نے بھی کھلے عام ہاتھ صاف کیے، جس کی وجہ سے ظلم و زیادتی کے واقعات رونما ہوئے۔ اس طرح فرانس

کے لوگوں نے عملی طور پر جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ کیا۔

4اگست 1789ء کو ایک کمیٹی نے قوم کی افراتفری پر ایک رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ پر اراکین اسمبلی میں خاموشی چھا گئی۔ سیشن ختم ہونے کو تھا اسی دوران 'نوآئی' نامی شخص نے کہا کہ معاشرے میں برائیوں کی وجہ جاگیر دارانہ نظام، ٹیکسوں کا بوجھ اور جاگیر داروں اور امراء کی دولت اور مراعات ہیں، جنہیں ختم کیا جانا چاہیے اور ساتھ ہی اس نے اپنے خصوصی حقوق کے ترک کرنے کا اعلان کیا۔ اس کی حمایت میں فرانس کے سب سے بڑے جاگیر دار 'ڈیوک ڈی ایگیو' نے اپنی مراعات ترک کر دیں۔ کچھ ہی دیر میں تمام ممبران نے اپنی مراعات ترک کر دیں۔ 'بشپ نینسی' نے اپنے طبقہ (کلاس) کی مراعات ترک کر دیں۔ ان قربانیوں اور پُر مسرت تاثرات کے درمیان صبح آٹھ بجے تک تقریباً 30 آرڈیننس جاری کیے گئے اور اس طرح ایک غیر معمولی سماجی انقلاب برپا ہوا، جواب تک کسی بھی قوم کی زندگی میں نہیں ہوا تھا۔ دراصل اہل فرانس کے لیے یہ ایک نئی صبح تھی۔

پاس شدہ قراردادوں کو باضابطہ طور پر قانون کی شکل دینے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں بہت سی مشکلات تھیں۔ جلد ہی دو گروپ بن گئے۔ (۱) ایک انقلاب کی کامیابیوں کو برقرار رکھنا چاہتا تھا (۲) دوسرا جو کھو گیا اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دوسری پارٹی سے تعلق رکھنے والے انقلابیوں کے مخالف مانے گئے۔ کچھ متکبر درباری لوئی کے بھائی کے ساتھ فرانس سے ہجرت کر گئے۔ اس کے ساتھ ہی ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس کی وجہ سے بعد میں فرانس کو یورپ کی بہت سی ریاستوں سے لڑنا پڑا۔ باقی درباریوں اور ملکہ کے دباؤ میں آکر بادشاہ نے متوسط طبقہ کے مفادات کی مخالفت شروع کر دی۔ بادشاہ کا چچازاد بھائی 'ڈیوک آف آرلس' جو بے پناہ دولت کا مالک تھا، درباریوں کے ساتھ مل کر خود کو بادشاہ کے مقام پر فائز کرنے کی سازش کر رہا تھا۔

4اگست کے فرمان بادشاہ کی منظوری کے بغیر قانونی شکل اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ عوام کو بادشاہ پر شک ہونے لگا۔ لوگوں کو شک تھا کہ بادشاہ انقلاب کو دبانے کے لیے ورسائی میں فوجیں جمع کر رہا ہے۔ ان افواہوں نے قحط اور بھوک سے دوچار لوگوں پر تباہ کن اثر ڈالا۔ عوامی غصہ ابلنے لگا۔ دریں اثنا 5اکتوبر کو ہزاروں خواتین کا ایک ہجوم پیرس میں جمع ہوا اور 'ہمیں روٹی دو' کے نعرے کے ساتھ ورسائی پہنچ گیا۔ سینکڑوں دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہوئے۔ ورسائی پہنچنے کے بعد مردوں اور عورتوں کے ایک گروہ نے شاہی محل کو گھیر لیا۔ بادشاہ اور ملکہ نے ہجوم کو کچھ یقین دہانیاں دے کر پُر سکون کرنے کی کوشش کی۔ لیکن 6اکتوبر کی صبح ہجوم ایک دروازے سے شاہی محل میں داخل ہوا اور بادشاہ و شاہی خاندان کو پیرس لے جانے کا مطالبہ کرنے لگا۔ بادشاہ اور اس کا خاندان پیرس جانے پر مجبور ہو گیا۔ جیسے ہی لاچار لوئی پیرس کے قریب پہنچا، عوام نے بیک آواز ناچتے اور گاتے ہوئے کہا کہ 'روٹی دینے والا اور اس کا خاندان ہمارے ساتھ ہے۔' پیرس میں شاہی خاندان کو تلیریز کے محل میں رکھا گیا۔ اب بادشاہ کی حالت قیدی جیسی ہو گئی۔ اس کے بعد لوئی کبھی ورسائی نہیں جا سکا۔ لوئی کے پیرس آنے کے بعد ان پر شہری عناصر کا اثر ورسوخ قائم ہو گیا۔ یہ ایک تبدیلی تھی جس کے بہت دوررس نتائج نکلے۔ جیسے جیسے انقلاب کی قیادت پیرس کے رہنماؤں کے ہاتھ میں آئی، اس کی شکل مزید پُر تشدد ہوتی گئی۔

10.5 آئین ساز اسمبلی کے افعال (Functions of the Constituent Assembly)

قومی اسمبلی کا بنیادی کام آئین سازی تھا۔ اس لیے قومی اسمبلی کو دستور ساز اسمبلی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس نے یہ کام ورسائی میں ہی شروع کیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی کے اس کام کا پہلا نتیجہ انسانی حقوق کا اعلان تھا۔ اس میں انسانوں کے فطری حقوق کا ذکر کیا گیا تھا۔ 27 اگست 1789ء کو دستور ساز اسمبلی نے اپنے آئیڈیل اور مقاصد کی شکل میں انسانی حقوق کا اعلان کیا، جس میں انسانوں کے بنیادی اور فطری حقوق پر زور دیا گیا تھا۔ انسانی حقوق کے منشور کا اعلان اہم تھا، لیکن کہا گیا کہ یہ اعلان فرانس میں جمہوری اور جمہوری نظریات کی ترقی کی تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ تھا۔ کچھ نے اسے جدید دور کا فرشتہ کہا۔ ان سب کے باوجود اس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ جیسے حقوق کے اعلان کے ساتھ اس میں فرائض کا ذکر نہیں تھا۔ یہ چیز انتشار کی وجہ بنی۔ دوسرے اس میں متوسط طبقہ کو تو دھیان میں رکھا گیا، لیکن عام لوگوں کو روزی روٹی دلانے کی کوئی یقین دہانی نہیں کی گئی۔ اس میں حقوق کا اعلان تو کر دیا گیا، لیکن اس کو فراہم کرانے کی کوئی گیارنٹی نہیں دی گئی۔ اس میں تجارت اور کاروبار کی آزادی کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی گئی۔ اسی طرح عوام کی تعلیم کے بارے میں کچھ ذکر نہیں کیا گیا۔

مذکورہ خامیوں کے باوجود منشور بہت اہمیت کا حامل تھا۔ در حقیقت منشور فرانسیسی انقلاب کا ایک روشن پہلو تھا، جس کے بغیر انقلاب ایک یورپی مظہر نہیں بن سکتا تھا۔ یہ اعلان "قدیم حکومت کی موت کا سرٹیفکیٹ تھا، لیکن اس میں فرانس کے لیے ایک نئی زندگی کی امید بھی تھی۔' اس میں ان تمام اصولوں کو اُجاگر کیا گیا جن کی بنیاد پر قومی اسمبلی پورے گورننس سسٹم (حکومتی نظام) میں اصلاحات لانا چاہتی تھی۔ یہ نئے دعوؤں کی توثیق اور سیاسی' سماجی اور قانونی حقوق کا بیان تھا۔ یہ محض ایک انسانی اعلان تھا۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں نافذ ہو سکتا تھا۔ کسی بھی ملک میں مطلق العنان بادشاہت یا جاگیر دارانہ مراعات سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اس کا فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ اس میں شہریوں کے حقوق کا بھی ذکر تھا۔ فرانس نے اپنے اس منشور کے ذریعہ پڑوسی مطلق العنان حکومت کو بہت بڑا چیلنج دیا۔ انیسویں صدی میں اسے 'منشور آزادی' ('Charter of Liberty') سمجھا جاتا تھا۔ اس اعلان نے عوامی حقوق کی بتدریج ترقی کا آغاز کیا اور انقلاب کو وسعت دی۔ شہریوں کے بنیادی حقوق کے اعلان کو فرانس کی تاریخ میں اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی برطانیہ میں 'میگنا کارٹا' اور امریکہ میں آزادی کے اعلان کو۔ کاغذ کا یہ ٹکڑا نپولین کی فوج سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوا۔ آئین ساز اسمبلی نے فرانس کی تاریخ میں پہلی بار 1791ء میں آئین بنایا۔ فرانس کے نئے آئین میں دو باتوں پر زور دیا گیا۔

1. ریاست کی اعلیٰ طاقت عوام میں ہے۔
2. طاقت کی مرکزیت ریاست اور عوام کے مفاد میں ہے۔

نئے آئین کے مطابق بادشاہ کے حقوق محدود تھے۔ انسانی حقوق کے پہلے اعدلان کو قانونی شکل دی گئی تھی۔ ججوں کے عہدوں کی خرید و فروخت کی روایت ختم ہو گئی۔ انصاف کے نقطۂ نظر سے تمام انسانوں کو برابر قرار دیا گیا۔ آئین ساز اسمبلی نے جاگیر داری اور مراعات کا خاتمہ کیا۔ کلیسا کی اجارہ داری پر حملہ کیا گیا۔ ریاست کے لوگوں کو مذہبی آزادی فراہم کی گئی اور کلیسا کی جائیداد کو قومی ملکیت قرار دیا گیا۔ اس سب کے باوجود دستور ساز اسمبلی آئین کو مستقل طور پر نافذ کرنے میں ناکام رہی۔ سیاسی اور معاشی مسائل کا حل نکالنے میں آئین ساز اسمبلی

ناکام ہوئی جس کی وجہ سے افراتفری پھیل گئی۔ دستور ساز اسمبلی بادشاہ اور بادشاہت کے خلاف نہیں تھی، لیکن بادشاہ نے تحمل اور دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ 20 جون 1792ء کو لوئی اور اس کا خاندان بھیس بدل کر آسٹریا کی سرحد عبور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اسے پیرس واپس لوٹنا پڑا۔ قومی اسمبلی کو تحلیل کر کے نئی آئین ساز اسمبلی بنائی گئی۔ نو منتخب آئین ساز اسمبلی میں ان لوگوں کی اکثریت تھی جو آئینی بادشاہت کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انقلاب کا کام پورا ہو چکا ہے اور اب ملکی مفاد میں نیا آئین نافذ ہونا چاہیے۔ لیکن بہت سے دوسرے لوگ بادشاہت کا خاتمہ اور جمہوریہ کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ جمہوریہ نوازوں (Republicans) کے دو گروپ تھے۔ جیکوبن (Jacobins) اور گیرونڈسٹ (Girondins)۔ ان میں جیکوبن زیادہ بنیاد پرست اور انقلابی تھے۔ ان کے لیڈروں میں مارا، دانتو، روبسپیئر وغیرہ تھے۔ گیرونڈسٹ کے اہم رہنماؤں میں مادام رولان، بوزدن، کنڈورسے، برسٹ وغیرہ اہم تھے۔

انقلاب فرانس کا دوسرا مرحلہ:

فرانس کے ریاستی انقلاب کا دوسرا مرحلہ جمہوریہ نوازوں کے انقلابی نظریات سے شروع ہوتا ہے۔ انقلاب کے پہلے مرحلے میں جو اقدامات اٹھائے وہ صرف اعلیٰ طبقے اور متوسط طبقے کے مفادات کے لیے تھے۔ نچلے طبقہ کے کسانوں یا مزدوروں کے مسائل بالکل اچھوتے تھے۔ دوسرے مرحلے میں انقلاب کی قیادت حریت پسند متوسط طبقے کے بجائے انقلابی متوسط طبقے کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے عام لوگوں کی وکالت کی۔ نئی مجلس قانون ساز کو درپیش ایک بڑا مسئلہ ان فرانسیسیوں کو کنٹرول کرنا تھا جو انقلاب مخالف تھے اور اسے کچلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں پادری اور امراء بھی شامل تھے۔ بہت سے لوگ جو انقلاب کے دوران بیرون ملک چلے گئے تھے، انقلاب کے خلاف بیرونی ممالک میں رائے عامہ ہموار کر رہے تھے اور وہاں کے حکمرانوں کو فرانس پر حملہ کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ فرانس کو انقلاب کی حفاظت کے لیے پرشیا، آسٹریا اور دوسرے ملکوں سے بھی ٹکر لینی پڑی، جس کے نتیجے میں ایک تاریخی جنگ کا آغاز ہوا، جس نے انقلاب کو بالکل نیا رخ دیا۔ اس کی وجہ سے فرانس میں 'جمہوریت' قائم ہوئی، پھر 'دہشت کا راج' قائم ہوا، جس کے پس منظر میں نپولین کا عروج ہوا۔

پلنٹیز (Pillnitz) کے مشترکہ اعلامیے میں پرشیا اور آسٹریا نے فرانس میں دوبارہ بادشاہت قائم کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ 20 اپریل 1792ء کو ان دو ممالک کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ ملک کا نیا آئین بنانے کے لیے ایک قومی کنونشن تشکیل دیا گیا۔ دریں اثناء ستمبر 1792ء میں ایک ہفتے کے اندر اندر ہزاروں انقلاب مخالف مارے گئے۔ کنونشن کا پہلا اجلاس 20 ستمبر 1792 کو ہوا۔ اس میں انتہا پسندوں کی اکثریت تھی۔ کنونشن نے بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریت کو قائم کیا۔ ملک کی حفاظت کرنے میں اسے بے مثال کامیابی ملی۔ کنونشن نے غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ قرض کی وصولی کے لیے قیدیوں کو گرفتار کرنے کے رواج پر بھی پابندی لگا دی گئی اور وزن و پیمائش کا نیا میٹرک نظام اپنایا گیا۔ انقلاب کے مخالفین کی جائیدادیں یا تو حکومت کے حوالے کر دی گئیں یا عام لوگوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ عوام کی سہولت کے لیے اناج اور دیگر اشیاء ضروریہ کی زیادہ سے زیادہ قیمتیں مقرر کی گئیں۔ نئے تشکیل شدہ کنونشن نے لوئی شانزدہم پر مقدمہ چلایا اور اسے 16 جنوری 1793ء کو پھانسی دے کر موت کی سزا سنائی۔ لوئی کے قتل سے یورپ کی قدامت پسند حکومتیں خوف زدہ ہو گئیں۔ آسٹریا اور پرشیا کے علاوہ اب برطانیہ، ہالینڈ اور اسپین وغیرہ جیسے ممالک بھی فرانس کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ ہزاروں لوگوں کو غداری کے

الزام میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سیاسی اتھل پتھل کے اس دور میں قومی اسمبلی کے قیام کے بعد سے سیاست میں غالب رہنے والے جیر ونڈ ستوں کی جگہ جیکوبنوں نے لے لی۔ نااہلی اور غداری کا الزام لگا کر جیر ونڈ ستوں کو اقتدار سے بے دخل کر دیا گیا اور جیکوبنوں نے کنونشن پر اجارہ داری قائم کی۔

جیکوبنوں نے دو کمیٹیاں بنائیں۔ 1۔ عوامی فلاحی کمیٹی (Committee of Public Welfare) 2۔ عوامی تحفظاتی کمیٹی (Committee of Public Safety)۔ بارہ رکنی عوامی تحفظاتی کمیٹی نے فرانسیسی ریاست کو 'دہشت کی ریاست' میں تبدیل کر دیا۔ ایسا قانون بنا دیا جس کے تحت کسی کو بھی صرف شک کی بنیاد پر پھانسی دی جا سکتی تھی۔ ان دونوں کمیٹیوں نے 'کمیون' کو بھی کچلنا شروع کر دیا۔ یکم جولائی 1794ء کو جیکوبنوں کے رہنما رابس پیر کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فرانس میں دہشت گردی کا راج ختم ہوا، مگر اپنے زوال سے پہلے اس نے تقریباً 20,000 لوگوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ دہشت گردی کے دور کے خاتمہ کے بعد انقلاب کی قیادت دوبارہ حریت پسندوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ حریت پسندوں کے عروج کے باعث متوسط طبقے کا مفاد پھر سے اہمیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ہنگامہ خیز حالات میں بھی کنونشن نے جنگوں میں بے مثال کامیابیاں حاصل کیں۔ 1793ء کے آخر تک تمام حملہ آور قوتوں کو ملک سے باہر نکال دیا گیا۔ 1794ء میں فرانسیسی افواج نے آگے بڑھ کر دشمن ممالک پر حملہ کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ فرانس کی فوجیں ناقابل تسخیر ہیں۔ 1795ء میں فرانس میں ہونے والے کنونشن نے نئے آئین کو منظوری دی اور ایک نئی پانچ رکنی کمیٹی 'ڈائرکٹری' تشکیل دی گئی۔ ڈائرکٹری کا دور 1795 سے 1799 تک رہا۔ اس کا زیادہ تر وقت غیر ملکی فوجوں کے ساتھ جنگ میں گزرا۔ ایسے ہی حالات میں نپولین کا ظہور ہوا۔ نومبر 1799ء میں نپولین نے ڈرامائی انداز میں فرانس کی حکمرانی کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس کے ساتھ ہی ڈائرکٹری ختم ہو گئی۔ یہ ڈائرکٹری فرانس میں پھیلے معاشی نظام اور سیاسی بدنظمی کو دور کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی، ایسے حالات میں لوگوں نے نپولین کا استقبال کیا۔

10.6 انقلاب کا جائزہ (An Appraisal of the Revolution)

1789ء میں نہ تو فرانس کے لوگ انقلاب چاہتے تھے اور نہ ہی انقلاب کی کوئی تیاری تھی۔ مالیاتی بحران کو حل کرنے کے لیے بلائے گئے اسٹیٹس جنرل کے کنونشن نے نادانستہ طور پر انقلاب کا آغاز کر دیا۔ اس طرح فرانس کا انقلاب بے ساختہ تھا۔ البتہ انقلاب کے ابتدائی دور کے مقاصد کا تعین کیا جا سکتا ہے جو درج ذیل ہے:

1. فرانس کے عوام کی اکثریت جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ چاہتی تھی۔
2. متوسط طبقہ تمام معاشی پابندیوں خصوصاً جاگیر دارانہ پابندیوں کو توڑنا چاہتا تھا۔
3. فرانس کے لوگ سماجی وقار اور حکمرانی میں شرکت چاہتے تھے۔
4. کسان جاگیر دارانہ ٹیکسوں اور ذمہ داری سے آزادی چاہتا تھا۔

5. عوام سماجی مساوات اور قانون کی برابری چاہتی تھی اور ایک محدود آئینی بادشاہت کا قیام چاہتی تھی۔

تاہم مساوات کے اصول کی خلاف ورزی ہوئی اور کسانوں کو سیاسی اور معاشی برابری نہیں ملی۔ انقلاب کے دوسرے مرحلے میں بادشاہت کا خاتمہ ہوا اور بادشاہ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ انقلاب کے تیسرے مرحلے میں انقلاب بین الاقوامی ہو گیا۔ آخری مرحلے میں انقلاب بورژوا تسلط میں چلا گیا، جس کی وجہ سے عام لوگ بے بس ہو گئے، حالانکہ یہ انقلاب کا مقصد نہیں تھا۔ ڈائرکٹری کی کمزور اور بدعنوان حکمرانی نے نپولین کو اقتدار پر قبضہ کرنے کی اجازت دے کر بورژوا مفادات کو فائدہ پہنچایا۔

10.7 انقلاب کی اہم شخصیات (Prominent Figures in the Revolution)

وہ شخصیات جن کی سوچ و فکر اور خیالات انقلاب کا محرک بنے اُن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

گبریل میرابیو (1791–1749): یہ بہت ذہین شخص تھا اور انقلاب فرانس کا اہم فرد تھا۔ اس نے منتشر معاشرے میں جرأت مندانہ کام کیا۔ اس نے برطانیہ، ہالینڈ اور پرشیا وغیرہ کا سفر کیا۔ فرانس کے طول و عرض میں گھوما، اس سے اس کے تجربات میں اضافہ ہوا۔ اس کا تعلق جاگیردار طبقہ سے تھا لیکن جب 1789ء میں پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے تو وہ تھرڈ اسٹیٹس جنرل کے تیسرے ایوان کا رکن منتخب ہوا۔ جب یہ سوال اٹھا کہ پارلیمنٹ کے تینوں ایوانوں کو ایک ساتھ بیٹھنا چاہیے یا الگ الگ۔ اس وقت میرابیو نے تیسرے ایوان کی قیادت کی اور تینوں ایوانوں کو ایک جگہ بیٹھنے کا مطالبہ کیا۔ 20 جون 1789ء کے 'حلف ٹینس کورٹ' ('Oath of Tennis) Court') واقعہ میں میرابیو کا اہم کردار تھا۔ جب بادشاہ کے نمائندے نے عام لوگوں کو ٹینس کورٹ سے نکلنے کو کہا تو یہ میرابیو ہی تھا جس نے بادشاہ کے نمائندے سے کہا 'جاؤ ان لوگوں کو بتاؤ جس نے تمہیں بھیجا ہے کہ لوگوں کی طاقت کے مقابلے میں ٹینس کی طاقت کچھ نہیں ہے۔' میرابیو کی کوششوں نے لوئی شانزدہم کو اپنی فوج کو پیرس سے نکالنے پر مجبور کیا۔ اس کی کوششوں سے ہی عوام سے جمع ہونے والا دسواں ٹیکس (Tithe) ختم کر دیا گیا۔ میرابیو انقلاب کا علمبردار اور قومی اسمبلی کا ترجمان تھا۔

جارج جیکس ڈینٹو (1794–1759): اس کا تعلق ایک عام گھرانے سے تھا۔ وہ کامیاب وکیل اور ماہر مقرر تھا۔ اس نے انقلاب کو بدنظمی اور خون ریزی سے روکنے کی مسلسل جدوجہد کی۔ اس نے بادشاہت پر سخت حملے کیے۔ پیرس کمیون پر ڈینٹو کا اثر بہت زیادہ تھا۔ اس نے پیرس کمیون کو ایک بہت طاقتور ادارہ بنا دیا۔ 10 اگست 1792 کو ڈینٹو کی قیادت میں پیرس کے ہجوم نے تولریز کے شاہی محل پر حملہ کر دیا۔ بادشاہ کے محافظ مارے گئے اور بادشاہ کو قیدی بنا لیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد فرانس پر ڈینٹو کا غلبہ ہو گیا۔ اس نے فرانس میں دہشت کا راج قائم کیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر فرانسیسی فوج کو منظم کیا اور شکست کو فتوحات میں تبدیل کر دیا۔

رابس پیر (1794–1758): یہ ہنرمند مصنف اور محب وطن کے ساتھ ہی مشہور وکیل تھا۔ 1789ء میں اسٹیٹس جنرل کا کارکن منتخب ہوا۔ دہشت گردی کے دور میں اس نے جیرونڈسٹ پارٹی کی طاقت کو کچل دیا۔ یہ دہشت گردی کے دور کا بہت فعال شخص تھا۔ اس کی

خواہش فلاحی ریاست قائم کرنا تھی۔

مارگوریٹ کارنوٹ(1823–1753): نے انقلاب فرانس کو ایک مضبوط اور منظم فوج فراہم کی۔ اس نے جوان اور طاقت ور لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا حکم جاری کیا۔ بوڑھے مردوں اور عورتوں کو جنگی ساز و سامان بنانے اور سپاہیوں کی دیکھ بھال کا کام سونپا گیا۔ اس کے عمل سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے پوری قوم نے ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ اس کی کوششوں سے فرانسیسی فوج نے نیدر لینڈر، رائن لینڈ، سیوائے وغیرہ علاقوں پر شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ اسپین، پرشیا اور ہالینڈ کے حکمرانوں کو فرانس کے ساتھ ذلت آمیز معاہدے کرنے پڑے۔ کارنوٹ کے کاموں سے خوش ہو کر فرانسیسی اسے جہت کا جز و کہنے لگے۔

ایبی ایمانوئیل جوزف سی (1834–1748): انقلاب فرانس کا سب سے اہم مفکر سی تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کلیسا اور معاشرہ نیز انتظامیہ کا ڈھانچہ بدل کر موجودہ تقاضہ کے مطابق کر دیا جائے۔ اس نے تیسرے ایوان کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تیسرا ایوان قوم کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی تحریروں نے تیسرے طبقہ کو احتجاج پر اکسایا۔ اس نے نیشنل کانفرنس اور ڈائرکٹروں کے رکن کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی۔ سی (Sie) نے 1795 میں آئین بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مذکورہ اہم شخصیات کے علاوہ سینٹ جست، جیل پال مارا، لفایت وغیرہ نے بھی انقلاب فرانس کو اپنی تحریروں، کاموں اور جدوجہد سے تحریک دی اور ان لوگوں کی کوششوں سے انقلاب فرانس ممکن ہو سکا۔

10.8 انقلاب فرانس کی اہمیت اور اس کے اثرات

(Significance and Effects of the French Revolution)

انقلاب فرانس نے نہ صرف فرانس بلکہ یورپ اور پوری دنیا کو متاثر کیا۔ جرمن فلسفی کانت نے اسے عقل کی فتح قرار دیا۔ ہیگل جیسے مصنف نے انقلاب کی یاد میں درخت لگائے۔ باسٹیل کے زوال کے بعد طلباء نے سینٹ پیٹرز برگ کی گلیوں میں خوشی سے رقص کیا۔ اس انقلاب نے فرانس کی سیاست کو یکسر تبدیل کر دیا۔ سماجی، مذہبی اور معاشی نظام بالکل بدل گیا۔ جان بال سٹیورٹ نے انقلاب کی اہمیت کے بارے میں لکھا ہے کہ 'انقلاب فرانس کے نتائج اتنے دور رس تھے' سی۔ ڈی بازن کا کہنا ہے کہ 'انقلاب فرانس نے ریاست کے حوالے سے ایک نئے تصور کو پیدا کیا، سیاست اور معاشرے کے حوالے سے نئے اصول پیش کیے اور زندگی کا ایک نیا زاویہ پیش کیا۔ اس نے لوگوں کی اکثریت میں تخیل اور خیالات کو بھڑکا دیا۔ منفرد جوش و خروش اور بے پناہ امیدوں سے متاثر کیا۔' جواہر لال نہرو کے مطابق 'انقلاب فرانس کی وجہ سے جمہوریہ کا تصور پورے یورپ میں پھیل گیا اور اس کے ساتھ وہ اصول بھی پھیل گئے جن کا انسانی حقوق کے اعلامیے میں اعلان کیا گیا تھا۔' روپوتکن (Kropotkin) کی رائے ہے کہ 'یہ انقلاب تمام جدید نظریات کا سرچشمہ تھا۔' اس انقلاب نے جدید زندگی کے حریت پسند، جمہوری اور ترقی پسند نظریے کی بنیاد رکھی۔ اس انقلاب نے یورپ میں جدید دور کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا اور عام لوگوں کو آزادی، مساوات اور جمہوریت کے احساس سے روشناس کرایا۔

اس انقلاب کی اہمیت صرف فرانس کے تناظر میں ہی نہیں بلکہ یورپ اور دنیا کے تناظر میں بھی ہے۔ یہ انقلاب فکر معاشرت اور سیاست کے میدان میں ایک فتح تھی جس کی وجہ سے مطلق العنان بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔ ساتھ ہی مراعات یافتہ طبقہ بھی ختم ہوا، جس کے نتیجے میں متوسط اور نچلے طبقے کی حالت میں بہتری آئی۔ کلیسا کی اعلیٰ ترین پوزیشن ختم ہوئی۔ اقتصادی حالت میں سدھار ہوا اور مطلوبہ معاشی تبدیلیاں ظاہر ہونے لگیں۔ انتظامی، آئینی اور عدالتی اصلاحات ہوئیں اور قومی دستور اسمبلی نے انتظامیہ میں یکسانیت لانے کی کوشش کی۔ نئی چھاؤنیں اور کیونز میں صوبائی اور مقامی کونسل تشکیل دی گئی اور 1791ء کے آئین نے آئینی بادشاہت قائم کی اور فرانس میں ایک ایوانی مقننہ کی تشکیل کی۔ 1795ء میں ایک نئے آئین کے ذریعے فرانس میں پہلی جمہوریہ قائم ہوئی۔ پورے فرانس کے لیے یکساں عدالتی نظام تشکیل دیا گیا۔ اس انقلاب کے کچھ برے اثرات بھی پڑے۔ انقلاب کے دوران فرانس میں عام لوگوں کو بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے لوگوں کی جانیں گئیں۔ اور فرانس ایک طویل عرصہ تک بدامنی، بدنظمی کا شکار رہا۔ ان بُرے اثرات کے باوجود 1789ء کے انقلاب نے فرانسیسیوں کو ایک طرز زندگی اور سوچ فراہم کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ تبدیلی کے اصول کی اہمیت کو متفقہ طور پر تسلیم کر لیا گیا اور اس انقلاب سے متاثر ہو کر جمہوری حقوق کا مطالبہ اٹھایا گیا۔

10.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

انقلاب فرانس 1789ء نے دنیا کے کئی نظریات کو بدل دیا اور سیاسی ڈھانچے کی از سر نو تعمیر کی جس نے انسانیت کو بلند مقام پر کھڑے کرتے ہوئے انہیں متحد کر کے اخوت کے نظریہ کو تقویت دیا اور ان کے مجروح جذبات کو بحال کیا جو ان کی ترقی کا باعث ہوئیں۔ لوئی شانزدہم نے اپنے پیشرو بادشاہوں کی طرح عوام کی فلاح و بہبود کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح عوام کی حالت اور خراب ہو گئی۔ بادشاہ اپنی مطلق العنانی کو اس حد تک بڑھا چکا تھا کہ وہ عوام کو خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بادشاہ عوام کی مرضی کے بجائے خدا کی عنایت کی وجہ سے حکومت کرتے ہیں۔ اس طرح عوام پر ظلم بڑھتا گیا۔ فرانس کی پارلیمنٹ برائے نام رہ گئی تھی۔ اس کا اجلاس 175 برسوں سے طلب نہیں کیا گیا تھا۔ ایسے حالات نے انقلاب کی راہ ہموار کی۔ فرانسیسی سماج تین طبقوں میں منقسم تھا۔ (۱) امراء (۲) کلیسا (۳) عوام۔ اس میں اول الذکر دو طبقوں کو خصوصی مراعات حاصل تھیں جبکہ تیسرا طبقہ ہر طرح کی مراعات سے محروم تھا۔ فرانس کی پارلیمان کے انتخاب 1788 تا 1789 میں منعقد ہوئے۔ انتخاب کے بعد پارلیمنٹ کا اجلاس ورسائی کے محل میں ہوا، جس میں تیسرے ایوان کے اراکین نے یہ تجویز پیش کی کہ پارلیمنٹ کا فیصلہ کثرت آراء پر نہ ہو بلکہ بالائی دو ایوانوں پر ہو۔ لیکن بادشاہ قطعی فیصلہ کرنے سے گریز کرتا رہا، جس کے نتیجہ یہ ہوا کہ ایوان زیریں نے خود کو قومی اسمبلی میں تبدیل کر لیا اور اپنا اجلاس منعقد کرنے کے لیے ورسائی محل پہنچ گئے۔ وہاں اجلاس کرنے کی اجازت نہ پا کر ٹینس کورٹ میں اپنا اجلاس منعقد کیا اور یہ طے کیا (حلف لیا) کہ جدید دستور کی تدوین تک وہ اپنے اجلاس کو ملتوی نہیں کریں گے۔ اس کو حلف ٹینس کورٹ کہا جاتا ہے۔ ایوان زیریں کے اراکین ایک طرف قومی اسمبلی کے دستور کی تدوین میں مصروف تھے، تو دوسری طرف بالائی ایوانوں کے اراکین بادشاہ پر زور دینے لگے کہ وہ فوجی طاقت کے ذریعے قومی اسمبلی کو تحلیل کر دے۔ اس پر عوام مشتعل ہو گئی اور ایک جم غفیر نے باسٹیل کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ یہ واقعہ 14 جولائی 1789ء کو واقع ہوا۔ قومی اسمبلی نے 14 اگست 1789ء کو جاگیرداریت کو قانونی طور

پر منسوخ کر دیا۔ تمام مراعات کا خاتمہ کر دیا اور تمام لوگوں کو مساوی حقوق دیے گئے۔ 1789ء ہی میں حقوق انسانی کا اعلان جاری کیا گیا جس کے ذریعہ تمام شہریوں کو سیاسی و معاشی مساوات اور آزادی عطا کی گئی۔ کلیسا کے عہدیداروں کی تمام مراعات کو ختم کر دیا گیا اور ان کی جائیداد کو قومی ملکیت بنا دیا گیا۔ ہزاروں خواتین نے ورسائی محل کی جانب کوچ کیا۔ بادشاہ اور اس کے اہل خاندان کو 16 اکتوبر 1789ء کو پیرس لایا گیا اور کچھ عرصہ کے بعد قومی اسمبلی بھی پیرس میں منتقل ہو گئی۔ بادشاہ نے اپنے خاندان کے ساتھ فرانس سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا اور 2 ستمبر 1792 کو بادشاہت ختم کر دی گئی اور لوئی شانزدہم کو پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح ریپبلک حکومت قائم کی گئی۔

10.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

Intendent	:	ناظر۔ ضلع دار
بورژوا	:	یہ لفظ فرانسیسی زبان سے لیا گیا ہے جس کے معنی سرمایہ دار طبقہ
مقننہ	:	اس جماعت یا مجلس کو مقننہ کہتے ہیں جو قوانین بناتی ہے اس میں ترمیم کرتی ہے اور پہلے سے بنے ہوئے قوانین کو ختم کرتی۔
کلیسا	:	عیسائیوں کا عبادت خانہ

10.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

10.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. فرانسیسی انقلاب کب ہوا؟
2. ''روح قوانین'' کس فلسفی کی کتاب ہے؟
3. ''سوشل کنٹریکٹ'' کے مصنف کا نام لکھیں۔
4. جنرل وِل ('General Will') کا نظریہ کس نے پیش کیا؟
5. اسٹیٹس جنرل کا عام انتخاب کس سن میں ہوا؟
6. فرانس کا دارالحکومت کہاں تھا؟
7. اسٹیٹس جنرل کے کل ارکان تعداد کتنی تھی؟
8. کنونشن کا پہلا اجلاس کس سن میں ہوا؟
9. لوئی شانزدہم کو پھانسی کی سزا کب ہوئی؟
10. ڈائرکٹری کی تشکیل کب ہوئی؟

10.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. انقلاب فرانس کے سیاسی اسباب بیان کیجیے۔
2. انقلاب فرانس کے فوری اسباب کیا تھے؟
3. کلیسا پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
4. انقلاب سے متعلق اہم شخصیات کا ذکر کریں۔
5. روسو پر ایک مضمون قلمبند کیجیے۔

10.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. انقلاب فرانس کے سماجی و معاشی اسباب پر اظہار خیال کیجیے۔
2. انقلاب کی ابتداء اور وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات قلمبند کیجیے۔
3. آئین ساز اسمبلی کے کاموں کا مرحلہ وار جائزہ لیجیے۔

10.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Droz, Jacques, *Europe between Revolutions, 1815–1848*, Fontana Press, London, 1967.
2. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
3. Gottlieb, Anthony, *The Dream of Enlightenment*: *The Rise of Modern Philosophy*, Penguin, UK, 2017.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
6. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
11. Soboul, Albert, *Understanding the French Revolution*, People's Publishing House, Bombay, 1989.
12. جے ایم تھامپسن۔ انقلاب فرانس۔NCPUL، نئی دہلی۔

اکائی 11۔نپولین کے عہد میں فرانس

(Napoleonic France)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید
11.1 مقاصد
11.2 ابتدائی زندگی
11.3 ابتدائی فوجی کامیابیاں
11.4 نپولین بطور قونصل اول
11.5 قونصل اول کی خارجہ پالیسی
11.6 شہنشاہ نپولین اول
11.7 نپولین کے زوال کے اسباب
11.8 اکتسابی نتائج
11.9 کلیدی الفاظ
11.10 نمونہ امتحانی سوالات
11.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید (Introduction)

دنیا کی تاریخ میں نپولین بوناپارٹ کا نام عظیم شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ جدید یورپ کی تاریخ اور فرانس کے مستقبل پر اس نے اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ نپولین کے قوانین اور انتظامی اصلاحات آج بھی تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ جدید فرانس میں رائج ہیں۔ آخر یہ نپولین کون تھا اور اسے اس قدر اہمیت کیوں حاصل ہے؟ یہ ہم اس اکائی کے ذریعے جانیں گے۔ کورسیکا جزیرے کے اجاکیو نامی مقام پر پیدا ہونے والا ایک معمولی وکیل کا بیٹا کیسے فرانس کا عظیم ترین شہنشاہ بن گیا، یہ ایک بڑی دلچسپ داستان ہے۔ نشاۃ ثانیہ اور عہد روشن خیالی نے یورپ میں حریت، مساوات اور انسان دوستی کے نظریات کو پیدا کیا۔ آگے چل کر یہی نظریات امریکی انقلاب کا سبب بنے جہاں امریکی نوآبادیاتی عوام نے فرد کی آزادی اور اس کے نمائندگی کے حق کے لیے آزادی کی جنگ لڑی۔ فرانس بھی امریکی جنگ آزادی میں شامل ہونے کی وجہ سے ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور 1789 میں فرانس میں انقلاب کا لاوا پھوٹ پڑا۔ فرانس میں انقلاب تو آگیا مگر وہاں کی عوام ابھی تک اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ نتیجتاً انقلاب کے نام پر بے انتہا خونریزی اور ملک میں انتشار برپا رہا۔ ایسے حالات میں ایک مضبوط منتظم اور اولوالعزم حکمراں کے طور پر نپولین کا عروج ہوا اور عوام نے اس کی سچے دل سے حمایت کی۔ پہلے قونصل کے طور پر اور بعد میں شہنشاہ کے طور پر نپولین نے فرانس کو یورپ کی عظیم طاقت اور سیاسی رہنما بنا دیا۔ اس نے بدعنوانی اور بدانتظامی کا خاتمہ کیا اور ملک کو پرامن بنایا۔ ملک میں آئینی اور قانونی اصلاحات کیں اور پورے ملک میں یکساں قوانین نافذ کیے۔ ساتھ ہی اس سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئیں جو اس کے زوال کا سبب بنیں۔ مثلاً اس نے اقرباپروری میں صلاحیت اور لیاقت کو نظر انداز کیا۔ خود پسندی اور جاہ طلبی میں براعظمی نظام نافذ کیا اور دوسرے اتحادیوں کو بھی اس پر مجبور کیا۔ موسمی حالات اور تیاریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے روس پر حملہ کیا جو مکمل تباہی ثابت ہوا۔ صنعتی ترقی اور سرمایے کی اہمیت کو درخور اعتنانہ سمجھا اور کسی قسم کی تکنیکی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی نہ ہی بحری بیڑے اور فوج کی جدید کاری پر توجہ دی۔ ان سب کا نتیجہ اس کے اچانک عروج کے ساتھ زوال کی صورت میں نکلا۔ اس اکائی میں ہم نپولین کے اسی عروج اور زوال اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے بارے میں پڑھیں گے۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- نپولین کی ابتدائی زندگی اور عسکری کامیابیوں کے بارے میں جانیں گے۔
- قونصل اول کے طور پر نپولین کی متعدد اصلاحات اور اس کے مجموعہ قوانین کی جانکاری حاصل کریں گے۔
- قونصل اول کے طور پر نپولین کی خارجہ پالیسی اور جنگوں کے بارے میں سمجھیں گے۔
- نپولین کے شہنشاہ بننے کے بعد کے کارنامے اور غلطیوں کے بارے سمجھیں گے۔
- نپولین کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کریں گے۔

11.2 ابتدائی زندگی (Early Life)

ڈائریکٹری کے آخری دنوں میں فرانس میں نپولین کا عروج ہوا۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ نپولین فرانسیسی طاقت اور یورپی سیاست کا مرکز کیسے بنا، اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ نپولین نسل کے لحاظ سے اطالوی، پیدائشی طور پر کورسیکائی اور قومیت کے لحاظ سے فرانسیسی تھا۔ وہ 15 اگست 1769 کو کورسیکا کے جزیرے اجاکیو (Ajaccio) میں ایک اطالوی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کارلو بوناپارٹ (Carlo Maria Buonaparte) ایک وکیل تھے لیکن ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس کی والدہ لیٹیزیا راмولینو (Maria Letizia Ramolino) ایک محنتی خاتون تھیں اور ہمیشہ اسے عظیم بننے کی ترغیب دیتی تھیں۔ نپولین چار بھائیوں اور تین بہنوں کے باوجود تنہا رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں وہ احساس کمتری کا شکار رہتا تھا کیونکہ ان کا تعلق طبقہ اشرافیہ سے نہیں تھا اور اس کے رد عمل کے طور پر وہ عمر بھر اشرافیہ خاندانوں سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب فرانسیسی حکومت نے کورسیکا کے باغیوں کو مطمئن کرنے کے لیے رعایتیں دینا شروع کیں تو اس سے نپولین کی زندگی بھی متاثر ہوئی۔ اسے فرانس میں برائن کے فوجی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفہ حاصل ہوا۔ وہ پڑھنے لکھنے کا شوقین تھا اور جغرافیہ، تاریخ، سیاسیات، ریاضی اور عظیم انسانوں کی سوانح عمری پڑھا کرتا تھا۔ وہ جولیس سیزر اور الیگزینڈر سے متاثر تھا۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد 16 سال کی عمر میں اسے فرانسیسی فوج کے توپ خانے کے لیے منتخب کیا گیا جبکہ وہ بحری فوج میں بھرتی ہونا چاہتا تھا۔ اسے بری فوج میں لیفٹیننٹ جنرل بنا دیا گیا۔ اسی دوران جب قومی اسمبلی نے فرانس کی دوسری ریاستوں کی طرح کورسیکا کو بھی مساوی حقوق دیے تو نپولین جیکوبن پارٹی کا رکن بن گیا۔ نپولین کو طولون (Toulon) کے محاصرے کے دوران ترقی کا پہلا موقع ملا۔ 28 اگست 1793 کو انگریز بحری بیڑے نے فرانس پر حملہ کر کے طولون پر قبضہ کر لیا۔ لیکن تین ماہ کے اندر نپولین نے برطانوی فوج کو شکست دے کر طولون سے باہر نکال دیا۔ یہ نپولین کی زندگی کا پہلا اہم کارنامہ تھا۔ اس کامیابی کی وجہ سے اسے بریگیڈیئر جنرل کا عہدہ دیا گیا۔ اس کو دوسری اہم کامیابی 5 اکتوبر 1795 کو اس وقت ملی جب عوام نے پیرس میں آئین سے غیر مطمئن ہو کر قومی مجلس (National Convention) کے خلاف بغاوت کی۔ نپولین نے باغیوں کو مکمل طور پر دبا کر فرانس کو خانہ جنگی سے بچا لیا۔ توپ خانہ کی مدد سے اس نے باغیوں کے جم غفیر کو چند لمحوں میں منتشر کر دیا۔ قومی مجلس کی حفاظت کی وجہ سے وہ فوج کے سربراہ پال براس (Paul Barras) کا پسندیدہ بن گیا اور اسے پوری اندرونی فوج کا سالار مقرر کر دیا گیا۔ 1796 میں اس نے جوزفین بوارنے (Josephine Beauharnais) نامی ایک بیوہ سے شادی کی۔ جوزفین کے اشرافیہ طبقہ سے روابط کی وجہ سے، اس شادی نے نپولین کے اقتدار کے اضافے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ قد کا چھوٹا مگر ہمت کا بلند اور دل کا مضبوط تھا۔ بڑے سے بڑے جنرل جب اس کے سامنے آتا تو نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ جنرل ماسانا (Massena) کا بیان ہے کہ نپولین جب اپنی سپہ سالاری کی ہیٹ پہن لیتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے قد میں دو فٹ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اطالیہ کی فوج کا جب وہ سپہ سالار مقرر ہوا تو اس میں ایسے بھی جنرل تھے جو اس کے مقابلے میں تجربہ کار تھے مگر وہ نپولین کے سامنے دب کر رہ گئے۔

11.3 ابتدائی فوجی کامیابیاں (Early Military Achievements)

نپولین کی فوجی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ڈائرکٹری نے اسے اطالوی مہم کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اطالوی مہم اپریل 1796 سے اپریل 1797 تک جاری رہی۔ آسٹریا (Austria) اور سارڈینیا (Sardinia) کی مشترکہ فوج میں ستر ہزار فوجی تھے اور نپولین کی فوج اس سے نصف تھی۔ سب سے پہلے اس نے سارڈینیا پر حملہ کیا اور اسے بری طرح شکست دی اور اس سے سیوائے (Savoy) اور نیس (Nice) کے علاقے حاصل کر لیے۔ اس کے بعد نپولین نے ملان (Milan) پر قبضہ کر لیا اور ریوولی (Rivoli) اور آرکولا (Arcola) کی لڑائیوں میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر آسٹریائی فوج کو شکست دی۔ فروری 1797 میں، مانتوا (Mantua) پر قبضہ کرنے کے بعد وہ آسٹریائی دارالحکومت ویانا (Vienna) کی طرف بڑھا ہی تھا، کہ آسٹریا کے شہنشاہ نے صلح کی پیشکش کی اور جنگ بندی ہو گئی۔ اس دوران اس نے مئی 1797 میں پرما (Parma)، موڈینا (Modena) کے ڈیوکوں اور جون 1797 میں نیپلز (Naples) کے حکمران اور پوپ سے معاہدے کر کے لڑی جانے والی جنگوں کے اخراجات بھی مفتوحہ علاقوں سے وصول کر لیے۔ پوپ نے نپولین کو آونیو (Avenue)، والونیا (Wallonia) اور فرارا (Ferrara) کا علاقہ سپرد کر دیا اور تین کروڑ فرینک، 500 قیمتی کتب اور بہت سی فنی تصاویر بھی پیش کیں۔ مفتوحہ علاقوں کو نپولین نے دو جمہوریہ ٹرانسپوڈین (Transpodean) اور سسپیڈین (Cespedian) کے طور پر منظم کیا۔ اس کے بعد اس نے اٹلی کے مشرقی علاقے وینس (Venice) کا انتظام سنبھال لیا۔ جون میں، اس نے ٹرانسپویڈن، سسپاڈین، لیگیشنز (Legations) رومانیہ ، اور وینس جمہوریہ کو ملا کر سیسالپائن جمہوریہ (Cisalpine Republic) اور جینوا (Geneva) اور شمال مغرب کے علاقوں کو ملا کر لیگورین جمہوریہ (Ligurian Republic) تشکیل دی۔ 1799 میں اس نے جنوبی اٹلی کے علاقوں جیسے نیپلز وغیرہ میں پارتھینوپین جمہوریہ (Parthenopean Republic) قائم کی۔ اس مہم سے اٹلی کے بیشتر حصوں پر آسٹریا کی بالادستی ختم ہوگئی اور فرانس کا اثر ورسوخ قائم ہو گیا، ساتھ ہی مستقبل میں اٹلی کے اتحاد کی راہ ہموار ہو گئی۔ آخر کار نپولین نے 17 اکتوبر 1797 کو آسٹریا کے ساتھ کیمپو فارمیو (Campo Formio) کے معاہدے پر دستخط کیے۔

اس معاہدے کے مطابق

- آسٹریا نے بیلجیم (Belgium) فرانس کے سپرد کر دیا۔
- لومبارڈی (Lombardi) پر فرانس کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔
- رائن (Rhine) کا علاقہ بھی فرانس کو دے دیا گیا۔
- وینس کے اریٹیریا (Eritrea) اور ڈالمیشیا (Dalmatia)، آسٹریا کو دے کر وینس کے مغربی حصے کو سسالپائن میں ضم کر کے فرانس کے ماتحت کر دیا گیا۔

11.3.1 مصری مہم (Egyptian Campaign)

یہ معاہدہ نپولین کی فوجی کامیابی کے ساتھ ساتھ اس کی عظیم سفارتی فتح بھی تھا۔ اس طرح ایک ہی مہم میں نپولین نے فرانس کی

سیاسی سرحدوں کو اس کی قدرتی حدود سے ملا دیا۔ اس سے نپولین فرانس میں بہت مقبول ہوا اور اسے قومی ہیرو کہا جانے لگا۔ فرانس کے خلاف بنائے گئے پہلے گروپ میں اب برطانیہ ہی باقی رہ گیا تھا، جسے یہ سمجھتے ہوئے کہ اسے براہ راست جنگ میں شکست دینا ممکن نہیں، نپولین نے مصر پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کا خیال تھا کہ مصر پر قبضہ کر کے وہ برطانیہ کی بحیرہ روم اور ایشیائی تجارت میں رکاوٹ ڈالے گا اور اس کی اقتصادی طاقت کو کمزور کر دے گا۔ فرانسیسی ڈائیرکٹر بھی نپولین کی مقبولیت سے خوفزدہ تھے اور اسے فرانس سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے مصری مہم کے لیے اس کا منصوبہ منظور کر لیا گیا۔ 19 مئی 1798 کو نپولین تقریباً چالیس ہزار فوجیوں کے ساتھ مصر روانہ ہوا۔ مالٹا(Malta) اور مصر کے مشہور شہر اسکندریہ (Alexandria) پر قبضہ کرنے کے بعد وہ قاہرہ (Cairo) پہنچا اور اہراموں کی جنگ(The Battle of the Pyramids) میں مملوک افواج پر فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ اس نے دریائے نیل کے ساحلی علاقوں پر مکمل تسلط حاصل کر لیا۔ اس مہم میں اس کے ساتھ بہت سے ماہرین ارضیات، ماہرین آثار قدیمہ، انجینئرس اور ڈاکٹرس بھی گئے تھے جنھوں نے مصر کی قدیم تہذیب و تمدن کا مطالعہ کیا اور کئی اہم دریافتیں کیں۔ مصر میں کیے گئے تحقیقی کام نپولین کے مستقل کاموں میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔

نپولین قاہرہ میں ہی تھا کہ برطانوی کمانڈر نیلسن (Nelson) نے خلیج ابو قیر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ لارڈ ویلزلی (Lord Wellesley) نے بھی نیلسن کی مدد کے لیے ہندوستان سے فوج بھیجی۔ اس طرح نپولین کے بحری بیڑے کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور اسے دریائے نیل کی جنگ (The Battle of the Nile) میں نیلسن کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی۔ نپولین نے ترکی کے ماتحت شام پر بھی حملہ کیا، لیکن وہاں بھی ناکام رہا۔ بیماری اور انگریزوں کے مسلسل تعاقب کی وجہ سے اس کی فوج ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ادھر یورپی حکمرانوں نے فرانس کے خلاف دوسرا دھڑا قائم کر لیا۔ آخر کار نپولین نے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک چھوٹے جہاز میں فرانس واپس جانے کا فیصلہ کیا۔

11.3.2 اٹھارہ بروما ئر کی بغاوت (Coup of the 18th Brumaire)

نپولین کی ابتدائی فوجی کامیابیاں، خاص طور پر اٹلی میں اس کی کامیابی نے اسے فرانس میں مقبول بنا دیا تھا۔ فرانس واپسی پر فرانسیسی عوام نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ اس وقت فرانس کے عوام ڈائرکٹری کی بدعنوان حکومت اور ملک میں پھیلی ہوئی افراتفری سے تنگ آ چکے تھے۔ اولوالعزم نپولین نے اقتدار پر قبضہ کرنے کا سنہرا موقع سمجھ کر ڈائریکٹری کے خلاف سازش کی۔ اس سازش میں اس نے اپنے ساتھ طالیراں(Talleyrand) ، فوشے (Fouché) سیئے (Sieyès) اور ڈیوک(Ducos) کو بھی شامل کر لیا۔ تین اہم ڈائریکٹروں سے جبراً استعفیٰ لے لیا گیا اور دو ڈائریکٹروں کو گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ سینئر قونصل کے زیادہ تر ارکان نپولین کے حامی تھے اور پانچ سو ارکان کی قونصل کا چیئرمین اس کا بھائی لوسیئن بوناپارٹ (Lucien Bonaparte) تھا۔ دونوں ایوانوں کے اجلاس میں نپولین نے اپنے سپاہیوں سے مخالفین کو ڈرا کر بورڈ آف ڈائریکٹرز کو ختم کرنے کی تجویز پاس کرائی۔ اس طرح، 10 نومبر 1799 کو، اٹھارہویں بروما ئر (18 Brumaire) کی آٹھویں فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار میں تبدیلی لائی گئی۔

11.3.3 1799 کا آئین (The Constitution of 1799)

ڈائرکٹری کے خاتمے کے بعد، اقتدار تین قونصلوں، نپولین، سیئے اور ڈوکو کے ہاتھ میں آگیا۔ نیا آئین بنانے کا کام قونصل کو سونپا گیا۔ 1799 کا آئین انقلاب فرانس کے بعد چوتھا آئین تھا۔ اس آئین کا خاکہ نپولین نے اس طرح تیار کیا تھا کہ تمام طاقت اس کے قبضے میں رہی۔ اس آئین نے فرانس کی ضروریات کو پورا کیا اور نپولین کی آمرانہ حکومت قائم کی۔ مجلس عاملہ (Executive) کے لیے تین ممبران پر مشتمل قونصلیٹ (Consulate) کا انتظام کیا گیا جس کی مدت دس سال رکھی گئی۔ ان میں سے قونصل اول (First Consul) کو کمیٹی کا چیئرمین بنایا گیا اور یہ عہدہ نپولین کو دیا گیا۔ حکمرانی کی ساری طاقت پہلے قونصل میں مرکوز تھی۔ قونصل دوم اور قونصل سوم کا کام صرف قونصل اول کو مشورہ دینا تھا۔ نپولین نے براہ راست سیئے اور ڈیوک کو ہٹا دیا اور اپنے حامیوں کیمبسری (Cambacérès) اور لبرون (Lebrun) کو قونصل دوم اور قونصل سوم مقرر کیا۔ اس کی وجہ سے ساری طاقت اس کے ہاتھ میں مرکوز ہو گئی۔ آئین میں چار ایوانوں پر مشتمل مجلس قانون ساز بھی تجویز کی گئی تھی۔

1. **ریاستی قونصل:** اس کا کام بل کا مسودہ تیار کرنا اور عدالت عالیہ کی طرح کام کرنا تھا۔
2. **سینیٹ:** یہ آئین کے تحفظ کے لیے ذمہ دار تھی۔
3. **ٹریبونیٹ:** بل پر بحث کر سکتی تھی، لیکن اسے منظور نہیں کر سکتی تھی۔
4. **مجلس قانون ساز یا اسمبلی:** یہ بل پر ووٹ دے سکتی تھی، لیکن اس پر بحث نہیں کر سکتی تھی۔

ان اسمبلیوں کے ممبران کا انتخاب بالواسطہ انتخابات کے ذریعے فہرستیں تیار کر کے کیا گیا۔ فہرستیں اس طرح تیار کی گئی تھیں کہ نپولین کی پسند کا شخص ہی ان کا ممبر ہو سکتا تھا۔ اس طرح جمہوریہ صرف ایک دکھاوا تھی جب کہ اصل اقتدار صرف نپولین کے ہاتھ میں تھا۔ چند سالوں کے بعد نپولین نے اس آئین پر عوامی استصواب رائے کرایا اور فرانس کے عوام نے بھاری اکثریت سے اس آئین کو قبول کر لیا۔

11.4 نپولین بطور قونصل اول (Napoleon as the First Consul)

فرانس میں موجود افراتفری کو دور کرنے کے لیے قونصل اول بننے کے بعد، نپولین نے متعدد اصلاحات کیں۔ اس کی انتظامی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے والی یہ اصلاحات اس کی مستقل کامیابیاں ثابت ہوئیں۔ فرانس کے داخلی نظام کو چست درست کرتے ہوئے ایک طرف تو اس نے انقلاب کے اصولوں کو استحکام بخشا اور دوسری طرف بوربون خاندان کے قائم کردہ روایتی نظام کو بھی ایک نئی شکل دے کر بحال کیا۔ اس کے ذریعہ کیے گئے کاموں نے فرانس میں جدید ریاست اور سماج کے اصولوں کو قائم کیا۔ تمام اصلاحات کے مرکز میں 'مساوات کے اصول' کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ لیکن انتظامیہ کی مرکزیت اور پریس پر پابندی وغیرہ کے ذریعے اس نے بوربون انتظامیہ کے کچھ انقلاب مخالف عناصر کو بھی اپنے طرز حکمرانی میں شامل کیا۔ اس کو یقین تھا کہ فرانسیسی عوام برابری چاہتی ہے، آزادی نہیں۔

11.4.1 انتظامی اصلاحات (Administrative Reforms)

نپولین نے قونصل اول کا عہدہ سنبھالتے ہی مقامی انتظامیہ کے پورے نظام کو مرکزی بنادیا۔ وہ اچھا منتظم تھا اس کے انتظامی تدبر کا ثبوت اس کے رویہ سے ملتا ہے جو اس نے کلیسا میں اختیار کیا۔ اس نے ملک کی انتظامی تقسیم کو جوں کا توں چھوڑ دیا۔ 1800 میں، اس نے قدیم نظام میں معمولی تبدیلیوں کے ساتھ قدیم نظام کے اعلیٰ افسران (Intendants) سے ملتے جلتے افسروں کا تقرر کر کے مرکزی حکومت قائم کی۔ اب مرکز نے ہر محکمے میں پریفیکٹس (Prefects)، اضلاع میں ڈپٹی پریفیکٹ (Deputy Prefects) اور شہروں اور کمیونز (Communes) میں میئر (Mayors) مقرر کرنا شروع کر دیے۔ یہ افسران مرکز کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے۔ مرکزی حکومت پالیسی طے کرتی تھی۔ ان کا کام مرکزی پالیسیوں کو پوری ریاست میں یکساں طور پر نافذ کرنا تھا۔ ان کی مدد کے لیے منتخب قونصلیں بھی قائم کی گئیں، جن کا کام اپنے علاقوں کے لیے قومی ٹیکسوں کا فیصلہ کرنا تھا۔ نپولین نے سیکرٹریٹ کو بھی ترقی دی اور برنارڈ مارے (Bernard Maret) کے تحت 'وزارت مملکت' (Secretariat of State) بنائی، جو ملک کا مرکزی دفتر حسابات بن گیا۔ فرانس میں مقامی انتظامیہ اور افسر شاہی کا یہ نظام کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اب بھی رائج ہے۔

11.4.2 پوپ کے ساتھ معاہدہ ('Concordat' with the Pope)

انقلابی حکومتوں نے کلیسا کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن فرانس میں آبادی کی اکثریت کیتھولک اور قدامت پسند تھی۔ بادشاہت پسندوں کے ساتھ مل کر مذہبی مخالفین حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرتے تھے۔ مذہب کے حوالے سے نپولین کی واضح رائے تھی کہ فرانس میں ایک ہی مذہب ہونا چاہیے جو ریاست کے کنڑول میں رہے۔ اس تناظر اور اس وقت کے حالات کے پیش نظر اس نے اپنی مذہبی پالیسی کا تعین کیا اور پوپ کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کی سفارتی کوششیں کیں۔ پوپ بھی فرانس جیسے اہم ملک کو اپنے دائرہ اثر سے دور نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ 1801 میں، نپولین نے پوپ پائس ہفتم (Pius-VII) کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، جسے *Concordat* کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق۔

1. کیتھولک مذہب کو فرانسیسی عوام کی اکثریت کا مذہب تسلیم کیا گیا تھا، ساتھ ہی فرانس کے تمام شہریوں کو مذہبی آزادی فراہم کی گئی۔
2. کلیسا کو ریاست کا ماتحت مانا گیا اور کلیسائی افسران ریاست کے ملازم تصور کیے گئے۔
3. کلیسا کے بشپوں کو مقرر کرنے کا حق قونصل اول کو ملا، پوپ کو صرف رسمی منظوری کا حق دیا گیا۔ بشپ حکومت کی اجازت سے پادریوں کا تقرر کر سکتے تھے۔
4. ریاست بشپ اور پادریوں کو تنخواہ دیتی تھی اور انہیں حب الوطنی کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔
5. انقلاب کے دوران ضبط کی گئی کلیسا کی زمینیں واپس نہیں کی گئیں اور کلیسا کو مستقل جائیداد خریدنے کا حق بھی نہیں دیا گیا۔
6. تعلیم پر کلیسا کا کنڑول ختم کر دیا گیا۔
7. انقلاب کے دوران قید ہونے والے پادریوں کو آزاد کیا گیا اور وہ جو فرانس چھوڑ کر چلے گئے تھے، انہیں دوبارہ آنے کی اجازت دے

دی گئی۔

اس طرح اس معاہدے سے نپولین نے ان سبھی باتوں کو پوپ سے قبول کرالیا جن کی ابتدا میں پوپ نے مخالفت کی تھی۔ لیکن فرانس کے انتہا پسند اور کیتھولک دونوں اس معاہدے سے مطمئن نہیں تھے۔ کیتھولکوں کی خواہش کے مطابق کلیسا کو اپنی سابقہ اہمیت دوبارہ حاصل نہیں ہوئی۔ دوسری طرف، انقلابی نظریات کے برعکس، کیتھولک مذہب نہ چاہتے ہوئے بھی فرانس کا ریاستی مذہب بنادیا گیا۔ پوپ اور نپولین کے تعلقات بھی زیادہ دیر تک اچھے نہ رہ سکے۔ نپولین نے پروٹسٹنٹوں کے حقوق واضح کرنے کے لیے منشور(Charter)جاری کیا اور فرانس میں سیکولر ریاست کی بنیاد ڈالی۔ 1804 میں اپنی تاجپوشی کے دوران، اس نے پوپ سے تاج قبول کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ سے لے کر اور اسے اپنے ہاتھوں سے پہن کر پوپ کی توہین کی۔ جب پوپ پائس ہفتم نے براعظمی منصوبے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو نپولین نے پوپ کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ اس پر ناراض ہو کر پوپ نے نپولین کو بدعتی قرار دے دیا۔ نپولین نے جوابی کاروائی کرتے ہوئے پوپ کو قید کر دیا۔ اس کی وجہ سے فرانس اور یورپ کے کیتھولک اس سے ناراض ہو گئے۔ اس کے باوجود، کنکورڈاٹ معاہدہ اگلی ایک صدی تک جاری رہا اور کلیسا اور ریاست کے درمیان اتحاد قائم رہا۔

11.4.3 قانونی اصلاحات (Legal Reforms)

نپولین کا سب سے زیادہ پائیدار کام شہری قوانین(Civil Laws)کی تدوین تھا۔ اس نے قانونی میدان میں پائے جانے والے تضادات کو دور کرنے اور یکسانیت قائم کرنے پر زور دیا۔ اس کے لیے اس نے چار ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کا تیار کردہ قانونی ضابطہ نپولینی قانون(Napoleonic Code) کہلاتا ہے۔ اس میں پانچ قسم کے قوانین مرتب کیے گئے۔

- شہری قوانین (Civil Code)
- سول طریقہ کار ضابطہ (Code of Civil Procedure)
- ضابطہ تعزیرات (Penal Code)
- ضابطہ فوجداری (Code of Criminal Procedure)
- کاروباری قانون (Commercial Code)

یہ قوانین تین ذرائع سے مرتب کیے گئے تھے: فرانسیسی روایتی قانون، رومی قانون اور انقلاب کے تجربات۔ 1804 میں بنے اس کے شہری قوانین یا سول کوڈ، قوانین میں سب سے زیادہ بااثر تھا۔ اس میں مساوات کے اصول کو قبول کیا گیا، آزادی کی حد بندی کی گئی اور مراعات اور جاگیردارانہ اصولوں کو ختم کر دیا گیا۔ سول کوڈ کے مطابق خاندان کو ایک مقدس اکائی تصور کیا گیا اور اس میں باپ کو اعلیٰ تصور کیا گیا۔ آبائی جائیداد پر تمام بیٹوں کا مساوی حق سمجھا گیا۔ ضابطہ بند شادی اور طلاق کو قبول کر لیا گیا لیکن عورتوں کو مکمل طور پر اپنے شوہروں کے ماتحت کر دیا گیا۔ نجی ملکیت کے اصول کو تسلیم کیا گیا اور زمین پر مالک کے حقوق کو مضبوط کیا گیا۔ شرح سود مقرر کر دی گئی۔ جائیداد حاصل

کرنے کا حق حکومت کے لیے محفوظ رکھا گیا۔ صنعتی گروہ اور مذہبی ادارے جائیدادیں جمع نہیں کر سکتے تھے۔ سول کوڈ کے علاوہ، دوسرے عائد کردہ قوانین، مطلق العنانیت کے نظریے سے متاثر تھے۔ ضابطہ تعزیرات میں سیاسی جرائم کی روک تھام کے لیے سزائے موت، عمر قید، جلاوطنی، جائیداد کی ضبطی جیسے قوانین وضع کیے گئے۔ فوجداری مقدمات میں جیوری کا نظام ختم کر دیا گیا۔ کاروباری قانون، عام کاروبار، بحری تجارت، دیوالیہ پن اور دیگر کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ نپولین کا قانون، فرانس کے جدید قوانین کا ماخذ ہے۔ نپولین نے اس کی تشکیل میں ذاتی دلچسپی ظاہر کی تھی اور صرف اس کی خواہش پر یہ بنایا جا سکا تھا۔ اسی وجہ سے اسے دوسرا جسٹینین بھی کہا جاتا ہے۔

11.4.4 تعلیمی اصلاحات (Educational Reforms)

نپولین نے تعلیم کو ریاست کی ترقی اور انتظامی نظام کو ہموار کرنے کا بنیادی ذریعہ سمجھا۔ اس نے تعلیم کی ترقی کے لیے ایک قومی تعلیمی پالیسی بنائی، جس کے ذریعے تعلیم پر ریاستی کنٹرول نافذ کیا گیا اور اسے قومی اور سیکولر بنایا گیا۔ اس نئی تعلیم کی بنیاد عیسائیت کی بنیادی اخلاقیات، سربراہ مملکت سے عقیدت اور یونیورسٹی کے بنیادی اصولوں کی پابندی تھی۔ نپولین نے تعلیم کو تین درجوں میں تقسیم کیا۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم۔ ہر شہر میں پرائمری اور سیکنڈری سکول قائم کیے گئے۔ تعلیم کا کام پریفیکٹس اور نائب پریفیکٹس کی نگرانی میں سونپا گیا۔ نظم وضبط اور فوجی تعلیم پر زیادہ توجہ دی گئی۔ ثانوی سطح پر، لیسے (Lycée) نامی حربی اسکول قائم کیے گئے۔ پیرس یونیورسٹی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے دوبارہ منظم کیا گیا۔ یونیورسٹی پر حکومت کا مکمل کنٹرول مسلط کر دیا گیا۔ نپولین نے خود پیرس یونیورسٹی کے سر کردہ اساتذہ اور حکام کا تقرر کیا۔ یونیورسٹیوں کو خود مختار ادارے کی بجائے محکمہ تعلیم کا حصہ بنایا گیا۔ یونیورسٹی کے سرٹیفکیٹ کے بغیر کسی کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ نیا اسکول کھولے یا عوامی سطح پر تعلیم دے۔ اساتذہ کی تربیت کے لیے عام اسکول کھولے گئے۔ نپولین نے پیادہ فوج کے لیے سینٹ سیر آفیسرس اسکول (Saint Cyr Officers' School) اور فنی تعلیم کے لیے ایکول پولی ٹیکنیک (École Polytechnique) قائم کیا۔ غریب اور ہونہار طلبہ کے لیے وظیفے کا بھی انتظام کیا گیا۔ نپولین نے خواتین کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ان کے لیے صرف پرائمری کی سطح تک تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا، جسے مذہبی اداروں کے اختیار میں رکھا گیا۔

11.4.5 معاشی اصلاحات (Economic Reforms)

قونصل اول بننے کے بعد، نپولین نے معاشی حالات کی اصلاح کی متعدد کوششیں کیں۔ معاشی نظام میں حکومتی کنٹرول اور نظام زر کی ترقی کے لیے نپولین نے بینکر کلاؤڈے پیریر (Claude Perier) کی مدد سے 1800 میں بینک آف فرانس قائم کیا۔ پرائیویٹ بینک ہونے کے باوجود اسے نوٹ جاری کرنے کی سرکاری اجارہ داری دی گئی۔ اس کے علاوہ اس بینک سے قرضہ حاصل کرنے کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ بینک نے فرانس کی کرنسی کی حیثیت کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ نپیولین نے زراعت کی ترقی کے لیے بنجر اور ریتلی علاقوں کو زرخیز بنانے کی کوششیں کیں اور نہروں کا نظام بہتر کیا گیا۔ لیکن زمین کی بحالی اور پیداوار کی ترقی کے لیے کوئی بنیادی اصلاحات نہیں کی گئیں۔

محصولات اور ٹیکسوں کی وصولی مرکزی حکومت کے تحت رکھی گئی۔ اس سے ٹیکس دہندگان اور حکومت دونوں کو فائدہ ہوا۔ ٹیکسوں کا تعین فرد کی معاشی حیثیت کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔

نپولین نے صنعتی شعبے کو مشینی بنانے کے بجائے پرانے نظام کو برقرار رکھا۔ وہ صنعتی انقلاب کی اہمیت کو نہ سمجھ سکا۔ فرانس کے کارخانے پرانے طریقے سے چلتے رہے۔ اگرچہ اونی صنعت، لوہے کی تیاری، نیل، چقندر سے چینی اور سوڈا بنانے کے طریقے میں بہتری آئی۔ تاہم نئی ٹیکنالوجی کے استعمال اور مشینوں کو فروغ نہ دینے کی وجہ سے فرانس اعلیٰ معیار کی اشیاء تیار نہیں کرسکا۔ اس نے مزدور یونینوں کو غیر قانونی قرار دیا اور مزدوروں پر سخت ریاستی کنٹرول قائم کیا۔ حالانکہ اس نے مزدوروں اور کسانوں کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کا خاص خیال رکھا۔ اس نے اناج کی برآمد پر پابندی لگادی اور روٹی کی قیمت مقرر کردی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ اس کی جنگوں پر ہونے والے اخراجات، ریاست کی آمدنی پر دباؤ نہ ڈالیں، اس نے مفتوحہ علاقوں سے جنگی اخراجات کی وصولی بھی کی۔ مفتوحہ علاقوں سے ملنے والی رقم ایک علیحدہ خزانے، ڈومین ایکسٹرااورڈنیر (Domain Extraordinaire) میں جمع کیا گیا تھا، جس کا استعمال جرنیلوں کو انعامات دینے کے ساتھ ساتھ جنگ سے متعلقہ ضروری اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ آزاد تجارت کے اصول کے برعکس نپولین تجارت پر مکمل ریاستی کنٹرول چاہتا تھا۔ اس کے مطابق خزینے پر کنٹرول اور تجارت میں توازن کے لیے ریاستی مداخلت ضروری ہے۔ اس نے قدیم نظام کے مطابق کچھ تجارتی زمرے قائم کیے۔ نپولین کا آزادانہ تجارت، صنعت کاری، نئی ٹیکنالوجی کے استعمال وغیرہ کو نظرانداز کرنا اور پرانی تحفظاتی پالیسی کو اپنانا حالات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس وجہ سے آزاد خیال متوسط طبقہ اور سرمایہ دار اس سے ناراض ہو گئے اور فرانس سرمایہ داری اور صنعتی ترقی میں برطانیہ سے پچھڑتا چلا گیا۔

11.4.6 ثقافتی اور رفاہی امور (Cultural and Welfare Works)

نپولین نے تقریباً 229 اچھی سڑکیں بنوائی تھیں۔ 30 سڑکیں پیرس (Paris) کو فرانس کے بڑے شہروں سے جوڑتی تھیں۔ دریاؤں پر پل بنائے گئے اور نہریں بنائی گئیں۔ دریائے سین (Seine) پر مضبوط پل بنایا گیا۔ پیرس کی دوبارہ تعمیر ہوئی اور اسے ایک خوبصورت اور عظیم الشان شہر کے طور پر قائم کیا گیا۔ پیرس کو سجانے کے لیے نپولین خود اٹلی اور مصر سے فن پارے لایا تھا۔ پیرس میں ہی عظیم لامیڈلین (La Madeleine) گرجاگھر بنایا گیا تھا۔ تماشاگاہیں، عجائب گھر اور بے گھر افراد کے لیے رہائش گاہیں تعمیر کی گئیں۔ پرانے شاہی محلات، ٹوئلری (Tuileries) اور فونتینبلو (Fontainebleau) کی دوبارہ تزئین و آرائش کی گئی۔ جوزفین کے لیے مالمیزون (Malmaison) نام کا ایک خوبصورت محل بنایا گیا تھا۔ عمارتوں اور فرنیچر کی تیاری میں ایک نیا انداز ابھر کر سامنے آیا، جسے طرز شاہی (Empire Style) کہا جاتا ہے۔ نپولین نے تعلیم اور ثقافت کی ترقی کے لیے عوامی لائبریریاں بھی قائم کیں۔ طولوں (Toulon) اور شیر بروک (Sherbrooke) بندرگاہوں کو بھی ترقی دی گئی۔ نپولین کے زمانے میں ممتاز مصور جیک لوئی ڈیوڈ (Jacques-Louis David) اور موریس اورنج (Maurice Orange) نے نپولین کی جنگوں کی خوبصورت تصاویر کے ذریعے اسے عظیم بنانے کی کوشش کی۔ نپولین نے بہت سی پابندیاں لگا کر ادب اور صحافت کی فطری ترقی کو روک دیا تھا۔ نتیجتاً فرانس میں

ادب کی زیادہ ترقی نہیں ہو سکی۔ اُس وقت کے ممتاز فرانسیسی ادیب شاتو بریاں ور مادام جرمائن ڈی سٹایل(Germaine de Staël) اس کے مخالف تھے۔ نپولین نے روایتی اشرافیہ کی اہمیت کو کم کرنے اور عام لوگوں اور ملازمین میں ملک کے تئیں عقیدت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیےایک لیجین آف آنر(Legion of Honour) قائم کیا،اس طرح مختلف شعبوں میں کامیابیوں کے لیے لوگوں کو نواز کر ایک نئ اشرافیہ کی تخلیق کی۔

11.5 قونصل اول کی خارجہ پالیسی (Foreign Policy of the First Consul)

فرانس میں آئین بنانے اور اندرونی خطے میں امن قائم کرنے کے بعد نپولین بوناپارٹ نے فرانس کے خلاف بننے والے دوسرے دھڑے کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ جب نپولین مصری مہم میں مصروف تھا۔تب ہی یورپی ممالک نے فرانس کے خلاف دوسرا گروپ قائم کیا۔اس گروپ میں آسٹریا، برطانیہ، روس، ترکی، نیپلز اور پرتگال جیسے ممالک شامل تھے۔ یہ گروہ فرانس کی سرحدوں کے لیے مستقل خطرہ بنتا جارہا تھا۔اس لیےاس نے جلدی سے دوسرے گروہ کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنایا۔

11.5.1 آسٹریاکے ساتھ جنگ (War with Austria)

آسٹریا نے اٹلی پر قبضہ کر کے اپنی پہلی مہم کی کامیابیوں کو تباہ کر دیا تھا۔اس لیے نپولین نے سب سے پہلے آسٹریا پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔اس نے خود جنوب مغرب میں اٹلی سے آسٹریا پر حملہ کیااور شمال مغرب میں رائن کے علاقے سے اپنے جرنیل بھیجے۔ مورینگو (Marengo)اور ہوہن لنڈن (Hohenlinden) کی مشہور لڑائیوں میں فرانسیسی فوج نے کامیابی حاصل کی اور آسٹریا کو دوبارہ صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ 1801 میں، آسٹریااور فرانس کے درمیان معاہدہ لون ول(Treaty of Lunéville)پر دستخط ہوئے، جس میں کیمپو فورمیو کی شرائط کو دہرایا گیا۔فرانس نے بیلجیئم اور دریائے رائن کے بائیں کنارے پر دوبارہ اقتدار حاصل کر لیااور خود نیپولین،اٹلی کی سیسالپائن، بتیوین(Batavian)اور ہیلویٹک(Helvetic)جمہوریاؤں کا صدر بن گیا۔1800 میں روس آسٹریا سے ناراض ہو گیا اور دوسرے گروپ سے الگ ہو گیا۔ 1801 میں نپولین نے آسٹریا کے ساتھ معاہدہ کیا۔اس کے بعد نیپلز نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔روس نے سویڈن(Sweden)، پرشیا(Prussia)اور ڈنمارک(Denmark) کے ساتھ مل کر مسلح غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی جس کا مقصد برطانیہ کو فرانسیسی سامان کے لیے غیر جانبدار ممالک کے جہازوں کی تلاشی لینے سے روکنا تھا۔اسپین نے فرانس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر کے اسے امریکہ میں لوئی یانا(Luciana) دے دیا۔ 1801 تک برطانیہ فرانس کا واحد دشمن تھا جو دوسرے گروپ میں رہ گیا تھا۔

11.5.2 برطانیہ کے ساتھ معاہدہ (Treaty with Britain)

تقریباًدس سال سے فرانس کی برطانیہ کے ساتھ جنگ جاری تھی۔ دونوں ہی ملک امن چاہتے تھے۔ نپولین سمجھ چکا تھا کہ طاقتور بحریہ کے بغیر برطانیہ کو شکست دینا ممکن نہیں۔اس کے علاوہ وہ فرانس کی داخلی پالیسی میں بھی اصلاحات لانا چاہتا تھا۔دوسری جانب برطانیہ

نے بھی بڑھتے ہوئے قومی قرضوں اور عوامی عدم اطمینان کے باعث سمجھوتہ کا موقف اپنایا۔ نتیجتاً 1802ء میں دونوں ملکوں نے معاہدہ امیہ (Treaty of Amiens) پر دستخط کئے۔ اس معاہدے کے مطابق برطانیہ نے فرانس کی قونصلیٹ حکومت کو تسلیم کر لیا اور سری لنکا (Cylon) اور ترینداد (Trinidad) کے علاوہ فرانس کی مفتوحہ نوآبادیوں کو واپس کر دیا۔ فرانس نے پوپ کے علاقوں اور نیپلز سے اپنی افواج کو واپس بلا لیا۔ فرانس نے ایونیائی جزائر (Ionian Islands) کی آزادی اور پرتگال کی سالمیت کو قبول کر لیا۔ مصر، ترکی کو واپس کر دیا گیا۔ یہ معاہدہ مستقل ثابت نہیں ہوا، یہ محض دونوں ملکوں کے درمیان جنگ بندی تھی۔ 1803 میں ان کے درمیان دوبارہ جنگ چھڑ گئی جس نے 1806 میں یورپی جنگ کی شکل اختیار کر لی۔

11.5.3 فرانسیسی نوآبادیات (The French Colonies)

نپولین، یورپ میں اپنی سرحدیں پھیلانے کے ساتھ ساتھ فرانس کے لیے ایک نوآبادیاتی ریاست قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسپین سے لوئی یانا کا علاقہ حاصل کیا۔ فرانسیسی گیانا (French Guiana) کو دریائے امیزن تک پھیلا دیا۔ سینٹ ڈومینگو (ویسٹ انڈیز میں ہیتی) کو بھی فتح کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ہندوستانی ریاستوں پر اثر و رسوخ قائم کرنے کی بھی کوشش کی لیکن برطانیہ کی مخالفت کی وجہ سے وہ نوآبادیاتی توسیع میں زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا۔

11.6 شہنشاہ نپولین اول (Emperor Napoleon-I, 1804–1814)

نپولین بہت اولوالعزم تھا۔ 1802 میں، اس نے ایک استصواب رائے کروایا اور اس میں کامیابی کے بعد خود کو تاحیات قونصل اول مقرر کر لیا۔ 1804 میں دوبارہ عوامی رائے شماری کروا کر فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ اس کی تاج پوشی 2 دسمبر 1804 کو پیرس کے مشہور کلیسا نوٹرڈیم (Notre-Dame) میں ہوئی جس میں یورپ بھر سے حکمرانوں اور معززین نے شرکت کی۔ اس نے پوپ کے ہاتھ سے شاہی تاج لیا اور خود پہن لیا۔ فرانس میں نپولین کی مطلق العنان حکمرانی قائم ہوئی۔ شہنشاہ بننے کے بعد، اس نے یورپ پر ایک ہمہ گیر سلطنت قائم کرنے کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ اس کے شہنشاہ بننے کے بعد کے دس سال کی تاریخ مسلسل جنگوں کی تاریخ ہے۔ نپولین کی سامراجی پالیسی کے خلاف برطانیہ کی قیادت میں یورپی ممالک کا گروپ قائم کیا۔ اس گروپ میں برطانیہ، آسٹریا، روس اور سویڈن شامل تھے اور اس کا مقصد فرانس کو اس کی اصل حدود میں رکھنا تھا۔ اس گروپ کو فرانس کے خلاف یورپی ممالک کا تیسرا گروپ کہا جاتا تھا۔ نپولین نے 20 اکتوبر 1805 کو آسٹریا پر حملہ کر کے اور اُلم کی جنگ (Battle of Ulm) میں اسے شکست دے کر اس گروہ کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کیا۔ پھر برطانیہ کو سمندری جنگ میں شکست دینے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

11.6.1 برطانیہ کے ساتھ جنگ (War with Britain)

نپولین کے سامراجی منصوبوں کو سب سے بڑی چنوتی دینے والا اس کا معروف دشمن برطانیہ تھا۔ برطانیہ کی تجارتی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے نپولین نے ہینوور (Hanover) پر قبضہ کر لیا تھا اور جرمنی کی بندرگاہوں کو برطانیہ کے لیے بند کر دیا تھا۔ دوسری طرف

برطانوی وزیر اعظم پٹ(Pitt)،فرانس کے خلاف گروہ بندی میں مصروف تھا۔ نتیجتاً 21اکتوبر 1805 کو دونوں ملکوں کے درمیان مشہور زمانہ جنگ ٹرافلگار (The Battle of Trafalgar)ہوئی۔ اس جنگ میں نپولین نے چارلس ولینو (Charles Villeneuve)کو فرانسیسی بحریہ کی کمان سونپی۔ برطانوی امیر البحر نیلسن تھا۔ نیلسن کی قابل قیادت میں برطانوی فوج نے فرانس اور اسپین کے مشترکہ بحری بیڑے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ نیلسن جنگ میں مارا گیا لیکن برطانیہ کی بحری برتری مسلم ہوگئی۔اس کے بعد نپولین نے کبھی برطانیہ کے خلاف براہ راست جنگ نہیں لڑی۔

11.6.2 آسٹریا پر حملہ (Invasion of Austria)

ٹرافلگار کی جنگ میں شکست کے فوراً بعد نپولین نے آسٹریا پر حملہ کیا۔2دسمبر 1805 کو آسٹریا اور روس کی مشترکہ افواج کے ساتھ آسٹرلس کی جنگ(Battle of Austerlitz) میں نپولین کا ٹکراؤ ہوا۔اسے تین شہنشاہوں کی جنگ بھی کہتے ہیں۔اس جنگ میں نپولین نے بھرپور عسکری صلاحیت کا ثبوت دیا اور اپنی زندگی کی سب سے بڑی فتح حاصل کی۔اس کے خلاف بننے والا تیسرا گروہ ٹوٹ گیا۔ آسٹریا کو 25دسمبر 1805 کو پریسبرگ کے معاہدہ(Treaty of Pressburg)پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا، جس کے مطابق

- آسٹریا کو وینس،اسٹریا اور ڈالمیشیا(Dalmatia)کے علاقے اٹلی کی ریاست کو دینے پڑے اور نپولین کو اٹلی کا بادشاہ ماننا پڑا۔
- فرانس کے اتحادی بویریا(Bavaria)اور ورٹمبرگ(Württemberg) کو آزاد ریاستوں کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ آسٹریا کو ٹائرول(Tyrol)کا علاقہ بویریا اور مغرب کے کچھ علاقے ورٹمبرگ کو دینے پڑے۔
- باڈن(Baden)کو گرینڈ ڈچی بنادیا گیا اور اسے آسٹریا کے مغرب سے کچھ علاقے بھی دلوائے گئے۔

یہ معاہدہ نپولین کی عظیم فتح تھی۔اس معاہدے سے آسٹریا کا وقار مجروح ہوا۔ تقریباً تیس لاکھ کی آبادی والے علاقے آسٹریا سے چھین لیے گئے اور رائن،اٹلی اور سوئٹزرلینڈ سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا۔

11.6.3 وسطی یورپ کی تنظیم نو (Reorganisation of Central Europe)

نپولین کے ہاتھوں آسٹریا کی شکست اور پریس برگ کے معاہدے کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ نپولین بادشاہ گر بن گیا۔اس نے جولائی 1806 میں جرمنی کی ازسر نو تعمیر کی ور بویریا، ورٹمبرگ اور 14دیگر جرمن ریاستوں کو ملا کر رائن وفاق (Confederation of the Rhine) تشکیل دیا۔ جرمنی کی کئی چھوٹی ریاستیں ختم کر کے اس نے رائن وفاق میں ضم کر دی گئیں۔ نپولین کو اس وفاق کا سرپرست تسلیم کیا گیا۔اس طرح اس نے آسٹریا اور پرشیا کی سرحد پر ایک بڑی ریاست قائم کر دی۔اس کے بعد 6اگست 1806 کو نپولین نے مقدس رومی شہنشاہ کا عہدہ ختم کر دیا۔ مقدس رومی شہنشاہ فرانسس اب صرف آسٹریا کا شہنشاہ رہ گیا تھا۔پریسبرگ کے معاہدے سے اٹلی میں بھی آسٹریا کا اثر ورسوخ ختم ہو گیا۔ نپولین نے نیپلز میں بورژوا حکمران کو ہٹا کر فروری 1806 میں جوزف بوناپارٹ کو حکمران مقرر کیا۔ہالینڈ میں بھی اس نے جون 1806 میں لوئی بوناپارٹ کو حکمران مقرر کیا۔اس طرح فرانس کے چاروں طرف ماتحت ریاستوں کا دائرہ بنا کر نپولین

نے اپنے رشتہ داروں کو ان ریاستوں کا حکمراں بنادیا۔

11.6.4 پرشیا کی شکست (Defeat of Prussia)

پرشیا کا شہنشاہ فریڈرک ولیم سوم نپولین کے خلاف دھڑے میں شامل نہیں ہوا کیونکہ وہ 1795 میں ہونے والے معاہدہ باسل (Treaty of Basel) کے بعد سے غیر جانبدار رہا تھا۔ پرشیا نے پریسبرگ کے معاہدے کے ذریعے جرمنی میں نپولین کی مداخلت سے ناراض ہو کر جنگ کا اعلان کر دیا۔ 14 اکتوبر 1806 کو نپولین نے پرشیا کو جینا (Jena) اور آوراسٹیٹ (Auerstedt) کی جنگ میں بری طرح شکست دی۔ پرشیا کے شہنشاہ نے روس میں پناہ لی۔ اس لیے نپولین نے فوراً روس پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد، پرشیا کو 1807 میں تلسیت (Tilsit) کے معاہدے کے ذریعے بہت سے علاقوں کو اس سے الگ کر کے سزا دی گئی۔ پرشیا کے مغربی صوبوں سے ویسٹ فیلیا ریاست (Kingdom of Westphalia) بنا کر نپولین نے اپنے بھائی جیروم بوناپارٹ (Jérôme Bonaparte) کو حکمران بنایا۔ پرشیا کے مشرقی صوبوں سے ایک نئی ریاست، ڈچی آف وارسا (Duchy of Warsaw)، قائم کر کے ڈیوک آف سیکسنی کو دی گئی۔ پرشیا کو معاوضے کے طور پر کافی رقم ادا کرنی پڑی اور اس کی فوج کو 22 ہزار تک کم کر دیا گیا۔ اس طرح اس معاہدے سے پرشیا کی بہت توہین ہوئی اور اس کی سلطنت نصف رہ گئی۔

11.6.5 روس کے ساتھ تعلقات (Relations with Russia)

فروری 1807 میں، نپولین نے ایلو کی جنگ (Battle of Eylau) میں روس کے ساتھ ایک خونریز جنگ لڑی۔ نپولین کی زندگی کی سب سے خونریز لڑائیوں میں سے ایک ہونے کے باوجود، یہ جنگ بے نتیجہ رہی۔ 14 جون 1807 میں ایک بار پھر، فرائڈ لینڈ کی جنگ (Battle of Friedland) میں روس کو شکست ہوئی۔ روس کو تلسیت (Tilsit) کے معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا۔ 7 جولائی 1807 کو ہونے والے اس معاہدے کے ذریعے نپولین نے سفارت کاری کے ذریعے روس کو اپنا دوست بنایا۔ معاہدہ تلسیت کی اہم شقیں تھیں۔

1. دونوں ممالک نے یورپ کو اپنے اپنے دائرہ اثر میں تقسیم کر لیا۔ مغربی اور وسطی یورپ میں نپولین اور مشرقی یورپ میں زار اسکندر کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی ملی۔
2. روس نے ہالینڈ، اٹلی اور جرمنی میں نپولین کی طرف سے کی گئی تبدیلیوں کو تسلیم کیا۔
3. یہ خفیہ طور پر طے پایا کہ روس برطانیہ اور فرانس کے درمیان معاہدہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اگر برطانیہ راضی نہ ہوا تو روس، برطانیہ کے خلاف نپولین کی تجارتی جنگ میں نپولین کا ساتھ دے گا۔
4. اسی طرح فرانس ترکی میں ثالثی کرے گا اور اگر ترکی فرانس کی ثالثی کو مسترد کرتا ہے تو روس اور فرانس ترکی کو آپس میں تقسیم کر لیں گے۔
5. نپولین نے زار کی درخواست کو قبول کر کے ریاست پرشیا کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا۔

تاہم اس معاہدے سے پرشیا ٹوٹ گیا تھا۔ تلسیت کا معاہدہ نپولین کی زندگی کا عروج تھا۔ اس کی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ 1805 اور 1807 کی فاتحانہ مہمات، نپولین کی ماہرانہ فوجی قیادت کے کامیاب ترین ابواب تھے۔ اب برطانیہ کے علاوہ تقریباً پورا یورپ اس کے زیر تسلط تھا۔

11.7 نپولین کے زوال کے اسباب (Causes for the Fall of Napoleon)

نپولین اپنی فتوحات اور کامیابیوں کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ 1807 عیسوی کے بعد اس کی جنگوں اور اقدامات نے اسے اپنے زوال کے قریب پہنچا دیا۔ نپولین نے خود بعض واقعات کو اپنے زوال کا سبب تسلیم کیا۔ اس نے پوپ کے ساتھ تعلقات، اسپین کی غیر اخلاقی فتح، روسی مہم اور برطانیہ کے خلاف براعظمی منصوبے کو اپنے زوال کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

11.7.1 براعظمی منصوبہ (The Continental Plan)

1812 کے معاہدہ ٹلسیٹ کے بعد برطانیہ ہی واحد غیر مفتوحہ ملک تھا جسے شکست دیے بغیر یورپ پر غلبہ حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ برطانیہ جغرافیائی طور پر ہر طرف سے سمندر میں گھرا ہوا تھا اور اس کا بحری بیڑہ بھی دنیا کا بہترین بیڑہ تھا۔ ٹرافلگار کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد نپولین سمجھ گیا تھا کہ سمندری جنگ میں برطانیہ کو شکست دینا ناممکن ہے۔ نپولین کا خیال تھا کہ برطانیہ کی تجارت اور کاروبار کو روک کر اسے شکست تسلیم کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ لہذا، برطانیہ کی معیشت کو نقصان پہنچانے کے مقصد سے، اس نے براعظمی منصوبہ بنایا۔ اس کے ذریعے برطانیہ کی تجارت پر پابندی لگا کر اس کی اقتصادی ناکہ بندی کی جانی تھی۔ یہ کوئی نیا نظام نہیں تھا، کیونکہ برطانیہ کے خلاف اقتصادی ناکہ بندی کی پالیسی آئینی قونصل اور ڈائرکٹری کے زمانے میں بھی طے ہو چکی تھی۔ نپولین نے اسے بڑے پیمانے پر نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے برطانیہ کا معاشی طور پر بائیکاٹ کرنے کے لیے بہت سے فرامین اور احکامات جاری کر کے یورپی ممالک پر ان کی پیروی کے لیے دباؤ ڈالا۔ اس پالیسی کو نپولین نے چار اعلانات کے ذریعے نافذ کیا تھا۔

برلن فرمان: 21 نومبر 1806 کو نپولین نے برلن میں براعظمی نظام کا اعلان کر کے اسے نافذ کیا۔ اس میں اس نے حکم جاری کیا کہ برطانوی جزائر کے خلاف اقتصادی ناکہ بندی شروع کر دی جائے۔ کوئی برطانوی جہاز کسی یورپی بندرگاہ پر نہیں آسکتا تھا۔ اگر کوئی برطانوی جہاز فرانس یا نپولین کی دوست ریاستوں کی طرف آتا ہے تو اسے اس کے سامان سمیت ضبط کر لیا جائے۔

وارسا فرمان: 25 جنوری 1807 کو نپولین نے وارسا فرمان کے ذریعے پرشیا اور ہینوور کے ساحلوں پر برطانوی تجارت پر پابندی لگا دی۔

ملان فرمان: 17 دسمبر 1807 کو نپولین نے ملان کا حکم نامہ جاری کیا۔ اس کے مطابق یہ اعلان کیا گیا کہ برطانوی بندرگاہوں میں پہنچنے والے یا تلاشی دینے والے بحری جہازوں کو ضبط کر لیا جائے گا، چاہے وہ جہاز کسی غیر جانبدار ملک کا ہی کیوں نہ ہو۔

فونٹیبلو فرمان: 18 اکتوبر 1810 کو نپولین نے سب سے سخت حکم جاری کیا۔ ان احکامات میں کہا گیا کہ ضبط شدہ انگریزی سامان کو جلا دیا جائے۔ اس کے علاوہ غیر قانونی کاروبار کرنے والوں کے لیے سخت سزا اور علیحدہ عدالت قائم کی گئی۔

11.7.2 برطانیہ کا ردعمل (The British Response)

نپولین کے براعظمی منصوبے کے جواب میں، برطانیہ نے جنوری 1807 میں آرڈران قونصل کے نام سے ایک قانون جاری کیا، جس کے مطابق فرانس یا اس کے اتحادیوں کے ساتھ تجارت کرنے والے جہاز ضبط کر لیے جائیں گے۔ غیر جانبدار ممالک کے جہازوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا کہ وہ یورپ کی کسی بھی بندرگاہ پر جانے سے پہلے برطانیہ کی بندرگاہوں کا دورہ کریں، برطانیہ کے ساتھ تجارت کریں اور لائسنس حاصل کریں۔ براعظمی نظام کو کامیاب بنانے کے لیے نپولین کو سمجھوتہ اور جنگ دونوں کا سہارا لینا پڑا۔ روس کے ساتھ معاہدہ کر کے پرشیا اور آسٹریا پر دباؤ ڈال کر انہیں براعظمی نظام کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ پرتگال اور اسپین کے ساتھ جزیرہ نمائی جنگ، پاپائی ریاستوں اور سویڈن پر قبضہ، بھائی لوئی بوناپارٹ کو معزول کرنا اور ہالینڈ کا فرانس کے ساتھ الحاق وغیرہ سب کچھ نپولین نے براعظمی منصوبے کو موثر بنانے کے لیے کیا تھا۔ اس نظام کا اثر نہ صرف برطانیہ بلکہ فرانس سمیت یورپ کے بیشتر ممالک پر بھی پڑا۔ یورپی ممالک کی درآمدات اور برآمدات رک گئیں۔ برطانیہ میں بے روزگاری اور خوراک کا بحران پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ، امریکہ اور ڈنمارک جیسے غیر جانبدار ممالک کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات بگڑ گئے۔ فرانس اور یورپ کے دیگر ممالک میں روزمرہ زندگی کی ضروری اشیاء کی قلت تھی۔ ان ممالک نے کچھ سامان خود پیدا کرنا شروع کیا لیکن یہ برطانیہ کی اعلیٰ معیار کی پیداوار کا نعم البدل نہ بن سکا۔ نپولین کو اپنی فوج کے لیے اوور کوٹ اور جوتے برطانیہ سے ہی درآمد کرنے پڑے۔ بالآخر یہ انتظام ناکام ہو گیا۔ اس کی ناکامی کی بنیادی وجوہات تھیں۔

1. فرانس کے پاس اپنی ہزاروں میل لمبی ساحلی پٹی کی نگرانی کے لیے طاقتور بحری بیڑے کی کمی تھی۔ طاقتور بحری بیڑے کی عدم موجودگی میں وہ کھلے سمندر میں بحری جہازوں پر قبضہ کرنے اور برطانیہ کے سامان کو یورپ آنے سے روکنے میں ناکام رہا۔
2. برطانیہ کا سامان خفیہ طور پر یورپی ممالک میں آنا شروع ہو گیا۔ بندرگاہوں میں اسمگلنگ اور بدعنوانی بڑھ گئی۔
3. برطانیہ کی پوری دنیا میں بہت سی نوآبادیات تھیں، جہاں سے وہ خام مال درآمد کرتا تھا اور تیار مال فروخت کرتا تھا۔ یورپی تجارت پر پابندی کا اس پر زیادہ اثر نہیں ہو سکا
4. برطانیہ یورپ سے غذائی اجناس درآمد کرتا تھا۔ براعظمی نظام کی وجہ سے اسے خوراک کا بحران جھیلنا پڑ رہا تھا۔ لیکن جب یہ بحران اپنے عروج پر پہنچا تو نپولین نے برطانیہ کو دس گنا قیمت پر اناج بھیجنا شروع کر دیا۔ اگر نپولین برطانیہ کو غلہ نہ بھیجتا تو ممکن تھا کہ برطانیہ اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتا۔
5. یورپی ممالک نے دباؤ میں آکر اس نظام کو قبول تو کر لیا تھا لیکن جیسے ہی انہیں موقع ملا وہ اس سے الگ ہو گئے۔ بہت سے ممالک نپولین کے مخالف ہو گئے اور وہ ان سے جنگوں میں الجھنے لگا۔
6. زیادہ تر ممالک روزانہ استعمال کی اشیاء تیار نہیں کرتے تھے اور برطانوی مصنوعات پر انحصار کرتے تھے۔ براعظمی نظام کی وجہ سے وسیع پیمانے پر معاشی مشکلات نے نپولین کی حکمرانی کو غیر مقبول بنا دیا۔ فرانس میں متوسط طبقہ بھی اس کا مخالف بن گیا۔ نپولین کا یہ منصوبہ ناقابل عمل تھا۔ دیگر ممالک سے توقع کرنا کہ وہ مشکلات برداشت کر کے تعاون کریں گے، نپولین کی بڑی غلطی تھی۔

11.7.3 جزیرہ نمائی جنگ (The Peninsular War)

پرتگال کے برطانیہ کے ساتھ سیاسی اور تجارتی تعلقات تھے اور اس نے نپولین کے براعظمی منصوبے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً نپولین نے اسپین کے ساتھ مل کر 1807 میں پرتگال پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ پرتگال کے خلاف مہم کے دوران فرانسیسی افواج اسپین کی سرحدوں پر گھیرا تنگ کرتی رہیں۔ نپولین کے عزائم میں اضافہ ہوا اور اس نے 1808 میں اسپین پر قبضہ کر لیا۔ اسپین پر بوربون خاندان کے چارلس چہارم کی حکومت تھی، جو ایک نااہل حکمران تھا۔ بادشاہ کا بیٹا فرڈیننڈ بھی اپنے باپ سے غیر مطمئن تھا۔ نپولین نے دونوں کی دشمنی کا فائدہ اٹھایا اور انہیں اسپین کے تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اسپین میں نپولین نے اپنے بھائی جوزف بوناپارٹ کو حکمران مقرر کیا۔ اسپین کے لوگوں نے نپولین کے اس عمل کو قومی توہین سمجھا اور پوری قوم نپولین کے خلاف لڑنے لگی۔ نپولین کو ایک طویل جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ جنگ 1808 سے 1813 تک جاری رہی اور اسے جزیرہ نمائی جنگ کہا گیا۔ پرتگال اور برطانیہ نے بھی اسپین کے قوم پرست لوگوں کی حمایت کی۔ 1808 میں ہسپانوی باغیوں نے فرانسیسی فوج کو شکست دی۔ بادشاہ جوزف کو بھاگنا پڑا۔ نپولین نے خود اسپین پر حملہ کیا اور ہسپانوی فوج کو شکست دے کر جوزف کو دوبارہ اسپین کے تخت پر بٹھایا۔ 1809ء میں نپولین وسطی یورپ میں سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ نپولین کی غیر موجودگی میں ہسپانوی فوج نے برطانیہ کی مدد سے 1812–1813 میں سیلمیکا (Salamanca) اور وکٹوریہ (Victoria) کی لڑائیوں میں فرانسیسی فوج کو شکست دی۔ اس طرح اسپین اور پرتگال فرانس کے تسلط سے آزاد ہو گئے۔ اسپین کا جغرافیائی محل وقوع، وسطی یورپ کے ممالک میں نپولین کی مصروفیت، برطانوی فوج کی جنگی صلاحیت اور اسپین میں قوم پرستی کا عروج، جزیرہ نمائی جنگ میں نپولین کی ناکامی کی وجوہات تھیں۔ اس جنگ میں تین لاکھ فرانسیسی فوجی مارے گئے۔ اسپین پر قبضہ نپولین کی بہت بڑی غلطی تھی۔ نپولین نے خود کہا تھا کہ اسپین کا ناسور میری تباہی کا سبب تھا۔ نپولین کا زوال اسی جنگ سے شروع ہوا۔

11.7.4 آسٹریا کے ساتھ دوبارہ جنگ (Second War with Austria)

نپولین کو جزیرہ نمائی جنگ میں مصروف دیکھ کر آسٹریا نے اپریل 1809 میں فرانس کے خلاف اعلان جنگ کیا لیکن آسٹریا کو جولائی 1809 میں واگرام کی جنگ (The Battle of Wagram) میں نپولین کی جنگی مہارت سے شکست ہوئی۔ آسٹریا کو فرانس کے ساتھ ویانا کے ذلت آمیز معاہدے پر دستخط کرنے پڑے، جس کے مطابق اسے الیریا (Illyria) کا صوبہ فرانس کو، مشرقی گیلیسیا (Eastern Galicia) روس اور مغربی گیلیسیا (Western Galicia) وارسا کی گرینڈ ڈچی کو دینا تھا۔ اسے براعظمی نظام کو قبول کرنا پڑا اور تاوان جنگ بھی ادا کرنا پڑا۔ اس معاہدے کے مطابق آسٹریا کی شہزادی میری لوئیس (Marie Louise) کی شادی نپولین سے ہوئی۔ نپولین نے اپنی سابقہ بیوی جوزفین کو طلاق دے دی کیونکہ وہ اسے کوئی اولاد نہ دے سکی۔ اس نے مذکورہ شادی اپنی عظیم سلطنت کے لیے وارث حاصل کرنے اور خاندانی فخر کو بڑھانے کے لیے کی۔

11.7.5 روسی مہم (The Russian Campaign)

روس اور فرانس کے درمیان تلسیت معاہدے کے ذریعے دوستی قائم ہوئی لیکن تلسیت معاہدے کی بنیاد مستقل نہیں تھی۔ دونوں

ممالک کے تعلقات کئی وجوہات کی بنا پر مسلسل خراب ہوتے رہے۔ روس براعظمی منصوبے کو جاری رکھنے کے حق میں نہیں تھا، کیونکہ وہ روزمرہ کی ضروری اشیاء کے لیے برطانیہ پر منحصر تھا۔ روس قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن نپولین اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ 1809 میں جب نپولین نے پولینڈ کا روس کے ساتھ الحاق کرنے کے بجائے وارسا کی گرینڈ ڈچی قائم کی تو روس نے نپولین کے اعلانات کو نظرانداز کر دیا اور برطانیہ کے ساتھ تجارت شروع کر دی۔ نپولین ایک روسی خاندان میں شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن روس کے زار نے اس کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ نپولین نے جون 1812 میں چھ لاکھ سپاہیوں کی بڑی فوج کے ساتھ روس پر حملہ کیا۔ روسی فوجوں نے براہ راست لڑنے کے بجائے پسپائی کی پالیسی اپنائی اور جن شہروں اور دیہاتوں سے وہ پیچھے ہٹے، انہیں مکمل طور پر تباہ کرتے چلے گئے۔ آخر کار 7 ستمبر 1812 کو نپولین نے بوروڈینو کی لڑائی (Battle of Borodino) میں روسی فوج کو شکست دی لیکن یہ کامیابی حتمی ثابت نہیں ہوئی۔ جب وہ 14 ستمبر کو ماسکو (Moscow) پہنچا تو اس نے ماسکو کو ویران پایا۔ روس کا زار ہتھیار ڈالنے کے بجائے سائبیریا چلا گیا۔ ماسکو میں پانچ ہفتے قیام کے بعد شدید سردی، خوراک کی کمی، فوج میں پھیلنے والی بیماریوں وغیرہ کی وجہ سے افسردہ اور مایوس ہو کر نپولین نے فوج کو واپس جانے کا حکم دیا۔ اس طرح نپولین کی روسی مہم بے سود ثابت ہوئی اور اس کی فوجی طاقت کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ چھ لاکھ کی عظیم الشان فوج میں سے صرف ایک لاکھ سپاہی رہ گئے۔ اس مہم نے نہ صرف نپولین کا وقار تباہ کیا بلکہ یورپی طاقتوں نے دوبارہ منظم ہو کر اس پر حملہ کیا۔ اس کے خلاف ایک طاقتور گروپ بنایا گیا۔

شہنشاہ نپولین اول کی سلطنت کا انتہائے عروج تقریباً 1812ء

(Source: https://en.wikipedia.org/wiki/First_French_Empire#/media/File:Europe_1812_map_en.png)

11.7.6 پرشیا میں قومی بیداری (Nationalism in Prussia)

نپولین کی فوجی مہمات نے فرانسیسی انقلاب کے نظریات کو یورپ میں پھیلایا۔ یورپ میں قوم پرستی کا احساس بیدار ہوا۔ اسپین اور روس میں نپولین کی ناکامی کی خبر ملتے ہی پرشیا کے لوگوں نے اپنے آپ کو نپولین کے تسلط سے آزاد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ پرشیا میں، ہزاروں رضاکاروں نے ملک کو نپولین کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے فوج میں شمولیت اختیار کی۔ فروری 1813 میں پرشیا کے شہنشاہ فریڈرک ولیم سوم اور روس کے شہنشاہ الیگزینڈر اول کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ نپولین کے خلاف جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یورپ اس سے آزاد نہیں ہو جاتا۔ مارچ 1813 میں پرشیا نے فرانس کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ شمالی اور وسطی جرمنی کی کچھ ریاستوں نے پرشیا کی حمایت کی۔ مئی، 1813 میں، نپولین نے لٹزن (Lützen) اور بوٹزن (Bautzen) کی جنگ میں پرشیا اور روس کی مشترکہ افواج کو شکست دی۔ دریں اثنا، آسٹریا کے چانسلر میٹرنخ (Metternich) کی ثالثی کے ذریعے، نپولین نے پلیسوز میں پرشیا اور روس کے ساتھ جنگ بندی کو قبول کیا۔ میٹرنخ نے اس سے سمجھوتہ کرنے کے لیے ایک معاہدہ اور کچھ تجاویز پیش کیں، لیکن نپولین نے میٹرنخ کی پیش کردہ تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً اگست 1813ء میں آسٹریا بھی جنگ میں شامل ہو گیا۔

11.7.7 اقوام کے ساتھ جنگ (The Battle of Nations)

پرشیا، روس، آسٹریا اور برطانیہ نے فرانس کے خلاف چھٹا گروپ قائم کیا۔ سویڈن اور کچھ دوسرے ممالک بھی اس گروپ میں شامل ہو گئے۔ نپولین نے دشمن کی فوجوں کو الگ الگ شکست دینے کا منصوبہ بنایا۔ سب سے پہلے اس نے اگست 1813 میں ڈریسڈن کی جنگ (The Battle of Dresden) میں آسٹریا کو شکست دی۔ یہ نپولین کی آخری فتح تھی۔ چھٹے گروپ کے ارکان نے ٹوپلیس (Toeplitz) میں آپس میں معاہدہ کیا۔ اسی دوران بویریا بھی اس گروپ میں شامل ہو گیا۔ اتحادیوں اور نپولین کے درمیان فیصلہ کن جنگ لیپزگ (Leipzig) میں 16 اکتوبر سے 19 اکتوبر 1813 تک ہوئی۔ اتحادی افواج نے نپولین کی فوج کو چاروں اطراف سے گھیر لیا اور نپولین کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ کو اقوام کی جنگ (The Battle of Nations) کہا جاتا ہے۔ نپولین کو اپنی باقی ماندہ فوج کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ اس جنگ کے نتیجے میں نپولین کے قائم کردہ رائن وفاق کا خاتمہ ہو گیا۔ جرمنی آزاد ہو گیا اور ڈنمارک اتحادیوں میں شامل ہو گیا۔ اس جنگ کے ساتھ ہی نپولین کے براعظمی نظام کا خاتمہ ہوا۔

لیپزگ کی جنگ کے بعد اتحادیوں نے نپولین کو امن مذاکرات کی تجویز پیش کی جسے نپولین نے مسترد کر دیا۔ 28 مارچ 1814 کو اتحادیوں نے آپس میں شومانت (Chaumont) کے مقام پر ایک معاہدہ کیا اور فیصلہ کیا کہ ان میں سے کوئی بھی نپولین کے ساتھ علیحدہ معاہدہ نہیں کرے گا۔ اس کے بعد اتحادی افواج نے فرانس پر حملہ کر دیا اور 31 مارچ 1814 کو پیرس میں داخل ہو گئیں۔ 9 مارچ 1814 کو لاؤن کی جنگ (The Battle of Laon) میں شکست کھانے کے بعد نپولین نے فاؤنٹین بلیو نامی جگہ پر اتحادیوں سے معاہدہ کیا۔ فاؤنٹین بلیو (Fontainebleau) 1814 معاہدے کے مطابق نپولین کو فرانس کے تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اسے ایلبا (Elba) جزیرے کا حکمران بنا دیا گیا اور اسے بیس لاکھ روپے سالانہ پنشن دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ 20 اپریل 1814 کو نپولین کو جزیرہ ایلبا بھیج

دیا گیا۔

11.7.8 نپولین کی آخری جنگ (The Last Battle of Napoleon)

اتحادیوں نے فرانس میں بوربون خاندان کو دوبارہ بحال کیا اور فرانس کی جغرافیائی سرحدیں جو 1792 میں تھی وہی دوبارہ متعین کردی گئی۔ اس کے بعد، ستمبر 1814 میں، اتحادی، یورپ کے مسائل کے حل کے لیے آسٹریائی دارالحکومت ویانا میں جمع ہوئے۔ نپولین ایلبا جزیرے پر حکومت کررہا تھا۔ ویانا کانفرنس میں اتحادیوں کے درمیان اختلافات اور بوربون حکمران لوئی ہشدہم کی حکمرانی کی وجہ سے فرانس میں پھیلے عدم اطمینان اور افراتفری کے بارے میں خبریں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ ایلبا کے جزیرے پر دس ماہ حکومت کرنے کے بعد مارچ 1815 میں نپولین اپنے کچھ سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہوکر فرانس پہنچ گیا۔ فرانس میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا، سینکڑوں لوگ اس کی فوج میں شامل ہوئے۔ حکمراں لوئی، بیلجیم بھاگ گیا اور نپولین دوبارہ فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ لیکن وہ فرانس پر صرف 100 دن ہی حکومت کرسکا۔

نپولین کے دوبارہ شہنشاہ بننے کی خبر ملتے ہی اتحادیوں نے اپنے باہمی اختلافات بھلا کر دوبارہ جنگ کی تیاری شروع کردی۔ انہوں نے فرانس پر ہر طرف سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ 18 جون 1815 کو نپولین کی زندگی کی آخری جنگ، اتحادیوں کے ساتھ واٹرلو کے میدان میں ہوئی۔ اتحادیوں کی فوج کی قیادت برطانوی کمانڈر ویلنگٹن (Wellington) کررہا تھا۔ اس جنگ میں نپولین اور اس کی فوج نے غیر معمولی جرات کا مظاہرہ کیا۔ لیکن جب وہ ویلنگٹن کی فوج کو شکست دینے والا تھا تو بلوشر (Blücher) کی قیادت میں پرشین فوج ویلنگٹن کی مدد کے لیے پہنچ گئی۔ نپولین کو شکست ہوئی اور اس نے امریکہ فرار ہونے کی کوشش کی لیکن برطانوی بحری ناکہ بندی کی وجہ سے بالآخر اسے برطانوی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ نپولین کو بحر اوقیانوس کے ایک ویران جزیرے سینٹ ہیلینا (Saint Helena) میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے لیے بھیجدیا گیا۔ چھ سال بعد، 5 مئی، 1821 کو، نپولین 52 سال کی عمر میں پیٹ کے کینسر سے انتقال کرگیا۔

11.7.9 نپولین کی شخصیت کا تجزیہ (An Analysis of Napoleon's Personality)

نپولین کی غلطیوں اور اس کے کردار کی کچھ خامیوں نے نپولین کے زوال میں نمایاں کردار ادا کیا۔ نپولین خود مرکوز اور انتہائی اولوالعزم تھا اور ایک روشن خیال آمر کی طرح کام کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مرکز میں رکھتے ہوئے پوری دنیا کو دیکھتا تھا۔ فرانس کا شہنشاہ بننے کے بعد وہ عالمی فتح کے خواب دیکھنے لگا۔ اس کے اس رجحان نے یورپ کے تمام ممالک کو اس کا دشمن بنادیا تھا۔ مغرور ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خود غرض اور نچلے متوسط طبقے والی مایوسی کا شکار تھا۔ تخت پر آنے کے بعد اس نے عوام کی مرضی کو نظرانداز کرنا شروع کردیا۔ اسے اپنے کام میں کسی کی مداخلت پسند نہیں تھی۔ اس نے اپنے آزاد خیال مشیروں راؤڈرے، شاپتال، طالیراں اور فوشے کی جگہ عام اہلیت کے لوگوں کو لے لیا اور جو صرف اس کی اطاعت کرتے تھے۔ اس کی اسی فطرت کی وجہ سے فوشے، طالیراں وغیرہ نے اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ نپولین نے نااہل ہونے کے باوجود اپنے تمام بہن بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اس کے خاندان کو بادشاہوں کا

خاندان کہا جاتا ہے۔ جیمز کیمبل (James Campbell) کے مطابق اس نے اپنے خاندان کے افراد میں انتظامی عہدے اس طرح تقسیم کیے جیسے وہ کرسمس کے دن تحائف تقسیم کر رہا ہو۔ اس نے اپنے بھائیوں کو ہالینڈ، اسپین اور ویسٹ فیلیا میں، اپنے سوتیلے بیٹے کو شمالی اٹلی میں، بہن کو ٹسکنی میں، اور اپنے بہنوئی کو جنوبی اٹلی میں مقرر کیا۔ اپنے بیٹے کی پیدائش کے بعد نپولین نے شیر خوار بیٹے کو روم کا بادشاہ بنادیا۔ نپولین کے ان رشتہ داروں نے اس سے فائدہ اٹھایا، لیکن بحران کے وقت اس کا ساتھ نہیں دیا۔

نپولین کی ترقی کی بنیاد عسکری پالیسی تھی۔ اس نے سب کچھ فوجی طاقت کے ذریعے کیا اور شہنشاہ بننے کے بعد بھی مسلسل جنگ میں مصروف رہا۔ اس نے اپنی زندگی میں تقریباً چالیس جنگیں لڑیں۔ اس نے فرانس کے قومی جذبات کو عسکریت پسندی میں بدل دیا تھا اور انقلاب کی کامیابیوں اور قوم پرست عناصر کو بھی نظر انداز کیا۔ فرانس میں پریس پر پابندی اور کچھ قدیم اداروں کو دوبارہ قائم کرنے جیسے اس کے اقدامات نے عوام میں عدم اطمینان پیدا کیا۔ اس نے پہلے یورپ کے دوسرے ممالک میں انقلابی عناصر کو پھیلایا لیکن پھر فرانس کی بالادستی کا اصول قائم کر کے وہاں اٹھنے والے قوم پرستی کے احساس کو دبانے کی کوشش کی۔ پورا یورپ ماننے لگا کہ نپولین فرد اور قوم دونوں کی آزادی کا مخالف ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سی غلطیاں کیں۔ جزیرہ نمائی جنگ، براعظمی منصوبہ بندی، پوپ کی نظر بندی، روسی مہم، دشمن کو کم سمجھنا، توسیع پسندی اور عسکری پالیسی پر عمل پیرا ہونا، فرانس کی جدیدیت اور اقتصادی صنعت کاری کو نظر انداز کرنا، ایسی وجوہات تھیں جس کے لیے وہ خود ذمہ دار تھا اور جو اس کے زوال کی بنیاد بنی۔ اسپین کی طاقت کا اندازہ نہ لگانا، ماسکو مہم کے دوران سخت سردیوں میں زیادہ دیر ٹھہرنا، پلیسس میں جنگ بندی، واٹرلو کی جنگ کے وقت حملے میں تاخیر وغیرہ نپولین کی سنگین غلطیاں تھیں۔ برطانیہ کے خلاف، جس کے پاس معاشی طور پر مضبوط اور طاقتور بحری بیڑا تھا، اس کی ضرورت سے زیادہ اور ناقابل عمل مزاحمت نے بھی اس کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

11.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1799 میں نپولین جب قونصل اول مقرر ہوا تو اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اس کم عمری میں فرانس کا مالک ہوا۔ یہ انقلاب فرانس کا اثر تھا کیونکہ انقلاب فرانس ایک عہد ساز واقعہ تھا۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ نپولین بوناپارٹ بھی انقلاب کی ہی پیداوار تھا۔ یہ صرف فرانسیسی انقلاب کے مساوات کے اصول کی وجہ سے ممکن ہو سکا کہ ایک معمولی سے وکیل کا بیٹا ترقی کر کے شہنشاہ فرانس بنا۔ قدیم جاگیردارانہ مراعاتی نظام میں یہ ناقابل تصور تھا۔ نپولین اپنی خداداد صلاحیتوں اور عسکری قابلیتوں کی وجہ سے کوتاہ قد ہونے کے باوجود فرانس کی فوج میں تیزی سے ترقی کرتا چلا گیا۔ پہلے اس نے اپنی فتوحات سے عوام کو اپنا گرویدہ بنایا اور پھر عوامی حمایت سے بدعنوان ڈائرکٹری کی شورش زدہ حکومت کا خاتمہ کر کے 1799 میں نیا آئین اور قونصلیٹ نظام نافذ کیا جس میں تمام تر اختیارات بطور قونصل اول نپولین کے ہاتھوں میں ہی مرکوز تھے۔ عوام نے اسے بخوشی قبول کر لیا کیونکہ وہ بد نظمی اور آئے دن کے قتل و خونریزی سے تنگ آچکے تھے اور ایک مضبوط مرکزی حکومت چاہتے تھے۔ قونصل اول کے طور پر نپولین نے بہت سی انتظامی، معاشی، قانونی اور تعلیمی اصلاحات کیں اور پوپ سے بھی سمجھوتہ کیا۔ علاوہ ازیں بیرونی فتوحات بھی حاصل کیں جن کا خرچہ مفتوحہ ممالک سے حاصل کیا اور فرانسیسی عوام کو خوش رکھا۔ ان کامیابیوں سے حوصلہ پا کر اس نے 1804 میں قونصلیٹ نظام ختم کر کے اپنی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ نپولین نے اپنے

دور شاہی میں تقریباً پورے یورپ کو مطیع یا اتحادی بنالیا اور فرانس کے گرد ماتحت ریاستوں کا ایک دائرہ بنادیا۔ لیکن برطانیہ کی بحری طاقت کو توڑنے میں ناکام رہا اور پہلے مصر میں اور بعد میں ٹرافلگار میں فرانسیسی بیڑے کو برطانوی بحریہ نے تباہ و برباد کر دیا۔ نپولین نے جواب میں براعظمی ناکابندی کا منصوبہ بنایا جو ناکام رہا۔ روس نے جب اس نظام سے باہر آنے کی کوشش کی تو اس پر نپولین نے 1812 میں حملہ کر دیا جو آخر کار لاکھوں فرانسیسی سپاہیوں کے بھوک اور ٹھنڈ سے مرنے کی وجہ بنا۔ یہیں سے نپولین کا زوال شروع ہوا۔ اس کے بعد اسپین میں جزیرہ نمائی جنگ میں بہت زیادہ مشغول رہنے کے باوجود کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ بعد میں لیپزگ اور واٹرلو کی شکستیں نپولین کا انجام اور اس کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ ثابت ہوئیں۔ نپولین کے کچھ غلط فیصلے اور عاقبت نااندیشی ہی اس کے زوال کا سبب بنی۔

11.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

فرینک : فرانس کی یورپی کرنسی یورو اپنانے سے پہلے فرانس کا پیسہ

عوامی استصواب رائے: عوام سے کسی بات یا مسئلہ پر رائے شماری کرانا

لیسے(Lycée) : فرانسیسی حربی اسکول

11.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

11.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. نپولین کہاں پیدا ہوا؟
2. نپولین کے والدین کا نام بتائیے۔
3. نپولین نے کس سے شادی کی؟
4. پوپ نے نپولین کو کون سے علاقے سپرد کیے؟
5. کیمپو فورمیو کا معاہدہ کس کے درمیان ہوا؟
6. مصری مہم میں کس برطانوی امیر البحر نے نپولین کی فوج کو شکست دی؟
7. کنکورڈاٹ سے کیا مراد ہے؟
8. نپولینی قانون(Napoleonic Code) میں کتنی قسم کے قوانین مرتب کیے گئے؟
9. لیسے سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
10. واٹرلو کی جنگ کے بعد نپولین کو کہاں قید کیا گیا؟

11.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. نپولین کی ابتدائی زندگی کے بارے میں نوٹ لکھیے۔
2. نپولین کی مصری مہم کے بارے میں نوٹ لکھیے۔
3. 1799 کے آئین کی خصوصیات بتائیے۔
4. نپولین کی قانونی اصلاحات پر نوٹ لکھیے۔
5. نیپولین کی روسی مہم پر نوٹ لکھیے۔

11.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. بطور قونصل اول نیپولین کے کردار کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. شہنشاہ نیپولین اول کے دور حکومت پر روشنی ڈالیے۔
3. نیپولین کے زوال کے اسباب پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

11.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bell, David Avrom, *Napoleon*: *A Very Short Introduction*, Oxford University Press, New Delhi, 2018.
2. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
3. Johnson, Paul, *Napoleon*: *A Penguin life*, Viking, United Kingdom, 2002.
4. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
5. Lanfrey, Pierre. *The History of Napoleon the First*, *1769–1800*, Macmillan and Company, UK, 1886.
6. Lowe, Norman, John Traynor, *Mastering Modern World History*, Bloomsbury, New Delhi, 2023.
7. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
8. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
9. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
10. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
11. Soboul, Albert, *Understanding the French Revolution*, People's Publishing House, Bombay, 1989.
12. سید علی محسن، تاریخ یورپ عہد جدید 1500 تا 1871، حسامی بکڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد۔

اکائی 12۔ مسئلہ مشرق

(The Eastern Question)

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 انیسویں صدی میں مسئلہ مشرق

12.2.1 مسئلہ مشرق کی اصل

12.3 یونانی جنگ آزادی

12.3.1 یونان کی جدوجہد آزادی کا پس منظر

12.3.2 بغاوت کا آغاز

12.3.3 عظیم طاقتوں کی مداخلت

12.3.4 جنگ آزادی کے نتائج

12.4 کریمیائی جنگ

12.4.1 کریمیائی جنگ کی وجوہات

12.4.2 کریمیائی جنگ میں یورپی ریاستوں کا موقف

12.4.3 معاہدہ پیرس

12.5 برلن کانگریس

12.5.1 برلن کانگریس کا پس منظر

12.5.2 معاہدہ برلن

12.5.3 معاہدہ برلن کا تجزیہ

12.6 اکتسابی نتائج

12.7 کلیدی الفاظ

12.8 نمونہ امتحانی سوالات

12.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید (Introduction)

جدید دور کی تاریخ میں، مسئلہ مشرق سے مراد اٹھارہویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے اوائل تک سلطنت عثمانیہ میں سیاسی اور معاشی عدم استحکام اور اس کے نتیجے میں یورپی عظیم طاقتوں کے درمیان پیدا ہونے والی جنگی مسابقت اور سیاسی تحفظات تھے۔ اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں 'یورپ کے مرد بیمار ('Sick Man of Europe') کے طور پر مشہور، عثمانی سلطنت کی فوجی طاقت کے نسبتاً کمزور پڑنے سے طاقت کے نظام کے اس نازک توازن کے بگڑنے کا خطرہ لاحق ہو گیا جس کی تشکیل یورپ کے کنسرٹ ('Concert of Europe') نے کی تھی۔ مسئلہ مشرق میں متعدد باہم مربوط عناصر شامل ہیں: عثمانیوں کی فوجی شکستیں، عثمانی ادارہ جاتی دیوالیہ پن، عثمانی سلطنت میں چلایا جانے والا سیاسی اور اقتصادی جدیدیت کا منصوبہ، اس کے صوبوں میں نسلی مذہبی قوم پرستی کا عروج اور عظیم طاقتوں کی باہمی مسابقت۔ ان مختلف مسائل کے درمیان تطبیق کرنے کی کوشش میں مورخ لیسلی روگنے شوماکر (Leslie Rogne Schumacher) نے مشرقی مسئلہ کی درج ذیل تعریف پیش کی ہے: 'مسئلہ مشرق سے مراد اٹھارویں صدی کے نصف آخر سے لے کر 1923 میں جدید ترکی کی تشکیل تک سلطنت عثمانیہ کی سیاسی، عسکری، اقتصادی طاقت اور علاقائی اہمیت میں کمی کے یورپ کے تجربے اور اس میں حصہ داری سے متعلق واقعات اور تبدیلیوں کا پیچیدہ مجموعہ ہے۔' مسئلہ مشرق بین الاقوامی سطح پر کب شروع ہوا یہ ابھی تک بحث کا موضوع بنا ہوا۔ حالانکہ کوئی مخصوص تاریخ نہیں ہے جب یہ مسئلہ شروع ہوا۔ روس-ترک جنگ (1828–29) نے اس مسئلے کی طرف یورپی طاقتوں، خاص طور پر روس اور برطانیہ کو متوجہ کیا۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کو اب قریب ہی سمجھ کر، یورپی طاقتیں عثمانی علاقوں میں اپنے فوجی، دفاعی اور تجارتی مفادات کے تحفظ کے لیے اقتدار کی جدوجہد میں مصروف ہو گئیں۔ سلطنتِ عثمانیہ کے زوال سے سامراجی روس نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ دوسری طرف، آسٹریا اور برطانیہ نے عثمانی سلطنت کی موجودگی اور روس کے توسیعی عزائم کو روکنا اپنی سلطنتوں کے بہترین مفاد میں سمجھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی مسئلہ مشرق کو نپٹایا جا سکا جس کے نتائج میں سے ایک عثمانی سلطنت کا خاتمہ اور تقسیم تھا۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مسئلہ مشرق کی نوعیت اور اہمیت اور نتائج کو سمجھ سکیں گے۔
- سلطنت عثمانیہ کے زوال سے پیدا ہونے والے مختلف مسائل کا جائزہ لے سکیں گے۔
- جزیرہ نمائے بلقان کی سیاست اور وہاں عظیم طاقتوں کے باہم متصادم مفادات کو سمجھ سکیں گے۔
- بلقانی ریاستوں میں ابھرنے والی قوم پرستی اور نئی قومی ریاستوں کے قیام کو نشان زد کر سکیں گے۔

- یونانی جنگ آزادی اور کریمیا کی جنگ کے اسباب و نتائج کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- معاہدہ پیرس اور معاہدہ برلن کی خوبیوں اور خامیوں کو جان سکیں گے۔

12.2 انیسویں صدی میں مسئلہ مشرق (The Eastern Question in the 19th Century)

12.2.1 مسئلہ مشرق کی اصل (The Origin of the Eastern Question)

یورپی تاریخ میں ترکی یا عثمانی سلطنت کے زوال کے نتیجے میں جو مسئلہ پیدا ہوا اسے مسئلہ مشرق کہا جاتا ہے۔ یورپ کے جنوب مشرق میں واقع جزیرہ نما بلقان کے تمام ممالک پر ترکی کی عثمانی سلطنت کی حکومت کی۔ سلطنت عثمانیہ کے اس یورپی حصے میں بنیادی طور پر سلاو نسل کے اور یونانی کلیسا کے ماننے والے عیسائی آباد تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی دور میں یہ لوگ مسلمان ترکوں کے ساتھ مل جل کر امن و امان کے ساتھ رہتے تھے۔ سلطنت کی مرکزی حکومت کے کمزور ہوتے ہی مقامی جاگیردار اور گورنر بدعنوان اور ظالم ہونے لگے۔ یہ لوگ مقامی رعایا پر ظلم کرتے جس میں بسا اوقات مذہبی تفریق بھی شامل ہو جاتی جس کے خلاف مقامی بغاوتیں پھوٹ پڑتی تھی۔ یورپی مورخین نے اسے خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور ایک مذہبی بغاوت کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت بلقانی بغاوتوں کے پیچھے ابھرتی ہوئی قوم پرستی اور جمہوریت کے جذبات تھے اسی وجہ سے آسٹریا ہنگری اور روس میں بھی بغاوتیں ہوئیں۔ عثمانی سلطنت سترھویں صدی کے آخر تک بہت طاقتور رہی لیکن اٹھارویں صدی میں اس میں کمزوری کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ سلطنت کے زوال کا عمل بتدریج آگے بڑھتا گیا۔ رفتہ رفتہ ترکی کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ اسے یورپ کا مرد بیمار کہا جانے لگا۔ اس صورتحال میں روس نے ترکی کی زوال پذیر حالت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش شروع کر دی۔ روس مغرب کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ تاہم، اس سمت میں روسی توسیع میں عثمانی سلطنت کا وجود ایک بڑی رکاوٹ تھا۔ بحیرہ اسود اور اس کی دو بڑی گزرگاہیں آبنائے باسفورس (Bosphorus Strait) اور درہ دانیال، (Dardanelles) سلطنت عثمانیہ کے زیر اختیار تھے۔ روس کی توسیع پسندانہ پالیسی کی کامیابی کے لیے روسی بحری جہازوں کا بحیرہ روم تک پہنچنا ضروری تھا اور وہاں پہنچنے کے لیے آبنائے باسفورس اور درہ دانیال، پر قابض ہونا ضروری تھا۔ روس ان آبنائے پر کنٹرول قائم کرنے کے لیے پر عزم تھا۔ اس کے علاوہ جزیرہ نما بلقان کے باشندے نسلاً سلاو اور مذہباً یونانی عیسائی ہونے کی وجہ سے روس سے قربت رکھتے تھے۔ نسل اور مذہب کی آڑ میں روس آسانی سے ایسی صورت حال پیدا کر سکتا تھا جو اس کی توسیع پسندانہ پالیسی کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوتی۔ دوسری طرف، برطانیہ کو ترک سلطنت کی علاقائی سالمیت میں خصوصی دلچسپی تھی۔ وہ سلطنت عثمانیہ کو اپنی ہندوستانی سلطنت اور روسی سلطنت کے درمیان ایک درمیانی ریاست کے طور پر دیکھتا تھا۔ برطانیہ کی نظر میں سلطنت عثمانیہ کا مستقل وجود ہندوستانی سلطنت کی سلامتی کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے برطانیہ کسی بھی قیمت پر 'یورپ کے مرد بیمار' کو زندہ رکھنے کے لیے پر عزم تھا۔ اس وجہ سے برطانیہ روس کی توسیع پسندانہ پالیسی کا سخت مخالف تھا۔ اس طرح بلقان کا علاقہ مختلف سامراجی طاقتوں کے درمیان مسابقت کا میدان بن گیا جس میں بعد میں کئی نئے فریق جیسے اٹلی، آسٹریا اور جرمنی بھی کود پڑے۔ اٹلی اور جرمنی کا اتحاد مکمل ہوتے ہی آسٹریا بھی بلقانی علاقوں کی طرف للچائی نظروں سے دیکھنے لگا۔ نتیجتاً کشیدگی بڑھنا یقینی ہو گیا۔ درحقیقت جنگ عظیم بھی انہیں اسباب اور رقابتوں کے نتیجے میں برپا ہوئی۔ ادھر عثمانی سلطنت

جس کا اس علاقے پر روایتی تسلط تھا، وہ کسی طرح بھی اندرونی بدنظمی دور نہ کر سکی اور نہ ہی بلقانی ریاستوں کو روس کی سازشوں سے بچا سکی۔ بلآخر وہ ترک قوم پرستی کی لہر سے مغلوب ہو کر فنا ہو گئی۔ مسئلہ مشرق میں متعدد اہم واقعات رونما ہوئے جن کا ہم آگے ذکر کریں گے۔

12.3 یونانی جنگ آزادی (Greek War of Independence)

12.3.1 یونان کی جدوجہد آزادی کا پس منظر (Background to the Greek Independence Struggle)

سلطنت عثمانیہ سترہویں صدی تک بہت طاقتور رہی۔ رقبے کے لحاظ سے اسے یورپ میں روسی سلطنت کے بعد ہی درجہ دیا گیا۔ مشرقی یورپ کے علاقے جیسے یونان، سربیا، رومانیہ، بلغاریہ، بوسنیا وغیرہ اس وسیع و عریض سلطنت کے زیر اثر تھے۔ ان علاقوں کے باشندے زبان، مذہب، خون وغیرہ کے حوالے سے ترکی سے بالکل مختلف تھے۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں سلطنت عثمانیہ میں کمزوری کے آثار نظر آنے لگے۔ ایسے میں آسٹریا اور روس نے ترکی کی گرتی ہوئی حالت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش شروع کر دی۔ شروع میں روس نے اس طرف زیادہ توجہ دی اور نسل اور مذہب کی آڑ میں اپنی طاقت بڑھانے کی پوری کوشش کی۔ برطانیہ روس کی اس توسیع پسندانہ پالیسی کا مخالف تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کا وجود ختم ہو جائے اور اس پر روس کا قبضہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے خدشہ تھا کہ اس کی ہندوستانی سلطنت کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ قوم پرستی اور جمہوریت کا جو جذبہ انقلاب فرانس اور نپولین کی جنگوں نے یورپ میں فروغ دیا تھا وہ برسوں پورے یورپ پر اثر انداز ہوتا رہا۔ یہ ناگزیر تھا کہ ان نئے جذبات کا اثر بلقان خطے کے ممالک پر نہ پڑے۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد، ایک مختلف نسل کے لیے دوسری نسلوں پر تسلط بنائے رکھنا قطعی طور پر ناممکن ہو گیا۔ اس لیے ویانا کانگریس کے بعد ان ریاستوں میں آزادی کے حصول کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے سربیا کے لوگوں نے 1804ء میں ترکی کے خلاف احتجاج کیا۔ اس کے نتیجے میں سربیا کے باشندوں کو مقامی خود مختاری کے کچھ حقوق مل گئے۔ سربیا کو جزوی خود مختاری کا حق حاصل ہوتے دیکھ کر جزیرہ نما بلقان کے دیگر ممالک کی ہمت بڑھ گئی اور انہوں نے بھی سیاسی حقوق حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ویانا کانگریس کے بعد اس خطے میں قوم پرستی کی لہر دوڑنے لگی۔ ویانا کانگریس کے بعد یونان کی جنگ آزادی بلقان کی قوم پرستی کا سب سے اہم واقعہ تھا۔

یونان ایک بہت قدیم ملک تھا۔ یورپ میں تہذیب سب سے پہلے یہیں سے شروع ہوئی۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک یونانیوں میں کسی حد تک قومی تنظیم کا تصور ابھرا تھا۔ یہ سب یونانی کلیسا کے پیروکار تھے۔ یکساں مذہبی جذبات کی وجہ سے ان میں نسلی اتحاد کا احساس بھی تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں ان میں ان کی عظمت رفتہ کا شعور بھی بیدار ہو رہا تھا۔ اس وقت یونانی زبان و ادب کے احیاء کے لیے ۸ فکری تحریک بھی چل رہی تھی۔ کئی کتابوں کے ذریعے مصنف ایڈی میٹ آس کوریج نے یونانیوں کو ان کی قدیم ثقافتی روایت سے آگاہ رہنے کا پیغام دیا۔ کونسٹن ٹائن ریگس نامی ایک اور قوم پرست ادیب نے حب الوطنی کے نغمے لکھے جو آنے والے دور کے انقلاب کی پیشین گوئی کرتے تھے۔ اس طرح، کوریج اور ریگس کے سیاسی نظریات اور ادبی تاثر کی وجہ سے یونانی اپنی محکومیت میں بے چینی محسوس کرنے لگے۔ انہوں نے خود کو ترکی کی جاگیردارانہ حکمرانی سے آزاد ہو کر قدیم یونانی سلطنت کو دوبارہ قائم کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔

ایک اور عنصر یونانیوں کی قومی بیداری میں مددگار ثابت ہوا۔ ترک سلطنت کے تحت یونانیوں کی حالت دیگر محکوم ذاتوں سے بہتر تھی۔ یونانی لوگوں کو حکومت کے مختلف محکموں میں اعلیٰ عہدے دیے جاتے تھے۔ یونانیوں کو ایجین جزائر (Aegean Islands) اور ساحلی علاقوں میں مکمل آزادی تھی، صرف انہیں تھوڑا سا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ اچھے ملاح ہونے کی وجہ سے ترکی کے بحری بیڑے میں زیادہ تر ملاح اور افسر یونانی ہی تھے۔ صنعت اور بحری تجارت میں بھی یونانی آگے تھے جس کی وجہ سے وہ خوشحال تھے۔ یونان کے عیسائیوں کو بھی بہت زیادہ مذہبی آزادی حاصل تھی۔ کلیسا میں یونانی پادری اہم عہدوں پر فائز تھے۔ ان میں ایک پڑھا لکھا متوسط طبقہ بھی تھا جو قوم پرستی کے جذبے سے زیادہ متاثر تھا۔ ایسے حالات میں ان کا آزادی کے لیے آگے بڑھنا فطری تھا۔ انقلاب فرانس کے ذریعے پھیلائے ہوئے نظریات کی وجہ سے ان کی قوم پرستی اور آزادی کی خواہش مضبوط ہوتی گئی۔ اٹلی اور اسپین کی طرح یونان میں بھی خفیہ انقلابی کمیٹیاں بننا شروع ہو گئیں۔ ان خفیہ کمیٹیوں میں فلکی ایٹیریا (*'Filiki Eteria'*) نامی ایک مسلح انقلابی تنظیم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ملک کے اندر اور باہر سے ہزاروں یونانی جلد ہی اس تنظیم میں شامل ہو گئے اور چار پانچ سالوں میں اس کے ارکان کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس کا مقصد ترکی کو یورپ سے بے دخل کر کے قسطنطنیہ میں یونانی سلطنت کو دوبارہ قائم کرنا تھا۔

12.3.2 بغاوت کا آغاز (Outbreak of the Revolt)

1821ء میں یونانیوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ ان کی پہلی بغاوت الیگزنڈر اپسلانٹی (Alexander Ypsilantis) کی قیادت میں مولداویا میں شروع ہوئی۔ موریا کے ہزاروں ترک یونانیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ جب ان کی آزادی کی جدوجہد زور پکڑے گی تو انہیں روس کی مدد حاصل ہوگی۔ لیکن، اس وقت، روسی حکمراں زار الیگزینڈر اول (Alexander-I)، آسٹرائی چانسلر میٹرنخ (Metternich) کے زیر اثر تھا، جو ترقی پسند نظریات کا سخت مخالف تھا۔ میٹرنخ کی رائے مانتے ہوئے زار نے یونانیوں کو کوئی مدد فراہم نہیں کی۔ اس سے ترکی کو ایک اچھا موقع ملا۔ سلطان نے ایک بڑی فوج بھیجی اور مولداویہ کی بغاوت کو دبا دیا گیا۔ لیکن یونان میں قوم پرستی کی جو آگ بھڑک رہی تھی اسے بجھانا ناممکن تھا۔ جیسے ہی مولداویہ میں بغاوت ختم ہوئی، یونان کے دیگر حصے بشمول میریا اور بحیرہ ایجیئن میں واقع جزائر میں بڑے پیمانے پر بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ یونانیوں میں قوم پرستی کا بے مثال جوش و جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور وہ باہر کے لوگوں سے بھی ہمدردی حاصل کر رہے تھے۔ یونانی عیسائیوں کی مدد کے لیے بہت سے ممالک سے رضاکار یونان پہنچنے لگے۔ برطانیہ کا مشہور شاعر بائرن بھی اس جنگ میں بطور رضاکار شریک تھا۔ یونان کی مدد کے لیے پورے یورپ میں فنڈز جمع کیے گئے۔ اس صورت حال میں ترکی کے لیے بغاوت کو کچلنا انتہائی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ یونانیوں کی بغاوت زور پکڑ رہی تھی۔ ترکی کا حکمران اس صورتحال سے گھبرا گیا۔ اس نے یونانی بغاوت کو دبانے کے لیے مصر کے حکمران محمد علی سے مدد طلب کی۔ محمد علی نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو ایک جدید فوج کے ساتھ سلطان کی مدد کے لیے بھیجا۔ اس نے بڑی بیدردی سے بغاوت کو دبا دیا۔ اگرچہ یورپی عوام پیسے اور ہتھیاروں سے یونانیوں کی مدد کر رہی تھی لیکن میٹرنخ یونانیوں کی بغاوت کے خلاف تھا۔ اس نے یورپی ممالک کی حکومتوں کو یونانیوں کو امداد فراہم کرنے سے منع کیا۔ میٹرنخ کا ان ممالک پر زبردست اثر تھا۔ اس وجہ سے یورپی ریاستیں، یونانیوں کے لیے کچھ کر نہیں سکیں۔ یونانیوں کی شکست یقینی دکھائی دے رہی تھی۔

12.3.3 عظیم طاقتوں کی مداخلت (Intervention of the Great Powers)

یونان کی جدوجہد آزادی کا سوال لائباخ کانگریس میں یورپی کنسرٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ میٹرنخ نے کہا کہ کسی بھی ریاست کو یونان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ برطانیہ بھی اس وقت کسی بھی غیر ملکی مداخلت کے خلاف تھا۔ اس کے خیال میں یونانیوں کی کامیابی سے ترک سلطنت کمزور پڑ جاتی اور روس کی توسیع کے امکانات بڑھ جاتے۔ ترک سلطنت کے وجود کو برقرار رکھنا برطانیہ کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم عنصر تھا۔ اس طرح آسٹریا اور برطانیہ دونوں کسی بھی قسم کی مداخلت اور غیر ملکی امداد کے خلاف تھے۔ لیکن یونانیوں کی شکست سے روس میں بے چینی پھیل رہی تھی۔ روس ترک سلطنت کا خاتمہ چاہتا تھا۔ جنوب مغرب کی طرف بڑھنا اس کی بنیادی پالیسی تھی اور یونان کی جنگ اسے اس کے لیے اچھا موقع فراہم کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ جنگ کے دوران کچھ ایسے واقعات بھی ہوئے جس کی وجہ سے روس ترکی سے سخت ناراض تھا۔ اس نے ترکی سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ لیے اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

روسی مداخلت کے امکان نے صورتحال کو انتہائی سنگین بنا دیا۔ ترکی نے اس مداخلت سے پہلے بغاوت کو مکمل طور پر کچلنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کریٹ پر قبضہ کیا اور ایتھنز سے بغاوت کو سختی سے کچلنا شروع کیا۔ ان کاروائیوں کی خبر سے یورپ بھر کے عوام میں جوش و خروش پھیل گیا۔ رائے عامہ نے یونانیوں کی مدد کے لیے ہر جگہ مختلف حکومتوں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اس وقت دو اہم واقعات پیش آئے جس سے حالات بالکل بدل گئے۔ 1822 میں کیسلرے کی جگہ جارج کیننگ (George Canning) برطانیہ کا وزیر خارجہ مقرر ہوا۔ وہ بھی عدم مداخلت کی پالیسی کا حامی تھا لیکن واقعات اس طرح رونما ہو رہے تھے کہ کیننگ کو مجبوراً اس پالیسی کو ترک کرنا پڑا۔ یونانی ابھی تک جنگ اور ترکوں سے لڑنے میں مصروف تھے۔ اس سے برطانیہ کو بہت نقصان ہو رہا تھا۔ یونانیوں کا سمندر پر غلبہ تھا جس کی وجہ سے برطانیہ کو بہت سے جہازوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن، برطانیہ اس کے لیے معاوضے کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ یہ دعویٰ اسی صورت میں جائز تھا جب یونان کو ایک متحارب ملک سمجھا جاتا۔ اب تک یونانی قزاق سمجھے جاتے تھے اور بین الاقوامی قانون کے تحت ان سے معاوضے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیننگ نے محسوس کیا کہ دس لاکھ کی آبادی والی قوم کو ڈاکو سمجھنا غلط ہے۔ برطانیہ کی پالیسی میں اس تبدیلی کی وجہ سے یونانیوں کو ایک جنگجو فریق ہونے کی منظوری ملی۔

برطانیہ کے اس فیصلے کا بین الاقوامی صورتحال پر گہرا اثر پڑا۔ جس کی وجہ سے آسٹریا اور روس کو اپنی پالیسی بدلنی پڑی۔ مداخلت کی ضرورت ہر جگہ محسوس ہونے لگی۔ تاہم مداخلت کی شکل پر شدید اختلاف پیدا ہوا۔ اسی دوران زار الیگزنڈر مر گیا اور نکولس اول روس کے تخت پر بیٹھا۔ وہ یونانیوں کا ساتھ لے کر جلد از جلد جنگ میں مداخلت کرنا چاہتا تھا۔ 1826 میں، برطانیہ اور روس نے ترکی کو تجویز پیش کی کہ وہ یونان کو ترک سلطنت کے تحت ایک ریاست کے طور پر تسلیم کرے لیکن، سلطان نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ دوسری طرف یورپی ممالک میں رائے عامہ ترکی کے خلاف ہو رہی تھی جو اسے قوم پرستی بنام مطلق العنانی کی جنگ سمجھ رہی تھی۔ اس دباؤ کے تحت روس، برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں نے ترکی کے سلطان کو خط لکھ کر یورپی امن کے تحفظ کے لیے یونانیوں کو فوری طور پر آزادی دینے کے لیے کہا۔ قدامت پسند پرشیا اور آسٹریا نے اس تجویز کی حمایت نہیں کی۔ جس وقت تینوں ریاستوں کی یہ مشترکہ تجویز ترکی کے سلطان کو بھیجی گئی، فرانس اور

برطانیہ نے اپنے بحری بیڑوں کو بحیرہ روم میں چوکس رہنے کا حکم دیا۔ ناوارینو کی بندرگاہ پر ترکی اور مصر کا ایک بحری بیڑا بھی موجود تھا۔ دونوں طرف کے بحری بیڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی جھڑپ ہوئی اور جنگ شروع ہوگئی۔ نتیجتاً ترکی کا بحری بیڑا مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ ایسے میں یورپی جنگ کا امکان پیدا ہوگیا۔ لیکن، اس موقع پر برطانیہ نے کچھ تحمل کا مظاہرہ کیا اور اپنے جہازوں کو واپس بلالیا۔ فرانس نے بھی برطانیہ کا ساتھ دیا۔ لیکن، روس نے صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ ترکی روس کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا مجبور ہو کر 1829ء میں سلطان کو روس کے ساتھ ایڈریانوپل کا معاہدہ (Treaty of Adrianople) کرنا پڑا، جس کے ذریعے یونان کی آزادی کو تسلیم کیا گیا اور یونان ایک آزاد ریاست کے طور پر ابھرا۔

12.3.4 جنگ آزادی کے نتائج (Consequences of the War of Independence)

ایک طویل اور سخت جدوجہد کے بعد یونانیوں نے مطلق العنان ترک حکومت سے آزادی حاصل کی اور اپنی آزاد ریاست قائم کی۔ یہ یورپ کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ یونانیوں کی کامیابی میٹرنخ کی رجعت پسندانہ پالیسی کے خلاف قوم پرستی کی فتح تھی۔ اس نے قوم پرستی کے جذبے کی مضبوط طاقت کا موثر ثبوت دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یونانیوں کی اس فتح نے 1830ء کے انقلابیوں کو متاثر کیا۔ یونان کے مسئلے کی وجہ سے میٹرنخ کا کانگریس کا نظام بکھر گیا۔ ایک طرف برطانیہ، فرانس اور روس کو مشترکہ مداخلت کے ذریعے یونان کو آزاد کرانے کا سہرا ملا تو دوسری طرف آسٹریا اور پرشیا ان کی کوششوں میں کئی رکاوٹیں پیش کرتے رہے۔ ایڈریانوپل کے معاہدے کے بعد بلقان کے علاقے میں روس کا وقار اور اثر بڑھ گیا جس کی بنیاد پر وہ اپنی طاقت میں مزید اضافہ کر سکتا تھا۔ اس جدوجہد نے تمام ریاستوں پر ترک سلطنت کی کمزوری اور کھوکھلا پن بھی واضح کردیا۔ اس کے نتیجے میں بلقان کی دوسری عیسائی ریاستوں میں بھی آزادی کی امید جاگ اٹھی۔ یونان کے مسئلے نے یہ بھی ثابت کردیا کہ بلقان کا مسئلہ یورپ کا ایک بہت بڑا اور پیچیدہ بین الاقوامی مسئلہ تھا جس میں برطانیہ، روس اور آسٹریا کے اپنے اپنے مفادات الجھے ہوئے تھے اس لیے ان کے لیے مکمل طور پر غیر جانبدار رہنا ممکن نہیں تھا۔

12.4 کریمیائی جنگ (The Crimean War)

12.4.1 کریمیائی جنگ کی وجوہات (Causes of the Crimean War)

انیسویں صدی میں مسئلہ مشرق کا دوسرا اہم واقعہ کریمیائی جنگ تھا۔ کریمیائی جنگ کو جدید دور میں لڑی جانے والی سب سے بیکار جنگ کہا جاتا ہے۔ موقع، صورت اور مسائل کے نقطہ نظر سے یہ ایک بالکل ہی معمولی اور بے سود جنگ تھی۔ اس کے باوجود یہ حریف طاقتوں کے الجھے ہوئے اور متضاد مفادات کا نتیجہ تھا۔ طوفان کا مرکز جزیرہ نما بلقان کی سیاست تھی۔ اس جزیرہ نما کے لوگوں کی قوم پرستانہ خواہشات اور اس خطے پر تسلط قائم کرنے کے لیے بڑی طاقتوں کے درمیان رقابت نے اسے یورپی کشیدگی کا ایک بڑا مقام بنا دیا تھا۔ یہ سارا مسئلہ یورپ میں سلطنت عثمانیہ کے زوال کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ زوال پذیر ترک سلطنت کو 'یورپ کا مرد بیمار' کہا جاتا تھا اور روسی توسیع پسندوں کی نظریں طویل عرصے تک اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کی خواہشات میں سے ایک جزیرہ نما بلقان کو اپنے اثر و رسوخ کے دائرہ میں شامل کرنا تھا۔ اس کے

ساتھ وہ بحیرہ اسود کو بحیرہ روم سے ملانے والے آبنائے باسفورس اور درہ دانیال پر بھی اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ برطانیہ، روس کے ان ارادوں کا سخت مخالف تھا۔ برطانیہ چاہتا تھا کہ 'یورپ کا مرد بیمار' کسی طرح زندہ رہے۔ وہ پوری سلطنت عثمانیہ کو اپنی ہندوستانی سلطنت اور روس کی توسیع پسند سلطنت کے درمیان ایک درمیانی ریاست تصور کرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ہندوستانی سلطنت کی سلامتی کے مفاد میں زوال پزیر عثمانی سلطنت کا وجود ضروری ہے۔ بلقان کا مسئلہ انیسویں صدی کے وسط تک ان دو بڑی طاقتوں کے مخالف مفادات کے تصادم کی وجہ سے سنگین رہا۔ لیکن، 1850ء کے فوراً بعد، اس مسئلے میں ایک اور عنصر کا اضافہ ہوا۔ یہ فرانسیسی شہنشاہ نپولین سوم تھا جس کا رویہ کریمیا کی جنگ کا پس منظر بنا۔ 1848ء کے انقلاب کی لہر میں وہ فرانسیسی جمہوریہ کا صدر منتخب ہوا اور 1851ء میں اس نے خود کو فرانس کا شہنشاہ قرار دے دیا۔ فرانس میں اس کے سب سے مضبوط حامی رومن کیتھولک کلیسا کے لوگ تھے۔ اپنے آپ کو اقتدار میں رکھنے کے لیے اسے کچھ ایسے کام کرنے ہی تھے جن سے رومن کیتھولک لوگ خوش رہیں اور اس کی حمایت جاری رکھیں۔ وہ بیت المقدس کے مقدس مقام میں رومی کلیسا کے ذاتی مفادات کا تحفظ کر کے ان مقاصد کو آسانی سے حاصل کر سکتا تھا۔ 1740 عیسوی کے ایک معاہدے کے مطابق مقدس مقام کے رومی پادریوں کو فرانس کی حفاظت میں رکھا گیا۔ لیکن، پچھلی دہائیوں میں، یونانی کلیسا کے پادریوں (جس کا سرپرست روس کا زار تھا) نے رومی پادریوں کے حقوق چھین لیے تھے۔ جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان ایک بار پھر پرانا جھگڑا شروع ہو گیا۔ نپولین سوم نے رومی پادریوں کا ساتھ دیتے ہوئے اس معاملے میں مداخلت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ رومی پادریوں کو ان کے حقوق واپس دلانے میں کامیاب ہو گیا تو وہ فرانس کے رومن کیتھولک کے درمیان مقبول بنا رہے گا۔ اگر یونانی پادریوں کا ساتھ دے کر روس نے اس معاملے میں مداخلت کی تو اس کے ساتھ جنگ کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔ نپولین کا خیال تھا کہ اگر روس کو ایسی جنگ میں شکست دے دی جائے تو فرانس میں اس کی شہرت میں اس بات سے اضافہ ہو جائے گا کہ اس نے روس سے 15-1814 کی ذلت آمیز شکست کا بدلہ لے لیا۔ اس طرح فرانس میں اس کے مخالفین خاموش ہو جائیں گے اور ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کا نام گونجنے لگے گا۔

12.4.2 کریمیائی جنگ میں یورپی ریاستوں کا موقف

(Stand taken by the European Powers in the Crimean War)

اس پس منظر میں نپولین سوم نے رومی پادریوں کا ساتھ دیا اور بیت المقدس میں ان کے غصب شدہ حقوق کی واپسی کا مطالبہ کیا اور عثمانی سلطان پر اس سلسلے میں مناسب اقدام کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا، کیونکہ بیت المقدس عثمانی سلطنت کے تحت آتا تھا۔ جب ترک سلطان نے رومی پادریوں کے حقوق کی بحالی کے لیے پہل کی تو روس نے اس معاملے میں مداخلت کی۔ روس کی اس مداخلت سے بحرانوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے جنگ چھڑ گئی۔ روس کا مطالبہ یہ تھا کہ یونانی پادریوں کے حقوق میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے اور ایک دوسرا مضحکہ خیز مطالبہ بھی کیا کہ سلطان، روسی زار کو اپنی تمام عیسائی رعایا کا محافظ تسلیم کرے۔ اس موقع پر برطانیہ بھی اس تنازعہ میں شامل ہو گیا۔ قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر نے ترک سلطان کو روسی مطالبات کو مسترد کرنے کا مشورہ دیا۔ برطانیہ کی حوصلہ افزائی سے ترکی نے روسی مطالبات کو ٹھکرا دیا۔ اس پر روس نے ترکی پر حملہ کر دیا اور ترکی کا ساتھ دیتے ہوئے برطانیہ اور فرانس بھی جنگ میں شامل ہو گئے۔ یہ

1853ء کی کریمیائی جنگ تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو اٹلی کی ایک چھوٹی ریاست سارڈینیا بھی اس میں شامل ہو گئی۔ سارڈینیا کا وزیر اعظم کاوور، فرانس کو اس کی مدد کر کے اپنا احسان مند بنانا چاہتا تھا تا کہ بعد میں اسے نپولین سوم سے اٹلی کے اتحاد میں مدد مل سکے۔ یورپ کی ایک اور عظیم ریاست پرشیا اس جنگ میں مکمل طور پر غیر جانبدار رہی لیکن آسٹریا نے روس کی بے بسی کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ روس کے ساتھ اپنے روایتی دوستانہ تعلقات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے دو بار انتباہ اس دھمکی کے ساتھ دیے کہ اگر انہیں قبول نہ کیا گیا تو آسٹریا بھی روس کے خلاف جنگ میں شامل ہو جائے گا۔ روس کے پاس آسٹریا کے مطالبات تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ بعد میں یہ رویہ آسٹریا کے لیے بہت مہنگا ثابت ہوا۔

12.4.3 معاہدہ پیرس (The Treaty of Paris, 1856)

کریمین جنگ 1856 کے معاہدہ پیرس کے ساتھ ختم ہوئی۔ اس معاہدے کے ذریعے تمام یورپی طاقتوں نے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کو برقرار رکھنے کا وعدہ کیا۔ یہ طے پایا کہ کسی ملک کو سلطان اور اس کی عیسائی رعایا کے درمیان مداخلت کا حق نہیں ہوگا۔ سلطان نے اپنی رعایا کے لیے بہتر حکمرانی کا انتظام کرنے کی ذمہ داری لی۔ روس کا کچھ علاقہ مولداویہ کو حاصل ہوا۔ بعد ازاں مولداویا اور بیلیویا کو ملا کر رومانیہ کی سلطنت قائم ہوئی۔ سربیا کو خود حکومتی کا حق مل گیا۔ بحیرہ اسود، جس کے دو آبنائے کئی دہائیوں سے روس کی نظروں میں تھے، کو غیر جانبدار قرار دیا گیا تھا۔ اگرچہ بحیرہ اسود میں روسی جنگی جہازوں کی موجودگی پر پابندی عائد کی گئی تھی لیکن اسے تمام ممالک کے تجارتی جہازوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

12.4.4 کریمیائی جنگ کے نتائج (Consequences of the Crimean War)

معاہدہ پیرس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے روس کی توسیع پسندانہ پالیسی کو روکا گیا اور جنگ میں شکست کی وجہ سے روس کی بہت تذلیل ہوئی۔ دوسری طرف یورپ کی بڑی طاقتوں کی حفاظت میں ترکی کو نئی زندگی حاصل ہوئی۔ نپولین سوم کو بہت تشہیر ملی اور اس کی شہرت پورے یورپ میں پھیل گئی۔ برطانیہ کو بھی ٹھوس منافع حاصل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کشیدگی کی اصل وجہ ختم ہو گئی ہے اور مسئلہ مشرق کا مستقل حل نکل آیا ہے۔ لیکن، ان تمام نتائج کا قریبی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ پیرس معاہدے نے مسئلے کا کوئی حل فراہم نہیں کیا۔ جیسا کہ بعد کے واقعات نے ظاہر کیا، کوئی بھی چیز روس کے عزائم کو روک نہیں سکی۔ اس معاہدہ کے بعد ترک انتظامیہ میں کوئی اصلاحات نہیں ہوئی اور وہ بدستور سابقہ جاگیردارانہ انداز سے چلتی رہی۔ سربیا کی آزادی کے بعد، اس معاہدے نے ماتحت ریاستوں کو اپنی آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اس طرح، پیرس کے معاہدے نے سلطنت عثمانیہ کے مزید ٹوٹ پھوٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اگر سربیا کی طرح دوسری ریاستیں بھی اپنی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتیں تو سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ یقینی تھا۔ اس طرح نہ تو کریمیا کی جنگ اور نہ ہی معاہدہ پیرس روس کی توسیع پسندانہ پالیسی کو روک سکا اور نہ ہی 'یورپ کے مرد بیمار کو مرنے سے بچا سکا۔

جنگ کے ذریعے برطانیہ کا کوئی بھی مقصد حاصل نہیں ہو سکا۔ اس کا مقصد ترکی کو بکھرنے سے بچانا تھا لیکن بعد کے واقعات نے

واضح کر دیا کہ ترکی کو زوال سے نہیں بچایا جاسکتا۔ اس جنگ میں برطانیہ کے ساٹھ ہزار فوجی مارے گئے اور قومی قرضہ بہت بڑھ گیا۔ فوج اور سامان کے بے تحاشہ اخراجات کے عوض برطانیہ کو کچھ نہیں ملا۔ جہاں تک فرانس کا تعلق ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نپولین سوم نے اپنی شان و شوکت حاصل کی، روس سے بدلہ لیا اور 1814-15 کا داغ دھو دیا۔ اس نے اپنے آپ کو کیتھولک کلیسا کا عظیم سرپرست ثابت کیا۔ اس کے نتیجے میں فرانس میں اس کی پوزیشن بہت مضبوط ہو گئی۔ ملک کے اندر اس کے بہت سے مخالفین خاموش ہو گئے۔ لیکن، جنگ کے طویل مدتی نتائج خود نپولین کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئے۔ اس نے ایک جرات مندانہ قدم اٹھانے میں جو کامیابی حاصل کی اس نے اسے مزید جرات مندانہ قدم اٹھانے کی ترغیب دی اور یہ بالآخر اس کے زوال کا باعث بنا۔ 1859 میں، ٹلی میں، 1812 سے 1867 تک میکسیکو میں اور 1870 میں خود فرانس میں، ہی وہ پرشیا کے ساتھ ایسی جنگوں میں مصروف تھا جس سے آسانی سے بچا جاسکتا تھا۔

جنگ سے صرف اطالوی ریاست سارڈینیا (Sardinia) نے ٹھوس فوائد حاصل کیے۔ کاوور کو وہ موقع ملا جس کی اسے توقع تھی۔ ایک بین الاقوامی کانفرنس (پیرس کانفرنس) میں بڑی طاقتوں کے ساتھ بیٹھ کر اس کا وقار بڑھا اور اسے اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ وہ نپولین کی خیر سگالی حاصل کرنے میں کامیاب رہا جس نے بعد میں اٹلی کے اتحاد کی راہ ہموار کی۔ آسٹریا کے خلاف جنگ چھیڑنے کے لیے فرانس کی مدد لینا ضروری تھا اور کریمیا کی جنگ میں فرانس کی مدد سے کاوور نے اس مدد کی یقین دہانی حاصل کی۔ یہ درست ہی کہا گیا ہے کہ کریمیا کی دلدل سے متحدہ اٹلی کا عروج ہوا۔

کریمیا کی جنگ ایک غیر ضروری اور فضول جنگ تھی، پھر بھی یہ نتائج سے بھرپور تھی۔ اس نے 1815ء کے ویانا نظام کی بنیاد ہلا دی۔ 1815 سے 1848 تک آسٹریا اور روس یورپ میں آزاد خیالی اور قوم پرستی کی لہر کو روک کر سابقہ حالت کو برقرار رکھنے میں ایک دوسرے کے مضبوط حامی تھے۔ 1850 میں دونوں نے مل کر جرمنی کے اتحاد کی ایک مضبوط کوشش کو روک دیا تھا۔ لیکن، کریمیائی جنگ کے بعد تبدیلی کی مخالفت کرنے والی قوتیں بہت کمزور ہو گئیں۔ جنگ کے بعد روس اور آسٹریا کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے کیونکہ آسٹریا نے جنگ کے وسط میں دو بار روس کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی۔ آسٹریا کی احسان نہ شناسی کی وجہ سے روس اور آسٹریا کے تعلقات اس قدر بگڑ گئے کہ پرشیا اور سارڈینیا دونوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور جرمنی اور اٹلی کا اتحاد مکمل کر لیا۔ جنگ کے دوران روس کے ساتھ پرشیا کا رویہ دوستانہ رہا۔ یہ ان پڑوسیوں کے درمیان انتہائی خوشگوار تعلقات کے قیام کا آغاز تھا۔ اس کی بنیاد پر، پرشیا نے 1866 کی آسٹریا-پرشیائی جنگ میں زار کی نمایاں حمایت حاصل کر کے جرمنی کا اتحاد تقریباً مکمل کر لیا۔

عام طور پر، کریمیا کی جنگ یورپی تاریخ کا خط منقسم تھی۔ یہ حقیقت خاص طور پر روس کے لیے سچ تھی۔ غیر ملکی جنگوں میں شکست نے زار نکولس اول کی حکمرانی کی پالیسی کو مکمل طور پر بیکار ثابت کر دیا اور روس میں جمہوریت کے قیام کی تحریک شروع کی۔ زار نکولس کا تیس سالہ دور آمریت کے تحفظ میں گزرا۔ اس کی حمایت میں روسی افواج کو بیرون ملک تعینات کیا گیا اور ملک کے اندر حریت پسندانہ خیالات کو کچلنے کے لیے ہر طرح کے طریقے استعمال کیے گئے۔ پورے ملک کو ایک فوج کے طور پر دیکھا گیا۔ پھر کریمیا کی جنگ میں روس کو شکست ہوئی۔

عظیم روسی آمر کی فوج کو حریت پسند مغرب کی فوج نے شکست دی تھی۔فوجی طاقت کا وہ وقار جس کے لیے سب کچھ قربان کیا گیا تھا شکست کی وجہ سے خاک میں مل گیا۔اس کی وجہ سے روسی عوام کا غصہ جو کہ جنگ سے پہلے اندرونی طور پر ابل رہا تھا، شکست کے بعد کھلے عام احتجاج میں بدل گیا اور روس میں ایک شدید پر تشدد تحریک شروع ہو گئی۔حالات کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے نئے زار الیگزینڈر دوم نے وقت کے تقاضے کو تسلیم کیا اور اصلاحی طریقے نافذ کیے، جیسے کسانوں اور غلاموں کی آزادی، انتظامیہ کی جدید کاری وغیرہ، تاکہ روس کو ایک جدید ریاست بنایا جا سکے۔اس طرح کریمیا کی جنگ نے یورپی تاریخ میں ہلچل مچا دی۔اس جنگ نے ایک نئے دور کا آغاز کیا، جس نے بہت سے انقلابی واقعات کا راستہ کھولا۔

12.5 برلن کانگریس (The Berlin Congress)

12.5.1 برلن کانگریس کا پس منظر (Background to the Berlin Congress)

مسئلہ مشرق یورپ میں سلطنت عثمانیہ کے ٹوٹنے سے پیدا ہوا۔1866 سے پہلے اس خطے کی سیاست میں برطانیہ اور روس دو اہم حریف تھے۔لیکن، اس سال کے بعد اس میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا۔جرمنی اور اٹلی کی سیاست سے نکالے جانے کے بعد آسٹریا نے بھی بلقان کے علاقے میں اپنا اثر و رسوخ پھیلانے کا فیصلہ کیا۔اس کے نتیجے میں بلقان کے علاقے میں روس اور آسٹریا کے درمیان مفادات کے تصادم کی ایک نئی صورتحال پیدا ہو گئی۔آسٹریا کے قدم جمانے سے پہلے ہی، روس نے بلقان کو زیر کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے سلاومت کی تحریک شروع کی۔1867 میں ماسکو میں ایک بہت بڑی سرب سلاوی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ایک مرکزی آل سلاو کمیٹی تشکیل دی گئی۔اس کا صدر مقام ماسکو میں قائم کیا گیا اور اس کی شاخیں بلقان کی مختلف ریاستوں میں قائم کی گئیں۔اس کا مقصد تمام سلاوی لوگوں کو منظم کرنا اور انہیں سلطنت عثمانیہ کے خلاف اکسانا تھا۔پان سلاوزم کے زیر اثر آکر بوسنیا کے لوگوں نے 1874 میں بغاوت کر دی۔عثمانی حکومت نے اس بغاوت کو کچلنا شروع کیا۔اس پر روس نے بوسنیا کے لوگوں کا ساتھ دیتے ہوئے مداخلت کی۔جب اس کی تنبیہات کا ترکی پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور جنگ میں شکست کھانے کے بعد ترکی پر 'معاہدہ سان سٹیفانو'(1877ء) مسلط کر دیا۔اس معاہدے کے نتیجے میں کچھ علاقوں کو روسی سلطنت میں ضم کر دیا گیا اور سربیا اور رومانیہ کو مکمل طور پر آزاد ریاستیں تصور کیا گیا۔اس ریاستوں کی تشکیل نے ہی یہ اشارہ دے دیا کہ یہ مکمل طور پر روس کے زیر اثر رہیں گی۔

سان سٹیفانو کے معاہدے کی برطانیہ اور آسٹریا دونوں نے سخت مخالفت کی کیونکہ اس کے نتیجے میں یورپ میں سلطنت عثمانیہ تقریباً ختم ہو گئی اور پورا خطہ روس کے زیر اثر آ گیا۔برطانیہ اور آسٹریا نے مطالبہ کیا کہ بلقان کے پورے مسئلے پر نئے سرے سے بحث کے لیے ایک یورپی کانفرنس بلائی جائے۔روس نے کانفرنس کے مطالبے کی مخالفت کی، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ کانفرنس میں گیا تو وہ جنگ جیت کر حاصل ہونے والے فوائد سے محروم ہو جائے گا۔اس صورت حال سے یورپ میں شدید کشیدگی پیدا ہو گئی اور ایسا لگتا تھا کہ دونوں فریقوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی۔اس صورتحال سے بچنے کے لیے بسمارک نے ثالثی کا کام کیا اور مداخلت کر کے روس کو کانفرنس میں شامل ہونے پر راضی

کر لیا۔اس نے روس کو یقین دلایا کہ چونکہ مشرقی مسئلے میں جرمنی کا اپنا کوئی مفاد نہیں ہے، اس لیے وہ غیر جانبدار رہے گا اور صرف ایک 'اچھے دلال' کا کردار ادا کرے گا اور تمام متعلقہ فریقوں کے قومی مفادات کے تحفظ کی کوشش کرے گا۔ جون 1878 میں برلن میں تمام اتحادی ریاستوں کی کانفرنس اسی پس منظر میں شروع ہوئی۔

12.5.2 معاہدہ برلن (The Treaty of Berlin)

کانفرنس میں کافی بحث و مباحثے کے بعد کچھ فیصلے کیے گئے اور انہیں معاہدہ برلن کے تحت تسلیم کر لیا گیا۔اس کے مطابق بلقان سے متعلق درج ذیل انتظامات کیے گئے تھے۔

1. روس کے پاس آردھن، بوتم اور کورس بنے رہے لیکن اسے ویزید کا علاقہ ترکی کو واپس کرنا پڑا۔ اسے رومانیہ کا ڈوبرجا بھی لوٹانا پڑا لیکن بدلے میں اسے بسربیا کا صوبہ مل گیا۔
2. سربیا، رومانیہ اور مونٹی نیگرو کو مکمل طور پر آزاد ریاستیں تسلیم کیا گیا۔
3. سان سٹیفانو معاہدے نے جس عظیم بلغاریہ ریاست کی بنیاد رکھی تھی اس سے رومیلیا اور مقدونیہ کو گھٹا کر اس کا رقبہ کم کر دیا گیا۔اس طرح، محدود کردہ ریاست بلغاریہ کو خود اختیاری ریاست قرار دیا گیا، حالانکہ یہ اب بھی برائے نام ترکی کی سلطنت کے ماتحت تھی۔اسی طرح رومانیہ اور مقدونیہ کو سلطنت عثمانیہ کے اندر خود مختار علاقے قرار دیا گیا۔
4. آسٹریا۔ ہنگری کو بوسنیا، ہرزیگووینا اور نوبھی بازار کے سنجاک پر اختیار اور حکومت کرنے کا حق ملا۔اس قبضے نے مونٹی نیگرو کو سربیا سے الگ کر دیا۔ سربیا کا حجم بھی کم کر دیا گیا۔
5. برطانیہ کو قبرص کا جزیرہ ملا۔

12.5.3 معاہدہ برلن کا تجزیہ (An Analysis of the Treaty of Berlin)

برلن کانگریس کے ججوں نے مشرقی مسئلے کا تسلی بخش حل تلاش کرنے اور یورپی ریاستوں کے درمیان ایک بڑی جنگ کو روکنے کا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن، یہ ان کا غلط دعوی تھا۔ یہ معاہدہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ کانگریس نے بلقانی عوام کی قوم پرست امنگوں کو بڑی طاقتوں کی رقابت پر قربان کر دیا۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ یہ واضح تھا کہ مستقبل قریب میں بلقانی آتش فشاں دوبارہ پھٹ پڑے گا۔ برلن۔کانگریس کا انعقاد برطانیہ اور آسٹریا کے مطالبے پر کیا گیا جس کا بنیادی مقصد سان سٹیفانو کے معاہدے پر غور کرنا تھا۔ان ممالک کا بنیادی ہدف بلقان کے علاقے میں روس کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو روکنا، مشرقی مسئلے کا تسلی بخش حل تلاش کرنا اور بلقان کے علاقے میں روس، آسٹریا اور برطانیہ کے مفادات کے درمیان توازن قائم کرنا تھا۔ کانگریس کے فیصلوں نے سان سٹیفانو کا معاہدہ منسوخ کر دیا، جس کے نتیجے میں روس کو بہت سے فوائد سے دستبردار ہونا پڑا اور اس کا اثر ورسوخ محدود ہو گیا۔ آسٹریا اور برطانیہ عظیم بلغاریہ کے ٹوٹنے سے کافی مطمئن نظر آئے۔ مزید برآں، یورپ میں ترک سلطنت کو ایک نئی زندگی ملی۔ ان تمام کامیابیوں سے خوش ہو کر برطانوی وزیر اعظم ڈزرائیلی نے دعویٰ کیا تھا کہ 'میں

برلن سے عزت سے امن لے کر لوٹا ہوں۔' لیکن ڈزرائیلی کا یہ دعویٰ کافی حد تک غلط تھا۔ یہ درست ہے کہ ڈزرائیلی کی کوششوں نے باسفورس کی طرف روس کی توسیع کو روک دیا گیا، لیکن اب روس کی توسیع دوسری سمتوں میں شروع ہوئی۔ بوسنیا اور ہرزیگووینا کے سرب صوبوں کو آسٹریا کے تابع کر کے بڑی غلطی کی گئی۔ اس کی وجہ سے بلقان کے علاقے میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ مذکورہ دونوں صوبوں کے رہائشی سرب برادری سے تعلق رکھتے تھے اور وہ سربیا کے ساتھ اتحاد چاہتے تھے۔ سربیا نے بھی کانگریس میں ان دو صوبوں کا دعویٰ کیا۔ لیکن، اس کی خواہشات کو نظرانداز کر دیا گیا کیونکہ وہ عظیم طاقت نہیں تھی۔ اس طرح اس فیصلے نے ایک نئے خطرناک مسئلے کو پیدا کیا، جو آسٹریا کے زوال کے بعد ہی ختم ہو سکا۔ دراصل پہلی جنگ عظیم کی فوری وجہ بوسنیا اور ہرزیگوینا کے سوال پر ہی پیدا ہوئی۔

ڈزرائیلی کا یہ دعویٰ کہ اس نے تقریباً مرتے ہوئے 'یورپ کے مرد بیمار' کو مرنے سے بچا لیا تھا، قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ برلن کانگریس کے فیصلوں کی وجہ سے ترکی نے اپنی یورپی سلطنت کا بڑا حصہ دوبارہ حاصل کر لیا۔ لیکن، 1875 سے 1878 کے واقعات کی وجہ سے، اس کی اصل طاقت ختم ہو گئی. اس کے بعد اگلے تیس سال تک وہ کسی طرح خستہ حالی میں زندہ رہا۔ برلن کانگریس کے ججوں نے بلقان کے علاقے میں کئی ریاستیں بنا کر اور اس کے کچھ علاقوں پر خود قبضہ کر کے اس کے ٹوٹنے پر اپنی مہر ثبت کر دی تھی۔ ڈزرائیلی کا یہ دعویٰ کہ وہ برلن سے باعزت امن کے ساتھ واپس آیا ہے، قبول نہیں کیا جا سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ 'میں برلن سے قبرص کے جزیرے کے ساتھ وطن واپس آیا ہوں۔'

برلن کانفرنس کے فیصلے ناکام ہونے ہی تھے کیونکہ مسائل کا کوئی حقیقی حل تلاش نہیں کیا گیا۔ بلقان خطے کا بنیادی مسئلہ قوم پرستی تھا۔ اس خطے کی چھوٹی محکوم ریاستیں قوم پرستی کے اصول کی بنیاد پر خود کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن، بڑی طاقتوں کے لیے سب سے بڑا اصول طاقت کا توازن تھا۔ یورپ میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے خیال سے متاثر ہو کر انہوں نے قوم پرستی کے اصول کو یکسر نظرانداز کر دیا۔ اس لیے بلقان کی ہر ریاست کی شکایات کو دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بلغاریہ سب سے زیادہ غیر مطمئن تھا۔ اس کی امیدیں جو سان سٹیفانو کے معاہدے کی وجہ سے جگیں تھیں برلن میں بکھر گئیں۔ عظیم بلغاریہ کی تقسیم مکمل طور پر غیر فطری تھی۔ لیکن، انہیں الگ کر کے بلغاری نسل کے اتحاد اور قومیت کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی، حالانکہ یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ 1885 میں بلغاریہ نے رومیلیا کا الحاق کر کے معاہدہ برلن کو بھاری چنوتی پیش کی جس کی وجہ سے یورپ میں ایک سنگین بحران پیدا ہو گیا۔ برلن معاہدے کے ذریعے مقدونیہ کو ترکی کے تسلط میں واپس دینا بھی ایک غلطی تھی۔ یہ یقینی تھا کہ مقدونیہ کے لوگ اس تسلط کی مخالفت کرتے اور کچھ عرصے بعد مقدونیہ میں ترکی کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ 1912 کی بلقان جنگوں پر منتج ہوا۔ اگلے تیس سالوں تک مقدونیہ کا مسئلہ یورپ کے سیاسی میدان پر حاوی رہا۔

رومانیہ کو بھی بڑی قوموں کی غداری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ عظیم طاقتوں کا رویہ انتہائی غیر منصفانہ تھا۔ بیسریبیا کا علاقہ اس سے چھین کر روس کو دے دیا گیا اور بدلے میں اسے ڈوبرجا کا بنجر علاقہ ملا۔ اس کی وجہ سے رومانیہ کے رہنماؤں کا بڑی طاقتوں پر سے اعتماد اٹھ

گیا۔ جنوبی سلاوی (یوگوسلاو) ریاستیں بھی برلن معاہدے سے کافی غیر مطمئن تھیں۔ سربیا کو بلغاریہ کے کچھ حصے مل گئے، لیکن معاہدے کی دیگر شرائط یقیناً قوم پرستی کے لیے سخت دھچکا تھیں۔ آسٹریا کو نوبھی بازار کے سنجک میں فوج رکھنے کا حق مل گیا۔ نتیجے کے طور پر، سربیا اور مونٹی نیگرو الگ تھلگ پڑ گئے اور سبھی سرب لوگوں کے متحد ہونے کی امید دم توڑ گئی۔ بوسنیا اور ہرزیگوینا پر آسٹریا کے قبضے کے ساتھ، سرب خواہشات مکمل طور پر بکھر گئیں۔ اس کی وجہ سے بلقان کے علاقے میں ایک نیا کشیدہ مسئلہ شروع ہوا۔ کانگریس میں یونان نے مطالبہ کیا تھا کہ تھیسالی، ایپیرس اور کریٹ کے جزائر کو یونان کے ساتھ ملا دیا جائے، کیونکہ ان جزائر کے باشندے یونانی تھے۔ لیکن، کانگریس نے اس مطالبہ کو بھی مسترد کر کے تمام یونانیوں کو غیر مطمئن کر دیا۔ چند سال بعد، ایک عظیم یونانی تحریک شروع ہوئی جس کا مقصد بکھرے ہوئے یونانیوں کو ایک ریاست میں منظم کرنا تھا۔ اس سے بلقان کے علاقے میں بھی کشیدگی پیدا ہو گئی۔

اس طرح برلن کانگریس نے بلقان خطے کی ریاستوں کے قوم پرستانہ جذبات کو نظر انداز کر کے صرف اپنے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور بلقان کے مسئلے کو حل کرنے کے بجائے، لڑکھڑاتے ہوئے ترکی کو ایک نئی زندگی دینے کے مقصد سے جو فیصلے کیے، ان کے نتیجے میں مسئلہ بلقان مزید پیچیدہ ہو گیا۔ بلقان کا مسئلہ اگلے تیس سالوں کے لیے دھماکہ خیز بنا رہا اور یہ بالآخر پہلی جنگ عظیم کے آغاز کا باعث بنا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برلن کے معاہدے میں بہت سی خامیاں تھیں۔ کسی حد تک ان خامیوں کا پیدا ہونا فطری تھا کیونکہ آخرکار دوسرے معاہدوں کی طرح یہ معاہدہ بھی ایک قسم کا سمجھوتہ ہی تھا۔ برلن کے نظام کا از سر نو جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ان ناگہانی حالات پر بھی توجہ دینا ہوگی جن میں برلن کے سیاست دان گھرے ہوئے تھے۔ واقعات رونما ہونے کے بعد، آنے والی نسلوں کے لیے ماضی کے سیاستدانوں کی غلطیوں کو تلاش کرنا یا ان پر الزام لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ان کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے ہمیں ہر صورت حال کو اسی شکل میں دیکھنا چاہیے جس میں اس وقت کے سیاست دانوں کے سامنے پیش ہوا تھا۔ برلن کا معاہدہ بھی ایک خاص اور انتہائی دھماکہ خیز صورت حال کا سامنا کرنے اور عظیم طاقتوں کے درمیان امن برقرار رکھنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس نے یقینی طور پر یہ مقصد فوراً پورا کر دیا اور ایک نسل تک بڑی ریاستوں کے درمیان جنگ نہیں ہوئی۔ یہ درست ہے کہ برلن کانفرنس کے بعد اگلے پچیس برس تک مسئلہ مشرق میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا اور انیسویں صدی کے آخری دور میں اس خطے میں نسبتاً امن تھا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس دور میں یورپ کی بڑی طاقتیں افریقہ کو تقسیم کرنے اور چین کو لوٹنے میں مصروف تھیں۔ اس کے باوجود بلقان خطے کی سیاست کو ہنگامہ خیز بنانے کے لیے تمام ذرائع یکجا ہو رہے تھے۔ بوسنیا معاملہ (1908ء) اور بلقان کی جنگوں (1912ء) کے لئے پس منظر تیار ہو رہا تھا۔ ان واقعات نے 1914 کے عظیم دھماکے کو ناگزیر بنا دیا۔

12.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مسئلہ مشرق، انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں سلطنت عثمانیہ کے انتشار سے پیدا ہونے والا سفارتی مسئلہ تھا، جس کا مرکز سابقہ عثمانی علاقوں کے تسلط کے لیے مسابقت اور مقابلہ آرائی تھا۔ ترک ریاست کے مقبوضات میں کسی بھی اندرونی تبدیلی سے یورپی طاقتوں

کے درمیان تناؤ پیدا ہوا، جن میں سے ہر ایک کو یہ خدشہ تھا کہ سیاسی خلفشار کا فائدہ اٹھا کر دوسرا اپنا اثر ورسوخ بڑھا سکتا ہے۔ یہ سوال انیسویں صدی کے دوران وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا رہا۔ مثلاً 1820 کی یونانی بغاوت کے دوران، 1853–56 میں کریمیائی جنگ کے دوران، 1875–78 کے بلقان بحران کے دوران، 1908 کے بوسنیائی بحران کے دوران اور 1912–13 کی بلقان جنگوں کے دوران۔ اس مسئلہ مشرق کے نتیجے میں عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کر لیے گئے۔ بلقان کے صوبے اس صدی کے دوران آزاد ریاستوں کے طور پر ابھرے جو اکثر روس یا دوسری بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک کے زیر اثر تھے۔ برطانیہ نے 1878 میں قبرص اور 1882 میں مصر پر قبضہ کر لیا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد فلسطین اور عراق کو مینڈیٹ کے طور پر حاصل کیا۔ فرانس نے 1920 میں شام اور لبنان پر قبضہ کر لیا۔ ترکی جو کہ عثمانی ریاست کا مرکز تھا، 1923 میں ایک آزاد جمہوریہ کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔

12.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

مسئلہ مشرق	:	عثمانی سلطنت کے زوال سے جنوب مشرقی یورپ میں پیدا ہونے والا بحران جہاں ہر بڑی طاقت اپنا رسوخ بڑھانے میں لگی تھی اور اس سلسلے میں باہمی مسابقت کر رہی تھی۔
برلن	:	جرمنی کی راجدھانی اور ایک اہم شہر
چانسلر	:	یورپی حکومتوں میں وزیر اعظم کا عہدہ

12.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

12.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. 'یورپ کا مرد بیمار' کسے کہا جاتا تھا؟
2. جزیرہ نمائے بلقان کہاں واقع ہے؟
3. بلقان کے اکثر لوگ کس نسل سے تعلق رکھتے تھے؟
4. بلقان کے لوگوں کی اکثریت کس کلیسا کی پیروکار تھی؟
5. بحیرہ اسود کی دو بڑی گزر گاہوں کا نام بتائیے۔
6. فلکی ایٹیریا نامی خفیہ تنظیم کہاں ابھری؟
7. یونانیوں کی پہلی بغاوت کا قائد کون تھا؟
8. کس معاہدے کے ذریعے یونان کی آزادی کو تسلیم کیا گیا؟
9. برطانیہ کس سلطنت کو اپنی ہندوستانی نوآبادیات کے درمیان درمیانی ریاست سمجھتا تھا؟
10. کریمیائی جنگ فرانس کے کس حکمراں کی وجہ سے شروع ہوئی؟

12.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مسئلہ مشرق کی اصل پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. یونان کی جدوجہد آزادی کے پس منظر پر نوٹ لکھیے۔
3. یونانی جنگ آزادی میں بڑی طاقتوں کی مداخلت پر نوٹ لکھیے۔
4. کریمیائی جنگ کی وجوہات بیان کیجیے۔
5. معاہدہ برلن کی شرائط بیان کیجیے۔

12.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. یونانی جنگ آزادی پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. کریمیائی جنگ پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. برلن کانگریس پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

12.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Blanning, T.C.W., *The Nineteenth Century*: *Europe*, *1789–1914*, Oxford University Press, New Delhi, 2000.
2. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
3. Gooch, George Peabody, *History of Modern Europe*, *1878–1919*, Cassell, London, 1924.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
6. Lindemann, Albert S., *A History of Modern Europe*: *From 1815 to the Present*, Wiley-Blackwell, Noida, 2013.
7. Lowe, Norman, *Mastering Modern World History*, Palgrave Macmillan, New Delhi, 2013.
8. Marriott, J.A.R., *The Eastern Question*: *An Historical Study in European Diplomacy*, Clarendon Press, New Delhi, 1969.
9. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
10. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
11. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
12. Taylor, A.J.P. *The Struggle for Mastery in Europe*, *1848–1918*, Oxford University Press, New Delhi, 1987.

اکائی 13۔اٹلی کا اتحاد

(The Unification of Italy)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید
13.1 مقاصد
13.2 اٹلی کے اتحاد کے اسباب
13.2.1 ریسار جیمنٹو
13.2.2 یورپ میں قوم پرستی کا عروج
13.2.3 اٹلی کے اتحاد میں نپولین کا کردار
13.2.4 اتحاد کی راہ میں رکاوٹیں
13.3 اتحاد کی طرف پیش رفت
13.3.1 کاربونری
13.3.2 جوسف مزینی
13.3.3 کاؤنٹ کاوور
13.3.4 جوزف گیری بالڈی
13.5 اکتسابی نتائج
13.6 کلیدی الفاظ
13.7 نمونہ امتحانی سوالات
13.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید (Introduction)

جب جذبات اور استدلال کے درمیان طاقت کا امتحان ہوتا ہے تو اکثر جذبات جیت جاتے ہیں کیونکہ جذبات میں سادگی، فراوانی اور تسلسل ہوتا ہے جو مغلوب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جب کہ عقل کو تجربے اور مطالعہ کے ذریعے پروان چڑھانا پڑتا ہے۔ قوم پرستی ایک ایسا احساس ہے جو کسی خاص علاقے کے لوگوں کو اس سے قدرتی اور بھرپور طریقے سے جوڑتا ہے۔ گو کہ انسان کے جذبات کی سب سے اعلیٰ شکل اس کی انسانی محبت ہے لیکن عملی زندگی میں انسان قوم کے نام سے جڑ جاتا ہے اور صحیح اور غلط کام کرتا ہے۔ آبائی سرزمین سے محبت، جس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے، سولہویں صدی تک رفتہ رفتہ جذبہ حب الوطنی میں بدل گئی، اور وطن اس پورے علاقے کو کہا جانے لگا جہاں زبان، ماضی اور ثقافتی اقدار عام طور پر جزو لاینفک ہوں اور جسے ایک قومی بازار بنیاد فراہم کرتا ہو۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد جب یورپ میں قومی بادشاہت کو عروج حاصل ہوا اور قومی زبان وادب نے ترقی کی تو قوم اور ملک مترادف بننے لگے۔ فرانس، برطانیہ اور اسپین جیسے ممالک نے اس میدان میں پہل کی۔ فرانسیسی انقلاب نے قوم پرستی کو نہ صرف کامیاب بلکہ باوقار بھی بنایا۔ نپولین نے اس کی مدد سے اقتدار حاصل کیا اور پورے یورپ میں فتح کا ڈنکا بجایا۔ لیکن جو فرانس کے لیے سچ تھا وہ دوسروں کے لیے بھی تو سچ تھا۔ رفتہ رفتہ یورپ کے دیگر علاقوں میں بھی قومی شعور مضبوط ہونے لگا اور نپولین کے خلاف جدوجہد کرکے دوسری قوموں نے اس کا زوال ناگزیر بنا دیا۔

ایسے دور میں جن علاقوں میں قومی شعور پھیلا، ان میں غیر ملکی تسلط اور دیگر وجوہات کی وجہ سے قومی اتحاد کے پہلے مرحلے میں پیچھے رہنے والے اٹلی اور جرمنی نمایاں تھے۔ عہد وسطیٰ کے بعد ہی زراعت، تجارت اور صنعت میں ترقی اور بورژوازی کی سماجی طاقت میں اضافے کے نتیجے میں منقسم اور مظلوم قوموں میں اتحاد اور آزادی کا مطالبہ بڑھنے لگا۔ اس اکائی میں ہم ترقی کے اس عمل کا مطالعہ کریں گے جس کی وجہ سے اٹلی کا اتحاد ممکن ہوا۔ میٹرنخ (Metternich) اٹلی کو 'محض ایک جغرافیائی اظہار' کہتا تھا اور یہ سچ بھی تھا کہ انیسویں صدی کے آغاز میں اٹلی نام کا کوئی ملک نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت اٹلی، ہندوستان کی طرح، جغرافیائی طور پر ایک اچھی طرح سے طے شدہ اکائی تھا۔ شمال میں کوہ آلپس اور تین طرف سے سمندروں میں گھرا یورپ کے جنوب وسطی حصے میں واقع یہ جزیرہ نما مکمل طور پر محفوظ تھا۔ یہی نہیں، یہاں ثقافتی اتحاد بھی موجود تھا جس نے اٹلی کو ایک زندہ نام رکھا، حالانکہ یورپ میں سیاسی نقطہ نظر سے اٹلی کا کوئی خاص وجود نہیں تھا۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اٹلی کے حالات وکیفیات کو جان سکیں گے
- اٹلی کے اتحاد کے اسباب سمجھ سکیں گے۔
- اتحاد کی طرف پیش رفت کا جائزہ لے سکیں گے۔
- اٹلی کے اتحاد میں مزینی، کاوور اور گیری بالڈی کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔

13.2 اٹلی کے اتحاد کے اسباب (Causes of the Unification of Italy)

13.2.1 ریسارجیمنٹو (The Risorgimento)

اٹلی کے اتحاد کی تحریک کو ریسارجیمنٹو (*'Risorgimento'*) بھی کہا جاتا ہے۔اس کو متحد کرنے والے بہت سے عناصر تھے۔ سب سے پہلے، اٹلی کی ایک ترقی یافتہ اور باوقار قدیم تاریخ تھی۔ رومی سلطنت میں صدیوں تک نہ صرف اٹلی بلکہ پورے جنوب مغربی یورپ پر رومی سیاست اور تہذیب کا غلبہ رہا۔ یہ واقعی اطالوی عوام کے لیے ایک شاندار دور تھا اور اس کی یاد ہمیشہ اٹلی کو اعتماد سے بھر دیتی تھی۔ اس کے علاوہ تمام مغربی یورپ کے ادب اور مذہب کی زبان لاطینی، اٹلی کی زبان تھی۔ لسانی اتحاد کی تاریخ بھی کافی پرانی تھی۔ قومی زبانوں کا عروج ہی اٹلی میں اطالوی زبان کے عظیم شاعر دانتے کی تخلیقات سے شروع ہوا سمجھا جاتا ہے۔ زبان کے بعد لوگ اگر کسی نام پر جڑتے ہیں تو وہ مذہب ہے۔ اٹلی میں مذہب کی سطح پر بھی اتحاد تھا۔ جب سے کیتھولک مذہب یورپ میں آیا اور پوپ کی رہائش گاہ، روم بنا، پورا اٹلی کیتھولک مذہب کا مظبوط پیروکار بن گیا۔ اس طرح اٹلی میں ہر طرح سے ایک منظم اکائی بننے کے عناصر موجود تھے۔ اٹلی ہزاروں سال تک ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہا۔ بہت سی چھوٹی اور بڑی ریاستوں میں بٹا ہوا یہ خطہ باہمی رقابت کا ہی نہیں بلکہ پڑوسی بڑے ممالک اسپین، فرانس اور آسٹریا کے درمیان تنازعات کا بھی شکار رہا۔ اٹھارویں صدی کے اٹلی کے سیاسی حالات کا موازنہ بڑی آسانی سے بارہویں صدی کے ہندوستان سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی ٹوٹ پھوٹ کے درمیان سے تنظیم اور یکجہتی کے بیج پھوٹے۔ کبھی داخلی کوششوں سے اور کبھی بیرونی حالات کے بالواسطہ اور بلاواسطہ نتائج کی وجہ سے اٹلی اتحاد کی طرف بڑھتا گیا۔

13.2.2 یورپ میں قوم پرستی کا عروج (The Rise of Nationalism in Europe)

فرانسیسی فلسفی ارنسٹ رینان نے 1882ء میں یونیورسٹی آف سوربون میں ایک لیکچر کے دوران بتایا کہ ان کی فہم کے مطابق قوم کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ بعد میں یہ لیکچر قوم کیا ہے؟ کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون مین رینان نے دوسروں کے اس خیال کو غلط بتایا کہ قوم کا مطلب ایک مشترکہ زبان، نسل، مذہب اور خطہ ارض ہے۔ ایک قوم عرصے تک کی گئی دوڑ دھوپ، جدوجہد قربانیوں اور جاں نثاریوں کے طویل ماضی کا نقطہ عروج ہے۔ ایک مایہ ناز ماضی، عظیم افراد اور شان و شوکت وہ معاشرتی سرمایہ ہے جس پر قومیت کے تصور کی اساس ہوتی ہے۔ ماضی کے باہمی کارنامے، حال میں مشترک ارادے اور امنگیں، بڑے بڑے کاموں کی مشترکہ جدوجہد، کچھ اور کرنے کی تمنا، ایک قوم ہونے کی بنیادی شرائط ہیں۔ لہٰذا ایک قوم دراصل وسیع پیمانے پر ایک دوسرے کو جوڑنے والا اتحاد ہے اور اس کی بقا روزانہ کا استصواب ہے۔ اس کا قلمرو اس کے باشندے ہیں اور صلاح و مشورے کا حق صرف رہنے والوں کو ہے۔ ایک قوم کسی دوسرے ملک کو اس کی مرضی کے خلاف اپنے میں ضم کرنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتی۔ قوموں کا وجود نہ صرف ایک اچھی بات ہے بلکہ ضروری ہے۔ قوموں کا وجود آزادی کی ضمانت ہے۔ اگر دنیا میں ایک آقا اور ایک ہی قانون ہو تو یہ آزادی ختم ہو جائے گی۔ انیسویں صدی میں قوم پرستی ایک ایسی قوت کی طرح سامنے آئی جو یورپ کی سیاسی اور ذہنی دنیا میں وسیع بنیادی تبدیلیاں لائی۔ ان تبدیلیوں کا نتیجہ یورپ کی متعدد قوموں والی سلطنتوں کی جگہ قومی ریاست کا ظہور تھا۔ ایک ایسی جدید ریاست کا تصور اور اس کے طور طریقے جس میں ایک مرکزی حکومت کو ایک مخصوص خطہ ارض

پر مکمل اختیار حاصل ہو یورپ میں ایک طویل عرصہ سے تشکیل پارہا تھا لیکن قومی ریاست سے مراد ایک ایسی ریاست تھی جس کے شہریوں کی اکثریت صرف اس کے حکمراں ہی نہیں ایک مشترکہ شناخت رکھتی ہو اور ایک مشترکہ موروثی تاریخ سے جڑی ہوئی ہو۔ یہ اجتماعیت زمانہ قدیم سے نہیں چلی آرہی تھی بلکہ رہنماؤں اور عوام کے عمل اور جدوجہد کے ذریعہ وجود میں آئی تھی۔

13.2.3 اٹلی کے اتحاد میں نپولین کا کردار (Role of Napoleon in the Unification of Italy)

نپولین کی فتوحات کے دوران سب سے پہلے اٹلی کو پامال کیا گیا، لیکن اٹلی ہی انقلاب کی کامیابیوں سے سب سے پہلے متعارف ہوا۔ نپولین نے سب سے پہلے اٹلی میں جمہوریہ قائم کیا اور شہنشاہ بننے کے بعد متعدد چھوٹی بڑی ریاستوں کو ختم کرکے انہیں صرف تین حصوں میں تقسیم کردیا۔ ایک حصے پر براہ راست فرانس کی حکومت تھی اور اٹلی اور نیپلز (Naples) کی ریاستوں پر نپولین کے نمائندوں اور رشتہ داروں کی حکومت تھی۔ اس طرح حقیقت میں پورے اٹلی پر ایک قسم کے اصول و قوانین لاگو تھے۔ ہزاروں سال بعد اٹلی میں باہر سے مسلط کردہ نظام نے اسی طرح بالواسطہ طور پر اتحاد کا پس منظر تیار کیا جس طرح برطانوی سلطنت نے ہندوستان میں کیا تھا۔ نپولین کے زوال کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا لیکن اس کا بالواسطہ اثر اٹلی کے اتحاد میں کارگر ثابت ہوا۔

13.2.4 اتحاد کی راہ میں رکاوٹیں (Barriers to the Unification of Italy)

ویانا کانگریس میں قدیم نظام کی حمایت کی وجہ سے اطالوی محب وطنوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اٹلی پھر چھوٹی چھوٹی جاگیردار ریاستوں میں منقسم ہو گیا۔ ویانا کی کانگریس کے بعد، اٹلی میں سسلی، ٹسکنی، پاپائی ریاست، لوکا، پارما، ماڈینا اور سارڈینیا (سیوائے اور پیڈمونٹ) کی ریاستیں تھیں۔ لومبارڈی اور وینیشیا پر آسٹریا کا قبضہ تھا۔ سیاسی طور پر منتشر اٹلی سماجی طور پر بھی بکھر گیا تھا۔ زیادہ تر ریاستوں میں جاگیردارانہ اور مطلق العنان حکمرانی تھی جس میں کچھ اشرافیہ کے زیر اثر تھیں۔ بدعنوان کلیسا استحصال میں شریک تھا اور رجعت پسندانہ قوتیں پرعزم تھیں کہ کہیں کوئی تبدیلی کی بات کرے تو اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

اس وقت اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اٹلی کی عوام غریب، ان پڑھ اور پسماندہ تھی۔ اسے یکجہتی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ان کا بنیادی مسئلہ روزی روٹی کا تھا۔ روشن خیال اور متوسط طبقے کے لوگ جو اتحاد میں ملک اور اپنا مفاد دیکھ رہے تھے، عوام کی حمایت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ مختلف ریاستوں کا حکمران طبقہ اتحاد کے خلاف تھا، کیونکہ اس سے اس کی اپنی خودمختاری ختم ہو جاتی۔ آسٹریا کے قبضے میں اٹلی کا ایک حصہ تھا اور وہ کہیں بھی کسی قسم کی تبدیلی کو اپنے حق میں نہیں سمجھتا تھا۔ سابقہ حالت کا سب سے بڑا پہرے دار اور محافظ میٹرنخ ہمیشہ اٹلی پر نظر بنائے رکھتا تھا کیونکہ اٹلی میں ہونے والی تبدیلی کی لہر آسٹریا تک ضرور پہنچتی۔ خود پوپ، اتحاد کا مخالف تھا کیونکہ اٹلی کے حکمران کی حیثیت سے تمام اٹلی کی سیاسی طاقت ایک جگہ سمٹ جاتی اور پوپ کا ایک حریف پیدا ہو جاتا۔ اسے مذہبی اقتدار کے خوف کو برقرار رکھنا تھا۔ اس کی وجہ سے یورپ کے دیگر کیتھولک ممالک بھی پوپ کے حامی اور اٹلی میں ہونے والی تبدیلیوں کے خلاف تھے۔ میٹرنخ کی قیادت میں ان تمام حکمرانوں نے ہر قسم کی آزادی اور اظہار رائے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ تبدیلی تو آ ہی رہی تھی۔

13.3 اتحاد کی طرف پیش رفت (Towards Unification)

13.3.1 کاربونری (The Carbonari)

انقلاب فرانس اور اپنے ماضی کے وقار سے متاثر ہو کر اور انقلاب کے لیے پر جوش لوگوں نے کاربونری (*'Carbonari'*) کے نام سے خفیہ انقلابی انجمنوں پر مشتمل ایک تنظیم بنالی تھی۔ نیپلز سے شروع ہونے والی یہ تنظیم رفتہ رفتہ پورے اٹلی میں پھیل گئی۔ اس تنظیم کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں ہر قسم اور طبقے کے لوگ شامل تھے۔ اس کی تنظیم زیادہ مضبوط نہیں تھی لیکن اس کا انقلابی جذبہ تبدیلی کی پکار کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔ کوئی ٹھوس کامیابی نہ ملنے کے باوجود عوام نے حکمرانوں کی راتوں کی نیندیں ضرور حرام کر رکھی تھیں۔ جب 1820 میں نیپلز میں بغاوت ہوئی تو میٹرنخ نے اتحاد اربعہ کی آڑ میں بڑے مظالم کیے اور سارے یورپ کے انقلابیوں کو یہ سبق سکھانا چاہا کہ انقلاب کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ انقلاب کو دبا تو دیا گیا لیکن یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے لیے ابھی بہت تیاری اور تنظیم کی ضرورت ہے۔

مقامی بغاوت کا عمل جاری رہا۔ جیسے ہی فرانس میں 1830 کا انقلاب آیا، اٹلی میں ایک بار پھر بغاوت شروع ہو گئی۔ پاپائی ریاستوں (The Papal States) میں شدید مظاہرے ہوئے۔ پرما (Parma) اور موڈینا (Modena) کی ریاستوں سے ان کے حکمرانوں کو نکال دیا گیا۔ باغیوں کو امید تھی کہ فرانسیسی حکمراں لوئی فلپ اول (Louis Philippe-I) ان کی مدد کرے گا، لیکن فلپ اتنا دریادل نہیں تھا۔ اسے اپنے تخت سے پیار تھا۔ لوئی کے لیے ایسے موقع پر آسٹریا (Austria) اور اس کے چانسلر میٹرنخ (Metternich) کے ساتھ اپنی پرانی دشمنی دوبارہ مول لینا مہلک ثابت ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میٹرنخ نے ایک بار پھر بغاوت کو سختی سے دبا دیا اور یہ واضح ہو گیا کہ جامع تنظیم اور منصوبہ بندی کے بغیر محض مقامی سطح پر بغاوت کر کے اٹلی میں ایک نئے دور کا آغاز کرنا ناممکن تھا۔ آخر کار ایسی صورت حال پیدا ہو گئی جو دراصل اتحاد کے لیے ضروری تھی۔

13.3.2 جوسف مزینی (Giuseppe Mazzini, 1805–1872)

قومی یکجہتی کے لیے قومی شعور اور جذباتی تعلق کے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر تڑپ اور جدوجہد کی ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب تک اٹلی میں اس کی کمی تھی جسے مزینی نے پورا کیا۔ اس کا شاعرانہ دل آزادی کی خواہش سے لبریز تھا اور اس نے اپنی نظموں کو آزادی اور قوم پرستی کے نظریات کا علمبردار بنایا۔ اس نے اطالویوں کی روح کو جدوجہد کے جذبے سے بھر دیا اور اسی لیے اسے 'اطالوی قوم پرستی کی روح' ('Soul of Italian Nationalism') کہا جاتا ہے۔ مزینی کی تحریروں کو خطرناک سمجھ کر اسے جلاوطن کر دیا گیا۔ اسے غیر ملکوں میں بھٹکنا پڑا۔ اس کا زیادہ تر وقت لندن میں گزرا جہاں یورپ بھر کے انقلابی دانشور بھاگ کر پناہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ وہاں اس کی ملاقات مارکس سے ہوئی۔ لیکن وہ مارکس سے الگ فلسفے پر یقین رکھتا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ اٹلی کے اتحاد میں سب سے بڑی رکاوٹ غیر ملکی قبضہ اور مداخلت ہے۔ آسٹریا کے اٹلی سے نکلتے ہی مقامی حکمرانوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے اور غیر ملکی مداخلت نہ ہونے کی صورت میں اطالوی محب وطن اپنا مقصد پورا کر سکیں گے۔ یہ کام خود اطالویوں کو اپنی ہمت اور تنظیم کے بل بوتے پر کرنا ہوگا۔ بیرون ملک سے مدد کی توقع رکھتے

ہوئے وہ اپنی تیاری کبھی مکمل نہیں کر پائیں گے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک تنظیم 'ینگ اٹلی' ('Young Italy') کی بنیاد رکھی جس کا مقصد اٹلی میں جمہوریہ قائم کرنا تھا۔ برطانیہ اور فرانس میں گھومتے پھرتے مزینی باقاعدگی سے لکھتا رہا اور لینن کی طرح بیرون ملک سے اپنے ہم وطنوں سے خطاب کرتا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ ینگ اٹلی بھی ایک خفیہ تنظیم تھی کیونکہ کسی بھی تنظیم کو کھلے عام کام کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن یہ کاربونری جیسی مبہم نظریات والی تنظیم نہیں تھی۔ ینگ اٹلی کے پاس اٹلی کے مستقبل کا تصور تھا اور اسے حاصل کرنے کے لیے ایک باقاعدہ منصوبہ تھا۔ ینگ اٹلی کے متاثر کن کردار کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ پوری دنیا میں قومی تبدیلی کے لیے ایسی تنظیمیں شروع کی گئیں۔ ہندوستان میں 'ینگ بنگال'، ترکی میں 'ینگ ترکی' وغیرہ۔

بعد میں یکجہتی کی تحریک کافی وسیع اور متنوع ہو گئی۔ وہ مزینی کے منصوبوں، طریقوں اور مقاصد سے بھٹکتی چلی گئی، لیکن اٹلی میں قومی شعور اور جدوجہد کی ذہنیت لانے میں مزینی پوری طرح کامیاب رہا۔ سب نے اس کے تعاون کا اعتراف کیا اور یہ سچ ہے کہ اس کے بغیر یہ پس منظر پیدا نہ ہوتا جس کی وجہ سے عملی اقدامات میں کامیابی ممکن ہوئی۔ مزینی کے علاوہ دیگر ادیب بھی اس سمت میں کام کر رہے تھے۔ اگرچہ ان کے رائے مختلف تھی، لیکن ہر کوئی ایک آزاد اور متحد اٹلی دیکھنا چاہتا تھا۔ 'نیو گلف' (*Neo-Guelph*) تحریک اور پارٹی کا رہنما ونسنزو جیوبرٹی (Vincenzo Gioberti) ایک پادری تھا جو بعد میں سارڈینیا کا وزیر اعظم بھی بنا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب *The Moral and Civil Primacy of the Italians* (اطالویوں کی اخلاقی اور شہری برتری) میں اطالوی ریاستوں کے وفاق کی وکالت کی۔ آسٹریا کو اٹلی سے نکالے جانے کے بعد وہ چاہتا تھا کہ پوپ کی سربراہی میں اطالوی ریاستوں کا ایک وفاق بنے۔ اس طرح کچھ مشکلات دور ہو جاتیں اور بین الاقوامی تعاون بھی حاصل ہو جاتا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ قیادت ایک ایسی ریاست کو دی جا رہی تھی جو اٹلی کی سب سے زیادہ بدعنوان ریاست تھی۔ پوپ کی اپنی ریاستوں میں جب اس قدر بدعنوانی اور بدانتظامی تھی تو پورے اٹلی کا کیا حال ہوتا؟ اسی لیے جیوبرٹی کے نکتہ کی زیادہ تشہیر نہ ہو سکی۔ کچھ مصنفین ایسے تھے جن کی رائے تھی کہ اگر تمام ریاستیں سارڈینیا (Sardinia) میں ضم ہو جائیں تو اٹلی کا ایک طاقتور اور منظم بادشاہت کے طور پر ابھرنا یقینی ہے۔ یہ خیال بھی سب کے لیے قابل قبول نہیں تھا اور شروع میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ لیکن ایک ہی دہائی کے اندر اطالوی تحریک اس راستے پر چل پڑی اور اسی پر چل کر اتحاد مکمل ہوا۔

1848 کے انقلاب سے پہلے ہی اٹلی میں ایک انقلابی تبدیلی کا آغاز ہو چکا تھا۔ پوپ کے طور پر پائس نہم (Pius-IX) کے انتخاب کے بعد سے ہی ایک نئی ہوا چلنے لگی۔ پائس ایک آزاد خیال انسان تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد ایک ایسا شخص، پوپ بنا جو اپنے کردار اور فطرت سے لوگوں کو قیادت فراہم کر سکتا تھا۔ اسے اٹلی میں تبدیلی چاہنے والوں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ اس نے خود ہی پہل کی۔ اس کی ریاستوں میں سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے اور انتظامیہ میں کئی طرح کی اصلاحات کی گئیں۔ میٹرنخ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے کہا کہ ایک آزاد خیال پوپ؟ یہ ناممکن ہے۔ لیکن پائس کی پالیسی میں حقیقت پسندی تھی۔ اس کے اس اقدام کی پیروی دیگر ریاستوں میں بھی ہوئی۔ جوش کی ایک لہر دوڑنے لگی۔ پیڈمونٹ (Piedmont) میں احتساب (Censor) ختم کر دیا گیا اور ایک آزاد خیال آئین متعارف کرایا گیا۔ نیپلز میں بھی یہی پالیسی اپنائی گئی۔

1848 کے انقلاب کے بعد تو جیسے پورے اٹلی میں آگ سی لگ گئی۔ محبان وطن نے اسے فیصلہ کن لمحہ سمجھ کر ایک حتمی اور فیصلہ کن جدوجہد شروع کرنا چاہی۔ لومبارڈی(Lombardy) کے شہر ملان(Milan) کے باشندوں نے آسٹریا کی جانب سے تمبا کو پر عائد ٹیکس کے خلاف احتجاجاً سگریٹ پینا چھوڑ دیا۔ جو بھی سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا جاتا اس پر حملہ کر دیا جاتا۔ ایک طرح سے تمبا کو فسادات شروع ہو گئے۔ لیکن اس بے ساختہ تحریک کو آسانی سے دبا دیا گیا۔ وینیشیا (Venetia) میں ایک بار پھر جمہوریہ قائم کر دیا گیا۔ ٹسکنی (Tuscany)، نیپلز، پیڈمونٹ اور پاپائی ریاستوں سے لومبارڈی کو امداد بھیجی جانے لگی۔ جہاں مطلق العنانی کا خاتمہ ہو چکا تھا وہاں کے لوگ دوسروں کی مدد کے لیے متحد ہونے لگے۔ میٹرنخ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے زوال کے بعد آسٹریا خود مشکل میں پڑ گیا۔ پورے اٹلی میں پہلی بار تحریکیں قومی نوعیت کی ہو گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کامیابی ضرور ملے گی، لیکن ابھی دیر تھی۔

بوڑھے آسٹریائی فیلڈ مارشل جوسیف راڈسکی(Joseph Radetzky) نے بساط پلٹ دی۔ اس نے دوسری جگہوں سے فوجیں لا کر انہیں اٹلی میں تعینات کیا اور اطالوی ریاستوں میں پھوٹ پڑنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند ہی دنوں میں اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ دوسری ریاستوں نے لومبارڈی سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ صرف پیڈمونٹ کی فوج وہاں رہ گئی اور اسے شکست دینا مشکل نہیں تھا۔ شمالی اٹلی پر ایک بار پھر آسٹریا کا تسلط قائم ہو گیا۔ ایک بار پھر انقلابی صورت حال پر قابو پا لیا گیا اور اٹلی ہی نہیں، پورے یورپ میں رجعت پسندی کو فتح حاصل ہو گئی۔ پوپ نے واقعات کا رخ دیکھا تو گھبرا گیا۔ اس نے اصلاحات واپس لے لیں۔ وہ کسی بھی طرح کیتھولک آسٹریا کے ساتھ جنگ کے لیے تیار نہیں تھا۔ کچھ رومیوں نے خونریزی شروع کر دی۔ پوپ فرار ہو گیا اور روم میں ایک بار پھر جمہوریہ قائم ہو گئی، جس کے تین حکمرانوں میں مزینی بھی شامل تھا۔ ٹسکنی میں بھی جمہوریہ کا اعلان کیا گیا تھا لیکن آسٹریائی فوج نے اسے اکھاڑ پھینکا۔ اٹلی پر آسٹریا کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی۔ ایک بار پھر اٹلی میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اپنے ملک کی کیتھولک آبادی کو مطمئن کرنے کے لیے فرانسیسی صدر لوئی نپولین نے پوپ اور اس کی ریاست کے تحفظ کے لیے ایک فوج روم بھیج دی۔ اٹلی اوپر سے پر سکون ہو گیا لیکن اندر سے ایسا نہیں تھا۔

13.3.3 کاؤنٹ کاوور (Count of Cavour)

پیڈمانٹ-سارڈینیا کی ریاست (Kingdom of Piedmont-Sardinia) اٹلی میں ایک استثنیٰ تھی۔ سارے اٹلی میں انقلاب اور انسداد انقلاب کے ادوار آتے جاتے تھے۔ لیکن پیڈمونٹ کے حکمران چارلس البرٹ (Charles Albert) نے اصلاحات کا سلسلہ نہیں روکا اور آسٹریا کے ساتھ معاہدے پر بھی رضامند نہیں ہوا۔ آسٹریائی افواج کے ہاتھوں کئی بار شکست کھانے کے بعد، اس نے تخت چھوڑ دیا اور اس کا بیٹا وکٹر ایمانوئل دوم(Victor Emmanuel-II) تخت پر بیٹھا۔ باپ کی طرح وہ بھی پر جوش تھا۔ تمام اٹلی کی نظریں اس نوجوان اور جوشیلے ایمانوئل پر تھیں لیکن حقیقت میں اٹلی کا نجات دہندہ کوئی اور تھا۔

1852 میں جب کاؤنٹ کاوور کو پیڈمونٹ کا وزیر اعظم بنایا گیا تو اٹلی کی قیادت ایک عملی اور دور اندیش سیاستدان کے ہاتھ میں آگئی۔ ابتدائی طور پر ایک فوجی انجینئر اور آزاد مطلق العنانی کا مخالف، کاوور اپنے وقت کا سب سے قابل منتظم اور رہنما ثابت ہوا۔ اس نے اس

سے قبل 'ال رسر جیمنٹو' (*Il Risorgimento*) نامی اخبار کے ذریعے آئینی بادشاہت کی تشہیر کی تھی۔اب اس نے اٹلی کے اتحاد کے لیے ایک قطعی خاکہ تیار کیا اور اس کے مطابق منصوبہ بند طریقے سے کام شروع کر دیا۔اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اٹلی کا اتحاد پیڈمونٹ کے حکمران کی قیادت میں ہوگا۔اس لیے سب سے پہلے پیڈمونٹ کو ایک طاقتور قوم بنانا ضروری تھا۔وہ بچپن سے ہی متجسس انسان تھا۔اس نے کئی بار یورپ اور اٹلی کا سفر کیا تھا اور مغربی معاشرے کو بخوبی سمجھتا تھا۔خاص طور پر برطانیہ اور فرانس کے اداروں سے وہ بہت متاثر تھا۔وزیراعظم بنتے ہی اسے اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا۔

جس وقت وہ اقتدار میں آیا، اس وقت پیڈمونٹ، قرضوں سے لدا ہوا تھا اور معیشت لڑکھڑا رہی تھی۔کاوور نے پیسہ بچانے کے بجائے سرمایہ لگا کر معاشی ترقی کی پالیسی اپنائی۔ریاست میں بڑے پیمانے پر ریلوے لائنیں بچھائی جانے لگیں۔سڑکوں، پلوں اور دیگر رفاہ عامہ کے کاموں کا تیزی سے آغاز کیا گیا۔زراعت اور صنعت کو حکومتی تحفظ اور امداد دی گئی۔ضروری سرمایہ حاصل کرنے کے لیے مذہبی درسگاہوں کو ختم کر دیا گیا۔دوسرے ممالک کے ساتھ تجارتی معاہدے کیے گئے۔آہستہ آہستہ ریاست میں خوشحالی کے آثار نمودار ہونے لگے۔نہ صرف خسارے کا بجٹ متوازن ہوا بلکہ بچت بھی شروع ہو گئی۔اب کاوور نے لامرمورا (La Marmora) نامی ایک ماہر کمانڈر کی مدد سے فوج کو دوبارہ منظم کرنا شروع کیا تاکہ معاشی طاقت فوجی طاقت میں تبدیل ہو جائے۔اس نے اٹلی میں ہر قسم کے لوگوں کی حمایت حاصل کی۔مشترکہ اہداف اور متنوع خیالات کے حامل لوگ، جذباتی اور جمہوریت پسند شاعر مزینی، پرجوش سپاہی اور انقلابی گیری بالڈی اور ماہر سیاست دان کاوور اکٹھا ہو کر اٹلی کے اتحاد کی کوششیں کرنے لگے۔

داخلی تیاری مکمل کرنے کے بعد کاوور نے اپنی حکمت عملی تبدیل کی۔مسئلہ مشرق (Eastern Question) کے الجھنے کی وجہ سے بحیرہ اسود (Black Sea) کے ساحل پر کریمیائی جنگ (Crimean War) جاری تھی۔نپولین کے زوال کے بعد پہلی بار ایک بین الاقوامی جنگ شروع ہوئی جس میں روس، آسٹریا، ترکی، فرانس اور برطانیہ جیسے طاقتور ممالک کے مفادات داؤ پر لگے تھے۔دوراندیش کاوور نے یہاں ایک موقع دیکھا۔کاوور نے اپنے سپاہیوں کو برطانیہ اور فرانس کی فوجوں کی مدد کے لیے بھیجا جو روس کے خلاف شکست کھا رہی تھیں۔اگرچہ یہ جنگ فیصلہ کن ثابت نہیں ہوئی، لیکن کاوور کے سپاہیوں نے اپنی قابلیت کا نشان ضرور چھوڑا۔جنگ کے بعد پیرس میں ایک کانفرنس بلائی گئی۔اس میں کاوور کو بھی دعوت ملی۔کاوور کے لیے یہ ایک اہم رسمی منظوری تھی۔کاوور کو پیرس میں اٹلی کا مسئلہ پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔آسٹریا کی ناراضگی اور مخالفت کے باوجود اٹلی کے اتحاد اور آسٹریا کی اٹلی سے بے دخلی کے ترجمان کاوور کو پیرس میں بے پناہ عزت مل رہی تھی۔اس نے اس مسئلے میں نپولین سوم کی دلچسپی پیدا کی۔پیرس میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا، لیکن اٹلی کا اتحاد اب یورپ کا مسئلہ بن گیا، کیونکہ تمام طاقتوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی۔وہ ریاستیں جن کی آسٹریا کے ساتھ دشمنی تھی ہمدردی ظاہر کرنے لگی۔اس طرح، ایک تیز سفارتی اقدام کے ساتھ، کاوور نے اپنے مقصد کی طرف ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اٹلی کی پیدائش کریمیا کی کیچڑ میں ہوا تھا۔

کاوور کو اب نپولین سوم کی مکمل حمایت حاصل ہونے لگی۔ وہ کہتا تھا کہ ہم چاہے یا نہ چاہے، ہماری قسمت کا انحصار فرانس پر ہے۔ وہ نپولین کی ذہنیت کو جانتا تھا۔ دوسری طرف نپولین کو بھی اٹلی میں دلچسپی تھی۔ جوانی میں اس کا کاربونری سے بھی گہرا تعلق رہا تھا۔ معاملہ کچھ بھی ہو، وہ قوم پرستی کے اصول کو ایک موثر ہتھیار سمجھتا تھا اور ایک ذات، زبان اور مذہب کے لوگ ایک ریاست میں رہیں، اس میں اس کی ہمدردی اور اس کی پالیسی دونوں شامل تھیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے چچا نپولین نے آسٹریا کی فتح سے ہی اپنی عظمت کا پس منظر تیار کیا تھا۔ اسے بخوبی معلوم تھا کہ فرانسیسی لوگ عزت و وقار کے خواہاں ہیں اور اگر اسے فتح مل جائے اور فرانس کی سرحدیں تھوڑی بھی وسیع ہو جائیں تو اس کی حیثیت مضبوط ہو جائے گی۔ اس نے جمہوریہ کا گلا گھونٹ کر دوسری بار سلطنت قائم کی تھی لیکن اس سلطنت کو پہلے جیسی شان و شوکت کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس نے کاوور کی آسٹریا کی مخالفت کی حمایت کی۔ دریں اثنا، اس پر ایک اطالوی کاؤنٹ نے حملہ کیا جس سے شبہ پیدا ہوا کہ وہ اٹلی سے ناراض ہو سکتا ہے، لیکن اٹلی میں اس کی دلچسپی بدستور جاری رہی۔

حالات کو سازگار دیکھ کر کاوور نے خفیہ طور پر پلومبیرس نامی جگہ پر نپولین سے ملاقات کی اور دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پایا جسے معاہدہ پلومبیرس (Plombières Agreement) کے نام سے جانا گیا۔ کسی رسمی معاہدے پر دستخط نہیں تو نہیں ہوئے، لیکن نپولین نے آسٹریا کے خلاف پیڈمونٹ کی مدد کرنے پر اتفاق کیا، بشرطیکہ آسٹریا اپنی طرف سے حملہ کر کے خود جارح قرار پائے۔ معاہدے کے مطابق آسٹریا کو بے دخل کرنے کے بعد لومبارڈی، وینیشیا اور پیڈمونٹ میں پوپ کی ریاست کے کچھ حصے کو ملا کر اٹلی کی ریاست بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ وسطی اٹلی میں پوپ اور ٹسکنی کی ایک متحدہ ریاست بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ روم پوپ کے کنٹرول میں ہی رہنے دیا گیا۔ پوپ شاید اپنے نقصان کے لیے تیار نہ ہوتا، اس لیے اطالوی ریاستوں کا ایک وفاق بنانے اور پوپ کو اس کا صدر بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ نپولین کی مدد کے بدلے، کاوور نے فرانس کو نیس (Nice) اور سیوائے (Savoy) کے علاقے دینے کا وعدہ کیا۔ اس طرح تجارتی انداز میں معاہدے کی شرائط کو حتمی شکل دی گئی لیکن ان دونوں میں سے کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ یہ کوئی مستقل انتظام ہو گا۔ نپولین بعد میں آسٹریا کے بجائے پورے اٹلی پر فرانسیسی اثر و رسوخ قائم کرنے کی پالیسی اپنا سکتا تھا۔ کاوور جانتا تھا کہ فرانس کو مدعو کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس وقت اس کے پاس یہ خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اب کاوور کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ جنگ کیسے شروع کی جائے کہ نتیجہ اس کے حق میں تو ہو ہی اور آسٹریا حملہ آور دکھائی دے۔ اس کا واحد راستہ اشتعال انگیز پالیسی اپنانا تھا۔ کاوور نے اپنی فوج کو سرحدوں پر کھڑا کرنا شروع کر دیا۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں ہونے لگیں۔ سیدھے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ آسٹریا کو اکسایا جانے لگا۔ حالات خراب ہونے پر آسٹریا نے دوسرے ممالک کی توجہ مبذول کرائی۔ برطانیہ نے ثالثی کی تجویز پیش کی۔ اگر اس تجویز پر عملدرآمد میں جلد بازی کی جاتی تو کاوور بھی اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا اور اس کا منصوبہ ادھورا رہ جاتا۔ لیکن آسٹریا نے تاخیر کر دی اور پیڈمونٹ کو خبردار کیا کہ وہ اپنی افواج کو ہٹا کر غیر مسلح کر دے۔ کاوور کی خواہش پوری ہوئی۔ اس نے انتباہ کو نظر انداز کیا اور آسٹریا نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ اب سب کچھ کاوور کے منصوبے کے مطابق ہونے لگا۔

1859 کی میجنٹا کی جنگ(The Battle of Magenta) میں پیڈ مونٹ کو کامیابی ملنا شروع ہو گئی۔ میجنٹا کی فتح کے بعد اطالوی ریاستوں میں عوامی بغاوتیں شروع ہو گئیں اور وہاں کے حکمرانوں میں خوف وہراس پھیل گیا۔ پیڈ مانٹ اور فرانس کی مشترکہ افواج کے ہاتھوں سولفیرینو کی جنگ(The Battle of Solferino) میں آسٹریا کی شکست کے بعد لومبارڈی پر قبضہ کر لیا گیا اور وینیشیا کا سقوط بھی قریب ہی تھا۔ پھر ایک غیر متوقع واقعہ ہوا۔ نپولین متزلزل پالیسی کا آدمی تھا۔ پہلے تو اس نے ولافرانکا میں آسٹریائی شہنشاہ سے ملاقات کی اور کچھ شرائط کے ساتھ ولافرنکا جنگ بندی(Armistice of Villafranca) پر دستخط کیے اور اس کے کچھ ہی دن بعد اپنے وعدوں اور منصوبوں کو ترک کرتے ہوئے آسٹریا کے ساتھ زیورخ کا معاہدہ(The Treaty of Zurich) کر لیا۔ اپنی فطرت کے عین مطابق، اس نے اپنی پالیسی کے نتائج کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی پالیسی سے پوپ کی سربراہی میں ایک وفاق بننے کے بجائے ایک طاقتور ریاست قائم ہو جائے گی جو فرانس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ پوپ کی طاقت کے کمزور ہونے کی وجہ سے کیتھولکوں میں اس کی مقبولیت میں کمی آ سکتی تھی۔ اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ وہ شاید اٹلی میں مصروف رہے اور کوئی اور حملہ کر دے۔ اس لیے کاوور کی رائے لیے بغیر اس نے آسٹریا سے معاہدہ کر لیا۔ اسے دھوکہ دینے میں کوئی جھجک نہیں محسوس ہوئی۔ اس معاہدے کے مطابق وہ جنگ سے الگ ہو گیا۔ منتوآ(Mantua) اور پیشیرا(Peschiera) کو چھوڑ کر لومبارڈی تو پیڈ مونٹ کو دے دیا گیا لیکن وینیشیا پر آسٹریا کا قبضہ برقرار رکھا گیا۔ وسطی اٹلی کے حکمرانوں کو ان کی سابقہ حکومتوں پر بھیج دیا گیا۔ لیکن جیسا کہ مورخ ہرنشا کا خیال ہے، اب اٹلی کی تقدیر آہستہ آہستہ عوام کے ہاتھ میں چلی گئی۔

کاوور کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، اب وہ کیا کرے؟ اس کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ وہ تنہا لڑائی جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن جب ایمانوئل تیار نہیں ہوا تو کاوور نے استعفیٰ دے دیا۔ جب حالات پر سکون ہوئے تو اسے واپس بلا لیا گیا۔ نپولین سوم نے نیس اور سیوائے کو لینے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا کیونکہ معاہدہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف، لومبارڈی پر پیڈ مونٹ کا پہلے ہی قبضہ ہو چکا تھا۔ وسطی اٹلی کی ریاستوں میں عوام اس قدر مشتعل ہو چکے تھے کہ وہ اپنے جاگیر دار حکمرانوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور ان حکمرانوں میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں تھی کہ وہ خود واپس لوٹ سکیں۔ ان ریاستوں میں انقلابی مجلسیں قائم ہو چکی تھیں اور وہ پیڈ مونٹ کے ساتھ الحاق کے لیے اتاولے ہو رہے تھے۔ صرف آسٹریا کی مداخلت ہی صورتحال کو بدل سکتی تھی۔ لیکن اب نپولین آسٹریا کے اثر ورسوخ کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ برطانیہ نے تجویز پیش کی کہ ان شاہی ریاستوں کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے دیا جائے۔ نپولین اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ اگر فرانس کو نیس اور سیوائے مل جائیں تو اسے ان ریاستوں کے پیڈ مونٹ میں ملنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اب ایک نیا تجربہ شروع ہوا۔ 1860 میں عوامی استصواب رائے کے لیے ووٹنگ ہوئی۔ وسط اٹلی کی ریاستوں نے تقریباً متفقہ طور پر پیڈ مونٹ میں اور نیس اور سیوائے نے فرانس میں انضمام کو قبول کر لیا۔ نیس اور سیوائے کے کھونے پر اٹلی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اٹلی کے لوگ یہ بھول گئے کہ ثقافتی طور پر یہ صوبے فرانس کے زیادہ قریب تھے اور ان کے جانے سے اٹلی کی یکسانیت برقرار رہتی اور اس کا کوئی خاص نقصان بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود گیری بالڈی نے کاوور پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ تم نے مجھے اپنے ہی وطن میں اجنبی بنا دیا ہے۔

13.3.4 جوزف گیری بالڈی (Giuseppe Garibaldi)

زیادہ تر اٹلی اب منظم ہو چکا تھا لیکن ابھی بھی کچھ حصہ باقی تھا۔ نیپلز، سسلی (Sicily) اور پاپائی ریاستوں کا ایک حصہ ابھی بھی الگ تھا۔ وینیشیا پر آسٹریا کا قبضہ تھا۔ اس نامکمل کام کو مکمل کرنے کا سہرا پرجوش محب وطن گیری بالڈی کو جاتا ہے۔ گیری بالڈی نے پوری دنیا کے قوم پرستوں کو اپنی حب الوطنی سے متاثر کیا۔ وہ نیس میں پیدا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کاوور نے نیس فرانس کو دیا تو اسے دکھ ہوا تھا۔ بچپن سے ہی وہ اٹلی کے مفادات کے لیے وقف تھا اور اس کی آزادی کے لیے مختلف قسم کی تحریکوں میں شامل رہا۔ اس نے سمندر چھان مارے تھے اور بحری قزاقوں سے بھی جنگ کی تھی۔ اس نے کتنی ہی بار خطرہ مول لیتے ہوئے بغاوت کی تھی اور ایک بار جب وہ پکڑا گیا تو اسے موت کی سزا بھی سنادی گئی تھی۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ لیکن وہ جہاں بھی رہا ہر جگہ اپنی قیادت کے نشان چھوڑ گیا۔ وہ 12 سال امریکہ میں رہا اور لاطینی امریکی عوام کی جدوجہد آزادی میں حصہ لیتا رہا۔ یہیں اس نے مسلح رضاکار بھرتی کرنے شروع کیے جنہیں ان کے مخصوص سرخ کپڑوں کی وجہ سے سرخ قمیص والے ('Red Shirts') کہا جانے لگا۔ اس نے 1848 میں آسٹریا کے خلاف بہادری سے جنگ کی۔ روم میں فرانسیسی فوج سے لڑتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کو بھی کھو دیا۔ کسی طرح وہاں سے فرار ہونے کے بعد وہ دوبارہ امریکہ چلا گیا اور نیویارک سے پیسے کمانے کے بعد جب وہ واپس اٹلی آیا تو اس نے کچھ دن سکون سے رہنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن اٹلی کے آزاد ہوئے بغیر اسے سکون کیسے ملتا؟ 1856 میں، وہ مزینی کے اثر سے آزاد ہو کر کاوور کا حامی بن گیا۔ کاوور نے اسے ایک ہی ملاقات میں اپنا پیروکار بنا لیا تھا۔ اختلافات کے باوجود، اس نے کاوور کی حمایت کی کیونکہ اس کے خیال میں اسی میں اٹلی کی بھلائی تھی۔ وہ بہادر، بے مثال جرات والا اور دانشمند سمجھا جاتا تھا۔ اس کی قیادت کو لوگ بآسانی قبول کر لیتے تھے۔

جب نپولین کے ساتھ معاہدہ ناکام ہوا تو کاوور نے کہا تھا 'مجھے شمالی سرے سے سفارت کاری کی مدد سے اٹلی کی تعمیر نہیں کرنے دی گئی، اب میں ایسا جنوب سے انقلاب کی مدد سے کروں گا۔' یہ موقع اس وقت آیا جب سسلی میں بغاوت ہوئی۔ گیری بالڈی نے 1150 وفادار اور سرفروش پیروکاروں کے ایک چھوٹے سے دستے کو منظم کیا تھا، جسے 'دی تھاؤزنڈ' ('The Thousand') کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ جب اسے سسلی کے جزیرے میں بغاوت کی خبر ملی تو وہ اپنے انہیں ساتھیوں کے ساتھ جینوا (Geneva) سے سسلی کے لیے روانہ ہوا۔ جب وہ سمندر کے مخدوش حالات کا سامنا کرنے کے بعد سسلی پہنچا تو کوئی بھی اسے قربانی کا بکرا کہہ سکتا تھا۔ دشمن کی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف جوش و جذبہ کافی نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود، اپنے بے مثال جوش، مہارت اور بادشاہ سے غیر مطمئن لوگوں کی بے مثال حمایت کی وجہ سے، گیری بالڈی نے کامیابی حاصل کی۔ جب اس نے میسینا (Messina) کے قلعے کے علاوہ پورے سسلی پر قبضہ کر لیا تو جس نے بھی اس کے بارے میں سنا وہ دنگ رہ گیا۔ اس نے فوری طور پر خود کو ایمانوئل کا نمائندہ قرار دے کر سسلی کا پیڈمونٹ میں الحاق کر دیا۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ نپولین سوم برطانیہ کے ساتھ مل کر گیری بالڈی کا راستہ روکنا چاہتا تھا لیکن برطانیہ نے اٹلی سے ہمدردی ظاہر کی اور گیری بالڈی کی مہم کامیاب ہو گئی۔ کچھ تیاری اور تنظیم کے بعد اس نے نیپلز پر حملہ کیا۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر تھی کیونکہ اسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی حمایت حاصل تھی اور کامیابی نے اس کی فوج کے حوصلے بلند کر رکھے تھے۔ لیکن مخالفت میں ایک لاکھ کی فوج کھڑی تھی

جس میں غیر مطمئن فوجی بھی شامل تھے۔ایک ناراض فوج ہمیشہ نقصان کا باعث بنتی ہے۔ان ناراض سپاہیوں نے گیری بالڈی کی فوج میں شمولیت اختیار کرنا شروع کر دی اور جب جنگ شروع ہوئی تو اپنی تعداد کے باوجود نیپلز کی فوج کے پیر اکھڑ گئے۔بادشاہ بھاگ گیا اور فاتح گیری بالڈی ایک ہیرو کے طور پر نیپلز میں داخل ہوا۔

کاوور اپنے کام کو ایک اور محب وطن اطالوی کے ذریعے مکمل ہوتے ہوئے دیکھ کر مطمئن تھا لیکن جب گیری بالڈی نے روم پر حملے کا منصوبہ بنایا تو وہ گھبرا گیا۔نپولین سوم کی فوج پوپ کی حفاظت کے لیے روم میں موجود تھی۔کاوور کو ڈر تھا کہ کہیں نپولین مداخلت نہ کر دے۔ تاہم وہ یہ جانتا تھا کہ روم کو چھوڑ کر پوپ کی تمام ریاست پر ہی کیوں نہ قبضہ کر لیا جائے تب بھی نپولین کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔اس کے علاوہ، اس نے یہ بھی شک تھا کہ کہیں گیریبالڈی کے پیروکار جمہوریہ کے حامی نہ بن جائیں۔لہٰذا،اس سے پہلے کہ گیری بالڈی اپنے جوش میں کچھ کر بیٹھتا کاوور نے خود اپنی فوج کو جنوب کی طرف بھیج دیا۔پاپائی ریاستوں کو فتح کرتے ہوئے یہ فوج، گیری بالڈی کی فوج سے جا ملی۔اس وقت تک میسینا کا قلعہ بھی فتح ہو چکا تھا۔مفتوحہ علاقوں میں ہر جگہ عوامی استصواب رائے کے بعد، لوگوں نے بھاری اکثریت سے پیڈمونٹ کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔

سارے اٹلی میں وینیشیا اور روم کے آس پاس کے علاقوں کو چھوڑ کر ہر جگہ ایک ہی اقتدار قائم ہو چکا تھا۔1861 میں ایمانوئل کو اٹلی کا بادشاہ قرار دیا گیا اور اٹلی کے اتحاد کا خواب کسی حد تک پورا ہو گیا۔کچھ دنوں بعد کاوور کا انتقال ہو گیا۔اس نے اتحاد کو مکمل ہوتے نہیں دیکھا، لیکن اس کی زندگی میں اٹلی ایک حقیقت بن چکا تھا۔اسے اپنی زندگی کے مشن کی تکمیل کا اطمینان ضرور ہو گا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم پامرسٹن(Palmerston) نے اسے جذباتی خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ کاوور کی ذہانت، جوش اور حب الوطنی نے ناممکن کو ممکن بنایا اور لوگ اس کی زندگی سے ہمیشہ سیکھیں گے۔روم کا الحاق نہ ہونے کی وجہ سے اٹلی کی سلطنت ادھوری دکھائی دے رہی تھی اور گیری بالڈی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر کے روم پر حملہ کیا۔یہ ایک غلط اقدام ہو سکتا تھا چنانچہ اطالوی فوج نے اسے روک دیا اور گیری بالڈی زخمی ہو گیا اور پکڑا گیا۔بہر کیف بیرونی طاقتوں نے اٹلی کے اتحاد کو مکمل کرنے میں بہت مدد کی۔ شمال میں جرمنی کو متحد کرنے کی کوششیں بھی متوازی طور پر جاری تھیں۔کاوور کی طرح پرشیا کا چانسلر بسمارک(Bismarck) بھی آسٹریا کو جرمنی کا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا۔اس نے آسٹریا کو شکست دینے کے اپنے منصوبے میں اٹلی کو بھی شامل کیا۔ایمانوئل نے دور اندیشی کا مظاہرہ کیا اور جب پرشیا نے شمال سے آسٹریا پر حملہ کیا تو جنوب سے اس کی فوج نے وینیشیا پر حملہ کر دیا۔نتیجے کے طور پر، آسٹریائی افواج تقسیم ہو گئیں اور 1866 میں سادووا کی جنگ(The Battle of Sadowa) میں پرشیا کے ہاتھوں آسٹریا کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔جب معاہدہ ہوا تو اس میں دیگر شرائط کے ساتھ یہ بھی شامل کیا گیا کہ وینیشیا اٹلی کو واپس کر دیا جائے۔

ادھر فرانس میں نپولین کے حالات خراب ہوتے جا رہے تھے اور روم میں اس کی فوجی دستے کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ پہلے اس کی تعداد کم ہوئی، پھر مقام تبدیل کر دیا گیا، لیکن 1870 میں جب پرشیا نے فرانس پر بھی حملہ کیا تو اس دستے کو واپس بلا لیا گیا۔ایمانوئل فوراً

روم میں داخل ہو گیا۔ عوام خوش تھی۔ پوپ کے سپاہیوں نے تھوڑی مزاحمت کی لیکن آخر میں روم کو تمام اٹلی کا دارالحکومت قرار دے دیا گیا۔ استصواب رائے میں بھی بھاری اکثریت پوپ کے خلاف بادشاہ کے حق میں رہی۔ ایمانوئل نے اعلان کیا: 'مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں اپنے ملک کو خوشحال اور عظیم بنانا ہے۔' اس طرح اٹلی اپنی تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہوا۔

پوپ انتہائی غیر مطمئن تھا۔ اس نے اپنے آپ کو محلات تک محدود کر لیا اور ان نئی ریاستوں سے کوئی تعلق رکھنے سے انکار کر دیا۔ پوپ کیتھولک مذہب کے مرکز میں ہی جلاوطنی کی زندگی گزارنے لگا۔ یہ صورت حال پچاس سال تک بنی رہی اور کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ جب 1922 میں اقتدار مسولینی کے ہاتھ میں آیا تو اپنی فاشسٹ طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے پوپ کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا اور پوپ کے محلات کو ایک آزاد ملک کی منظوری مل گئی۔ دنیا کی سب سے چھوٹی اور صرف مردوں کے زیر تسلط ریاست، جس میں ایک بھی خاتون شہری نہیں، واٹیکن سٹی (Vatican City) قائم ہوئی۔ کچھ چھوٹے چھوٹے صوبے ابھی بھی اٹلی کی سرحدوں سے باہر ایسے تھے جنہیں اطالوی لوگ اپنا سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کو اٹلی میں ضم کرنے کی تحریک جاری رہی جس نے فاشزم کو پروان چڑھانے میں مدد کی۔ لیکن حقیقت میں اٹلی کی متحد اور منظم اطالوی ریاست 1870 میں ہی پیدا ہوئی تھی۔

13.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ آسٹریا کے چانسلر میٹرنخ نے لارڈ پامسٹرن سے ہوئی اپنی بات چیت مین اٹلی کو محض ایک جغرافیائی مظاہرہ کہا تھا۔ 1815 میں جو کچھ ناممکن نظر آتا تھا وہ تقریباً 50 سال بعد ہی حقیقت بن گیا۔ مسئلہ اتنا پیچیدہ تھا کہ اسے حل کرنے کے لیے ہر قسم کی پالیسی اپنانا ضروری تھی۔ جوزف مزینی نے ایک متحد اٹلی تصور عوام کے سامنے رکھا اور ینگ اٹلی تحریک چلائی۔ کاوور نے تمام پیچیدگیوں کو سمجھ کر سیاست، تدبر، جنگ اور انقلاب جیسے ہر طریقے کو استعمال کیا۔ اس نے ضرورت پڑنے پر عوامی حمایت کا استعمال کیا اور ضرورت پڑنے پر غیر ملکی امداد بھی لی۔ اس تناظر میں اگر صرف ایک شخص کی تعریف کرنی ہو تو کاوور کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ اعداد و شمار کے ذریعے تاریخ کو سمجھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ مزینی اٹلی کی روح، کاوور عقل اور گیریبالڈی ہاتھ کی طرح تھے، ایمانوئل خود جسم تھا۔ یہ استعارہ کسی حد تک درست ہے۔ یہ مزینی تھا جس نے اٹلی کو ایک زندہ تخیل کے طور پر پیش کیا، جسے کاوور کی ذہانت اور مہارت نے شکل دی تھی۔ گیری بالڈی نے اسے مضبوط اور وسیع کیا تھا۔ اس لیے صرف تینوں کو ہی خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چارلس اور اس کے بیٹے اور اٹلی کے بادشاہ ایمانوئل کو بھی ان کی آزاد خیال اور دور اندیش پالیسیوں کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اٹلی کے اتحاد میں ہم عصر حالات کا ہی اہم کردار تھا۔ انیسویں صدی بورژوا طبقے کی ترقی کی صدی رہی ہے۔ اس طبقے نے یورپ بھر میں جاگیردارانہ سلطنتوں کی مخالفت اور ان سے مقابلہ کیا۔ اس نے ہر حریت پسند تحریک کی حمایت کی اور وقت آنے پر قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ صنعتی انقلاب، قوم پرستی اور سرمایہ دار طبقے کی ترقی بیک وقت ہوئی۔ قوم پرستی کے نام پر طاقتور اور منظم ملک میں معاشی ترقی اور منافع کا امکان تھا۔ اس لیے سرمایہ دار طبقے نے اسے اکسایا، بڑھایا اور اپنے ہاتھ میں رکھا۔ قوم پرستانہ جذبات کے پھیلنے کی وجہ

سے عوام بھی اس میں شامل ہو جاتے تھے۔ان کی طاقت ہی دراصل کبھی کبھی فیصلہ کن طاقت ہوتی تھی، لیکن ان کے شعور میں اضافہ نہ ہونے پائے اور وہ اپنی طاقت جان کر اقتدار کے لیے لڑنا شروع نہ کردیں،اس لیے تحریکوں کو ہمیشہ اس جگہ روک دیا جاتا تھا جہاں سے وہ عوام کے ہاتھ میں جانے لگتے تھے۔اٹلی میں بھی مزینی کی قیادت عوام کو بیدار کرسکتی تھی اور وہاں پر آزاد خیالوں کو شکست دی جاسکتی تھی لیکن کاوور اور دوسرے آزاد خیالوں نے ہمیشہ آگے بڑھ کر باد شاہت اور آزاز خیالی کا جھنڈا جمہوریت اور اشتراکیت سے آگے رکھا اور اٹلی کی اتحاد اور ترقی خالصتاً متوسط طبقے کے آئینی انداز میں کیا گیا۔اٹلی میں عوام اور اشتراکیت کو بھلے ہی آگے آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن یہاں پرشیا اور جرمنی کی طرح مطلق العنانی اور جارحیت نہیں تھی۔پیڈمونٹ میں خود ایک آزاد خیال آئین بنا کر اور وہیں سے اصلاحات کا سلسلہ شروع کرکے جہاں تک ممکن ہوسکا آئین اور رائے عامہ کا احترام کیا گیا۔اسی لیے ساری دنیا میں اٹلی کے رہنماؤں کو جو عزت ملی وہ جرمنی کے قائدین کو نہیں مل سکی۔لیکن دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ اٹلی کے اتحاد سے معاشرے کے صرف اعلیٰ طبقے کو ہی فائدہ پہنچا۔جنوبی اٹلی اور پورے اٹلی میں عام لوگوں کے مسائل جوں کے توں بنی رہے۔نیا جمہوری ڈھانچہ بھی ان کے حالات کو تبدیل نہیں کرسکا۔اس نے نئے نئے ٹیکسوں کے ذریعے ان کا استحصال ہی کیا۔ایسے ہی غریب ملک میں جہاں جمہوری مسائل مکمل طور پر سلجھ نہ سکے تھے، پہلی جنگ عظیم کے بعد فاشزم نئے نعروں اور نئے خوابوں کے ساتھ ابھرا اور اٹلی دنیا کی پہلی فاشسٹ ریاست بن گئی۔دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی اٹلی میں حقیقی تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔ صحیح معنوں میں عوام کو ایک صدی گزرنے کے بعد بھی انضمام کے ثمرات پوری طرح سے نہیں مل سکے۔عوام اب چوکس اور جدوجہد میں مصروف ہیں۔

13.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

پاپائی ریاستیں : (Papal States)یعنی وہ علاقے جو روم کے پاپائے اعظم کے زیر اقتدار تھے جیسے روم،مارچے، امبریا، روماگنا،اور ایمیلیا کے کچھ حصے۔

احتساب : (Censor)اخبارات اور ذرائع ابلاغ پر پابندیاں۔

ریسار جیمنٹو : لاطینی زبان میں اٹلی کے اتحاد کو کہتے ہیں۔

ریڈ شرٹس : گیری بالڈی کے پیروکار جو سرخ قمیص یا گاؤن پہنتے تھے۔

13.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

13.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. کس نے اٹلی کو محض جغرافیائی اظہار کہا؟
2. 'اطالوی قوم پرستی کی روح' کسے کہا جاتا ہے؟
3. ینگ اٹلی تحریک کی بنیاد کس نے رکھی؟

4. 'اطالویوں کی اخلاقی اور شہری برتری' کتاب کس نے تصنیف کی؟

5. نیو گلف تحریک کا رہنما کون تھا؟

6. 'ال رسر جیمنٹو' (*Il Risorgimento*) نامی اخبار کے ذریعے آئینی بادشاہت کی تشہیر کس نے کی تھی؟

7. ریسار جیمنٹو (Risorgimento) سے کیا مراد لیا جاتا ہے؟

8. ریڈ شرٹس کون تھے؟

9. کاربونری تنظیم کہاں سے شروع ہوئی؟

10. کاوور کون تھا؟

13.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اٹلی کے اتحاد کی راہ میں رکاوٹوں پر روشنی ڈالیے۔

2. کاربونری تنظیم کے بارے میں مختصراً بتائیے۔

3. نپولین سوم کی متزلزل اطالوی پالیسی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

4. گیری بالڈی کے روم پر حملے پر نوٹ لکھیے۔

5. یہ اکائی آپ کو کس قدر پسند آئی، دس سطروں میں بیان کیجیے۔

13.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مزینی اطالوی اتحاد کا بنیاد گزار تھا، تفصیلی وضاحت کیجیے۔

2. اٹلی کے اتحاد میں کاوور کا کیا کردار تھا، بالتفصیل بیان کیجئے۔

3. گیری بالڈی کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

13.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Droz, Jacques, *Europe between Revolutions, 1815–1848*, Fontana Press, London, 1967.
2. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
3. Gottlieb, Anthony, *The Dream of Enlightenment*: *The Rise of Modern Philosophy*, Penguin, UK, 2017.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).

6. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.

اکائی 14۔ جرمنی کا اتحاد

(The Unification of Germany)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 جرمنی میں قوم پرستی

14.3 جرمن اتحاد کے معاشی عوامل

14.3.1 صنعتی ترقی

14.3.2 بورژوا طبقے کا عروج

14.3.3 ریلوے کی توسیع

14.4 جرمنی کا اتحاد

14.4.1 1815ء میں جرمنی کی حالت

14.4.2 1848ء کے انقلابات اور جرمنی کے اتحاد کی کوشش

14.4.3 بسمارک اور جرمنی کا اتحاد

14.5 جرمنی اتحاد کے بعد

14.6 اکتسابی نتائج

14.7 کلیدی الفاظ

14.8 نمونہ امتحانی سوالات

14.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید (Introduction)

1870 سے پہلے جرمنی کوئی ایک ملک نہیں تھا بلکہ مختلف جرمن زبان بولنے والی ریاستوں میں منقسم ایک جغرافیائی اکائی تھا۔اس کے اتحاد میں متعدد رکاوٹیں تھیں جیسے قومی شعور کی کمی، حکمرانوں کی خود غرضیاں اور باہمی چپقلش ،بیرونی اثر ورسوخ اور بالادستی وغیرہ۔نپولین کے حملوں سے پہلے یہ تقریباً تین سو ریاستوں میں منقسم تھا جن میں سب سے طاقتور پرشیا تھا۔ مقدس رومی سلطنت کے قیام کے بعد سے یہ علاقے آسٹریا کے زیر تسلط تھے۔نپولین کے ہاتھوں آسٹریا کی شکست سے جرمنی اور اٹلی کو متحد ہونے کا موقع ملااور ان میں قوم پرستی کی بیج پھوٹنے لگے۔نپولین نے 300 ریاستوں کو ایک دوسرے میں ملا کر جرمن ریاستوں کی کل تعداد 38 کردی تھی۔اس نے آسٹریا اور پرشیا کو چھوڑ کر بقیہ جرمن ریاستوں کو ملا کر 1806 میں ایک رہائن وفاق (Confederation of the Rhine) تشکیل دیا جس کا سربراہ 1813 تک فرانس رہا۔1815 میں واٹرلو (Waterloo) کی جنگ میں نپولین کی شکست کے بعد آسٹریا کا چانسلر (وزیر اعظم) میٹرنخ یورپی سیاست پر حاوی ہوگیا۔وہ متحد جرمنی کے سخت خلاف تھا۔1815 میں آسٹریا کی صدارت میں ویانا کانگریس (The Vienna Congress) کے دوران 39 جرمن ریاستوں کو ملا کر ایک ڈھیلا ڈھالا جرمن وفاق (The German Confederation) تشکیل دیا گیا جس کی سربراہی آسٹریا کر رہا تھا۔

دوسری طرف جرمنی میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے معاشی اور اقتصادی ترقی کی رفتار تیز ہوگئی اور ایک طاقتور بورژوا طبقہ ابھر کر سامنے آیا جو ایک متحدہ جرمنی اور یکساں قانونی اور مالیاتی نظام کا خواہش مند تھا۔اس طبقے کے دباؤ کی وجہ سے 1834 میں ایک معاشی اتحاد یعنی زولورین کا قیام عمل میں آیا جس نے ملک میں ایک ریاست سے دوسری ریاست کے درمیان چنگیوں کی تعداد کم کردی۔اسی دوران ریلوے کی ترقی کی وجہ سے ملک کے مختلف حصے ایک دوسرے سے جڑنے لگے اور وہ اتحاد کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔1848 کے انقلابات کے دوران جرمن ریاستوں میں حریت پسندوں نے آزادی اور اتحاد کی کوشش کی۔ جرمن وفاق کے حریت پسند 1848 میں فرینکفرٹ اسمبلی میں ملے۔ان کا مقصد جرمنی کو ایک ملک بنانا تھا لیکن ان کا منصوبہ ناکام ہوگیا اور اس لوگوں کو میٹرنخ کے ذریعے سختی سے کچل دیا گیا۔اب زمین تو ہموار ہوچکی تھی مگر ایک اولوالعزم اور طاقتور قیادت کی سخت ضرورت تھی جسے پرشیا نے پورا کیا۔ جرمنی کے اتحاد کی ابتدا پرشیا کے تخت پر ولیم اول کے بیٹھنے سے ہوئی۔ولیم اول نے 1862 میں بسمارک کو اپنا وزیر اعظم منتخب کیا۔بسمارک نے ہی جرمنی کے اتحاد کا بیڑا اٹھایا۔اس نے اپنی 'خون اور فولاد' کی سخت پالیسی اور بروقت تدبر سے اس کام کو انجام دیا۔اسے پہلے آسٹریا سے نپٹنا پڑا جس کے لیے اس نے آسٹریا کے کمزور ہونے کا انتظار کیا اور مناسب وقت پر اسے میدان جنگ میں شکست دی۔اس طرح آسٹریا جرمنی سے باہر ہوگیا اور پرشیا کی صدارت میں شمالی جرمن وفاق تشکیل دیا گیا۔صرف چار جنوبی ریاستیں اس سے باہر تھیں جنہیں فرانس کی وجہ سے ہاتھ لگانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔بلآخر سیڈان کی جنگ میں فرانس کو شکست دے کر جرمنی کا اتحاد مکمل ہوگیا۔دوسری جرمن رائخ یا سلطنت قائم ہوئی اور جنوری 1871ء میں پرشیا کے حکمراں ولیم اول کو جرمنی کا قیصر یا شہنشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- جرمن قوم پرستی کے محرکات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- جرمنی کے اتحاد کے معاشی عوامل کے بارے میں پتہ لگا سکیں گے۔
- 1815 سے 1870 کے دوران جرمنی کے سیاسی حالات پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- جرمنی کے اتحاد میں بسمارک کے کردار کے بارے میں جان سکیں گے۔
- اتحاد کے بعد جرمنی کے حالات سے واقف ہو سکیں گے

14.2 جرمنی میں قوم پرستی (Nationalism in Germany)

1870 عیسوی سے پہلے نارڈک-ٹیوٹن نسل کے جفاکش اور محنتی لوگوں کا ملک جرمنی، بہت سی چھوٹی اور بڑی ریاستوں، رجواڑوں اور خطوں میں تقسیم تھا۔ در حقیقت یہ کسی ملک کا نام نہیں تھا بلکہ جرمن بولنے والی ریاستوں کے ایک گروپ کا نام تھا۔ ایسے بکھرے ہوئے جرمن بولنے والے لوگوں کے لیے جدید دور میں قوم پرستی ایک اہم جذبہ بن گئی۔ مختلف وجوہات کی بنا پر جرمن قوم پرستی میں شروع ہی سے تعصب اور عدم رواداری کی بو آنے لگی تھی۔ جرمن قوم پرستی میں فرد پر ریاست کی بالادستی کے اصول پر زور دیا جاتا تھا۔ نتیجے کے طور پر، یہ قومیت کے مازینی کے تصور سے بنیادی طور پر مختلف تھا۔ جرمن قوم پرستی نپولین کی جنگوں کے دوران ایک مضبوط قوت کے طور پر ابھرنا شروع ہوئی۔ نپولین کے ہاتھوں مقدس رومی سلطنت کے خاتمہ کے بعد جرمن ریاستوں کی تعداد تین سو سے گھٹ کر 38 ہو گئی تھی۔ نپولین نے جس طرح جرمن بولنے والے علاقوں کو تقسیم کر کے من مانی طور پر علاقائی ریاستیں بنانے کی کوشش کی، اس کے بطن سے قوم پرستی کا ایسا پودا نکلا جس نے بعد میں یورپ کی ترقی کو شکل دی۔ جرمنوں نے نہ صرف نپولین کی حکمرانی کے خلاف بلکہ فرانسیسی تہذیب کے صدیوں پرانے غلبے کے خلاف بھی بغاوت کی۔ فرانس کا انقلاب اور نپولین کا اثر جرمنی کے سب سے بڑے ثقافتی عروج کا دور تھا۔ گوئٹے، شیلر، ہرڈر، کانٹ، فکٹے، ہیگل، شیلر میشور اور بہت سے دوسرے مفکر اور صاحب بصیرت اس دور میں پیدا ہوئے اور انیسویں صدی میں جرمنی کو عمومی طور پر فکر کے میدان میں یورپ کا رہنما سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ جرمن فکر کی خصوصیات کا تعلق کسی نہ کسی طرح قوم پرستی سے تھا۔

ویسٹ فیلیا کے معاہدے سے پہلے جرمن بولنے والے لوگوں میں قومی شعور بہت کم تھا۔ وہ مقدس رومی سلطنت کی دنیا میں رہتے تھے۔ ان ریاستوں سے باہر وہ یورپ کے بارے میں سوچتے تھے، لیکن، جرمنی کے بارے میں وہ سب سے کم باخبر تھے۔ ان کے پاس کوئی ترقی یافتہ زبان نہیں تھی لیکن تہذیب کے لحاظ سے وہ فرانس کے معترف تھے۔ جرمن اشرافیہ نے فرانسیسی لباس، فیشن، آداب، خیالات اور زبان کو اپنایا۔ یہ سب ایک مہذب بین الاقوامی طرز زندگی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ عظیم فریڈرک نے اپنی کتابیں فرانسیسی زبان میں لکھیں اور اپنی سلطنت میں فرانسیسی افسران کا تقرر کیا۔

جرمنی کے اتحاد کے مختلف ادوار

(Source:https://www.insightsonindia.com/wp-content/uploads/2021/08/Unification-of-Germany.png)

1780 کے آس پاس جرمنی میں تبدیلی کے آثار نمودار ہوئے۔ 1748ء میں جان گوٹفرائڈ ہرڈر (Johann Gottfried Herder) کی کتاب *Ideas for the Philosophy of the History of Mankind* شائع ہوئی۔ ہرڈر ایک سنجیدہ طبیعت کا آدمی تھا اور فرانسیسی آداب کی نقل کرنا نامناسب سمجھتا تھا۔ وہ فرانسیسیوں کو ہلکے پھلکے لوگ سمجھتا تھا۔ اپنی کتاب کے آخر میں اس نے لکھا ہے، 'فرانسیسی آداب یا کسی بھی غیر ملکی انداز کی تقلید لوگوں کو سطحی اور مصنوعی بناتی ہے۔'' اس نے بتایا کہ جرمنی کے طریقے

فرانس کے طریقوں سے مختلف ہیں۔ اس لیے فرانسیسی طریقے جرمن عوام کے لیے قابل قبول نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کا خیال تھا کہ حقیقی ثقافت یا تہذیب صرف مقامی بنیاد سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اسے اعلیٰ طبقات کی شہری اور مصنوعی زندگی سے نہیں بلکہ عام لوگوں کی زندگی سے پروان چڑھنا چاہیے۔ ہرڈر کے خیال میں، ایک زبان والے لوگوں کی اپنی منفرد فطرت، شعور یا صلاحیت ہوتی ہے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ صرف وہی تہذیب مضبوط ہوگی جس کی اپنی 'قومی روح' یا قومی فطرت ہوگی۔ ہرڈر نے اسے 'وولک جسٹ' (Volksgeist) کا نام دیا۔ ہر عوام کی اپنی ایک خاص فطرت ہوتی ہے۔ ہرڈر نے قوموں کے درمیان تصادم کے بارے میں نہیں سوچا، اس نے صرف یہ کہا کہ ایک قوم سے دوسری قوم میں فرق ہے۔ وہ یہ بھی نہیں مانتا تھا کہ جرمن ثقافت بہترین ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر ایک زبان بولنے والی عوام کو اپنے اپنے طریقے سے اپنی صلاحیتوں کو نکھارنا چاہیے، ٹھیک اس طرح جیسے ایک پودے کی شاخیں اپنے آپ نکلتی جاتی ہیں۔ مختلف پودوں کے پھول، پھل اور پتے مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ان میں بیرونی اثر ورسوخ کی وجہ سے کوئی اچانک تبدیلی یا بگاڑ نہیں ہونا چاہیے۔

ہرڈر کی فلسفیانہ سوچ نے ثقافتی قوم پرستی کو جنم دیا۔ اس میں کوئی سیاسی شبہ نہیں تھا کہ جرمن نسل ایک طویل عرصے تک غیر سیاسی رہی۔ مقدس رومی سلطنت کی دنیا میں ان کے سامنے کوئی سیاسی سوال پیدا نہیں ہوا۔ انقلاب فرانس نے اسے پہلی بار ریاست اور سیاست کی طرف متوجہ کیا۔ انقلاب فرانس نے ثابت کر دیا تھا کہ اگر کوئی عوام ریاست پر قبضہ کرلے اور اسے اپنے مفاد کے لیے عزم کے ساتھ استعمال کر لے تو وہ کتنا کچھ حاصل کر سکتی ہے۔ پہلی بات یہ تھی کہ فرانسیسیوں نے شہری (citizen) ہونے کا وقار حاصل کیا تھا، وہ اپنے لیے خود ذمہ دار تھے اور ملک کے سیاسی واقتصادی امور میں حصہ لے رہے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان کی اپنی ریاست تھی جو اتحاد کے دھاگے سے مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی۔ اس ریاست میں ایک پوری قوم آزادی کے ایک نئے شعور کے جوش وجذبے سے لبریز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یورپ میں بہترین بن سکے۔

مقدس رومی سلطنت کا بیکار ہونا جرمن عوام کے لیے باعث شرم تھا جس کی وجہ سے ان کا آبائی وطن صدیوں تک یورپ کا میدان جنگ بنا رہا۔ اب انہیں یہ سوچ کر غصہ آتا تھا کہ کس طرح اس کے بادشاہ اور شہزادے عوام پر اپنی گرفت قائم رکھنے اور اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے آپس میں لڑتے تھے اور فرانسیسیوں کے سامنے خود کا مذاق بنواتے تھے۔ نتیجے کے طور پر، جرمنی کی قومی بیداری کا رخ نہ صرف نپولین اور فرانسیسیوں کے خلاف تھا، بلکہ ملک کو منقسم رکھنے والے بادشاہوں اور شہزادوں اور نیم فرانسیسی بنے اعلیٰ طبقات کے خلاف بھی تھا۔ جرمن نشاۃ ثانیہ کی یہ لہر 1800 عیسوی کے بعد تیزی سے پورے ملک میں پھیلنے لگی۔ جرمنی میں نشاۃ ثانیہ کی یہ تحریک جمہوری تھی کیونکہ اس میں عام آدمی کی اعلیٰ خصوصیات پر زور دیا گیا تھا۔ جرمنی میں سیاسی اتحاد اور سیاسی وقار دونوں کا فقدان تھا، نتیجتاً جرمن دونوں سے حیرت زدہ ہو رہے تھے۔ ان کی بہت سی پریشانیاں تھیں۔ اب انہوں نے محسوس کیا کہ جرمن نسل کی سنجیدہ اخلاقی فکر، مضبوط عزم اور مخصوص ثقافت کا اظہار کرنے والی عظیم جرمن ریاست ان سب کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ایسی ریاست جرمنی کے شہریوں کو انفرادی سطح پر اخلاقی معیار فراہم کرے گی، چھوٹی خود غرض ریاستوں کا سوال حل کرے گی اور قومی زندگی کو ٹوٹ پھوٹ سے بچائے گی۔ وہ غیر ملکیوں کو اپنی سرحدوں میں گھسنے کی اجازت نہیں دے گی اور انہیں شکست کے احساس سے محفوظ رکھے گی۔ یہ قوم پرستانہ فلسفہ کچھ مبہم تھا، کیونکہ عملی طور

پر کرنے کے لیے کچھ خاص نہیں تھا۔

فادر جان نے نوجوانوں کی ایک قسم کی تحریک شروع کی۔اس نے بہت ورزش گاہیں قائم کیں۔ان کا مقصد نہ صرف نوجوانوں کو مضبوط اور جسمانی طور پر قابل بنانا تھا بلکہ قوم پرستی کا شعور بیدار کرنا بھی تھا۔اسی وجہ سے انہیں 'سیاسی' ورزش گاہ کہا جانے لگا اور جون ان کا موجد تھا۔وہ اپنے نوجوانوں کو مہمات پر لے کر کھلے آسمان تلے تماشا کرنے کے لیے لے جاتا جو فرانسیسی لباس پہنے مقامی اشرافیہ کا مذاق اڑاتے۔اس نے نوجوانوں میں غیر ملکیوں،یہودیوں اور ان تمام چیزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کیا جو جرمن 'ووک جیسٹ' کو بگاڑ سکتے ہیں۔بہت سے دوسرے لوگوں نے اخلاقی انجمنیں،سائنسی انجمنیں،وغیرہ قائم کیں۔ان انجمنوں کا واحد مقصد جرمنی کی مستقبل کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ہرڈر کے ووک جیسٹ یا 'قومی روح' کے تصور نے کچھ ہی عرصے میں جرمنی کے ذہنوں اور روحوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔لوک کہانیوں سے لے کر فلسفیانہ افکار تک اس سے متاثر ہونے لگے۔لوک کہانیوں کا مجموعہ *Grimm's Fairy Tales*(گریم کی پریوں کی کہانیاں)،1812 میں شائع ہوا۔اس کے مرتب کرنے والے تقابلی لسانیات کو بڑھاوا دینے والے گریم نامی دو بھائی تھے۔گریم برادران نے بولیوں اور لہجوں کے مطالعہ کے لیے ملک بھر کا سفر کیا تھا۔

1800 عیسوی کے بعد کی نسل کے ہرڈر کے کچھ شاگردوں کے افکار میں جرمن قوم پرستی کی نوعیت بدلنا شروع ہوئی۔جان فشٹے(Johann Fichte, 1762–1814)، اپنے وقت کا ایک عظیم فلسفی تھا۔انیسویں صدی کے نصف آخر میں ابھرنے والی انتہا پسند جرمن قوم پرستی کے ابھرنے میں فشٹے کا اہم کردار تھا۔اس کے نقطہ نظر میں تبدیلی جرمنی کے خلاف فرانس کی فوجی مہمات اور خاص طور پر 1806 میں نپولین کی افواج کے ہاتھوں پرشیا(Prussia) کی ذلت آمیز شکست کے سبب ہوئی۔فشٹے نے 1808 میں قوم کے نام کئی لیکچر دیے۔*Addresses to the German Nation* (جرمن قوم سے خطاب) نامی کتاب میں جمع کردہ ان تقاریر میں اس نے اپنے ملک میں قومی تعلیمی نظام کی ضرورت پر زور دیا۔اس نے کہا کہ جرمن ہم وطنوں کی اخلاقی ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں۔اپنی قومی انفرادیت کو پہچاننا اور وطن سے وفاداری اس قومی نظام تعلیم کے مقاصد تھے۔قومی بحران کے وقت عوام کے ذہنوں میں کون سا جذبہ ہونا چاہیے،اس پر غور کرتے ہوئے فشٹے نے کہا کہ ایسے وقت میں امن پسند شہری میں آئین اور قوانین سے محبت نہیں بلکہ اعلیٰ ترین حب الوطنی کی آگ بھڑکائی جانی چاہیے۔یہ حب الوطنی قوم پر ابدی سایہ کی طرح چھائی رہتی ہے۔اس کی وجہ سے محب وطن مسکرا کر اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔بزدل بھی اپنے آپ کو قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔فشٹے نے کہا کہ جرمنی میں ایک انمٹ شعور،ایک ابدی روح،ایک لافانی قومی فطرت ہے۔اسے بھاری سے بھاری قیمت چکا کر ہر قسم کے بیرونی اثرات سے پاک رکھنا ضروری ہے،کیونکہ جرمنی کا قومی کردار دیگر تمام لوگوں کے قومی کردار سے بلند اور عظیم ہے۔انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ جرمن شعور،فرانس اور مغربی یورپ کے دیگر ممالک کے قومی شعور اور نوعیت سے ہمیشہ مختلف رہا ہے۔اب تک اسے نظر انداز کیا جا رہا تھا لیکن کسی دن اس کی بھی ضرور سنی جائے گی۔اپنی ابتدائی کتابوں میں فشٹے نے انفرادی آزادی کے سوال پر بھی غور کیا۔اب وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف ایک طاقتور مطلق العنان ریاست ہی فرد کو حقیقی آزادی کی ضمانت دے سکتی ہے۔فشٹے نے آزادی کی بہت سادہ تعریف پیش کی لیکن،انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ایک فرد خود کو قوم کی بڑی شخصیت

میں ضم کر کے ہی اسے حاصل کر سکتا ہے۔اس کے علاوہ فشٹے نے یہ بھی کہا کہ جرمن نسل دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ اصلی اور صلاحیتوں سے مالامال ہے۔اگرچہ وہ خود ان خیالات کو انتہا پسندی تک نہیں لے جانا چاہتے تھے لیکن ان کی تقریروں کا ٹھیک ویسا ہی اثر ہوا۔ان کے لیکچرز آنے والی دہائیوں میں انتہا پسند جرمن قوم پرستی کے لیے تحریک کا ذریعہ بنے۔

جرمنی میں قوم پرستی کی لہر میں کردار ادا کرنے والے بہت سے دوسرے مصنفین کے کاموں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ان میں عالمی شہرت یافتہ فلسفی مفکر فریڈرک ہیگل (1770–1831) سرفہرست تھے۔ہیگل کے فلسفہ تاریخ کے بہت سے نتائج جرمن قوم پرست مثالیت کے بنیادی اصول بن گئے۔ان میں ریاست کو اہم مقام دینے کا اصول سرفہرست تھا۔اٹھارویں صدی کی انفرادیت کے رد عمل میں ہیگل نے کہا کہ ریاست فرد کی ضروریات کو پورا کرنے کا محض ایک مصنوعی ذریعہ نہیں ہے۔ان کے خیال میں ریاستیں تاریخ کے عمل میں عالمی شعور کی فعال شکل ہیں۔ہیگل کے الفاظ میں 'اس کا کام فطری (خدائی) تصورات کی مجسم شکل پیش کرنی ہے۔ان کے خیال میں ریاست کے ساتھ اپنی شناخت قائم کر کے ہی انسان حقیقی معنوں میں اخلاقی زندگی گزار سکتا ہے۔ایک شخص صرف اپنے آپ کو ریاست کے حوالے کر کے اور اس کے قوانین اور احکامات پر غیر مشروط عمل کر کے ہی حقیقی آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ہیگل کے مطابق تاریخ کے عمل کا مقصد 'آزادی' کا حصول تھا۔اس کے آخری مرحلے میں جرمن قومی ریاست کو ایک خاص کردار ادا کرنا تھا۔پورے جرمنی میں پرشیا کی بادشاہت کے وقار میں اضافے کا سہرا کچھ حد تک ہیگل کو بھی دیا جاتا ہے۔اگرچہ اس نے کہا تھا کہ مستقبل کی جرمنی کی ریاست کا ڈھانچہ آئینی ہوگا، لیکن اس کے باوجود اس نے پورے جرمن عوام کو مکمل شعور کی منزل تک لے جانے کے آلے کے طور پر طاقتور ریاست پرشیا کو اپنی مکمل حمایت فراہم کی۔

ہیگل نے اپنی فلسفیانہ سوچ میں کوئی ٹھوس سیاسی پروگرام پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔لیکن، کارل مارکس پر ہیگل کے اثر کے نتیجے میں، اس کا اثر سائنسی اشتراکی نظریے پر پڑا۔ہیگل کا خیال تھا کہ اس نے انسانی تاریخ اور سمت دریافت کر لی ہے۔اس نے جدلیاتی عمل پر خصوصی زور دیا۔اس کا عقیدہ تھا کہ عالمی شعور اسی عمل کے ذریعے اپنا اظہار کرتا ہے۔ہیگل کے یہ موقف مارکس کے جدلیاتی مادیت کے نظریہ میں جھلکتے تھے۔دریں اثنا، جرمنی میں دیگر مکاتب فکر کے ساتھ ہیگل کے فلسفے نے تاریخ کے مطالعہ کو فلسفیانہ نقطہ نظر سے زیادہ معنی خیز بنا دیا۔تاریخ، وقت کے عمل کا مطالعہ ہونے کے ناطے، دنیا کی حقیقی اہمیت سے پردہ اٹھانے کی کلید تھی۔اس کے نتیجے میں تاریخ کی مختلف شاخوں کے مطالعہ اور تدریس کو حوصلہ ملا۔جرمن یونیورسٹیاں، علم تاریخ کے مراکز بن گئیں۔لیوپولڈ وون رانکے (Leopold von Ranke, 1795–1886) کا نام جرمنی کے مشہور مورخین میں لیا جاتا ہے۔رانکے خاص طور پر قوم پرست جذبات سے متاثر تھے۔اس کی تاریخ کے دھارے فرانسیسی مخالف تھے۔

معاشیات کے میدان میں فریڈرک لسٹ (Friedrich List, 1789–1846) نے اپنی کتاب *The National System of Political Economy* (سیاسی معیشت کے نظام) میں تقریباً ایسا ہی نتیجہ پیش کیا۔1841 میں شائع ہونے والی اس کتاب میں اس نے برطانیہ میں سیاسی معیشت کے مطالعہ اور تدریس پر تنقید کی۔لسٹ کے مطابق یہ محض ایک خاص

تاریخی تناظر پر تیار کردہ نظریات کا ایک سلسلہ تھا۔ اس طرح، لسٹ، تاریخی معاشیات کا موجد بن گیا۔ اس نے کہا کہ 'آزاد تجارت کا اصول' دراصل صرف ایک منصوبہ تھا جس سے کہ دنیا کے دیگر ممالک کو خام مال اور خوراک کی سپلائی کا ذریعہ بنائے رکھ کر برطانیہ کو دنیا کا صنعتی کارخانہ بنایا جائے۔ کوئی بھی ملک جو مہذب اور ترقی یافتہ بننے کی خواہش رکھتا ہے اس کے اپنے شہر، کارخانے، صنعتیں اور سرمایہ ہونا چاہیے۔ لیکن ان دنوں برطانیہ کی صنعتوں کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔ لٰہذا ہر ایسی خواہش رکھنے والے ملک کے لیے لازم ہو گیا ہے کہ وہ چنگیوں کی اونچی دیواریں کھڑی کر کے اپنے یہاں صنعت کاری کے عمل پر زور دے۔

14.3 جرمن اتحاد کے معاشی عوامل (Economic Factors in German Unification)

جرمنی کے اتحاد کا تمام تر سہرا اوٹو فان بسمارک (Otto von Bismarck) کے سر باندھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عظیم کام اس کی خون اور لوہے ('Blood and Iron') کی پالیسی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ لیکن، ایک نقطہ نظر سے یہ غلط نظریہ ہے۔ یہ درست ہے کہ جرمنی کا اتحاد سیاسی چالوں اور جنگوں کا نتیجہ تھا۔ بسمارک نے یکے بعد دیگرے تین جنگوں کے ذریعے اتحاد کے مخالفین کو شکست دی اور جرمن اتحاد کو مکمل کیا۔ اس لیے جرمنی کی سیاسی تعمیر نو بنیادی طور پر بسمارک کا کام تھا۔ تاہم اس کی کامیابیوں کی تاریخی اہمیت کا صحیح معنوں میں اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اگر انہیں محض سیاسی، سفارتی اور عسکری کامیابیاں مان لیا جائے۔ سچ یہ ہے کہ اتحاد کا حصول، جرمنی کی معاشی اور سماجی زندگی کے بدلتے ہوئے ڈھانچے کا نتیجہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ اتنا ہی صنعتی انقلاب کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا جتنا کہ بسمارک کی سیاسی اور سفارتی پالیسی کا۔ کسی حد تک 'کوئلہ اور لوہے' ('Coal and Iron') کا عنصر 'خون اور لوہے' (Blood and Iron) کے عنصر سے زیادہ طاقتور تھا۔

14.3.1 صنعتی ترقی (Industrial Growth)

جرمن ریاستوں کی معاشی سماجی زندگی میں تبدیلی کا یہ عمل ویانا کانگریس کے فوراً بعد شروع ہوا۔ 1815 اور 1848 کے درمیانی عرصے نے جرمنی کی صنعت کاری کی زمین تیار ہوئی، جس پر صدی کے نصف آخر میں ہونے والی صنعتی عروج کی عمارت کھڑی ہونے والی تھی۔ اس عرصے میں کوئلہ اور دیگر معدنی صنعتوں کے میدان میں ترقی کی رفتار خاص طور پر تیز تھی۔ روہر (Ruhr) کے علاقے میں نئی ٹیکنالوجی کے استعمال سے کوئلہ نکالنے کا کام زور پکڑ گیا۔ 1840 کی دہائی میں، اسین (Essen) کے کروپ صنعتی ادارے (Krupp Industries) میں اعلیٰ معیار کا اسٹیل تیار ہونا شروع ہوا۔ 1850 تک جرمن بولنے والے علاقے میں تین ہزار میل لمبی ریلوے لائنیں بچھائی جا چکی تھیں۔ صنعتی انقلاب کے بڑھتے ہوئے مرحلے میں، جرمن ریاستوں نے اپنے محصولی نظام میں اصلاحات کی کوشش کی۔ ہر سرحد پر چنگی (Custom Duty) ادا کرنے کی ضرورت سے جرمن صنعت کاروں اور کاروباریوں کو بہت نقصان ہوتا تھا اور اسی وجہ سے جرمن صنعت کار پورے ملک کے لیے پیداوار کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ 1833 میں ہیمبرگ سے نوریمبرگ سامان بیچنے کی غرض سے جانے والا ایک تاجر 11 کسٹم چوکیوں سے گزرتا تھا اور ہر چوکی پر اس کو تقریباً پانچ فی صد محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ ڈیوٹی یا محصول سامان

کے وزن یا ناپ کے اعتبار سے لگایا جاتا تھا۔ کیونکہ ہر علاقے کے اپنے اپنے پیمانے اور اوزان تھے اس لئے اکثر اس کاروائی میں بہت وقت ضائع ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر کپڑے کا پیمانہ ایلے(Elle) کہلاتا تھا لیکن ہر علاقے میں ایلے کی لمبائی مختلف تھی۔ مثلاً فرینکفرٹ میں خریدے ہوئے ایک ایلے کپڑے کی لمبائی 7.54 سینٹی میٹر تھی۔ نتیجے کے طور پر، اس دور میں جرمن معیشت کا سب سے اہم واقعہ 1834 میں پرشیا کی پہل سے 'زولورین' (Zollverein) یا چنگیوں کے وفاق (Custom Union) کا قیام تھا۔ اس کے ذریعے چنگیوں کو متحد کیا گیا۔

1844ء تک جرمنی کی اکثر ریاستیں اس کے تحت آچکی تھیں۔ انہوں نے اپنی سرحدوں کے اندر ایک ریاست سے دوسری ریاست تک سامان کی نقل و حمل کے لیے متعدد چنگیاں ختم کر دیں اور کرنسیون کی تعداد 30 سے گھٹا کر 2 کر دی۔ جرمنی میں یونیورسٹی آف ٹوبنجن (University of Tübingen) میں معاشیات کے پروفیسر فریڈرک لسٹ نے 1834ء میں لکھا۔' زولورائن (چنگی وفاق) کا مقصد جرمنی کو معاشی طور پر ایک قوم بنانا ہے۔ باہر کے ممالک میں اس کے مفاد کی حفاظت کر کے اندرون خانہ اس کی اپنی پیداوار کو بڑھا کر یہ قوم کو مالی لحاظ سے بھی مضبوط بنائے گی۔ یہ انفرادی اور ریاستی مفادات کو باہم آمیز کر کے قومی احساس اور جذبہ کو فروغ دے گی۔ جرمن عوام کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ ایک آزاد معاشی نظام ہی ان کے قومی جذبے کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ نئے معاشی وفاق سے صرف آسٹریا باہر رہا۔ سیاسی انضمام سے پہلے ملک کا معاشی انضمام مکمل ہو چکا تھا۔ زولورین کی قیادت پرشیا کر رہا تھا۔ اس لیے اس کی قیادت میں اتحاد کا پس منظر تیار ہونے لگا تھا۔

14.3.2 بورژوا طبقے کا عروج (Rise of the Bourgeoisie)

1848ء سے پہلے کی چند دہائیوں میں، جرمنی کی صنعت کاری کے نتیجے میں، وہاں ایک بااثر اور حساس بورژوا (درمیانی) طبقہ ابھرا۔ اگرچہ اس طبقے کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن سیاست پر اس کا اثر بڑھتا جا رہا تھا۔ زولورین کا قیام اس کے دباؤ کی وجہ سے ہی ممکن ہوا۔ بورژوا طبقہ جرمنی کے اتحاد کا سب سے بڑا حامی تھا۔ یہ لوگ موثر حکمرانی اور آسان معاشی سرگرمیوں کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ 1843 میں ایک رسالے میں شائع ہونے والے اس طبقے کے ترجمان کا یہ بیان قابل غور ہے کہ 'ایک جرمنی کے بجائے 38 جرمنی ہیں، 38 حکومتیں، اتنی ہی انتظامیہ، اتنی ہی عدالتیں اور سفارت خانے ہیں۔ کاش! صرف ایک ہی نظام حکومت ان سب کے بجائے ہوتا تو کتنی بچت ہوتی۔' درحقیقت انیسویں صدی کے نصف اول میں جرمن زبان بولنے والے علاقوں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ نپولین کے انتظامی اقدامات نے چھوٹی چھوٹی بے شمار جاگیروں کا، 39 ریاستوں پر مشتمل ایک وفاق پیدا کر دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے الگ پیمانے وزن اور اپنی کرنسی رکھتا تھا۔ صنعتوں کے نئے رہنما 1860 کی دہائی میں بسمارک کی پالیسیوں کے زبردست حامی تھے۔ صنعت کاری کی وجہ سے جرمنی میں ابھرنے والے نئے معاشی سماج کے تحت باہمی انحصار اور مشترکہ جذبات پروان چڑھے۔ نوزائیدہ بورژوا طبقہ، تمام اقتصادی پابندیوں کو ختم کرنے اور جرمنی کے فرسودہ سیاسی نظام کی تبدیلی کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس کے نتیجے میں آزاد خیالی اور قوم پرستی کی ایک لہر سی چلنے لگی تھی۔ یہ نیا طبقہ اخبارات کو کنٹرول کرتا تھا اور ان کے ذریعے قومی یکجہتی کی تحریکوں کی بھرپور حمایت کر کے مضبوط رائے عامہ تشکیل دے رہا تھا۔

14.3.3 ریلوے کی توسیع (Expansion of the Railways)

ریلوے لائنوں کی تعمیر نے جرمن زندگی پر ایک انقلابی اثر ڈالا۔ جرمنی کی قدرتی جغرافیائی خصوصیات، اتحاد کی راہ میں بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ایک چھوٹا سا سمندری ساحل، سردیوں میں اس کی ندیوں کا جم جانا، اس کی پسماندہ سڑکیں، اس سب نے نقل و حمل کو مشکل بنادیا تھا۔ جرمنی کے لوگ ان قدرتی رکاوٹوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ لیکن، لوہے کی نئی پٹریوں نے جرمنی کے اندرونی علاقوں کو بھی نئی طاقتوں سے جوڑ دیا اور اس سے تجارت کو نئی تحریک ملی۔ جس طرح زولورین نے مصنوعی اقتصادی رکاوٹوں کو ہٹادیا تھا، اسی طرح ریلوے نے جرمن اتحاد اور خوشحالی کی راہ میں حائل قدرتی رکاوٹوں کو دور کر دیا تھا۔ مندرجہ بالا صورت حال کی غیر موجودگی میں، یہ ناقابل یقین لگتا ہے کہ بسمارک صرف اپنی 'خون اور لوہے' کی پالیسی کے زور پر جرمنی کو متحد کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ ریلوے کا راستہ، واقعی جرمنی کے سیاسی اتحاد کے لیے بہت اہم تھا۔ اس سے جرمنی لوہے کی زیادہ سے زیادہ پیداوار کے قابل ہو گیا، کیونکہ اب معدنی مواد آسانی سے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ ریلوے لائنوں کی تعمیر میں فوجی افادیت پر پوری توجہ دی گئی۔ دفاعی اہمیت کی حامل ریلوے کی تعمیر کے لیے حکومتی حوصلہ افزائی کی گئی۔ عظیم فوجی رہنما ملٹکے اکبر (Moltke, the Elder) کی رہنمائی میں دفاعی پالیسیاں اس طرح تیار کی گئیں کہ فوجیوں اور جنگی ساز وسامان کی منتقلی کی نئی رفتار کا بھرپور استعمال کیا جاسکے۔ جرمنی کے اتحاد کے لیے لڑی گئی تین جنگوں میں پرشیا کی فیصلہ کن فتوحات کا راز اسی حقیقت میں پوشیدہ تھا۔ ریل لائنوں کی تعمیر نے جرمنی کی صنعت کاری کی راہ ہموار کر دی تھی۔ اس کے نتیجے میں جرمن زندگی کے تمام شعبوں میں بنیادی تبدیلیاں لانے والی طاقتور قوتیں ابھر رہی تھیں۔ ان قوتوں کے پیدا کردہ مسائل کو ایک متحد ملک کی طاقتور حکومت ہی حل کر سکتی تھی۔ صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والی نئی ضروریات نے مطالبہ کیا کہ جرمنی کو اب ایک متحد قوم کے طور پر ابھرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے، 1850 کی دہائی میں بہت سے کل جرمن (All-German) ادارے قائم کیے گئے تھے جس کا مقصد اقتصادی ملاپ کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ 1850 میں جرمن ماہرین معیشت کی ایک کانفرنس نے پورے جرمنی کے لیے آزاد تجارت اور ایک ہی سکے کے نظام کا مطالبہ کیا۔ جرمن ماہرین قانون نے پورے جرمنی کے لیے یکساں قانونی نظام کا مطالبہ کیا۔ سیاسی سطح پر، 1859 میں، ایک آل جرمن کانفرنس نے تمام ریاستوں کے حریت پسندوں سے پرشیا کی قیادت میں ایک قومی تحریک چلانے کا مطالبہ کیا۔ اس کی حمایت جرمن سرمایہ داروں، صنعتکاروں اور بینکروں نے کی۔ جرمنی میں ٹیلی گراف کا نظام صرف اسی صورت میں ترقی کر سکتا تھی جب اسے کل جرمن سطح پر کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس سب نے جرمنی کے سیاسی اتحاد کی کامیابی کو بالکل ضروری بنادیا۔ یہ درست ہے کہ جرمنی کا اتحاد بسمارک کی ذہانت اور پرشین فوج کی طاقت سے مکمل ہوا، لیکن یہ اتحاد دراصل جرمنی کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں تبدیلی کا نتیجہ تھا۔

14.4 جرمنی کا اتحاد (The Unification of Germany)

14.4.1 1815ء میں جرمنی کی حالت (Condition of Germany in 1815)

1870ء کے پہلے جرمنی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں، علاقوں میں منقسم تھا۔ 1806ء میں نپولین نے مقدس رومی سلطنت کو ختم کر کے متعدد چھوٹی چھوٹی تقریباً تین سو ریاستوں کو ملا کر رہائن وفاق (Confederation of the Rhine) قائم کیا۔ نپولین کی

شکست کے بعد جرمنی کے لوگوں میں اتحاد کے مضبوط دھاگے میں بندھنے کی امید جاگی۔ لیکن ویانا میں قائم کردہ نظام سے انہیں کافی مایوسی ہوئی جسے آسٹریا کے چانسلر پرنس آف میٹرنخ (Prince of Metternich) نے تیار کیا تھا۔ اس نظام کے مطابق ایک جرمن وفاق کا قیام عمل میں آیا جس میں 38 ریاستیں تھیں۔ آسٹریا اور پرشیا ان میں سب سے بڑے اور طاقت ور تھے۔ اس ڈھیلے ڈھالے وفاق کا ایک وفاقی ایوان تھا جس کا صدر آسٹریا کا حکمراں ہوتا تھا۔ یہ ایک بیکار ادارہ تھا۔ اس کا قیام میٹرنخ کے امیدوں کی تکمیل اور جرمن حریت پسندوں کے خاتمے کے لئے کیا گیا تھا۔ جرمن وفاق سے جرمنی کے لوگوں کی امیدیں پوری نہیں ہوسکتی تھیں۔ ہر رکن ریاست کا حکمراں اپنی مخصوص حیثیت بنائے رکھنے پر زور دیتا تھا۔ ادھر ملک بھر میں کل جرمنیت (Pan Germanism) کی لہر دوڑ رہی تھی، جس کا مرکز جرمنی کی یونیورسٹیاں تھیں۔ طلبہ نے برشن شاٹن (Burschenschaften) نامی تنظیم کا قیام کر کے 1815ء کے بعد ملکی اتحاد کی تحریک شروع کی۔ لیکن آسٹریائی چانسلر میٹرنخ نے سخت اقدامات کر کے اسے کچل دیا۔ 1830 کے فرانسیسی انقلاب کے نتیجے کے طور پر جرمنی کی کئی ریاستوں میں بھی انقلابات آئے اور کہیں کہیں حریت پسندی کو وقتی کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ 1832ء میں جرمنی کے ہیم برگ (Hamburg) شہر میں ایک عظیم جرمن جشن منایا گیا۔ لیکن فوراً ہی میٹرنخ کے ظلم و جبر کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک دو برس کے اندر ہی مخالفت کی آواز بند ہوگئی۔ جرمنی کے اتحاد کے لئے ہوئی ساری کوششیں بیکار ہوگئیں۔

14.4.2 1848ء کے انقلابات اور جرمنی کے اتحاد کی کوشش

(The Revolutions of 1848 and the Attempts at Unifying Germany)

1848ء میں جیسے ہی فرانسیسی انقلاب کی خبر جرمن زبان والے علاقوں میں پھیلی۔ حکمرانوں کی حکومتیں زیر و زبر ہونے لگیں۔ بہت سارے جرمن حکمراں گدی چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور حریت پسندوں کئی جگہوں پر فتحیاب ہوئے۔ ایسی ہی حالت میں ملک بھر کے حریت پسندوں نے مختلف ریاستوں کو ایک کر کے جرمن ریاست کی تعمیر کی کوشش کی۔ وہ لوگ فرینکفرٹ قومی اسمبلی (Frankfurt National Assembly) میں اکٹھا ہوئے اور جرمنی کے اتحاد ے مختلف مشوروں پر غور کرنے لگے۔ لیکن فرینکفرٹ اسمبلی کے ممبران فضول کی بکواس میں اپنا وقت بتاتے رہے اور ان کی بات چیت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس دوران دوبارہ رجعت پسند طاقتیں (Reactionary Forces) سیاسی میدان میں حاوی ہوگئیں۔ حریت پسندوں کو کچل دیا گیا اور 1815 کا ڈھیلا ڈھالا جرمن وفاق دوبارہ قائم ہوگیا۔ پھر بھی سماجی معاشی طاقتیں واقعات کو دوسرا رخ دے رہیں تھیں۔ ان سب سے جو ماحول بن رہا تھا اس میں خود کی کوششوں سے ملک کے اتحاد کی کوشش کا بے نتیجہ ہونا ظاہر تھا۔ اب پرشیا کی صدارت میں خون اور فولاد کی پالیسی کے ذریعے جنگ کی آگ سے جرمن ریاست کی پیدائش کا پس منظر تیزی سے تیار ہونے لگا تھا۔ پرشیا کی طاقت میں اضافے نے اسے آسٹریا کا بنیادی حریف اور جرمن اتحاد کی تحریک کا اہم رہنما بنا دیا تھا۔ پرشیا کا حکمراں ولیم اول (William-I) پرشیا کی صدارت میں جرمنی کے اتحاد میں یقین رکھتا تھا، لیکن اس کا سب سے کٹر مخالف آسٹریا تھا۔ یہ یقینی تھا کہ جرمنی کا اتحاد، آسٹریا کو جنگ میں شکست دینے اور اسے جرمن سیاست سے باہر کرنے سے ہی ممکن ہوگا۔ اس لیے اس نے پرشیا کی فوجی طاقت بڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ تاہم فوجی اخراجات کے حوالے سے پرشیا کی اسمبلی میں اس کی مخالفت کی گئی اور سیاسی

تعطل پیدا ہو گیا۔ ولیم اول نے اس تعطل سے نبٹنے کے لئے 1862 میں بسمارک کو اپنا چانسلر متعین کیا۔

14.4.3 بسمارک اور جرمنی کا اتحاد (Bismarck and the Unification of Germany)

انیسویں صدی کے وسط کے آس پاس پرشیا میں ایک شخص ابھر کر سامنے آیا جو آگے چل کر نہ صرف جرمنی پر بلکہ سارے یورپ کی سیاست پر حاوی ہو گیا۔ یہ شخص پرشیا کا ایک زمیندار تھا اور اس کا نام اوٹو فون بسمارک (Otto von Bismarck) تھا۔ وہ واٹرلو کی جنگ کے سال یعنی 1815ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے مختلف درباروں میں کئی سال سفیر کے فرائض انجام دئے تھے۔ 1862ء میں اس نے پرشیا کا چانسلر (وزیر) بننے کے ایک ہفتے کے اندر اس نے اپنی ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ اس زمانے کے بڑے مسائل تقریروں اور اکثریت کی تجویزوں سے نہیں بلکہ فولاد اور خون سے حل ہوں گے۔ یہ دو لفظ 'فولاد اور خون' سچ مچ اس کی اس حکمت عملی کے بنیاد تھے، جسے اس نے دور اندیشی اور سختی کے ساتھ نبھایا۔ اسے جمہوریت سے نفرت تھی اور وہ پارلیامنٹوں اور عوامی آئین ساز انجمنوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ان کی حیثیت اس کے نزدیک آثار قدیمہ کی سی تھی۔ مگر اس کے جواہر اور اس کی صلاحتیں ایسی تھیں کہ اس نے زمانے کو اپنی مرضی کے سامنے جھکا لیا۔ اس نے جدید جرمنی کی تعمیر کی اور انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپ کی تاریخ کو اپنے سانچے میں ڈھال دیا۔ سائنس دانوں اور مفکروں کا جرمنی تو پیچھے رہ گیا، جبکہ خون اور فولاد والا اور فوجی مہارت والا جدید جرمنی یورپ کے براعظم پر چھانے لگا۔ اس وقت ایک مشہور جرمن نے کہا تھا 'بسمارک جرمنی کو اونچا اٹھا رہا ہے مگر جرمنوں کو نیچے ڈھکیل رہا ہے۔' جرمنی کو یورپ اور بین الاقوامی معاملات میں بڑی طاقت بنانے کی اس کی پالیسی سے جرمن لوگ بہت خوش ہوتے تھے اور بڑھتی ہوئی قوم پرستی کی چکاچوند میں وہ بسمارک کے ہر طرح کے تشدد کو برداشت کرنے کے لئے خوشی سے تیار تھے۔

1862 میں بسمارک کے پرشیا کے چانسلر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد، ملک کے اتحاد کی تحریک نے ایک نئی حقیقت پسندانہ اور عملی شکل اختیار کی۔ بسمارک حقیقت پسندانہ سیاست کا مرد میدان تھا اور اس کا پختہ یقین تھا کہ ہمعصر عظیم مسائل، تقریروں اور اکثریت سے نہیں بلکہ 'خون اور لوہے' سے حل کیے جا سکتے ہیں۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے بسمارک نے ایک دہائی میں تین جنگیں لڑیں اور جرمنی کے قومی اتحاد کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا۔ اس نے واضح طور پر دیکھا کہ قومی یکجہتی کا مقصد آسٹریا کو جرمن سیاست سے الگ کیے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس نے فوراً اس کی تیاری شروع کر دی اور اپنی فوجی تنظیم کو خاموشی سے مستحکم کرتا رہا۔ اسی درمیان نیپولین سوم نے آسٹریا پر حملہ کر کے اسے شکست دے دی۔ اس شکست کے نتیجے کے طور پر گیری بالڈی نے جنوبی اٹلی میں فوجی کاروائی کی اور اٹلی ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔ یہ سب باتیں بسمارک کے حق میں تھیں، کیوں کہ ان سے آسٹریا کمزور پڑ گیا تھا۔ پھر بھی وہ مزید علاقے اور طاقت حاصل ہونے تک آسٹریا سے الجھنے میں تامل کرتا رہا۔ جب روسی پولینڈ میں قومی بغاوت ہوئی تو بسمارک نے روس کے زار کو یہ تجویز بھیجی کہ ضرورت ہو تو پولینڈ کو گولی کا نشانہ بنانے میں اس کی مدد کو وہ آجائے۔ یہ ایک شرمناک تجویز تھی۔ اس سے مستقبل میں یورپ کی کسی الجھن میں زار کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا اس کا مقصد پورا ہو گیا۔

اس وقت دو چھوٹی ریاستوں ہولسٹین(Holstein)اور شلیسوگ (Schleswig) کا مسئلہ سامنے آیا۔ بسمارک کو اپنی پالیسی کے نفاذ کے لیے ایک بنا بنایا موقع مل گیا۔ شلیسوگ میں جزوی طور پر ڈین(Danish) اور جزوی طور پر جرمن نژاد لوگ آباد تھے۔ ڈنمارک(Denmark) اسے اپنے ملک کا اٹوٹ حصہ بنانا چاہتا تھا۔اسے روکنے کے لیے بسمارک نے آسٹریا کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ ان دونوں نے مل کر 1864 میں ڈنمارک کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور ڈنمارک کو شکست دے کر پرشیا نے شلس وِگ اور آسٹریا نے ہولسٹین پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ لیکن، دونوں کا مستقبل پرشیا اور آسٹریا کی مشترکہ ذمہ داری رہا۔ ظاہر تھا کہ یہ انتظام زیادہ دیر چلنے والا نہیں تھا۔ تقسیم اور مشترکہ ذمہ داری کے اس منصوبے نے آسٹرو پرشین تعاون کے امکان کو خطرے میں ڈال دیا۔ بسمارک جانتا تھا کہ اس سوال پر اس کا آسٹریا کے ساتھ تنازعہ ہوگا اور اسے حل کرنے کا جنگ ہی واحد راستہ ہوگا۔ یہ جنگ آسٹریا کے خلاف چھیڑی گئی جرمن خانہ جنگی ہوگی۔ جلد ہی دو جرمن ریاستوں کے درمیان چھوٹی ریاستوں کے مسائل کے حوالے سے تنازعہ پیدا ہوگیا۔آمدورفت کے راستوں پر قبضہ، داخلی امن برقرار رکھنے کا سوال وغیرہ ایسے مسائل تھے جن پر دونوں کے درمیان شدید اختلاف شروع ہوگیا اور جھگڑا بڑھتا گیا۔اس بہانے سے کہ وہ ان تنازعات کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، بسمارک نے درحقیقت انہیں بڑھنے دیا اور 1866 تک اس نے ایسی صورتحال پیدا کر دی جس میں آسٹریا اور پرشیا کے درمیان جنگ چھڑنا ناگزیر ہوگیا۔ 1866 کی آسٹریائی پرشیائی جنگ بمشکل سات ہفتے جاری رہی، لیکن اس کے نتائج دوررس اور فیصلہ کن تھے۔ آسٹریا کو مکمل شکست ہوئی۔ میدان اب پرشیا کے لیے خالی تھا۔ اس نے کئی ریاستوں کو براہ راست اپنے ساتھ ملا لیا۔ جرمن وفاق توڑ دیا گیا اور چار جنوبی جرمن ریاستوں کے علاوہ تمام شمالی ریاستوں کا ایک شمالی جرمن وفاق (North German Confederation) قائم کیا گیا جس کا قائد پرشیا تھا۔اس طرح، مین(Main) دریا کے جنوب میں چار جرمن ریاستوں کو چھوڑ کر جرمنی کے اتحاد کا پہلا مرحلہ مکمل ہوگیا۔

چار جنوبی ریاستیں بویریا(Bavaria)، باڈن(Baden)، ورٹمبرگ(Württemberg) اور ہیس ڈرمسٹاڈ (Hesse-Darmstadt) نئے وفاق سے باہر تھیں۔ یہ واضح تھا کہ حالات ابھی تک مستحکم نہیں ہوئے تھے۔ چھوٹی جنوبی جرمن ریاستیں خلا میں معلق چھوڑ دیں گئیں۔ جلد یا بدیر انہیں آسٹریائی، پرشیائی یا فرانسیسی کسی نہ کسی علاقے میں ملنا ہی تھا۔ بسمارک انہیں پرشیا کے ساتھ ملانے کے لیے زمین تیار کرتا رہا۔ دوسری طرف پرشیا کے عروج اور بڑھتی ہوئی طاقت سے فرانس بے چین ہو رہا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر ان چار ریاستوں کو پرشیا کے ساتھ انضمام کی اجازت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ ایسے میں ہر طرف یہ محسوس ہو رہا تھا کہ فرانس اور پرشیا کے درمیان ان چار ریاستوں کو لے کر جنگ ناگزیر ہے۔ بسمارک نے جنوبی جرمن ریاستوں میں فرانس کے لیے پھیلی بدگمانی کو مزید تیز کر دیا۔ جنوبی جرمنی جو سابقہ دور میں اکثر فرانس کا اپنی مرضی سے پیروکار ہوا کرتا تھا، اس قدر قوم پرست ہو چکا تھا کہ اب اسے کسی دوسری قوم پر منحصر ہونا ذلت آمیز لگنے لگا تھا۔ بسمارک نے محسوس کیا کہ فرانس اور پرشیا کے درمیان جنگ ان چھوٹی ریاستوں کو دہشت زدہ کر دے گی اور وہ پرشیا سے ہاتھ ملانے پر مجبور ہو جائیں گی۔ 15 جولائی 1870 کو کچھ غیر اہم وجوہات کی بنا پر (مثلاً اسپین کے تخت کی جانشینی کا مسئلہ) نپولین سوم نے پرشیا پر حملہ کیا۔

فرانسیسی پرشین جنگ یعنی جنگ سیڈان(The Battle of Sedan)میں جیسا کہ متوقع تھا،پرشیا کو جنوبی جرمن ریاستوں کی حمایت حاصل تھی۔اس جنگ میں فرانس کو فیصلہ کن اور بری طرح شکست ہوئی۔ نپولین کو جنگ میں قید کر لیا گیا تھا۔ فاتح جرمن فوجیں پیرس میں داخل ہوئیں۔ بسمارک نے فرانس کی شکست کو جرمنی کے اتحاد کو مکمل کرنے کے لیے استعمال کیا۔ قومی جوش وجذبے نے جنوبی جرمن ریاستوں کو جرمن وفاق میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ 18 جنوری 1871 کو پرشیا کے ہوہن زولرن خاندان (The Hohenzollern House)کے حکمراں ولیم اول کو ورسائی کے محل میں جرمنی کا شہنشاہ قرار دیا گیااور اسے جرمن قیصر(شہنشاہ)کا لقب دیا گیا۔ جرمنی کے سب حکمرانوں اور نمائندوں نے وہاں جمع ہو کر اپنے نئے شہنشاہ کو تعظیم دی۔اس طرح دوسری جرمن رائخ یا سلطنت (Second German Reich or, Empire) قائم ہوئی۔ یورپ کے نقشے پر ایک متحد جرمنی ابھرا۔ بعد ازاں فرینکفرٹ معاہدے کے مطابق فرانس کے صنعتی علاقے الساس(Alsace) اور لورین (Lorraine)کو بھی جرمن سلطنت میں ضم کر دیا گیا۔ جرمن سلطنت میں تمام بالغ افراد کو ووٹ کا حق دے کر ایک قومی اسمبلی کا قیام ہوا جس میں 25ء جرمن ریاستوں کے نمائندوں کو جرمن سلطنت کی پالیسی بنانا تھا۔ پرشیا کا حکمراں جرمنی کا بادشاہ بنااور پرشین فوج کو جرمنی کی قومی فوج تسلیم کیا گیااور رائخ کا چانسلر بھی پرشیا ہی بنا۔

14.5 جرمنی اتحاد کے بعد (Germany, after Unification)

جرمنی میں اب چانسلر بسمارک ہی سب کچھ تھا۔اس کی فولاد اور خون کی حکمت عملی کامیاب ہو گئی تھی۔ جرمنی نے اس حکمت عملی کو تسلیم کر لیا تھااور اعلی اور فیاضانہ خیالوں کی قدر وقیمت گھٹ گئی تھی۔ بسمارک کی یہ کوشش تھی کہ اقتدار بادشاہ کے ہاتھ میں رہے، کیوں کہ اس کا جمہوریت میں یقین نہیں تھا۔ جیسے جیسے جرمنی کی صنعتی ترقی ہوتی جاتی تھی اور مزدور طبقہ زور پکڑتا جاتا تھا، ویسے ویسے یہ طبقہ کچھ بنیادی تبدیلیوں کی مانگیں پیش کرتااور نئے مسائل پیدا کرتا جارہا تھا۔ بسمارک نے اس کی دو تدبیریں کیں: ایک طرف وہ مزدوروں کی حالت بہتر بناتا گیااور دوسری طرف اشتراکیت کو کچلتا رہا۔اس نے سماجی ترقیاتی قوانین کے ذریعے مزدوروں کے سامنے چارہ ڈال کر انھیں اپنی طرف ملانے یا کم سے کم اپنے مطالبات میں بہت شدت دکھانے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔اس طرح جرمنی نے مزدوروں کے لئے بڑھاپے کی پنشنیں، بیمے اور علاج ومعالجے اور ان کی حالت سدھارنے کے قانون بنا کر اس سمت سب سے پہلے قدم اٹھایا، جب کہ برطانیہ کی صنعتیں اور مزدور تحریکیں جرمنی سے پرانی ہونے کے باوجود اس سلسلہ میں زیادہ کچھ نہیں کر پائی تھیں۔اس حکمت عملی کو کچھ کامیابی تو ملی، لیکن پھر بھی مزدوروں کی تنظیم زور پکڑتی گئی۔

مزدور تنظیمیں بڑھنے لگیں اور1875ء میں سب نے مل کر جرمن ورکرز ایسوسی ایشن (German Workers' Association)اور سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی(Social Democratic Workers' Party)کو ملا کر جرمنی کی سوشلسٹ ورکرز پارٹی(Socialist Workers' Party of Germany)قائم کی جو بعد میں جرمنی اور یورپ کی سب بڑی

مارکسوادی پارٹی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی آف جرمنی(Social Democratic Party of Germany)میں تبدیل ہوگئی۔ بسمارک اشتراکیت کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو برداشت نہیں کرسکا۔ کسی نے شہنشاہ کو قتل کرنے کی کوشش کی اور بسمارک کو اشتراکیوں پر ظلم ڈھانے کا اچھا بہانہ مل گیا۔1878ء میں ہر طرح اشتراکی سرگرمیوں کو دبانے کے لئے اشتراک دشمن قوانین بنائے گئے۔ ہزاروں اشتراکیوں کو ملک بدر یا قیدوبند کی سزائیں دی گئیں۔ ملک بدر کیے ہوئے بہت سے لوگ امریکا چلے گئے اور وہاں جاکر اشتراکیت کے پہلے مبلغ بنے۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو سخت صدمہ تو پہنچا مگر وہ ختم نہیں ہوئی اور آگے چل کر وہ مزید مضبوط ہوکر ابھری۔ بسمارک کی ظلم وتشدد کی پالیسی اس کا خاتمہ نہ سکی۔ الٹے اس پالیسی کی کامیابی خود اسی کے حق میں مضر ثابت ہوئی۔ جیسے جیسے اس جماعت کی طاقت بڑھتی گئی اس کی تنظیم بہت وسیع ہوتی گئی۔

بسمارک کافی عرصے ماہرانہ حکمت عملی سے یورپ کے نقشے پر چھایا رہا۔ اپنے زمانے کی بین الاقوامی سیاست سے وہ من چاہا کھیل کھیلتا رہا۔ بسمارک نے آسٹریا اور اٹلی کو ملاکر سہ طاقتی اتحاد کے نام ایک گروہ بنایا، کیوں کہ اب اسے فرانس والوں کی طرف سے انتقام لینے کا اندیشہ ہونے لگا تھا۔ اس طرح دونوں فریق اسلحہ جمع کرنے، سازشیں کرنے اور ایک دوسرے کو آنکھیں دکھانے میں لگے رہے۔ 1888ء میں شہنشاہ ولیم دوم کے نام سے ایک نوجوان جرمنی کا قیصر ہوا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بہت شدت سے بیٹھ گیا تھا کہ وہ بہت زبردست آدمی ہے اور وہ اسی زعم میں بہت جلدی بسمارک سے لڑ پڑا۔ اس مردِ آہن کو اس بڑھاپے میں عہدے سے معزول کردیا گیا۔ اس کی دلدہی کے لیے اسے پرنس کا خطاب دے دیا گیا۔ مگر بادشاہوں کی طرف سے اسے جو خوش فہمیاں تھیں اب وہ دور ہوچکی تھیں۔ شرم وغیرت کے مارے وہ اپنی جاگیر میں تنہا رہنے لگا۔ ایک دوست سے اس نے کہا تھا 'میں نے جب یہ عہدہ سنبھالا تھا اس وقت میرا دل حکومت سے وفاداری اور شہنشاہ سے عقیدت مندی کے جذبے سے سرشار تھا لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ خزانہ اب دھیرے دھیرے کم ہوتا جارہا ہے۔ میں نے تین شہنشاہوں کی منمانیاں دیکھ لی ہے اور یہ منظر مجھے دل کش نہیں معلوم ہوا۔' یہ بدمزاج بوڑھا کچھ دن اور جیتا رہا اور 1898ء میں 83 سال کی عمر میں انتقال کرگیا۔ قیصر کے ہاتھوں برخاست ہونے کے بعد بلکہ موت کے بعد بھی اس کا سایہ جرمنی پر قائم رہا اور اس کی روح اس کے وارثوں اور جانشینوں کو گرماتی رہی۔ مگر اس کے بعد آنے والے لوگ اس کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے۔

14.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

نپولین کی جنگوں کے خاتمے کے وقت سے ہی جرمنی کی سیاسی تقسیم میں کمی ہوچکی تھی۔ مقدس رومی سلطنت کے خاتمے کے بعد جرمن ریاستوں کی تعداد تین سو سے گھٹ کر 39 رہ گئی تھی۔ ہر جرمن ریاست کی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے 1815ء میں ویانا کانگریس کے ذریعے جرمن وفاق کا قیام ہوا۔ اس نظام کی تشکیل آسٹریا، پرشیا اور روس کے حکمرانوں کے ذریعے کی گئی تھی جن کا مقصد یورپ میں جمہوری فکر کے فروغ کو روکنا تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ جرمن مفکر جان گوٹ فریڈ ہرڈر جیسے دوسرے رومانوی دانشوروں کا خیال تھا کہ حقیقی جرمن ثقافت کو عام آدمی میں تلاش کرنا چاہئے۔ عوامی نغموں، عوامی شاعروں اور عوامی تماشوں کے ذریعے قوم پرستی کو مقبول بنایا گیا۔ قوم پرستی کے فروغ میں معاشی اور صنعتی عوامل شامل ہوگئے۔ بورژوا طبقے کے عروج اور ریلوے کی توسیع نے متحدہ ملک کے

تصور کو مضبوط کیا۔ بیرونی مداخلت اور اثر رسوخ کو بری نظر سے دیکھا جانے لگا۔ سیاسی طور پر پرشیا میں بسمارک کے عروج نے آسٹریا اور فرانس کی مداخلت کا سد باب کیا۔ بسمارک نے مختلف جنگوں کے ذریعے سیاسی اتحاد کے اس عمل کو مکمل کر دیا۔ پرشیا کے حکمراں ولیم اول کو جرمن قیصر کا خطاب دے کر پورے ملک کا شہنشاہ تسلیم کیا گیا۔

14.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

وولک جسٹ	:	(Volksgeist) 'قومی روح' یا قومی فطرت
چنگی	:	ملکی یا ریاستی سرحد پر تجارتی سامان پر لیا جانے والا محصول
پرشیا	:	(Prussia) موجودہ جرمنی کے شمال میں واقع ایک ریاست جس نے بعد میں جرمنی کو متحد کیا۔
بورژوا طبقہ	:	متوسط اور کاروباری طبقہ جیسے دکاندار، تاجر، صحافی اور وکیل وغیرہ
زار	:	روس کا حکمراں زار کہلاتا تھا۔
چانسلر	:	وزیر اعظم
رائخ	:	جرمن زبان میں سلطنت کو کہا جاتا ہے۔

14.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

14.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. نپولین کے حملوں سے پہلے جرمن ریاستوں کی تعداد کتنی تھی؟
2. رہائن وفاق کس نے قائم کیا؟
3. جرمن وفاق کا قیام کب ہوا؟
4. جرمن وفاق میں کتنی ریاستیں شامل تھیں۔
5. زولورین سے کیا مراد ہے؟
6. زولورین کب قائم ہوئی؟
7. بسمارک کون تھا؟
8. سیڈان کی جنگ کس کے درمیان ہوئی؟
9. خون اور فولاد کی پالیسی کس نے لاگو کی؟
10. بسمارک کو کس نے چانسلر منتخب کیا؟

14.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جرمن ریاستوں کے بارے میں ایک نوٹ لکھئے۔
2. جرمنی میں صنعتی ترقی پر نوٹ لکھیے۔
3. جرمنی میں بورژوا طبقے کے عروج پر نوٹ لکھیے۔
4. جرمنی میں ریلوے لائنوں کی توسیع اور اس کے اثرات پر مختصر مضمون لکھیے۔
5. اتحاد کے بعد جرمنی کے حالات پر روشنی ڈالیے۔

14.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جرمنی میں قوم پرستی کے عروج پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. جرمن اتحاد کے معاشی عوامل پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. جرمنی کے اتحاد میں بسمارک کے کردار پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

14.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Droz, Jacques, *Europe between Revolutions, 1815–1848*, Fontana Press, London, 1967.
2. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
3. Gottlieb, Anthony, *The Dream of Enlightenment*: *The Rise of Modern Philosophy*, Penguin, UK, 2017.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
6. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.

اکائی 15۔دانشورانہ رجحانات: حریت پسندی، قوم پرستی

(Intellectual Trends: Liberalism and Nationalism)

اکائی کے اجزاء

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 پس منظر

15.3 حریت پسندی

15.3.1 برطانیہ میں حریت پسندی اور جمہوریت کا ارتقاء

15.3.2 اصلاح کی ابتدائی کوششیں

15.3.3 چارٹر ایکٹ۔1832 کا اصلاح ایکٹ

15.3.4 چارٹسٹ تحریک اور اصلاح بل

15.4 فرانس میں حریت پسندی کا آغاز اور جمہوریت کا ارتقاء

15.5 قوم پرستی

15.5.1 قوم پرستی اور قومی ریاستیں

15.6 اکتسابی نتائج

15.7 کلیدی الفاظ

15.8 نمونہ امتحانی سوالات

15.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید (Introduction)

نشاۃ ثانیہ نے یورپ کی تاریخ کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔ لوگوں کے دل ودماغ میں نئی امنگیں پیدا ہوئیں اور نئے خیالات کی نشو ونما ہوئی۔ اُن میں علم حاصل کرنے اور قدرت کے اسرار نہفتہ کا سراغ لگانے کا شوق پیدا ہوا۔ جغرافیائی معلومات کی وسعت، نئی ایجادات اور وسائل کی فراوانی نے اقتصادی نظام کو بھی ترقی دی۔ توہم کی جگہ عقلیت پسندی نے لی، جس کے سبب انسانی زندگی سے وابستہ بہت سے مسائل پر توجہ دی گئی۔ قوت استدلال سے کام لے کر سیاسی، سماجی اور معاشی میدانوں میں نئی راہیں دریافت کی گئیں۔ نئے افکار و نظریات پیدا ہوئے۔ سیاسی مطلق العنانیت، سماجی ناہمواری، مذہبی تعصب اور جاگیردارانہ نظام کی جگہ حریت پسندی اور قوم پرستی جیسے نئے نظریات نے لے لی۔ ان نظریات نے یورپ میں جدید دور کی تکمیل کا راستہ صاف کر دیا۔ نئے نظریات کی بدولت انفرادی اور اجتماعی زندگیاں متاثر ہوئیں۔ مساوات اور آزادی کے جذبات سے سرشار ایسی قومی ریاستوں کی تشکیل کا آغاز ہوا، جن میں مذہبی مداخلت کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا۔ حکومت میں عوام کا کردار اہمیت اختیار کرنے لگا۔ شخصی آزادی کا تصور ایک واضح شکل میں سماج کے سامنے آیا۔ ان نئے رجحانات کے آغاز وارتقاء میں برطانیہ اور فرانس کو اولیت حاصل رہی جو بتدریج پورے یورپ میں پھیل گئے۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- یورپ کے جدید دور میں پیدا ہونے والے مختلف افکار و نظریات کو سمجھ سکیں گے۔
- قوم پرستی کے جدید تصور سے واقف ہو جائیں گے۔
- حریت پسندی کے آغاز وارتقاء سے آگاہ ہو جائیں گے۔
- اس صورتحال کا تجزیہ کر سکیں گے جس نے یورپ کو مکمل طور سے جدید دور میں داخل کر دیا۔

15.2 پس منظر (The Context)

نشاۃ ثانیہ اور مذہبی اصلاحی تحریکوں نے یورپ میں عہدِ وسطیٰ کا خاتمہ کر دیا۔ قدیم سیاسی و سماجی نظام کی جگہ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جاگیرداروں اور مذہبی رہنماؤں کے تسلط سے عوام کو آزادی ملی۔ جغرافیائی معلومات اور سائنسی ایجادات کے سبب استعماریت کا آغاز ہوا۔ صنعتی انقلاب نے یورپی ممالک کو نوآبادیات کی دوڑ میں شامل کر دیا۔ سیاسی، سماجی اور معاشی بیداری نے زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔ اس بیداری میں اُن مفکرین اور دانشوروں کا بڑا ہاتھ تھا جنہوں نے اپنے افکار و نظریات کو عوام تک بڑی جانفشانی سے پہنچایا۔ ان مفکرین نے اس پرانے نظام کی بنیادیں ہلا دیں جس کی باگ دوڑ مطلق النعان فرمانرواؤں کے ہاتھ میں تھی اور جہاں عوام کا ایک بڑا طبقہ زندگی کی بنیادی سہولیات سے بھی محروم تھا۔ ماضی میں حکومتیں مخصوص جغرافیائی خطوں پر منحصر تھیں اور اقتدار کا بنیادی تعلق علاقوں سے تھا۔ یہ صورتحال تبدیل ہوئی اور جغرافیائی علاقوں کے ساتھ ساتھ دیگر مشترک اقدار ریاست کے وجود کے لیے اہم اور لازمی قرار پائیں۔ ان میں زبان، رنگ و نسل، مذہب اور

تہذیب وثقافت جیسے عناصر نے اتحاد کے نئے راستے کھولے، جس کی بنیاد پر قومی ریاستیں وجود میں آئیں۔ یہ مشترک قدریں جدید قوم پرستی کی بنیاد ثابت ہوئیں۔ جدید دور نے سماجی ساخت کو بھی تبدیل کیا۔ عوام کو مختلف سطحوں پر آزادی حاصل ہوئی۔ مذہبی رہنماؤں کے شکنجے سے نجات ملی۔ وسائل کی منصفانہ تقسیم کے لیے آواز اٹھنے لگی۔ یہاں تک کہ حکومت کے ادارے میں بھی ان کا دخل لازمی قرار پایا۔ حقیقتاً حریت پسندی اور قوم پرستی جدید یورپ کی تشکیل ان کی تعمیر وترقی اور کامیابی کے نقیب بن گئے۔

15.3 حریت پسندی (Liberalism)

حریت پسندی کی صحیح تعریف آسان نہیں ہے، کیونکہ مختلف زمانوں میں اس کی شکلیں بدلتی رہی ہیں اور اسے الگ الگ معنوں میں لیا جاتا رہا ہے۔ عموماً دانشوروں کے نزدیک اس کا مطلب آزادی، آزاد خیالی اور مساوات ہے، لیکن ایسی آزادی اور مساوات جو اخلاقی قیود کے دائرے میں ہو۔ حریت پسند شخصی آزادی مثلاً لکھنے بولنے، املاک رکھنے اور تنظیمیں بنانے کی آزادی کو یقینی بنانا چاہتے تھے۔ ان کا منشاء تھا کہ منتخب پارلیمنٹ والی آئینی حکومتوں کی تشکیل ہو۔ وہ ووٹ دینے کے حق کو وسعت تو دینا چاہتے تھے، لیکن اسے عام کرنا انہیں پسند نہیں تھا۔ آغاز میں اسے محدود حق رائے دہی اور نجی حقوق کے آئینی تحفظ کی نسبت سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ حریت پسندی، کم سے کم حکومتی مداخلت کی قائل تھی۔ اسی طرح سے وہ سرکاری کاموں میں مذہبی مداخلت کے سخت خلاف تھی۔ حریت پسندی کے مخالفین میں بادشاہ، فوجی افسران، اعلیٰ طبقہ اور پادری شامل تھے۔ اس کا اثر سب سے پہلے مغربی یورپ کے اُن ممالک میں ہوا جو صنعتی انقلاب سے گذر چکے تھے۔ اصولی طور پر حریت پسندی، عقلیت پسندی کی اس تحریک سے متاثر تھی جو اٹھارہویں صدی میں یورپ میں پھیلی۔ چنانچہ اس دور میں حریت پسندی کے حامی افراد پارلیمانی نظام اور قانون کی حکمرانی کے تو حامی تھے، لیکن غریبوں اور مزدوروں کو حق رائے دہی دینے کے مخالف تھے۔ وہ سماجی اصلاح کے پیرو کار اس لیے تھے تاکہ خود کو مطلق العنان حکومتوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ پارلیمانی نظام کا مقصد ان کے نزدیک خود کے لیے خوشحالی کا حصول تھا۔ 1870 کے بعد حریت پسندی کی سمجھ تبدیل ہونے لگی۔ اب تک متوسط طبقہ املاک اور اقتدار حاصل کر چکا تھا۔ اب وہ مزید سیاسی وسماجی تبدیلیوں کے حق میں نہیں تھا۔ یہی سب تھا کہ اس دور میں صنعتی متوسط طبقہ کا رویہ غیر روادار ہوتا گیا اور مزدور و محروم طبقہ ان کی جگہ نہیں لے سکا۔

حریت پسندی اور جمہوریت کے مثالی قیام کے لیے مذہبی غیر جانبداری یا لامذہبیت (Secularism) لازمی ہے۔ فرانسیسی انقلاب نے یورپ میں لامذہب ریاستوں کے قیام کی راہ ہموار کی۔ مفکر ہالیاک (Holyoake) مغربی یورپ کے بابائے لامذہبیت کے طور پر مشہور ہے۔ اس نے اپنے خیالات *The Principles of Secularism* اور *The Origin and Nature of Secularism* میں پیش کیے۔ یورپ میں لامذہبیت کی اشاعت نے قوم پرستی کو مضبوط کیا جس کے نتیجے میں روایتی قدامت پسند عناصر کی جگہ حریت پسند عناصر نے لے لی۔ ایک نظریہ کے طور پر حریت پسندی کا آغاز سولہویں وسترہویں صدی میں ہوا تھا جو منظم طریقے سے برطانیہ میں پھلا پھولا۔ ایک نظریہ سیاسی کے طور اس کا آغاز تھامس ہابس نے کیا تھا جس کو بعد میں جان لاک (John Locke)، مانٹیسکو

(Montesquieu)، ایڈم اسمتھ (Adam Smith)، تھامس پین (Thomas Paine)، ریکارڈو (Ricardo)، مالتھس (Malthus)، جرمی بینتھم (Jeremy Bentham) اور جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) نے مختلف پہلوؤں سے اس میں اعانت کی، جس کے نتیجے میں لوگوں کی سیاسی اور معاشی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ حریت پسند گروہ کے مطابق حکومت صرف ان معاملات میں فعال ہونی چاہیے جہاں متصادم اور متضاد اغراض و مقاصد دکھائی دیں۔ وہ حکومت کو ایک لازمی برائی (Necessary Evil) کی شکل میں دیکھتے تھے۔ جرمی بینتھم کے مطابق سب سے بہتر سرکار وہ ہے جو سب سے کم حکومت کرے۔ اس نظریہ کے مطابق حکومت کا بنیادی کام افراد کی نجی ملکیت جیسے حقوق کا تحفظ کرنا تھا۔ جان لاک نے کہا کہ اگر حکومت اس میں ناکام رہتی ہے تو اس کا وجود بے معنی ہے۔

جان اسٹوارٹ مل اور تھامس بل گرین جیسے مفکرین نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں حریت پسندی کے اصول و ضوابط میں تبدیلیاں کیں۔ معاشی میدان میں عدم مداخلت کی پالیسی کی جگہ یہ خیال پیش کیا گیا کہ ریاست کا مقصد فرد کی عمومی فلاح و بہبود ہے۔ چنانچہ یہ تسلیم کیا گیا کہ مزدوروں کو استحصال سے بچانے اور پیداواری وسائل کی منصفانہ تقسیم کے لیے حکومت کو مثبت کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ابتداء میں حریت پسندی کا موقف سیاسی و معاشی زندگی میں کم سے کم مداخلت تھا جسے علم سیاسیات کی اصطلاح میں منفی حریت پسندی کہا گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں منفی حریت پسندی کی جگہ مثبت حریت پسندی نے لے لی۔ کہا جانے لگا کہ سماجی مفاد کے تحفظ کے لیے ریاست کی مداخلت ضروری ہے۔ بلاشبہ جاگیردارانہ نظام کے مقابلے میں حریت پسندی ایک انقلابی نظریہ تھا، لیکن آج اس کی بہت سی خامیاں اجاگر ہو چکی ہیں۔ معاشی مشکلات سے آزاد زندگی دینے میں یہ ناکام ثابت ہوا۔

15.3.1 برطانیہ میں حریت پسندی اور جمہوریت کا ارتقاء

(Liberalism and the Development of Democracy in Britain)

1688ء کے انقلاب سے برطانیہ میں جمہوریت کا آغاز ہوا۔ شہنشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان اقتدارِ اعلیٰ کی جو رسہ کشی اسٹوارٹ کے عہد سے چلی آ رہی تھی وہ ختم ہو گئی۔ پارلیمنٹ کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کر لیا گیا اور بادشاہ کی مطلق العنانیت ختم ہو گئی۔ اور اقتدار پارلیمنٹ کے ہاتھوں میں آ گیا لیکن اس سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ پارلیمنٹ میں جاگیردار اور اعلیٰ طبقہ کا بول بالا تھا۔ ان کے نزدیک اب اور کسی اصلاح یا تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی۔ اس طرح عوام اب بھی سیاسی حقوق سے محروم ہی رہے۔ پارلیمنٹ ان کی نمائندہ نہیں تھی۔ حق رائے دہی بہت محدود تھا۔ انتخابی نظام میں خامیاں تھیں، جنہیں دور کرنے کے لیے سب سے پہلے جان لاک نے 1689ء میں آواز اٹھائی۔ 1730ء کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوا لیکن پوری کامیابی نہیں ملی۔ اس وقت برطانیہ کی پارلیمنٹ میں دو پارٹیاں تھیں 'ٹوری' (Tory) اور 'وہیگ' (Whig)۔ اور یہ دونوں ہی کسی بھی اصلاح کے حق میں نہیں تھیں۔ لیکن 1760ء کے بعد پارلیمنٹ میں اصلاح کا مطالبہ منظم شکل اختیار کر گیا جس کے نتیجے میں 1832ء میں پہلا اصلاح ایکٹ پاس ہوا۔

15.3.2 اصلاح کی ابتدائی کوششیں (Early Efforts at Reform)

1815ء میں نپولین کی شکست کے ساتھ ہی یورپ میں امن وامان قائم ہوا لیکن برطانیہ عظیم معاشی بحران کا شکار ہو گیا۔ بیکاری بڑھ گئی، صرف نچلا طبقہ ہی نہیں عوام کے ایک بڑے حصے کو صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ غیر اطمینان بخش صورتحال نے لوگوں میں زبردست بے چینی پیدا کر دی۔ اس صورتحال سے نمٹنے میں حکومت ناکام رہی۔ برسراقتدار ٹوری پارٹی کے وزیراعظم لارڈ لیورپل نے طاقت استعمال کر کے مسئلے کو حل کرنا چاہا، لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اناج مہنگا ہو گیا۔ عوام کی بھیڑ نے اناج کے گوداموں میں آگ لگا دی۔ جگہ جگہ تشدد شروع ہو گیا۔ جرائم بڑھ گئے۔ یہ تحریک بنیادی طور سے معاشی مسائل سے وابستہ تھی، لیکن بعد میں اس میں سیاسی مطالبات بھی جوڑ دیئے گئے۔ حق رائے دہی اور سالانہ پارلیمنٹ اجلاس کی مانگ بھی شروع ہو گئی۔ عام طور سے برطانیہ میں اصلاح کا دور 1831ء سے مانا جاتا ہے۔ 1831ء کے انتخابات میں وہیگ (Whig) پارٹی نے حکومت سنبھالی اور انہوں نے پارلیمانی و انتظامی امور میں اصلاح کا آغاز کیا۔ اس سے قبل 40 برسوں تک ٹوری پارٹی کے ہاتھ میں اقتدار رہا تھا جو کٹر اور پرانے خیالات کی تھی، حالانکہ اس کے کچھ اراکین اصلاح کے حامی تھے اور انہوں نے مختلف اوقات میں اصلاحی اقدام اٹھائے۔ ان میں وزیر خارجہ کینگ 'وزیر داخلہ پیل اور بورڈ آف ٹریڈ کا صدر ہسکسن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پیل نے قانون 'عدلیہ اور پولیس میں سدھار کیے۔ قانون کی سختی کم کی اور انصاف کو آسان بنانے کا کام کیا۔ اس نے فوجداری سے متعلق 279 قوانین ختم کر دیئے، سو سے زائد معمولی جرائم کے لیے سزائے موت کا قانون بھی اس میں شامل ہے۔ 1829ء میں اس نے پہلی بار پولیس نظم اس طرح قائم کیا کہ شہروں میں امن وامان قائم ہو گیا۔

ہسکسن نے 1825ء میں بحری قوانین میں اصلاحات نافذ کیے۔ اس نے آزاد تجارت کی سمت پیش قدمی کی۔ پہلے صرف برطانیہ کے جہازوں کو ہی باہر سے مال لانے کا حق تھا، لیکن نئے قوانین کے تحت کوئی بھی ملک برطانوی بندرگاہوں پر مال لا سکتا تھا۔ اسی طرح برآمدات کو بڑھاوا دینے کے لیے بہت سے اشیائی برآمدات پر ٹیکس کم کر دیا گیا۔ سرمایہ دار اور مزدور کے باہمی تصادم کو کم کرنے کے لیے مزدوروں کو تنظیمیں بنانے کی آزادی مل گئی۔ اسی طرح ہسکسن کے معاون رابنسن نے بجٹ اور ٹیکس کے نظام کو آسان بنایا۔ اس نے بہت سے ٹیکس ختم کر دیے۔ کینگ نے خارجی امور میں حریت پسند پالیسی اختیار کی۔ اس نے یورپ کے مطلق العنان بادشاہوں کی مخالفت کی اور قومیت کی بنیاد پر آزادی کی جدوجہد کرنے والی تحریکوں کی حمایت کی، جس کے سبب یونان و جنوبی امریکہ کی نوآبادیات کو آزادی حاصل ہوئی۔

15.3.3 1832 کا عظیم اصلاحی قانون (The Great Reform Act of 1832)

1688ء کے انقلاب نے برطانیہ کا اقتدار اشرافیہ کو منتقل کر دیا۔ پارلیمنٹ میں ان ہی کا دبدبہ تھا۔ ٹوری اور وہگ دونوں پارٹیوں میں وہی اکثریت میں تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کسی بھی طرح کی اصلاحی یا حریت پسند اقدام کیے جائیں، جن سے ان کی طاقت کم ہو۔ حقیقتاً اس وقت برطانیہ میں پارلیمنٹ عوام کی نمائندہ نہیں تھی۔ انتخابی عمل میں بھی بہت سی خامیاں تھیں۔ نمائندگی علاقوں کی آبادی کے تناسب میں نہیں تھی۔ دارالعوام (House of Commons) میں عوام کے منتخب کردہ نمائندے تو پہنچتے مگر ناقص نظام کے سبب مٹھی بھر

افراد اسے کنٹرول کرتے۔ یہی نہیں بلکہ برطانیہ کا پورا انتخابی نظام بدعنوانی کا شکار تھا۔ ووٹوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ کچھ سرمایہ دار انتخابی حلقے ہی خرید لیتے اور اپنی پسند کے فرد کو نامزد کر دیتے اور یہ سب کھلے عام ہوتا تھا۔ ہیزن کے مطابق 'اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ برطانیہ کی اس وقت کی حکومت نمائندہ حکومت نہیں تھی بلکہ جاگیردارانہ طرز کی تھی۔' بہر حال برطانیہ میں پارلیمانی اصلاح کے لیے تحریکیں واٹرلو کی جنگ کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں، لیکن 31–1830 میں ان میں تیزی آگئی۔ بہت سی تنظیمیں اور کلب اس میں شامل ہو گئے۔ بینتھم، اسٹوارٹ مل اور جیمس مل جیسے مفکرین نے اپنے ہاتھوں میں اصلاح کا علم اٹھا لیا۔ لندن میں جگہ جگہ جلسے ہونے لگے جن میں ہزاروں افراد نے شامل ہو کر تحریک کو تقویت بخشی۔ ہڑتالوں کا دور شروع ہو گیا۔ ٹوری رہنما ڈیوک آف ویلنگٹن نے اصلاح مخالف بیان دے کر عوام کو ناراض کر دیا اور انتخاب میں وہگ پارٹی کو فتح حاصل ہوئی، جس نے اقتدار میں آتے ہی پارلیمانی اصلاحات کو ترجیح دی۔

پہلا اصلاحی بل (First Bill of Reform) یکم مارچ 1831ء کو لارڈ جان رسل نے دارالعوام میں پیش کیا، لیکن اسے منظور کرانے میں ناکام رہا۔ 17 اپریل 1831ء کو ناکامی کے بعد وزیر اعظم گرے کے کہنے پر دارالعوام کو برخاست کر دیا گیا اور نئے انتخابات کا اعلان ہوا۔ 1831ء کے انتخابات میں یہ بل پورے ملک میں چھایا رہا، جس کے نتیجے میں حامیان اصلاح کو طاقت ملی اور وہ پہلے سے زیادہ ووٹوں اور سیٹوں کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ 24 جون 1831ء کو جان رسل نے پہلے بل کے مطابق ہی دوسرا بل دارالعوام میں پیش کیا۔ 22 ستمبر 1831ء کو یہ منظور ہو گیا جس کے بعد اسے دارالامراء (House of Lords) میں بھیجا گیا، لیکن وہاں 8 اکتوبر 1831ء کو اسے نامنظور کر دیا گیا۔ اس سے عوام میں ناراضگی پھیلی اور جگہ جگہ امراء کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ لندن سمیت کئی شہروں میں فسادات بھی ہوئے۔ عوام کی طرف سے یہ احتجاج بہت شدید تھا۔ اس بار حکومت نے استعفیٰ نہیں دیا بلکہ مخالفین کا ڈٹ کر سامنا کیا اور بل دوبارہ لایا گیا جو 12 مارچ 1832ء کو دارالعوام میں منظور ہونے کے بعد دارالامراء میں پیش ہوا اور بہت ردوقدح کے بعد بالآخر منظور ہو گیا۔ برطانیہ کی آئینی تاریخ میں یہ پہلا اصلاحی بل بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے انتخابی حلقوں کا تناسبی اختلاف دور ہوا۔ رائے دہندگان کی تعداد بڑھی اور زمینداروں و امراء کی سیاسی اجارہ داری ختم ہوئی۔

15.3.4 چارٹسٹ تحریک اور اصلاح بل (The Chartist Movement, and the Bill of Reform)

1832 کے عظیم اصلاحی قانون سے، برطانیہ میں جائیداد کے مالک متوسط طبقے کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ تاہم، پہلے اصلاحی بل سے عوام کو براہ راست کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا، کیونکہ اب سیاسی قوت سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ میں آگئی تھی اور اس نے مزدوروں کی فلاح کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ مزدور طبقے کو ابھی بھی ووٹ کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ اس صورتحال نے مزدوروں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ جب تک طاقت خود ان کے ہاتھ میں نہیں آتی تب تک ان کی حالت سدھرنے والی نہیں ہے۔ اس احساس نے برطانیہ میں 'چارٹسٹ تحریک' کو جنم دیا۔ چارٹسٹوں کے 6 مطالبات تھے۔

1. تمام بالغ افراد کو حق رائے دہی حاصل ہو
2. پارلیمنٹ کا انتخاب سالانہ ہو

3. رائے شماری خفیہ ہو
4. انتخابی حلقوں میں تناسب ہو
5. دارالعوام کا رکن بننے کے لیے جائیداد کی شرط ختم ہو
6. پارلیمنٹ کے اراکین کو تنخواہ دی جائے۔

ان مطالبات کے حصول کے لیے زبردست تحریک چلائی گئی۔ بے شمار افراد کے ذریعے دستخط شدہ قرارداد پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی گئی۔ اسی طرح کا ایک اور خط پچاس لاکھ لوگوں کے دستخط کے ساتھ پارلیمنٹ میں پیش ہوا، لیکن اس کے زیادہ تر دستخط جعلی پائے گئے، جس سے چارٹسٹوں کی بڑی بدنامی ہوئی، جس سے تحریک خود ہی ختم ہو گئی۔ لیکن اس کے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ ٹوری پارٹی جس نے پہلے اصلاح بل کی مخالفت کی تھی' نے بھی اس کے حق میں اپنا موقف بدل دیا، کیونکہ اس تحریک نے ملک کے کونے کونے تک عوام میں بیداری کا کام کیا تھا۔ 1867 میں قدامت پسند کابینہ کی قیادت میں پارلیمنٹ نے دوسرا اصلاح ایکٹ منظور کیا۔ اس کے تحت رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ انتخابی حلقوں کی تقسیم میں بھی شفافیت آئی۔ اس کے علاوہ لندن اور اسکاٹ لینڈ کی یونیورسٹیوں کو بھی اپنے نمائندے بھیجنے کا حق ملا۔ لگ بھگ 10,80,000 نئے ووٹر بنے اور ساتھ ہی آبادی کے تناسب سے علاقوں کو نمائندے منتخب کرنے کی آزادی ملی۔ ان سب کے باوجود یہ ایکٹ بہت سی خامیوں کو دور کرنے میں ناکام رہا، مثلاً زرعی مزدور' خواتین اور کان مزدور ووٹ دینے کے حق سے محروم ہی تھے۔ خفیہ رائے شماری کی عدم موجودگی کے سبب مزدور مل مالکان کے دباؤ سے آزاد نہیں ہو سکے اور حق رائے دہی بنیادی حق اب بھی نہیں بن سکا، وغیرہ۔

1872ء میں خفیہ رائے دہی کا بل منظور ہوا جس کے بعد بیلٹ پیپر کا نظم شروع ہوا۔ کچھ دنوں بعد ووٹ کے لیے رشوت دینا اور دہشت زدہ کرنے کو بھی جرم تسلیم کر لیا گیا۔ 1883ء میں 'کرپٹ پریکٹشنز ایکٹ' منظور ہوا جس کے تحت امیدواروں کے ذریعے الیکشن میں خرچ کی جانے والی رقم محدود کر دی گئی۔ 1884ء میں حریت پسند پارٹی کے رہنما' وزیر اعظم گلنڈاسٹن کے عہد میں حق رائے دہی ایکٹ منظور ہوا۔ تیسرے اصلاح ایکٹ سے زرعی مزدوروں اور چھوٹے شہروں کے باشندوں کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا۔ یہ بہت اہم ایکٹ تھا لیکن اس کے باوجود خواتین اور لگ بھگ 30 فیصد بالغ مرد حق رائے دہی سے محروم تھے۔ یہ عمل بتدریج 1928ء میں 21 سال سے اوپر کی خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق ملنے کے بعد مکمل ہوا۔

15.4 فرانس میں حریت پسندی اور جمہوریت کا ارتقاء

(Development of Liberalism and Democracy in France)

یورپ کے مختلف ممالک میں عصری سماجی' مذہبی' معاشی اور سیاسی صورتحال کے تحت حریت پسندی کا ارتقاء ہوا۔ برطانیہ میں بادشاہت کا خاتمہ حریت پسندی کا مظہر ہے۔ جبکہ فرانس میں حریت پسندی جاگیردار طبقہ اور بوربوا خاندان کے زوال کی علامت ہے۔ فرانس

میں عظیم انقلاب سے قبل مختلف دانشوروں اور مفکرین نے حریت پسندی کے لیے زمین تیار کر دی تھی۔ یہ لوگ فرانس کے سبھی مسائل کا بنیادی سبب مطلق العنانیت کو مانتے تھے۔ چنانچہ انتظامیہ میں حکومت کی مداخلت کم سے کم ہونے کے حق میں تھے۔ یہ افراد کے کچھ بنیادی حقوق کا تحفظ چاہتے تھے اور ملک کی اندرونی و بیرونی تجارت پر سے معاشی پابندیاں بنانے کی پالیسی کے حامی تھے۔ انتظامیہ میں غیر مرکزیت کے حق میں تھے۔ فرانس کی اس وقت کی سب سے بڑی لعنت جاگیر داروں کی خصوصی مراعات و حقوق تھے۔ یہ دانشور اس سے نجات چاہتے تھے۔ ان سب کے حصول کے لیے یہ برطانیہ کے انتظامی ڈھانچہ کو فرانس میں لاگو کرنے کے حامی تھے۔ نپولین کے زوال کے بعد 1815ء میں ویانا کانفرنس میں لوئی ہشد ہم (1824–1814) کو بادشاہت ملنے سے فرانس میں دوبارہ بوربن خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔ لوئی نے اپنی حکومت کے لیے مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ایک "آئینی اجازت نامے" کا اعلان کیا، جس میں برطانیہ کی طرح جوابدہ کابینہ اور دو ایوانوں پر مشتمل قانون ساز کی شق رکھی گئی۔ قانون کی نظر میں سب کو مساوی درجہ دیا گیا۔ انتظامی امور کے عہدوں کے لیے قابلیت کو بنیاد بنایا گیا۔ کیتھولک مذہب کو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا۔ ساتھ ہی سبھی فرقوں کو مذہبی آزادی دی گئی۔ لکھنے، بولنے کے ساتھ پریس کی آزادی کا اعلان کیا گیا۔

1824ء میں لوئی کی موت کے بعد چارلس دہم تخت نشین ہوا۔ وہ پرانے نظام اور مطلق العنانیت کا حامی تھا۔ اس کی کٹر پالیسیوں پر تنقید شروع ہوگئی۔ اس کے دور میں پادریوں کی اہمیت بڑھ گئی۔ پیرس میں اس کے خلاف اخبارات نے آواز اٹھانی شروع کر دی۔ جولائی 1830ء میں چارلس نے آرڈیننس جاری کر کے نئے اخبارات پر پابندی لگائی۔ پہلے انتخابات رد کر کے نئے انتخابات کے لیے تاریخوں کا اعلان کیا۔ اس آرڈیننس نے تیل میں چنگاری کا کام کیا۔ پیرس میں بغاوت ہوگئی اور پُر تشدد تحریک نے چارلس دہم کے اقتدار کو ختم کر دیا۔ اس جولائی انقلاب نے لوئی فلپ کو بادشاہت سونپ دی لیکن اب وہ فرانس کا حکمراں نہیں بلکہ فرانسیسیوں کا حکمراں کہلایا۔ اس نے پرانے آئین کو کچھ تبدیلیوں کے ساتھ قبول کر لیا۔ اس کے دور کا آغاز جمہوری انداز میں ہوا لیکن جلد ہی صورتحال بدل گئی۔ فرانس میں اس وقت مختلف سیاسی گروپ فعال تھے، مثلاً جمہوریت پسند، اشتراکی، حریت پسند وغیرہ۔ بادشاہ ان میں سے کسی کو بھی مطمئن نہیں کر سکا۔ چارلس کی جب مخالفت شروع ہوئی تو اس نے بھی طاقت سے اسے کچلنا چاہا، لیکن تشدد بڑھتا گیا اور آخر کار 24 فروری 1848ء کو پُر تشدد واقعات کے دوران فوج نے بھی بادشاہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ تخت چھوڑ کر برطانیہ بھاگ گیا۔ یہ 1848ء کا انقلاب فرانس کی تاریخ میں بہت اہم ہے کیونکہ اس نے حق رائے دہی کے دائرہ کو وسیع کر کے اقتدار کو متوسط طبقہ کے ہاتھوں سے لے کر پورے سماج کو سونپ دیا۔ یہی نہیں اس نے یورپ کے بیشتر حصوں میں انقلاب کو جلا بخشی اور حریت پسند تحریکوں کی آبیاری کی۔ 20 دسمبر 1848ء کو نپولین سوم نے صدر کا عہدہ سنبھالا جس کے ساتھ ہی فرانس میں جمہوریت قائم ہوگئی، لیکن وہ قلیل مدتی رہی۔ اگلے انتخاب میں بادشاہت کے حامی گروہ کو اکثریت حاصل ہوگئی اور جلد ہی نپولین نے شہنشاہ کا خطاب اختیار کر کے جمہوریت کا خاتمہ کر دیا۔

1870ء میں فرانس اور پرشیا کے درمیان سیڈان کی جنگ ہوئی، جس میں حیرت انگیز طور پر فرانس کو شکست ہوئی۔ نپولین سوم کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعہ نے ایک بار پھر فرانس میں جمہوریت زندہ باد کے نعروں سے پیرس کی سڑکوں کو آشنا کر دیا۔ نپولین سوم کو گدی سے

ہٹا کر جمہوریت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ 1875ء میں نیا جمہوری آئین تشکیل دیا گیا۔ بلاشبہ جدید دور میں حریت پسندی اور جمہوریت کا ارتقاء سب سے پہلے برطانیہ اور فرانس میں ہوا۔ بڑے پیمانے پر حق رائے دہی اور حکومت میں عوام کی شمولیت اسی دور کی دین ہے۔ اس صدی میں یورپ کے بیشتر حصوں میں جمہوری بنیادوں پر سیاسی نظام کی بنیادیں استوار کی گئی۔

15.5 قوم پرستی (Nationalism)

زبان، تہذیب و ثقافت، روایات اور نسل کا اشتراک افراد کو ایک کڑی میں پروتا ہے اور انہیں متحد کرنے کا کام کرتا ہے۔ یہ مشترک قدریں کبھی حقیقی ہوتی ہیں اور کبھی اصل روایتوں اور افسانوں کی بنیاد پر بن جاتے ہیں۔ قوم پرستی کے بانی مفکر ہینس کوہن کا کہنا ہے "قومیتیں تاریخ کی زندہ قوموں کی دین ہیں، اس لیے یہ حتمی نہیں ہوتیں، ان میں ہمیشہ اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں" اس کے مطابق قوم پرستی کا تصور اور اس کی ساخت جدید عہد سے بہت پہلے ہی نشو و نما پاچکی تھی۔ قدیم عبرانی اور یونانی عہد میں ہی یہ پیدا ہو چکی تھی۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ یونانیوں میں سیاسی قوم پرستی نہیں تھا۔ البتہ فارسی جنگوں کے دوران قلیل وقت کے لیے وطن سے محبت کا جذبہ ابھرا تھا۔ مارکسسٹ نظریہ کے مطابق جاگیر دارانہ نظام کا زوال اور سرمایہ داری کا عروج قوم پرستی کے پس پشت کارفرما ہے۔ کیونکہ نسل، تہذیب و ثقافت اور دیگر مشترک قدریں تو پہلے بھی موجود تھیں، لیکن سرمایہ داری نے نئے معاشی رشتوں اور رابطوں کو جنم دیا جس کے نتیجے میں قوم پرستی وجود میں آیا۔ نیشنلز کی پیدائش اور اس کی تاریخ کے سلسلے میں یہ بات یقینی طور سے کہی جاسکتی ہے کہ قدیم دور یا عہد وسطیٰ میں پہلے ہی اس کے اثرات پائے جاتے ہیں، لیکن یورپ کا جدید دور ہی قومی ریاستوں کے طلوع کا گواہ ہے اور سیاسی قوت کی حیثیت سے اسی عہد میں قوم پرستی نے اپنی شناخت قائم کی۔

15.5.1 قوم پرستی اور قومی ریاستیں (Nationalism and Nation-States)

امریکی انقلاب (1706ء) اور فرانسیسی انقلاب (1787ء) کے دوران قوم پرستی کے جدید تصور نے آنکھ کھولی۔ امریکہ کے برعکس فرانس میں قومی ریاست کا مفہوم 'ایک اور غیر منقسم' مانا گیا۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ کسی گروہ یا طبقے کی مخصوص مشترک قدریں جو اسے دوسروں سے علیحدہ کرتی ہیں اور جو پہلے سے موجود ہوتی ہیں، قومی ریاست کی تشکیل کرتی ہیں۔ انقلاب کے بعد فرانس میں بڑے پیمانے پر لسانی اتحاد پر زور دیا گیا۔ اسی طرح اٹلی کے اتحاد اور قوم پرستی میں بھی اطالوی زبان اہم تھی۔ یورپ میں قوم پرستی کے ارتقاء کو دو حصوں میں سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلا مرحلہ 1789ء کے فرانسیسی انقلاب سے پہلے کا دور ہے، جب یہ ابتدائی شکل کی حیثیت رکھتا تھا اور دوسرا مرحلہ انقلاب فرانس کے بعد کا دور ہے، جس میں اس فکر نے واضح شکل اختیار کی اور ایک طاقت بن کر ابھرا۔

1789ء انقلاب سے قبل: جیسا کہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ قوم پرستی کی نشو و نما میں مشترک روایات، زبان اور تہذیب و ثقافت کا اہم کردار ہے۔ اس نقطہ نظر سے عہد وسطیٰ برطانیہ اور فرانس کے باشندوں میں اسی قسم کا اتحاد اور یگانگت پائی جاتی تھی۔ برطانیہ کے لوگوں میں تو چودھویں صدی میں ہی یہ احساس پیدا ہو چکا تھا۔ پندرہویں صدی میں مشترکہ عناصر کو فرانسیسیوں نے بھی محسوس کرنا شروع کر دیا تھا اور اُن میں بھی متحدہ قومیت کا جذبہ نشو نما پانے لگا تھا۔ اسی صدی میں اسپین اور ہالینڈ میں بھی قومیت کا جذبہ ابھرنے لگا تھا اور اس بنیاد پر حکومتیں بھی

قائم ہوئی تھیں۔اس طرح برطانیہ ٬فرانس اوراسپین تین طاقتور قومی حکومتیں اپنی مشترکہ بنیادوں پر وجود میں آچکی تھیں، لیکن ان میں برطانیہ سب سے آگے تھا، کیونکہ فرانس اوراسپین کے عوام کا ملکی نظم ونسق میں کوئی دخل نہیں تھا،اس لیے انہیں اپنی اپنی حکومتوں کے سیاسی اغراض و مقاصد میں بھی بہت دلچسپی نہیں تھی۔ابتدائی قوم پرستی کے ضمن میں مشہور فرانسیسی مورخ اور سیاست داں گیزو کا یہ قول دلچسپ ہے، جس کے مطابق برطانیہ اور فرانس کے درمیان ہوئی سوسالہ جنگوں (1453–1337) نے قوم پرستی کو فروغ دیا۔ برطانیہ کے بادشاہ نے فرانس کے تخت پر اپنا دعویٰ پیش کیا، جس کے نتیجے میں جاگیردار ٬مزدور ٬کسان ہر طبقے کی ایک ہی خواہش تھی کہ غیر ملکی حملہ آور کو بادشاہ بنایا جائے۔ کچھ لوگ اسے ایمرجنسی صورتحال مانتے ہیں، لیکن تب بھی حب الوطنی کا جذبہ کسی نہ کسی سطح پر ضرور موجود تھا۔

جدید قوم پرستی: انیسویں صدی کو قوم پرستی کی صدی تسلیم کیا جاتا ہے، کیونکہ اس دور میں برطانیہ اور فرانس کی طرز پر قومی ریاستوں کے قیام نے عمومی شکل اختیار کی اور اسے جدید سماج کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ فریڈرک لسٹ کی ''دی نیشنل سسٹم آف پولیٹیکل اکانامی'' کی کتاب اس ضمن میں ایک نمایاں تحریک تھی ''ایک بڑی آبادی اور وسیع علاقہ جس میں کئی طرح کے قومی وسائل موجود ہوں ایک عام قوم پرستی کی لازمی ضرورت ہیں۔ایک ریاست اپنی آبادی اور علاقے سے متعین ہوتی ہے، جس کی اپنی زنان اور ادب ہوتا ہے اور اپنے فنون وادب کو فروغ دینے کے لیے طاقتور منظم ادارے ہوتے ہیں۔ایک چھوٹی ریاست اپنی حدود کے اندر مکمل نہیں ہوسکتی اور نہ ہی پیداوار کی سبھی ضرورتیں پوری کرسکتی ہے۔ عملی شکل میں قوم پرستی کے حریت پسند عہد میں قوم پرستی کا تصور کچھ خاص شکل کی ریاستوں پر ہی نافذ ہوسکتا تھا کیونکہ اس وقت بڑی اور وسیع ریاستوں کو ہی بہتر سمجھا جاتا تھا'' اسی کو ہالیس بام نے ''قوم پرستی کا دہلیز اصول'' کہا ہے۔ جس کو فریڈرک اینگلس اور میزنی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ 1857ء میں میزنی نے یورپ کا جو نقشہ بنایا تھا،اس میں صرف ایک درجن ریاستیں اور فیڈریشن تھے۔اس کے برعکس دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ میں 26 قومی ریاستوں کی تشکیل ہوئی۔ پولینڈ کے کرنل پلسوڈسکی کے مطابق قومیں ریاستوں کی تشکیل کرتی ہیں نہ کہ ریاستیں قوموں کی۔ قوم ریاست کے مابین تعلق کو جسنظریہ سے بھی دیکھا جائے لیکن جمہوریت کے انتخابی نظام کے قائم ہونے کے بعد قوم پرستی کا یہ حریت پسند تصور بھی ختم ہوگیا۔

1789ء کے فرانسیسی انقلاب اور اس کے افکار و نظریات نے پرانے نظام کا تانا بانا بکھیر دیا اور ملک میں نئی فضا پیدا ہوگئی۔ سطحی طور پر فرانس کی حکومت جمہور کے ہاتھوں میں آئی۔ شہنشاہیت کی سرخ ریشم کے پرچم کی جگہ عوام کا سہ رنگا جھنڈے نے لے لی۔ فرانس کی افواج اب بادشاہ کے لیے نہیں بلکہ عوام یا ملک کے لیے جنگ کرنے لگیں اور ان کی بے جگری نے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ نپولین نے جو فتوحات حاصلکیں ان میں اسی جوش وولولہ کا بڑا دخل تھا۔ان ہی سے ترغیب پاکر اٹلی اور جرمن قوم پرستی کا وجود عمل میں آیا۔ قومی ریاستوں کی تشکیل میں نپولین نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں انقلابی وجمہوریت حامی نظریات وافکار نے نشینلزم کی ترویج میں مدد دی۔اس سے دانشور اور بورژوا دونوں طبقات متاثر ہوئے، جن کی قیادت میں بعد میں اٹلی اور جرمنی کے اتحاد کی تحریکیں شروع ہوئیں۔انیسویں صدی کے اواخر میں عوامی سیاست نے اپنے قدم پسارے، جس کے سبب خاص طورے سے مشرقی یورپ میں قوم پرستی کی ترقی زیادہ تیزی سے ہوئی۔ یہ علاقہ مغربی یورپ کے مقابلے میں پسماندہ تھا۔ برطانیہ اور فرانس جیسے پرانے ممالک میں تاریخی عوامل نے ہی جغرافیائی حدود کے اندر قوم

پرستی کو فروغ دیا۔ جرمنی اور اٹلی میں صورتحال الگ تھی۔ یہاں جرمن اور اطالوی زبان بولنے والے لوگوں کی وجہ سے قومی اتحاد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان دونوں ممالک میں انیسویں صدی کے وسط میں گھریلو سطح پر معاشی اور سیاسی اتحاد قائم کیا گیا، لیکن مخالفوں اور مخالفتوں سے نمٹنے کے لیے فوج کی مدد لی گئی۔

ویانا کانگریس کے بعد کئی قوموں نے جو آزاد حکومتیں قائم کرنا چاہتی تھیں' بغاوت کا پرچم اُٹھایا۔ ان میں پولینڈ' اٹلی اور اسپین کی امریکی نوآبادیوں کے لوگ شامل تھے۔ جرمنی اور بیلجیم کے لوگ بھی قومی اتحاد کے نام پر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حالانکہ ان تحریکوں کے انداز جداگانہ تھے اور نتائج بھی مختلف۔ کچھ تحریکیں کامیاب ہوئیں اور کچھ ناکام۔ پولینڈ' آسٹریا' پرشیا' اور روس میں یہ تحریک دھیمی تھی۔ ان تینوں ریاستوں کا غیر جمہوری ڈھانچہ کافی مضبوط تھا۔ اسپین کی امریکی نوآبادیاں نے اپنے زور بازو سے آزادی حاصل کی، لیکن اسپین اُن پر دوبارہ قابض ہونا چاہتا تھا۔ یورپ کی کچھ ریاستیں اسپین کی حامی تھیں، لیکن برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مخالفت کے سبب ایسا نہیں ہو سکا۔ اسی طرح برطانیہ اور فرانس نے بیلجیم کی اُس وقت حمایت کی جب اُس نے ہالینڈ سے آزادی کے حصول کے لیے بغاوت کر دی۔ ویانا کانگریس نے بیلجیم کو ہالینڈ سے ملحق کر دیا تھا، لیکن وہاں کے لوگوں کی آزادی کی دھن نے انہیں کامیابی سے ہمکنار کیا۔

قومی حب وطنی کے جذبہ کے تحت حاصل ہونے والی کامیابی نے بھی قوم پرستی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ سلطنتِ عثمانیہ میں بھی جو مختلف یورپی اقوام آباد تھیں، انہوں نے بھی شورش برپا کر دی اور اپنی آزادی کے لیے بگل بجایا۔ چنانچہ برطانیہ اور فرانس و روس کی کوششوں سے سب سے پہلے 1820ء میں یونان نے آزادی حاصل کی۔ کچھ عرصے بعد سربیا' رومانیہ' بلغاریہ کے بھی کچھ حصّے آزاد ہو گئے۔ انیسویں صدی میں بڑی سلطنتوں میں صرف آسٹریا ہی یورپ کا ایسا ملک تھا جہاں قومی حکومت نہیں تھیں۔ اس کے مختلف حصوں میں آسٹریائی، چیک، سلاوی، کروٹ، سلون اور مگیار قومیں آباد تھیں۔ ان میں مگیار اور آسٹروی سب سے اہم تھے۔ ان میں بھی آزادی کا جذبہ بڑی قوت کے ساتھ عیاں تھا۔ مختصراً جہاں ماضی میں یورپ کی مختلف سلطنتوں کی پہچان اُن کے جغرافیائی علاقے تھے، وہیں جدید دور میں ریاستوں کی تشکیل میں زبان' نسل' تہذیب و ثقافت اور تاریخی عناصر کا اہم کردار رہا اور یہی قوم پرستی کی بنیاد بھی تھیں۔

15.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

یورپ کا جدید عہد ایک طرف نشاۃ ثانیہ، جاگیردارانہ نظام کا زوال، مذہبی اصلاحات اور نئی سائنسی ایجادات اور روشن خیالی سے وابستہ تحریک نے یورپ کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کو بدل دیا۔ ان میں حریت پسندی اور قوم پرستی بہت اہم تھا۔

حریت پسندی: موٹے طور پر حریت پسندی کا مطلب ہے 'اقدار کی حامل آزادی اور مساوات' اس کا آغاز سیاسی میدان میں ہوا لیکن بتدریج معاشی سرگرمیاں بھی اس کے دائرہ اثر میں آگئیں۔ اٹھارہویں صدی میں مغربی یورپ میں حریت پسندی نے فروغ پایا اور جلد ہی ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ بیسویں صدی میں یہ دنیا کے کئی ممالک میں پھیل گئی۔ یہ تحریک غیر مساوات اور مطلق العنانیت کے خلاف ایک آواز تھی۔ ابتدائی حریت پسندی میں آئین' حکومت میں عوام کی شمولیت قانون کی نظر میں سب کی برابری' مذہبی رواداری' شخصی آزادی اور

جمہوریت جیسے اہم موضوع شامل تھے۔اس کی فکری جڑیں فرانس کے انقلاب میں نمایاں تھیں۔ لیکن اس کے لیے سازگار فضا پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔ نشاۃ ثانیہ مذہبی اصلاحی تحریکیں اور جاگیردارانہ نظام کا زوال اس کے پس پشت کارفرما عناصر تھے۔ کلیسا کی آمریت ختم ہوئی۔ 1688ء کے برطانیہ کے انقلاب نے بادشاہ پر پارلیمنٹ کی بالادستی قائم کردی۔ بتدریج حق رائے دہی کا دائرہ بڑھتا گیا۔ ساتھ ہی جواب دہ کابینہ وجود میں آیا۔ سائنسی سوچ اور سائنسی ایجادات نے بھی حریت پسندی کے فروغ میں مدد دی۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ انسان اپنی عقل سے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ مانٹیسکو، بینتھم اور ایڈم اسمتھ ابتدائی منفی حریت پسندی کے موجد ہیں۔ ان کے مطابق ہر انسان اپنے معاملات میں فیصلہ لینے کے لیے سب سے بہتر ہے۔ ان لوگوں کی مانگ تھی کہ حکومت کا عمل دخل انسان کی فطری زندگی میں قلیل ہونا چاہیے۔ مثبت حریت پسندی نے روایتی ساخت کو تبدیل کیا جس کا اثر انیسویں صدی کے نصف آخر میں زیادہ گہرا ہو گیا۔ تھامس مل اور گرین نے یہ نظریہ دیا کہ معاشی میدان میں عدم مداخلت کے بجائے ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ فرد کی عام فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔ جدید دور میں حریت پسندی اور جمہوریت کا ارتقاء سب سے پہلے فرانس اور برطانیہ میں ہوا۔ حکومت میں متوسط طبقہ کی شمولیت کے لیے آواز اٹھنے لگی اور آہستہ آہستہ مزدور و کسان کی بھی حصہ داری کو تسلیم کر لیا گیا۔ البتہ خواتین کا حق رائے دہی اور ان کی حکومت میں شمولیت بیسویں صدی کی دین ہے۔

قوم پرستی: یورپ کے بہت سے ملک جن کے باشندوں میں زبان، نسل، ثقافت اور روایات کے اعتبار سے اتحاد پایا جاتا تھا۔ مدت سے اپنی اپنی قومی حکومتیں قائم کرنے کے لیے بے تاب تھیں۔ اٹلی کے مشہور مصنف میکاولی نے اپنے ملک کی ریاستوں کو ملا کر ایک متحدہ حکومت کا خواب دیکھا تھا۔ پولینڈ کے باشندوں کو اس خیال نے بے چین کر رکھا تھا کہ ان کی آزادی چھین گئی اور ان کا ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جرمن قوم بھی اپنے ماضی کے شہنشاہوں کو یاد کر رہی تھی۔ انقلاب فرانس (1789ء) اور نپولین کی فتوحات نے ان مبہم آرزوؤں کو نئی زندگی بخش دی۔ اہلِ یورپ کے قومی جذبات کو ابھارنے میں نپولین کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ اس نے وارسا کی ریاست قائم کی۔ اٹلی کی ریاستوں کو متحد کر کے اس سرزمین پر بادشاہت کی داغ بیل ڈالی۔ البتہ ویانا کانگریس نے قوم پرستی کے جذبے کو قابل اعتناء نہیں سمجھا، تو بھی یہ نظریہ برابر فروغ پاتا رہا۔ فرانس اور برطانیہ میں قائم قومی حکومتوں نے دوسرے ممالک کے قومی جذبات کا نہ صرف خیال رکھا بلکہ انہیں ہوا بھی دی۔

15.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

مطلق العنانیت	:	تمام اختیارات ایک جگہ مرکوز ہونا
جمہوریت	:	عوامی حکومت
حق رائے دہی	:	حکومت کی تشکیل میں ووٹ دینے کا حق
واٹرلو	:	جنگ کا وہ میدان جہاں اتحادی افواج نے نپولین کو شکست دی
عدلیہ	:	انصاف کا محکمہ
خارجی امور	:	کسی ملک کے دوسرے ممالک سے روابط
اشرافیہ	:	اعلیٰ طبقہ

دارالعوام	:	برطانوی پارلیمنٹ کا نچلاایوان
دارالامراء	:	برطانوی پارلیمنٹ کا بالائی ایوان
بیلٹ پیپر	:	وہ کاغذ جس کے ذریعے نمائندے منتخب ہوتے ہیں اور انتخاب خفیہ رہتا ہے

15.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

15.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. مغربی یورپ کا بابائے لامذہبیت کسے کہا جاتا ہے؟
2. سیاسی اصول کے طور پر حریت پسندی کا آغاز کس مفکر نے کیا؟
3. سیاسی و معاشی زندگی میں کم سے کم ریاستی مداخلت کا نظریہ کس نے دیا؟
4. برطانیہ میں اصلاح کے دور کا آغاز کب سے مانا جاتا ہے؟
5. برطانیہ میں دوسرا اصلاح بل کس نے پیش کیا؟
6. عہد جدید کے ابتدائی دور میں برطانیہ اور فرانس کے علاوہ مغربی یورپ کی تیسری قومی حکومت کا نام بتائیے۔
7. یورپ میں قوم پرستی کے ارتقاء کو کتنے مرحلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے؟
8. میزنی کا تعلق کس ملک سے تھا؟
9. یونان و سربیا کس سلطنت کے زیر نگیں تھے؟
10. *The National System of Political Economy* کس کی تصنیف ہے؟

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. یورپ میں حریت پسندی اور قوم پرستی کا آغاز وارتقاء کس پس منظر میں ہوا؟ روشنی ڈالیے۔
2. حریت پسندی کی تعریف بیان کیجیے اور مختلف زمانوں میں اس کے بدلتے مفہوم کو واضح کیجیے۔
3. چارٹسٹ تحریک سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
4. کون کون سے عناصر لوگوں کو رشتہ اتحاد میں منسلک کرتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔
5. قوم پرستی کے فروغ میں انقلاب فرانس اور نپولین کے کردار کا تجزیہ کیجیے۔

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. برطانیہ کی پارلیمنٹ میں ہونے والے اصلاحی اقدامات پر مضمون لکھیے۔
2. فرانس میں حریت پسندی کے آغاز وارتقاء کو مفصل بیان کیجیے۔

3. یورپ میں قوم پرستی کس طرح پھیلا اور کن کن ممالک میں اسے زیادہ فروغ حاصل ہوا؟

15.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Anderson, Benedict, *Imagined Communities: Reflections on the Origins and Spread of Nationalism*, Verso, London, 2006 (First Edition 1983).
1. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
2. Gray, John, *Concepts in Social Sciences*: *Liberalism*, World View, Delhi, 1998.
3. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
4. Hobsbawm, Eric J., *On Nationalism*, edited and introduced by Donald Sassoon, Little Brown, Great Britain, 2021.
5. Hobsbawm, Eric J., *Nations and Nationalism since 1780*: *Programme*, *Myth*, *Reality*, Cambridge University Press, Delhi, 2013 (first published 1990).
6. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
7. Lowe, Norman, John Traynor, *Mastering Modern World History*, Bloomsbury, New Delhi, 2023.
8. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
9. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
10. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
11. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
12. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
13. Soboul, Albert, *Understanding the French Revolution*, People's Publishing House, Bombay, 1989.

اکائی 16۔اشتراکیت

(Socialism)

اکائی کے اجزاء

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 پس منظر

16.3 اشتراکیت

16.3.1 طبقاتی کشمکش

16.4 اشتراکیت کی ابتداء

16.4.1 جین چارلس لیونارڈڈی سسمونڈی

16.4.2 رابرٹ اُووین

16.4.3 بے بوف

16.4.4 سینٹ سائمن

16.4.5 لوئی بلانک

16.5 جرمنی میں اشتراکیت کاآغاز

16.5.1 کارل مارکس

16.6 مزدور تحریکیں

16.7 اکتسابی نتائج

16.8 کلیدی الفاظ

16.9 نمونہ امتحانی سوالات

16.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید (Introduction)

پندرھویں صدی عیسوی سے یورپ میں جدید عہد کا آغاز ہوا۔ مذہبی اصلاحی تحریکوں، نئی جغرافیائی دریافتوں اور تجارت وصنعت کے میدان میں ترقی کو اس دور کی اہم پیشرفت مانا جاتا ہے۔ صنعتی انقلاب نے ایک نئے یورپ کو جنم دیا۔ ان سب کے نتیجے میں یورپی سماج بھی بہت سی تبدیلیوں سے آشنا ہوا۔ نئے افکار وخیالات پروان چڑھے اور انہوں نے انسانی رشتوں کو بھی متاثر کیا۔ جدید مشینوں اور بڑے کارخانوں کے وجود میں آنے سے پیداوار میں اضافہ ہوا۔ جس کے لیے خام مال کی ضرورت بڑھ گئی۔ ساتھ ہی تیار شدہ سامان کے لیے نئے بازاروں کی تلاش شروع ہوئی۔ نتیجتاً ایشیاء، افریقہ اور امریکہ کے بہت سے کمزور اور پسماندہ ممالک یورپی اقوام کے زیر تسلط آگئے، جن کا ایک طویل عرصے تک استحصال ہوتا رہا۔ بڑھتی ہوئی تجارتی ضرورتوں کے پیش نظر نئے ممالک میں دراندازی، استعماریت میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے یورپ کی معیشت کو ترقی کی بلندیوں تک تو پہنچایا لیکن خود ان سامراجی طاقتوں کے اندرونی ڈھانچے کو بھی متاثر کیا۔ اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب نے معاشی ہی نہیں سماجی جہتوں پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ اشتراکیت بھی اسی کی پیداوار ہے۔ معاشی پس منظر میں پروان چڑھنے والے اس نظریہ نے یورپ کو ہی نہیں دنیا کے ایک بڑے حصہ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ تجارت اور صنعت وحرفت کی وسعت نے یورپ کو جس مادی زندگی سے روشناس کرایا، اسی کی پیچیدگیوں اور مسائل کو حل کرنے کے لیے اشتراکیت میدان عمل میں آیا۔ نئی درجہ بندیوں نے سماج میں جو نئے سوالات کھڑے کیے تھے، اشتراکیت ان ہی کے جواب دیتا نظر آتا ہے۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کو پڑھ لینے کے بعد آپ

- اشتراکیت کے آغاز کی صورتحال کو سمجھ سکیں گے۔
- ان اسباب کا تجزیہ کر سکیں گے جنہوں نے اشتراکیت کو جنم دیا۔
- اشتراکیت کے اہم علمبرداروں اور ان کے کارناموں سے واقف ہو سکیں گے۔
- اشتراکیت کے سیاسی، سماجی اور معاشی اثرات سے روشناس ہوں گے۔

16.2 پس منظر (The Context)

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں نئی سائنسی ایجادات کے سبب مشینوں کے دور کا آغاز ہوا۔ جس نے بڑے پیمانے پر پیداوار کو ممکن بنادیا۔ معاشی وتکنیکی تبدیلیوں نے فکر کو بھی نیا زاویہ دیا۔ گھریلو پیداواری نظام کی جگہ کارخانوں اور فیکٹریوں نے لے لی اور جدید تجارتی نظام وجود میں آگیا۔ صنعتی میدان میں ہونے والی یہ تبدیلیاں ایسی واضح اور پائیدار تھیں کہ ان کے لیے ''صنعتی انقلاب'' کی اصطلاح وضع کی گئی۔ مارش ڈوب نے اپنی کتاب ''اسٹڈیز ان دی ڈیولپمنٹ آف کیپٹلزم'' میں اعتراف کیا ہے کہ ''اس دور میں سماجی تعلقات، صنعتی ڈھانچہ میں تبدیلی کی رفتار، پیداوار اور تجارت کی وسعت اتنی زیادہ تھی کہ ان کو بیان کرنے کے لیے ''انقلاب'' سے بہتر کوئی دوسرا لفظ نہیں ہوگا۔'' یہ

انقلاب نہ تو منصوبہ بند تھااور نہ ہی اچانک، بلکہ یہ بتدریج رونما ہوا۔ اور سب سے پہلے برطانیہ میں ہوا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ تمام عناصر جو اس کے لیے ضروری تھے، برطانیہ میں موجود تھے۔ برطانیہ کے بعد ہی یہ دوسرے ممالک تک پہنچا۔ صنعتی انقلاب نے انسانی زندگی کے تمام سیاسی، سماجی اور معاشی شعبوں کو متاثر کیا۔ اصول و نظریات میں تبدیلی واقع ہوئی۔ سرمایہ اور محنت کے امتزاج نے پیداوار میں تو اضافہ کیا ہی لیکن سماج میں نئے طبقات کے وجود کا سبب بھی بنا۔ سرمایہ دار اور مزدور کے مابین کشمکش نے جو صورتحال پیدا کی اس میں نئے مفکرین پیدا ہوئے، جنہوں نے اس جدوجہد کو ختم کرنے اور طبقاتی تفریق کے مسائل کو حل کرنے کے لیے نئے نظریات پیش کیے۔ ان نئے افکار میں سب سے اہم اشتراکیت ہے جو بنیادی طور پر مزدوروں کے حقوق کے تحفظ اور انہیں سرمایہ داروں کے استحصال سے بچانے کے اصول پر منضبط ہے۔ صنعتی انقلاب نے انسانی زندگی کو خوشحالی اور آسودگی بخشی اور انسان کی طاقت میں اضافہ کیا، لیکن اس کے سبب دو اہم مسائل بھی پیدا ہوئے۔ اول طاقتور ممالک کا پسماندہ علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی نوآبادیت قائم کرنا اور دوسرے سرمایہ داروں کے ذریعہ مزدوروں کا استحصال۔ یہ دونوں ہی انیسویں اور بیسویں صدی میں عالمی امن و بھائی چارہ کے لیے خطرہ بنے رہے۔

16.3 اشتراکیت (Socialism)

Socialism لفظ لاطینی زبان کے Socius سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ساتھی یا مددگار۔ اس لفظ کو سب سے پہلے 1803 میں اٹلی میں استعمال کیا گیا تھا، جس کے بعد مشہور اشتراکی مفکر رابرٹ آوین نے اپنے رسالہ 'کوآپریٹیو میگزین' میں 1827 میں لفظ سوشلسٹ استعمال کیا۔ اشتراکیت ایسے سماجی نظام کو کہتے ہیں جس میں پیداواری ذرائع سماج کی اجتماعی ملکیت ہوتے ہیں اور ان کی پیداوار ذہنی یا جسمانی کام کرنے والوں کی تخلیقی محنت کے مطابق تقسیم کی جاتی ہے۔ اشتراکیت کا مشہور ترین تصور کارل مارکس اور فریڈرک اینگل نے دیا۔

16.3.1 طبقاتی کشمکش (Class Struggle)

سوشلسٹ نظریہ کا آغاز صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ہوا۔ صنعتی انقلاب کا آغاز برطانیہ سے ہوا تھا اور پھر دھیرے دھیرے دوسرے ممالک میں پھیلتا چلا گیا۔ اس نے مذکورہ ممالک کی معیشت میں عظیم اور بنیادی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی جگہ بڑے کارخانوں اور مشینوں سے آراستہ فیکٹریوں نے لے لی۔ اس نے سماج میں دو نئے طبقوں کو جنم دیا، ایک سرمایہ دار یا بورژوا، دوسرے مزدور یا پرولتاری۔ سرمایہ کار کارخانوں کے مالک تھے اور تجارت و صنعت پر ان کی اجارہ داری تھی۔ مزدور کارخانوں میں کام کرنے والے وہ عوام تھے جن کی محنت و مشقت ان کارخانوں کی بقا کی ذمہ دار تھی۔ سرمایہ دار مضبوط حیثیت کے مالک تھے اور لگاتار سماج میں ان کا قد بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف مزدور تعداد میں زیادہ ہوتے ہوئے بھی بہت خراب حالت میں تھے۔ کارخانوں کے مالکان کی مفاد پرستی اور خود غرضی ان کا استحصال کر رہی تھی۔ چنانچہ ان تمام صنعتی ممالک میں مزدوروں کی حالت دگرگوں تھی۔ یہ طبقہ پیداواری عمل کا ایک ناگزیر حصہ تھا لیکن اپنی محنت کی پیداوار سے منافع کا کوئی حصہ ملنا تو دور کی بات انہیں پیٹ بھر کھانا ملنا بھی مشکل ہوتا۔ اس طرح صنعتی انقلاب سے گذرے یورپی ممالک میں دو ایسے طبقے وجود میں آ گئے جو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہوئے بھی متضاد حیثیت رکھتے تھے۔ ایک طرف خوشحال سرمایہ دار جو

مسلسل آسودگی کی نئی منزلوں سے گذر رہا تھا۔ دوسری طرف مزدور جو خون پسینہ بہانے کے باوجود کسمپرسی اور بے چارگی کی زندگی گذارنے پر مجبور تھا۔ یہ طبقہ مکمل طور پر اپنی بقا کے لیے سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر منحصر تھا۔ کارخانوں کے قیام میں برطانیہ کو اولیت کا درجہ حاصل تھا۔ وہاں کام کی تلاش میں زمینیں چھوڑ کر آنے والا مزدور طبقہ بھی سب سے پہلے پیدا ہوا۔ کارخانوں کے اندر اور رہائشی جھونپڑیوں' دونوں جگہ ان مزدوروں کا براحال تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں کے کام کے اوقات اتنے طویل تھے کہ آج سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ قانون کے ذریعہ ان کی حالت سدھارنے کے لیے جو قدم اٹھائے گئے، مل مالکان نے ان کی مخالفت کی۔ لیکن اس مخالفت کی بھی مخالفت شروع ہوئی اور سرمایہ داروں کی اجارہ داری کے خلاف بھی آواز بلند ہونا شروع ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کچھ صنعت کار بھی اس طبقاتی تناؤ اور کشمکش کو دور کرنا چاہتے تھے۔ ان میں ایک اہم نام جرمن صنعت کار والٹر راؤ ناتھ کا ہے۔ یہ ایک ماہر عمرانیات بھی تھا۔ اس نے مضامین اور کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا جس میں آمدنی کی تقسیم نو اور موروثی املاک کا خاتمہ جیسے اہم موضوعات کو اٹھایا۔ اس کا خیال تھا کہ مزدور انتظامیہ کا حصہ بن سکتے ہیں۔ والٹر راؤ ناتھ کے یہ افکار عملی طور پر کبھی نافذ نہیں ہو سکے۔ انہیں مزدوروں اور سرمایہ داروں دونوں نے شبہ کی نظر سے دیکھا۔

ایک طرف صنعتی انقلاب اپنی تمام تر مثبت و منفی خصوصیات کے ساتھ تیزی سے پھیل رہا تھا۔ دوسری طرف کچھ ایسے افراد بھی سامنے آرہے تھے جو انسانی جذبات سے سرشار اس نظام کی خرابیوں کو اجاگر کرنے میں لگے تھے۔ وہ مزدوروں کی بہبودی کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ دونوں طبقات کے درمیان کی خلیج کم ہونی چاہیے۔ لیکن یہ کس طرح عمل میں لائی جائے اس مسئلے پر ان میں آپس میں اختلاف تھا۔ کچھ کا خیال تھا کہ پیداوار کے وسائل پر ریاست کا کنڑول ہوتا کہ سب کو مساوی طور پر حصہ ملے۔ دوسری طرف کچھ مفکرین سمجھتے تھے کہ چھوٹے چھوٹے سیلف فاینانس کمیون کی تشکیل سے اس مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔

برطانیہ سمیت سبھی ممالک میں مزدوروں کی حالت خستہ تھی۔ وہ غریبی اور کام کی زیادتی کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ نپولین کی جنگی مہمات نے برطانیہ کی معیشت کو کمزور کر دیا تھا، جس کے سبب سب سے زیادہ خسارے میں یہی مزدور طبقہ تھا۔ حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے جدوجہد کا راستہ اپنانا چاہا اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے یونین بنانا چاہا لیکن انہیں ایسا کرنے نہیں دیا گیا۔ برطانیہ کے حکمراں فرانس کے انقلاب سے اتنے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے ایسے قوانین وضع کیے کہ مزدور اپنے دکھ سکھ پر گفتگو کرنے کے لیے بھی یکجا نہیں ہو سکتے تھے۔ جواب میں مزدوروں نے خفیہ انجمنیں بنائیں۔ آپس میں رازداری کے حلف لیے اور سنسان مقامات پر آدھی رات کو میٹنگوں کا انعقاد کرنے لگے۔ کبھی کسی ساتھی کی غداری کے سبب راز کھلنے پر ان کے اوپر سازش کرنے کے مقدمات قائم ہوتے اور بھیانک سزائیں بھی دی جاتیں۔ مزدوروں کے مشتعل ہونے کے واقعات بھی کبھی کبھی رونما ہوتے۔ وہ طیش میں آکر کارخانوں کو آگ لگا دیتے۔ مشینیں توڑ پھوڑ دیتے اور مالکان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ بالآخر 1825 میں مزدوروں میں عائد کچھ پابندیاں ہٹائی گئیں اور انہیں یونین بنانے کی اجازت بھی مل گئی۔ لیکن یہ یونین بنانے والے مزدور ہنر مند لوگ تھے جنہیں اچھی تنخواہیں ملتی تھیں۔ عام مزدور طویل عرصے تک ان سہولتوں سے اور منتشر ہی رہے۔ مزدور تحریکوں نے ساتھ بیٹھ کر شرائط طئے کرنے کے طریقے اپنائے اور ان مزدوروں کے پاس اپنی بات منوانے کا سب سے کارگر ہتھیار ہڑتال تھا۔ کام بند کر کے وہ دباؤ ڈال سکتے تھے۔ مگر مل مالکان کے پاس اس سے بڑا ہتھیار تھا، وہ تنخواہیں روک کر انہیں بھوکوں

مرنے پر مجبور کر سکتے تھے۔اس طرح دونوں فریقوں میں یہ لڑائی جاری رہی۔مزدوروں نے بڑی قربانیاں دیں لیکن بتدریج اس کے مثبت اثرات نمودار ہونے لگے۔ان مزدوروں کا برطانیہ کی پارلیمنٹ پر کوئی اثر نہیں تھا کیونکہ انہیں ووٹ دینے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔1823 کے اصلاحی بل میں صرف اعلیٰ متوسط طبقے کو ہی ووٹ دینے کا حق ملا تھا،مزدوروں کو نہیں یہاں تک کہ نچلا متوسط طبقہ بھی اس سے محروم تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز تک تمام یورپ صنعتی انقلاب کے زیر اثر آچکا تھا۔ براعظم کے وہ حصے جہاں انیسویں صدی کے اوائل ہی میں کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ایک صدی بعد مختلف فکری و نظریاتی تبدیلیوں کے دور سے گذر رہے تھے۔اشتراکیت پیر پسار رہا تھا اور مزدور تحریکیں سر اٹھانے لگی تھیں۔ایسے دانشمند افراد کی تعداد بڑھ رہی تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ صنعتی انقلاب اور تکنیک کی ترقی نے مادی وسائل کو بڑھایا ہے لیکن بدلے میں انسانیت کا معیار پست ہو رہا ہے۔ایک بڑا طبقہ ناانصافی اور استحصال کی گرفت میں ہے اور ان کی زندگی اچھی نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ 1900ء سے لے کر 1914ء تک مزدوروں کا یہ طبقہ زیادہ غیر مطمئن نظر آتا ہے۔انیسویں صدی کے آخری ربع میں گو اجرتوں میں اضافہ ہوا اور قیمتیں کم ہوئیں، لیکن پھر بھی حقیقی آمدنی کے نقطہ نظر سے وہ نقصان میں ہی تھے۔1870 کے بعد مزدوروں کی حالت کچھ بہتر ہوئی لیکن ان کے مقابلے میں سرمایہ داروں کی زندگی کئی گنا زیادہ بہتر ہوئی، جس کے نتیجے میں دونوں طبقوں کے مابین خلیج زیادہ واضح ہوتی چلی گئی۔سرمایہ داروں کی پُر تعیش زندگی کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔امریکی ماہر عمرانیات تھوریسٹن ویبلن نے اپنی کتاب ''تھیوری آف دی لیبر کلاس'' (1899) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔اپنی ایک دیگر تحقیقی تصنیف ''امپیریل جرمنی اینڈ دی انڈسٹریل ریولیوشن'' (1915) میں بہت واضح طور پر بیان کیا کہ سرمایہ دار طبقہ کی آسائش بھری زندگی اور غیر مساوی آمدنی سے مزدور طبقہ پر بہت زیادہ منفی اثر پڑ رہا ہے۔کام کے لیے ان کی لگن اور ایمانداری کم ہوتی جا رہی ہے۔مالک اور مزدور دونوں کے رشتوں میں ہم آہنگی کا فقدان پیدا ہونے لگا ہے، جس کے نتیجے میں مزدوروں کا استحصال بڑھ رہا ہے وہیں دوسری طرف خود مزدوروں کی جانب سے ہڑتال اور تالہ بندی جیسی تحریکوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ان سب کے نتیجے میں سماجی ناہمواری اور تناؤ روز بروز زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔

16.4 اشتراکیت کی ابتداء (The Emergence of Socialism)

برطانیہ جہاں سے صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا تھا۔اسی سرزمین میں سب سے پہلے اشتراکیت کے بیج پھوٹے۔نئے معاشی نظام اور اس سے پیدا شدہ طبقاتی کشمکش کے خلاف آواز اٹھنے لگی اور تنقید شروع ہوئی۔اس کے پس پردہ دو بنیادی اسباب کارفرما تھے۔

- برطانیہ میں ایسے بہت سے چھوٹے کسان تھے جن کی زمینیں خوشحال زمیندار خریدنے جا رہے تھے چنانچہ اپنی زمینوں سے محروم ہونے کے بعد یہ صرف مزدور بن کر رہ گئے اور استحصال کا بہ آسانی شکار ہوتے گئے۔
- اس دور میں برطانیہ میں ایسے مفکرین پیدا ہوئے جنہوں نے کہا کہ زمین پر صرف تھوڑے سے خوشحال و مالدار افراد کا قبضہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ سماج کی ملکیت ہونی چاہیے۔

تھامس پین نے سب سے پہلے 1791 میں اپنی شائع کردہ کتاب *Rights of Man* میں یہ مطالبہ کیا کہ زمین پر سماج کا قبضہ ہونا

چاہیے۔ اس کے علاوہ اس نے مزدوروں کے لیے پنشن، تعطیلات اور دیگر سہولیات کو بھی ضروری قرار دیا۔ ولیم گوڈرن نے نجی املاک کو غلط قرار دیا۔ مشہور شاعر شیلی نے بھی غریبوں کے استحصال اور حکومت کی بے رحمی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ایسے وقت میں جب مزدور معاشی بدحالی سے گذر رہے تھے اور ان کے استحصال کے تدارک کے لیے حکومت کو بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، تب کچھ مفکرین، ادیب اور دانشور ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اس راستے میں وہ چراغ روشن کیے جن سے مزدوروں کی زندگی میں اجالا ہو سکے۔ یہی وہ افراد تھے جنہوں نے سماجی اور معاشی میدانوں میں اس نظریہ کی تشکیل کی جسے اشتراکیت کہا جاتا ہے۔ یہ مزدوروں کی پسماندگی کو دور کرنے اور انہیں سرمایہ داروں کی گرفت سے نکال کر استحصال سے بچانے کے لیے کوشاں تھے۔ انہوں نے سماجی ناہمواری کا تجزیہ کیا اور اس کے اسباب کو سمجھا پھر وہ نقطہ نظر پیش کیا جو ان کے نزدیک اس کا حل تھا۔ ان میں سائمنڈ ڈی سسمونڈی، رابرٹ اُووین، سینٹ سائمن، لوئی بلاک اور کالرمارکس اہم مقام رکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے یورپی ممالک میں جاری معاشی نظام پر سخت تنقید کی اور سرمایہ داروں و مزدوروں کے مابین رشتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے نئے نظریات کی تشکیل کی۔

16.4.1 جین چارلس لیونارڈ ڈی سسمونڈی (Jean Charles Léonard de Sismondi, 1773–1842)

سسمونڈی پہلا ماہر معاشیات تھا جس نے رائج الوقت معاشی اصول و ضوابط پر کامیاب تنقید کی۔ اس نے ایڈم اسمتھ کے نظریات کو اپنے تجربہ اور مطالعہ کی روشنی میں غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایڈم اسمتھ اور اس کے موافقین کے اس نظریہ کو باطل اور نقصان دہ قرار دیا جس میں انہوں نے سماجی و معاشی معاملات میں حکومت کو مداخلت سے روکا تھا۔ سسمونڈی کا کہنا تھا کہ سماجی و معاشی انصاف قائم کرنے اور ملک کو مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے حکومت کو دخل اندازی کرنی چاہیے۔ سماجی و معاشی تبدیلیوں پر اگر ریاست کی گرفت نہیں ہوگی تو عوام پر کسی نہ کسی شکل میں خراب اثرات ڈالیں گی۔ اس نے مشینوں اور نئی ایجادات کے خلاف بہت سے دلائل دیے ہیں، جو ظاہر ہے قبول نہیں کیے جا سکتے۔ لیکن پھر بھی اس کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے افکار میں اشتراکیت کے ابتدائی آثار ضرور نظر آتے ہیں لیکن وہ ان کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا اور نہ ہی اس کے خیالات دیرپا ثابت ہوئے۔

16.4.2 رابرٹ اُووین (Robert Owen)

جب برطانیہ میں مزدور اپنی حالت بہتر بنانے اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کر رہے تھے، اس وقت مانچسٹر کے مل مالکان میں سے ہی ایک شخص ان کی حمایت میں کھڑا ہوا۔ یہ مزدوروں کی بیچارگی اور پستی کا چشم دید گواہ تھا۔ اس سے ان کی ذلت بھری زندگی دیکھی نہیں گئی۔ اس طبقے کی دل دہلانے والی حالت نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ یہ شخص تھا رابرٹ اُووین۔ اس کی پیدائش 14 مئی 1771ء کو ویلز کے نیو ٹاؤن قصبہ میں ہوئی۔ 30 سال کی عمر میں وہ نیو لینارک نامی مل کا مالک بنا، جو اسی کی نگرانی میں چلتی رہی۔ سرمایہ دار ہوتے ہوئے بھی وہ مزدوروں کا ہمدرد تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی پیدائش ایک غریب خاندان میں ہوئی تھی۔ وہ اُن حالات سے خود گذرا تھا، مزدوروں کی معاشی بدحالی کا اسے ذاتی تجربہ تھا۔ تجربات کی ایک بھٹی سے گذر کر وہ کارخانہ کا مالک بنا تھا۔ اسے ان خرابیوں کا خوب اندازہ تھا جو

اس معاشی نظام کی دین تھیں۔ اسی لیے وہ آزاد تجارت کی پالیسی کا سخت مخالف تھا۔ مزدوروں کے استحصال کا بنیادی سبب وہ اسی کو مانتا تھا۔ وہ سماج میں جاری صنعتی و معاشی مسابقت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے اس نے بہت قدم اٹھائے۔ ان کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مختلف پروگرام شروع کیے۔ وہ قول کا ہی نہیں عمل کا بھی سوشلسٹ تھا۔ اس نے خود اپنے نجی کارخانے میں مزدوروں کی صحت، صفائی، تعلیم اور تنخواہ وغیرہ جیسے اہم شعبوں میں اصلاحات کیں اور قابلِ ذکر سہولیات فراہم کرائیں۔ اس کے وضع کیے ہوئے قوانین مزدوروں کی تاریخ میں بہت اہم ہیں۔ یہ مندرجہ ذیل ہیں:

- مزدوروں کے کام کے اوقات 17 گھنٹے یومیہ سے کم کرکے 10 گھنٹے کر دیے۔
- مزدوروں کو دی جانے والی مالی اور جسمانی سزائیں موقوف کر دیں۔
- دس سال سے کم عمر کے بچوں کا کارخانوں میں کام کرنا ممنوع قرار دیا۔
- مزدوروں کے بچوں کے لیے مفت تعلیم کا انتظام کیا۔
- مزدوروں کی رہائش کے لیے صاف ستھرے اور ہوادار مکانات بنوائے۔
- روزمرہ کی استعمال کی جانے والی اشیاء کم قیمت میں مہیا کرائیں۔
- مزدوروں کی ضروریات کے مطابق ان کی تنخواہیں مقرر کیں جس سے وہ بہتر زندگی گذار سکیں۔

رابرٹ اُووین کے یہ ٹھوس اقدامات ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نے ان کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے وہ عملی صورتحال پیدا کی جس نے یقیناً مزدوروں کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا۔ لیکن یہ کافی نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ آزادانہ مسابقت کی بنیاد پر قائم اس معیشت میں یہ سرمایہ دار، مزدور کا استحصال ہی کرتے رہیں گے۔ اس صنعتی نظام میں ان کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سسٹم کے ظلم و استبداد سے تحفظ کے لیے اس نے اپنے کارخانوں میں مزدوروں کی مثالی کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کیں۔ ان کے رہن سہن، تفریح، تعلیم و صحت غرض کہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے سہولیات بہم پہنچائیں۔ اُووین کا یہ بھی ماننا تھا کہ مزدوروں کے لیے آسانیاں فراہم کرکے پیداوار کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ جتنا پیسہ وہ مزدوروں کی بہبود کے لیے خرچ کر رہا ہے اس سے زیادہ منافع یہ مزدور اسے دیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ اپنے مزدوروں کی سہولیات پر ایک کثیر رقم خرچ کرنے کے بعد بھی اس نے 60 ہزار سونے کے سکوں کا منافع حاصل کیا۔ اس نے ان مخالفین کا منھ بند کر دیا جو اس کی مذکورہ پالیسی کو کارخانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ منافع صرف مزدوروں کا استحصال کرکے ہی حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کا خیال رکھ کر بھی فائدہ ہو سکتا ہے۔ رابرٹ کی سوچ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس کا تو یہ بھی خیال تھا کہ مزدوروں کو صرف تنخواہ ہی نہیں بلکہ دیگر ضروری سہولیات کے ساتھ ساتھ منافع میں سے بھی مناسب حصہ ملنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے مزدوروں کی کام کے تئیں لگن اور جذبے میں اضافہ ہوگا جس کا لازمی نتیجہ پیداوار اور منافع میں اضافہ ہوگا۔ رابرٹ اُووین کی اصلاحات اور مزدوروں کی بہبود کے لیے کیے گئے اقدامات کی وجہ سے اس کے کارخانوں میں کبھی کوئی ایسا مسئلہ پیدا نہیں ہوا جس سے مزدور طبقے میں بے اطمینانی پھیلے یا مالکوں اور کام کرنے والوں میں کشمکش ہو۔ یہی نہیں بلکہ اس کی جگمان دونوں طبقوں میں بھائی چارہ اور ہم آہنگی کی فضا

قائم ہوگئی۔ دونوں کے مضبوط رشتوں نے نہ صرف صنعت کو ترقی دی بلکہ امن وسکون کا ماحول بننے سے مزدوروں کو آسودگی بھی حاصل ہوئی۔ خود رابرٹ اُووین کو بڑی شہرت ملی۔ اس کے ہمعصر سیاست داں اور اربابِ حل وعقد،مزدوروں کے مسائل کو حل کرنے میں اس کا لوہا ماننے لگے۔ یہاں تک کہ روس، ہالینڈ سمیت کئی دیگر ممالک میں اس طرح کے مسائل کو نپٹانے کے لیے اس کو دعوت دی جانے لگی۔

لفظ Socialism (اشتراکیت) رابرٹ اُووین نے ہی سب سے پہلے استعمال کیا تھا۔ اس طرح اس نے اپنے وہ افکار و نظریات جو ''دی نیو ویو آف سوسائٹی'' اور ''دی بک آف نیو مورل ورلڈ'' نامی کتابوں میں پیش کیے تھے، انہیں عملی طور پر اپنے کارخانوں اور ملوں کے مزدوروں پر نافذ کیے۔ بلاشبہ اسے کامیابی ملی لیکن محدود۔ کیونکہ وہ اپنی برادری یعنی مل مالکان اور صنعت کاروں کے خیالات تبدیل نہیں کر سکا۔ لیکن اس کا استعمال کیا ہوا لفظ اشتراکیت دنیا بھر میں بے حد مقبول ہوا۔ اس تحریک میں اس کا کردار بنیادی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسے بابائے کوآپریٹیو تحریک کہا جاتا ہے۔ مختلف دانشوران کے مطابق سوشلسٹ تحریک میں اووین کا کردار بہت اہم ہے۔ برطانیہ میں اووین کے علاوہ ولیم تھامپس، تھامس ہارڈسکم اور جان گرے وغیرہ کئی دیگر سوشلسٹ ادیبوں نے بھی اس موضوع پر دھیان دیا اور پیداوار می محنت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے یہ حل پیش کیا کہ منافع مالک اور مزدور دونوں کے درمیان تقسیم ہونا چاہیے۔ چارلس کنگس لے اور ڈینی سن مورس نے مزدوروں کی حالت بہتر بنانے کے لیے پُرامن تحریکیں چلائیں۔ ان دونوں کو کرسچین سوشلسٹ کہا جاتا ہے۔

16.4.3 بے بوف (Babeuf)

برطانیہ کے ساتھ ہی فرانس میں بھی سوشلسٹ خیالات جن ملے ابھر رہے تھے۔ 1789ء کے انقلاب کے نتیجہ میں تاجروں اور کسانوں کو تو فائدہ ہوا تھا، لیکن مزدور بے چارے خالی ہاتھ ہی رہ گئے تھے۔ 1795 میں بے بوف نامی ایک شخص نے کمیونسٹ ریاست قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو سزا کی موت دی گئی۔ لیکن اس کے خیالات کا اثر ختم نہیں ہو سکا۔ اس کا ماننا تھا کہ کل املاک ریاست کے قبضے میں ہونی چاہیے اور سماج سے غریبی و عدم مساوات کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ اس کے مطابق اس کا طریقہ یہ اپنایا جائے کہ جب کسی فرد کی موت ہو تو اس کی املاک کو ریاست اپنے قبضے میں لے لے۔ اپنے اخبار کے ذریعے بے بوف نے ان خیالات کی اشاعت کی۔ 1794 میں اس نے لکھا تھا ''جب میں دیکھتا ہوں کہ غریبوں کے جسم پر نہ کپڑے ہیں اور نہ پیروں میں جوتے۔ غریب لوگ ہی کپڑے اور جوتے بناتے ہیں لیکن اُنہیں یہ استعمال کے لیے نہیں ملتے اور جب میں ان لوگوں کا خیال کرتا ہوں جو خود کچھ بھی کام نہیں کرتے، لیکن ان کے پاس کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے تو میرا یہ یقین مضبوط ہو جاتا ہے کہ ریاست اب بھی عوام کے خلاف صرف کچھ لوگوں کی سازش ہے۔ بے بوف فرانس کا بابائے اشتراکیت کہلاتا ہے۔

16.4.4 سینٹ سائمن (Saint Simon, 1760–1825)

کاؤنٹ ہنری ڈی سینٹ سائمنٹ فرانس کے دارالسلطنت پیرس میں 1760 میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق ایک جاگیر دار گھرانہ سے تھا۔ 18 سال کی عمر میں وہ فوج میں شامل ہو گیا۔ امریکہ کی جنگ آزادی کے دوران اس کی مدد کے لیے ایک فوج فرانس سے بھی گئی تھی۔

سائمن اس فوج کا ایک ممبر تھا۔ 1789 کے فرانسیسی انقلاب میں اس نے فعال کردار ادا کیا، جس کے سبب اسے کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ اس انقلاب کے دوران جو واقعات رونما ہوئے اس نے سائمن کے انداز فکر کو متاثر کیا۔ اسی دور میں اس کو نئے سماج کی تشکیل کرنے کی رغبت ملی۔ دراصل سماج میں پھیلی برائیوں مثلاً غریبی، ضروری اشیاء کی دستیابی اور طبقاتی خلیج نے اسے اس سمت میں سوچنے پر مجبور کیا۔ علاوہ ازیں امریکہ کی ترقی بھی اس کے لیے متاثر کن ثابت ہوئی۔ سیاسی، سماجی اور معاشی محرکات نے اسے سوشلسٹ بنا دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سائمن دوسرے سوشلسٹ دانشوروں کی طرح نجی املاک کا مخالف نہیں تھا۔ وہ اس کے تصور کی اصلاح کا حامی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ملکیت رکھنے والے افراد اس کا غلط استعمال نہ کریں، تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ مانتا تھا کہ قومی پیداوار میں اضافہ کرنے والی املاک نقصان دہ نہیں ہے۔ سوشلسٹ گروپ میں اس کا شمار کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مزدوروں اور غریبوں کا بہت ہمدرد تھا اور ان کی فلاح و بہبود کا متمنی۔ وہ سماجی اور معاشی ترقی کے لیے صنعت کاری کو ضروری سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ صنعتیں ہی سماج میں کام مہیا کراتی ہیں۔ یہ مذہب کو بھی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ اس لیے انہیں ہر حال میں ہونا چاہیے۔ اس نے اپنی مشہور کتاب ''دی آرگنائزر'' میں لکھا ہے ''فرض کر لیجیے فرانس سے اچانک 50 صف اول کے ڈاکٹر، 50 کیمیاداں، 50 ماہر طبعیات، 50 بینکر، 200 تاجر، 500 کسان اور 500 انجینئر ختم ہو جائیں تو پورا ملک تباہ ہو جائے گا اور اس میں خوشحالی باقی نہیں رہے گی۔ لیکن اس کے برخلاف اگر ان تمام مذکورہ افراد کے باقی رہتے ہوئے شاہی گھرانے کے ممبر، تمام درباری و افسران، وزراء، پادری، سپاہی، جج اور جاگیردار مر جائیں تو بلاشبہ فرانس کے عوام کو غم تو بہت ہوگا لیکن یہ دکھ جذباتی ہوگا اور اس سے ملک کو کوئی حقیقی نقصان نہیں ہوگا''

سائمن کے اس مندرجہ بالا قول سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی نظر میں صنعتی طبقہ کے افراد سب سے زیادہ اہم ہیں۔ یہ طبقہ ناگزیر ہے۔ اس کا خیال تھا کہ صنعتی طبقہ اپنی بقاء کے لیے کسی دوسرے پر منحصر نہیں ہے، جبکہ دوسرے تمام لوگ اپنی حیات کے لیے ان کے محتاج ہیں۔ سوشلسٹ مفکر ہونے کے سبب وہ غیر مساوی تقسیم اور طبقاتی کشمکش کو ختم کر کے مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانا اور ایک نئے صنعتی سماج کی تشکیل چاہتا تھا۔ ایسا سماج جس میں کسی کا استحصال نہ ہو۔ وہ اس کمزور طبقہ کو تمام سیاسی حقوق دینے کا علمبردار تھا۔ اس نے ایک سوشلسٹ منصوبہ تیار کیا جس سے مزدوروں کے استحصال کو ختم کر کے سماج کی تنظیم نو ہو سکے۔ سینٹ سائمن نے یہ اصول دیا کہ 'طاقت کے مطابق محنت اور کام کے حساب سے اجرت' (Labour according to Capacity and Reward according to Service)۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ جس فرد کو جو طاقت اور اہلیت ہے اس کو سامنے رکھ کر کام کرانا چاہیے اور وہ جتنا کام کرے اس کے حساب سے مزدوری دینی چاہیے۔ سائمن کا کہنا تھا کہ اگر ایسا ہو جائے گا تو مزدور طبقہ نہ صرف آسودہ و مطمئن رہے گا بلکہ وہ صنعتی میدان میں اپنی صلاحیتوں اور طاقت کا زیادہ سے زیادہ استعمال بھی کر سکے گا۔ جس کے لازمی نتیجے میں پیداوار میں اضافہ، صنعتوں میں ترقی اور ملک کو فیض حاصل ہوگا۔ اس اصول کے مطابق دونوں طبقوں کی آپسی رسہ کشی ختم ہو جائے گی، سرمایہ داروں اور مزدوروں میں بھائی چارہ اور ہم آہنگی کی فضا بنے گی اور پھر یہ دونوں مل کر فیکٹری کی صنعتی و معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کریں گے۔

سینٹ سائمن نے مزدوروں کو سرمایہ داروں کے استحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے بہت واضح طور پر کہا تھا کہ پیداوار کے تمام

وسائل حکومت کے پاس ہونے چاہیے اور اسی کو اپنے سرمایہ سے کارخانہ قائم کرنے کا حق ہونا چاہیے۔اس نے یہ نظریہ اس دور میں پیش کیا جب فرانس میں بڑے پیمانے پر صنعتیں وجود میں نہیں آئی تھیں اور مزدور طبقہ کی شکل و ساخت بہت واضح نہیں ہوئی تھی۔اسی کے مدنظر مشہور دانشور اینگلس نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ اس میں ایک باصلاحیت مفکر کی بصیرت ہے۔یہی سبب ہے کہ اس کے بعد آنے والے تمام دانشوروں نے اس ضمن میں جو خیالات پیش کیے اور جو براہ راست معاشیات سے متعلق نہیں تھے،اُن سب کے درمیان اس کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

سائمن نے فرانس کو انقلاب سے گذرتے دیکھا تھا، لیکن اسے مایوسی اس وقت ہوئی جب اس نے دیکھا کہ اتنی قربانیوں کے بعد بھی عوام اقتدار سے محروم ہی ہے۔تب اس نے ایک ایسی مذہبی فکر کا تصور پیش کیا جو سائنس اور صنعتکاری کو ایک دھاگہ میں باندھ کر سماج کی قیادت کرے۔تاکہ کوئی کسی کا استحصال نہ کرسکے۔اپنی مذہبی ذہنیت کے باوجود وہ اس بات کے لیے فکر مند تھا کہ سماج کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ غریب طبقہ کی حالت کیسے بہتر ہو۔وہ متعصب مذہبیت کا مخالف اور سائنس کا مضبوط علمبردار تھا۔وہ سماج کی تشکیل نو سائنس کی بنیادوں پر کرنا چاہتا تھا تاکہ مزدوروں کا معیار زندگی بہتر ہو، مسابقت ختم ہو، پیداوار میں اضافہ ہو اور اس کو غیر ذمہ دار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں نہیں چھوڑا جائے،اس پر ایسے ہاتھوں کا کنٹرول رہنا چاہیے جس سے مزدوروں کو بھی فائدہ حاصل ہوسکے۔حقیقتاً سائمن فرانسیسی اشتراکیت کا حقیقی بانی ہے۔مشہور امریکی ماہر معاشیات جے اے شمپیٹر نے اپنی کتاب ''ہسٹری آف اکنامک انالیسس'' میں سائمن کے نظریہ کی دو خصوصیات بیان کی ہیں۔اس کے مطابق سائمن کے معاشی خیالات کی پہلی خاص بات یہ ہے کہ اس کی بنیاد میں انسانیت کا جذبہ کارفرما ہے۔اس میں سسمونڈی کی طرح ناامیدی نہیں بلکہ امید کی جھلک نظر آتی ہے۔اور دوسری یہ کہ سائمن نے سائنس اور صنعت کاری کو اپنے نظریہ میں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سائمن سائنس اور صنعت کاری کی بنیاد پر بورژوا اور پرولتاری طبقوں کی کشمکش ختم کرکے مزدوروں کے حقوق کا دفاع اور ان کی فلاح چاہتا تھا۔

سینٹ سائمن کے اس نظریہ کو چارلس فوریئے نے آگے بڑھایا۔اس نے اُن سرمایہ داروں کی پول کھولی جو خوشحالی ریاست کی بات کرتے تھے۔اس نے طنزیہ انداز میں بتایا کہ کس طرح ان خوبصورت لفظوں کے جال سے اخلاقی دیوالیہ پن جھلکتا ہے۔اینگلس نے اسے عظیم طنزنگار کہا ہے، جس نے سرمایہ دارانہ نظام کو تلخ حقیقتوں سے عوام کو روشناس کرایا۔اس نے بے شمار غریب مزدوروں کی فلاح کے لیے کوآپریٹیو گروپ بنانے کا منصوبہ پیش کیا۔اس طرح فوریئے اور سائمن دونوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مزدوروں کی فلاح تبھی ممکن ہے جب سرمایہ داروں کا کنٹرول ختم ہوجائے۔لیکن دونوں کا یہ نظریہ عملی میدان میں اتنا کامیاب نہیں ہوا جتنی ضرورت تھی۔

16.4.5 لوئی بلانک (Louis Blanc)

سینٹ سائمن کے افکار و نظریات کی عملی میدان میں اشاعت کا سہرا فرانس کے ایک دوسرے مفکر و ادیب کے سر ہے۔یہ فرانس کا سب سے زیادہ باثر سوشلسٹ دانشور رہنما تھا۔بلانک 28 اکتوبر 1823ء کو اسپین کے شہر میڈرڈ میں پیدا ہوا۔لیکن اس کا باپ فرانس میں

ایک سرکاری عہدہ پر فائز تھا۔ اس لیے بلانک کی تعلیم فرانس میں ہوئی۔ پروفیسر بینے نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "اگرچہ ابتدائی سوشلسٹوں میں بلانک بنیادی مفکر نہیں تھا، لیکن سماجی اصلاح اور سیاست کے مابین تعلق پیدا کرنے کے معاملے میں وہ پہلا سوشلسٹ تھا۔ ریاستی اشتراکیت کا آغاز بھی اسی کی دین ہے۔ اس نے اپنے سماجی و معاشی نظریات اپنی مشہور تصنیف "آرگنائزیشن آف لیبر" میں پیش کیے ہیں۔ 1841–1839 میں مکمل ہوئی اس کتاب میں اس نے پیداواری طریقہ کار سے سرمایہ دارانہ نظام کو علیحدہ کر کے ایک نئی سماجی ساخت کا خاکہ پیش کیا۔ وہ ریاست کے غریبوں کو بینکر مانتا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ مزدوروں کے لیے پیداوار کے وسائل فراہم کرنا ریاست کے فرائض میں شامل ہے۔ پسماندہ افراد کی آزادی کی حفاظت کرتے ہوئے انہیں کام کرنے کی آزادی دینا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس کے مطابق ریاست کے لیے مزدوروں کی بہبودی کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ اسے مزدوروں کے تعلق سے فلاح ادارہ کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ کارخانوں میں مزدور یونین کا قیام مزدوروں کی کارخانہ چلانے میں حصہ داری تاکہ جمہوری طبقہ سے صنعتی نظام چلتا رہے اور پیداوار میں ریاست کی سرمایہ کاری سمیت کئی اہم عناصر لوئی بلانک کے سوشلسٹ منصوبہ کا حصہ تھے۔

لوئی بلانک نے اپنی مذکورہ کتاب میں ایک دیگر اہم موضوع کو بھی اٹھایا ہے۔ اس نے مزدوروں سے بہت واضح طور پر کہا کہ اگر انہیں اپنے مسائل کو حل کرنا ہے تو ہر حال میں بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر جمہوری حکومت قائم کرنا ہوگی۔ جمہوریت ہی مزدوروں کے استحصال کا سدباب کر سکتی ہے۔ بلانک مزدوروں کی خراب حالت اور معاشی پسماندگی کے لیے ہمعصر حکومتوں کو ہی ذمہ داری سمجھتا تھا، کیونکہ یہ سرمایہ کی ہی قائم کردہ تھیں اور ان ہی کے حق میں کام کرتی تھیں۔ وہ کہتا ہے "جسمانی طور پر صحتمند لوگوں کو کام دینا اور ضعیف و بے سہارا افراد کی مدد و حفاظت کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

"آرگنائزیشن آف لیبر" میں لوئی بلانک نے سیاسی و معاشی نظام کی تشکیل نو کے لیے مندرجہ ذیل اصول منضبط کیے ہیں:

- ہر صحت مند آدمی کو کام کرنے کا حق ہے اور حکومت کو اسے روزگار مہیا کرنا چاہیے۔
- ریاستی حکومتوں کو اپنے سرمایہ سے قومی صنعتیں قائم کرنی چاہیے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پیداوار کے وسائل پر حکومت کا کنٹرول ہونا ضروری ہے۔
- آقا و ملازم کا طبقاتی فرق ختم ہونا چاہیے۔ مزدوروں کو ان کی محنت کا پورا پھل ملنا چاہیے۔ کارخانوں کے انتظام و انصرام میں مزدوروں کا کردار بنیادی ہونا چاہیے۔
- ریاستی حکومتوں کا قیام جمہوری بنیادوں پر ہونا چاہیے۔

لوئی بلانک مزدوروں کے مفاد میں ریاست کی دخل اندازی کا حامی تھا۔ وہ حکومت سے اس بات کی توقع رکھتا تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً مزدوروں کی بہبودی کے لیے قوانین وضع کرے اور ساتھ ہی پیداواری عمل کے لیے غیر سودی سرمایہ بھی فراہم کرے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ سماج وادی نظریہ کے تعلق سے بلانک کا شمار بنیادی مفکرین میں نہیں ہوتا ہے بلکہ اسے سینٹ سائمن کے پیروکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ معاملات میں اس کے خیالات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ سماجی اصلاح اور سیاست کے مابین تعلق پیدا کرنے اور

دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے معاملے میں بلانک کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔یہی سبب ہے کہ ریاستی اشتراکیت (State Socialism) کا سہرا بھی اسی کے سر بندھتا ہے۔اس کی تحریروں سے انیسویں صدی کے فرانس میں مزدور تحریکوں کا آغاز ہوا۔اس نے معاشی میدان میں نجی آزادی اور شخصی حقوق کے اصول کی مخالفت کی اور ریاست میں مزدور کے ''کام کے حق'' اور اس حق کے حصول کے لیے قومی کارخانوں یا سماجی ورکشاپ کے قیام کی مانگ کی۔ان کے قیام کے ذریعے وہ خود غرض سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں کو ختم کرنا چاہتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ انقلابی سازشوں کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کر کے اشتراکیت لایا جاسکتا ہے۔اس نے مزدور یونین کے قیام پر بھی زور دیا۔بلانک نے یہ تمام نظریات اپنی تصنیف ''آرگنائزیشن آف لیبر'' میں پیش کیے ہیں۔لوئی فلپ (1848–1830) کے دور اقتدار میں یہ خیالات بہت تیزی سے اشاعت پذیر ہوئے۔

وہ وسائل سے محروم سماج کے نظر انداز طبقہ کا زبردست حامی تھا۔بلاشبہ اس نے اپنے بنیادی نظریات سے فرانس کے اس طبقہ میں بیداری پیدا کردی۔اسی کا نتیجہ تھا کہ 1848 کے انقلاب میں شہنشاہ لوئی فلپ کے خلاف اس گروہ کے افراد نے فعال کردار ادا کیا۔1848 کے انقلاب کے بعد لوئی بلانک کو انٹیریم حکومت میں شامل کیا گیا اور معاشی اصلاحات کی ذمہ داری اسے سونپی گئی۔ چنانچہ اس نے سماجی ورکشاپ کے قیام کو منظوری دلوائی۔انہیں سرمایہ داری کے اختتام کی کلید سمجھا گیا۔ان میں کام کرنے والے مزدوروں کو حکومت کے ذریعہ خام مال فراہم کر کے اشیاء کی پیداوار کو ممکن بنانا تھا۔ حکومت پر درمیانی طبقہ کی بالادستی تھی۔ چنانچہ حکومت کی حالت مضبوط ہوتے ہی یہ ورکشاپ بند کردی گئی۔1848 میں پیرس کی جگہوں میں جنرل کیونیاک کی قیادت میں فوجیوں نے ہزاروں مزدوروں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ 1851 میں متوسط طبقہ کی حمایت نے لوئی فلپ کی بغاوت کو قانونی بنادیا۔اور 1852 میں فلپ کو تخت نشین کردیا گیا۔اس طرح فرانس میں اشتراکیت کے قیام کی اولین کوشش ناکام ہوگئی۔

مندرجہ بالا تمام سوشلسٹ مصنفین و مفکرین جن کا ہم نے گذشتہ اوراق میں جائزہ لیا۔جدید اشتراکیت کے پیش رو تھے۔ جنہوں نے 1848ء تک دنیا کے بیشتر ممالک خصوصاً برطانیہ اور فرانس میں اپنے نظریات وخیالات کی اشاعت کی۔انہوں نے اپنے وقت کے سماجی و معاشی نظام کی خامیوں اور برائیوں کو اجاگر کیا اور ساتھ ہی کام کرنے کے حق،مزدور یونین اور معاشی استحصال جیسے اہم مسائل پر توجہ دی اور ان سے متعلقہ اصول وضوابط کا تعین کیا،جس کے نتیجے میں فرانس کے مزدور طبقہ میں سب سے پہلے سوشلسٹ بیداری پیدا ہوئی۔انقلاب کی علامت سرخ جھنڈا بھی فرانس سے دیگر ممالک تک پہنچا۔فرانس کے ساتھ ہی برطانیہ کے عوام نے بھی سوشلسٹ نظریات سے متاثر ہو کر مزدوروں کے مفاد کے تحفظ کے لیے تحریکیں شروع کیں۔اور مزدور یونین کے قیام،کام کرنے کے اوقات کا تعین،ہڑتال کرنے و دھرنا دینے کی آزادی جیسے اہم مسائل کے سدباب کے لیے کوشش کی گئیں۔ برطانیہ میں چارٹسٹ تحریک کے آغاز و ترقی کے پس پشت بھی سوشلسٹ نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔اس تحریک کا مقصد بھی مزدوروں کی سماجی و معاشی حالت کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ ملک کے پارلیمانی نظام کی خامیوں کو دور کرنا،ووٹ کے حق کو وسیع کرنا اور مزدوروں کو پارلیمانی حقوق دینا تھا۔

16.5 جرمنی میں اشتراکیت کا آغاز (The Emergence of Socialism in Germany)

اشتراکیت کی تاریخ میں کارل مارکس کو اہم ہی نہیں منفرد مقام حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جرمنی میں کارل مارکس سے پہلے ہی اشتراکیت کا بیج پھوٹ چکا تھا۔ 1830 میں فرانس میں رونما ہونے والے انقلاب کی لہر کے نتیجے میں بیوخنر نے ایک خفیہ تنظیم قائم کی جس کا نام تھا "آدمی کے حقوق" اس تنظیم کے اراکین کا یقین تھا کہ سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ سماجی انقلاب بھی ضروری ہے۔ اس نے اپنا مینی فیسٹو بھی شائع کیا تھا جس کا پہلا جملہ تھا "جھونپڑیوں میں امن و سکھ قائم ہو اور محلات کی بنا ہو" جرمنی میں اشتراکیت کی بنیاد فرڈی نینڈ لیسل نے رکھی تھی۔ وہ تحریک کا کامیاب روح رواں تھا۔ اس نے 1863ء میں لیپزگ (Leipzig) میں "جنرل ایسوسی ایشن آف ورکرس" قائم کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنے شہریوں کی زیادہ سے زیادہ فلاح و بہبود کرنا ریاست کا اہم فریضہ ہے، جس کے لیے سماج اور کارخانہ جات سمیت مکمل معاشی زندگی پر ریاست کا کنٹرول ہونا چاہیے۔ لیسل پہلا فرد تھا جس نے آزاد مزدور تحریک کی حقیقی طاقت کو سمجھا۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ سوشلسٹ تحریک کی مضبوطی اور کامیابی کا انحصار خود مزدوروں پر ہے۔ اسے کسی بھی متوسط حریت پسند طبقہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا یقین تھا کہ سب کو حاصل ووٹ کے حق کی بنیاد پر جو نظام تشکیل ہوگا، اس کے تحت متحد مزدور ریاست پر اپنی گرفت مضبوط کر سکتے ہیں اور عوامی فلاح کے لیے راہ ہموار کر سکتے ہیں۔ جرمنی میں سوشلسٹ نظریات کی اشاعت اور مزدوروں کو متحد کرنے کے لیے مختلف تنظیموں اور پارٹیوں کی تشکیل کی گئی۔ ایسا ہی ایک ادارہ "لیگ آف دی جسٹ" پیرس کے مزدوروں نے 1836ء میں قائم کیا۔ اس کا نعرہ تھا "سبھی لوگ بھائی بھائی ہیں" اس پلیٹ فارم پر سماجی و معاشی مسائل پر مباحثہ ہوتا ہے۔ کارل مارکس اور اینگلس اس تنظیم کے اہم اور سرگرم رکن تھے۔ بتدریج اس کی شاخیں برطانیہ، جرمنی اور بیلجیم کے مختلف علاقوں میں قائم ہو گئیں۔ 1847ء میں اس کا نام بدل کر "کمیونسٹ لیگ" کر دیا گیا۔ اس کے اہم مقاصد تھے سرمایہ دار طبقہ کا خاتمہ، مزدوروں کی حکومت، طبقاتی تفریق کا خاتمہ اور ایسے سماج کی تشکیل جس میں نجی ملکیت اور طبقاتی تفریق نہ ہو۔ اس ادارے نے پیغام دیا کہ "دنیا بھر کے مزدور ایک ہوں" اسی لیگ نے مارکس اور اینگلس کو ایک مینی فیسٹو تیار کرنے کی ہدایت کی تھی۔

16.5.1 کارل مارکس (Karl Marx)

کارل مارکس 1818ء جنوب مشرقی جرمنی میں رائن ندی کے کنارے پر واقع ٹراونس نامی شہر میں پیدا ہوا۔ اس نے برلن یونیورسٹی سمیت کئی اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ قانون، تاریخ، فلسفہ اور معاشیات اس کے پسندیدہ مضامین تھے۔ یہ وہ دور تھا جب براعظم یورپ کی سیاسی فضا انقلابی تھی۔ چنانچہ مارکس کے خیالات و نظریات بھی اس سے متاثر ہوئے اور اس نے 1842ء میں ایک اخبار نکالنا شروع کیا، جس میں شائع ہونے والے مضامین و تحریریں انقلابی افکار سے سرشار تھیں۔ نتیجتاً پرشا کی حکومت نے اخبار پر پابندی لگا دی اور مارکس کو بھی جلاوطن ہونا پڑا۔ اس نے پیرس میں پناہ لی، جہاں اس کی ملاقات فرانس کے دیگر سوشلسٹوں سے ہوئی۔ اس موضوع پر اس نے کتابیں پڑھیں۔ یہیں اس کی ملاقات ایک اور جرمن فریڈرک اینگلس سے ہوئی جو برطانیہ میں جاکر بس گیا تھا اور وہاں کپڑوں کے ایک کارخانہ کا مالک تھا۔ اینگلس بھی زمانہ کی سماجی حالت سے دکھی تھا، وہ بھی چاروں طرف پھیلی غربت کا علاج تلاش کرنا چاہتا تھا۔ رابرٹ اووین کے اصلاحی خیالات

اور کوششیں اسے پسند تھیں۔ پیرس نے مارکس اور اینگلس کو درست بنادیا۔ مشترکہ مقصد نے دونوں کے تعلق کو اتنا گہرا بنادیا کہ زیادہ تر کتابیں دونوں نے مل کر لکھیں۔

اپنے انقلابی افکار کے سبب مارکس کو پیرس سے بھی نکلنا پڑا۔ وہ لندن چلا گیا اور وہاں ایک طویل عرصے تک مقیم رہا۔ لندن میں اس کے نظریات نے حتمی شکل اختیار کی۔ وہ اپنے پیش رو مفکرین سائمن فیوریئے کی طرح خیالی دنیا میں نہیں رہتا تھا۔ حقیقتاً وہ سائنسی اشتراکیت کا بانی تھا۔ اس نے واضح نظریہ پیش کیا۔ 1848ء میں پورا یورپ انقلاب کی لہر سے دوچار تھا۔ اسی سال مارکس اور اینگلس نے جرمن زبان میں ایک مشترکہ مینی فیسٹو جاری کیا، جو کمیونسٹ مینی فیسٹو کہلایا۔ اس میں کارل مارکس نے اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی افکار کو بہت واضح شکل میں پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ سرمایہ اور طاقت کی غیر منصفانہ تقسیم ہی طبقاتی کشمکش کا اصل سبب ہے اور انسانی تاریخ اسی طبقاتی کشمکش سے بھری ہے۔ مارکس کے مطابق انسانی سماج کئی طبقات میں منقسم ہے۔ جو طبقہ پیداوار کے کل وسائل پر قابض ہو جاتا ہے سرمایہ دار کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس سماج میں ایک طبقہ اُن افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو ہر طرح کے سرمایہ، قوت اور وسائل سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ اپنی بساط سے زیادہ محنت ومشقت کر کے ملک کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں، لیکن اس کا پھل انہیں اتنا بھی نہیں ملتا کہ وہ زندگی کی گاڑی کو صحیح طریقے سے چلا سکیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ پیداوار کا کل عمل سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق مزدوروں کا سماجی و معاشی استحصال کرتے ہیں۔ یہی استحصال طبقاتی کشمکش کو جنم دیتا ہے۔ اس مینی فیسٹو میں مارکس نے یہ امید ظاہر کی کہ وہ دن دور نہیں جب پوری دنیا کے مزدوروں میں غیر معمولی اتحاد پیدا ہوگا اور پھر اُن کی طاقت کے آگے سرمایہ دار سرنگوں ہو جائیں گے۔ اس نے مزدوروں سے اپیل کرتے ہوئے کہا ''دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ، تمھیں اس سرمایہ دارانہ نظام کو منہدم کرنا ہے۔ تمھارے پاس کھونے کے لیے اپنی تکلیفوں کے سوا کچھ نہیں ہے''۔ مارکس کو یقین تھا کہ جس طرح 1789ء میں فرانس کے انقلابیوں نے جاگیر دارانہ نظام کو تباہ کر کے مکمل اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسی طرح ایک بار پھر مزدوروں کو متوسط طبقہ کی نجی املاک کو ختم کر کے مکمل اختیارات کو اپنے ہاتھوں میں لینا ہوگا۔ 1848ء میں جرمنی میں جو انقلاب آیا اس پر مارکس کے نظریات کا پورا اثر تھا۔ اس انقلاب کے بعد مارکس کو یہ احساس ہوا کہ مزدوروں میں اُن کے حقوق کے تئیں بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک مکمل سائنسی نظریہ کی ضرورت ہے۔ اسی کے پیش نظر مارکس نے 'داس کیپیٹل' تصنیف کی۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1867ء میں شائع ہوا۔ اسے سوشلسٹوں کی بائبل کہا جاتا ہے۔

سوشلسٹ تحریک کی تاریخ میں ایک اور اہم واقعہ 1864ء میں ''بین الاقوامی کامگار کمیٹی'' کا قیام ہے۔ اسے ''فرسٹ انٹرنیشنل'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے تحریک کو عالمی شکل دی۔ یہ بھی کارل مارکس کی دین تھی۔ اس کے قیام کے لیے لندن میں ایک اجلاس ہوا جس میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، جرمنی، پولینڈ اور سوئٹزرلینڈ کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ اس میں مزدوروں کی تحریک کو عالمی سطح پر وسعت دینے پر زور دیا گیا۔ 1889ء میں پیرس میں دوسرا عالمی اجلاس منعقد ہوا۔ اسے سکینڈ انٹرنیشنل کہا گیا۔ اس میں یہ طئے کیا گیا کہ ہر سال یکم مئی کا دن مزدوروں کے اتحاد کے دن کے طور پر منایا جائے گا۔ یکم مئی 1890ء کو یورپ اور امریکہ میں لاکھوں مزدوروں نے ہڑتال کر دی اور بڑے پیمانے پر مظاہرے کیے۔ تب سے یکم مئی عالمی یوم مزدور کے طور پر منایا جاتا ہے۔

16.6 مزدور تحریکیں (Labour Movements)

یورپ میں سرمایہ داری کے خلاف دو طرح کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اول وہ تحریکیں جن کا بنیادی مقصد سرمایہ داری کو ختم کرنا تھا۔ دوم وہ تحریکیں جو سرمایہ داروں کے ساتھ مفاہمت کرنا چاہتی تھیں۔ اول قسم کی تحریکیں اشتراکیت کی پیدائش کا سبب بنیں جبکہ دوسری قسم نے مزدور یونین کی تشکیل کی۔ اس طرح کی انجمنیں فرانس میں اوائل میں ہی قائم ہو گئیں تھیں، لیکن حکومت کے ذریعے ان پر پابندی لگائی جاتی رہی۔ فرانس کے انقلابیوں نے 1791ء میں ''لی چیپلز ایکٹ'' کے ذریعے اور 1799 میں ٹوریو نے ''کنونشن ایکٹ'' کے ذریعہ اس طرح کی پابندیاں عائد کی تھیں۔ 1825ء میں حریت پسند ٹوریو نے مزدور یونینوں کے قیام کے لیے اجازت دی، لیکن حقیقی منظوری گلیڈسٹن کی حریت پسند کابینہ سے ملی، حالانکہ نپولین سوم نے ان پر دوبارہ پابندی عائد کر دی تھی جو 1884 میں ختم ہوئی۔

برطانیہ میں بھی 1850ء کے آس پاس مزدور یونینوں کا قیام تیزی سے ہو رہا تھا۔ خاص طور سے صنعت کاروں اور کاریگروں کی اپنی اپنی انجمنیں تشکیل پا رہی تھیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں اڑچنوں اور دشواریوں کے باوجود مزدور تحریکیں پنپ رہی تھیں۔ مزدوروں کو متحد کرنے میں مندرجہ ذیل اسباب اہم تھے:

- آغاز میں مزدوروں کے کام کرنے کے حالات اچھے نہیں تھے۔ خاص طور سے بچوں اور عورتوں کی صورتحال بہت خراب تھی۔ کارخانوں کا گھٹا ہوا خراب ماحول ان کی صحت کے لیے بہت نقصاندہ تھا۔
- 1789ء کے فرانسیسی انقلاب کے آزادی، مساوات اور بھائی چارہ کے نعرے نے مزدوروں کو متحد ہونے کے لیے ترغیب دی۔
- مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس احساس کو بیدار کیا کہ وہ متحد ہو کر ملکی سیاست پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور اپنے موافق قوانین وضع کر سکتے ہیں۔

16.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اٹھارہویں صدی کا نصف آخر یورپ میں کچھ ایسی تبدیلیوں کا گواہ ہے، جنہوں نے انسان کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کو اتنا متاثر کیا کہ تاریخ میں اس تبدیلی کو انقلاب کہا گیا۔ اس دور میں نئی سائنسی ایجادات اور مشینوں کے وجود میں آنے سے نہ صرف انسان کو سہولیات میسر ہوئیں بلکہ انہوں نے سماجی ساخت میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ دستکاری اور گھریلو پیداواری نظام کی جگہ مشینوں اور کارخانوں نے لے لی۔ پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا۔ پیداوار کے عمل کی ایسی واضح تبدیلی کو صنعتی انقلاب کہا جاتا ہے۔ اس کا آغاز برطانیہ سے ہوا اور بتدریج یورپ کے دیگر ممالک تک پھیل گیا۔ اس کے نتیجے میں سماج دو واضح حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک وہ لوگ جو ان کارخانوں کے مالک تھے اور پیداوار کے وسائل ان ہی کے قبضے میں تھے۔ دوسرے وہ مزدور جو دن رات ان کارخانوں میں کام کر کے پیداوار کا سبب بنتے۔ المیہ یہ تھا کہ یہ محنت کش طبقہ منافع سے محروم رہتا اور سارا فائدہ فیکٹری مالکان کو حاصل ہوتا۔ یہ سرمایہ دار تھے اور ان کے ہاتھوں استحصال ہونے والے مزدور۔ پہلے طبقہ کو بورژوا اور دوسرے کو پرولتاری کہا جاتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ان دو طبقات کی آپسی کشمکش اشتراکیت کے

وجود میں آنے کا باعث ہوئی۔ دراصل کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی،ان کی زندگی مشقتوں سے بھری تھی اور وہ مراعات سے محروم تھے۔ وہ دن رات کام کرتے لیکن بدلے میں زندگی گذارنے کے لیے ضروری بنیادی اشیاء بھی ان کو نہیں مل پاتیں۔ دوسری طرف سرمایہ دار مسلسل دولت و ثروت دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہے تھے۔ ایسے میں سماج میں کچھ افراد ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے اس ناانصافی اور استحصال کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ نمودار ہوا، جس نے اس صورتحال کا تجزیہ کیا،اس کے اسباب کا جائزہ لیا اور اس معاشی ناہمواری اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم سے پیدا شدہ مسائل کا حل بھی پیش کیا۔ ایسے دور میں جب حکومت بھی ان کے استحصال کو روکنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی، تب یہ ادیب اور مفکرین مزدوروں کے پشت پناہ بن کر اُٹھے۔ مزدور طبقہ کی معاشی بدحالی دور کرنے اور انہیں سرمایہ داروں کے پنجے سے آزاد کرنے کے لیے انہوں نے سماجی اور معاشی سطح پر وہ نظریہ پیش کیا، جسے اشتراکیت کہا جاتا ہے۔ اس میں سائمنڈ ڈی سسمونڈی، رابرٹ اووین، سینٹ سائمن، لوئی بلانک اور کارل مارکس اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے عصری معاشی نظام کو اپنا نشانہ بنایا اور سرمایہ داروں و مزدوروں میں طبقاتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے اصول وضوابط کی تشکیل کی۔

سسمونڈی نے سماجی و معاشی انصاف قائم رکھنے کے لیے حکومت کی مداخلت کو ضروری قرار دیا۔ رابرٹ اووین آزاد تجارت کی پالیسی کا سخت مخالف تھا۔ اس کو استحصال کی بنیاد قرار دیتا تھا۔ اس نے مزدوروں کی حالت بہتر بنانے کے لیے بہت سے عملی قدم اٹھائے۔ مزدوروں کی صحت، صفائی، تعلیم، کام کرنے کے اوقات جیسے اہم شعبوں میں اصلاحات کیں اور قوانین وضع کیے۔ لفظ اشتراکیت بھی سب سے پہلے رابرٹ اووین نے ہی استعمال کیا۔ فرانس کا سینٹ سینٹ سائمن نجی املاک کو غلط نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اس میں اصلاح چاہتا تھا تاکہ اس کا غلط استعمال نہ ہو۔ وہ ترقی کے لیے صنعت کاری کو لازمی سمجھتا تھا۔ لیکن اس کا کہنا تھا کہ پیداوار کے تمام وسائل حکومت کے پاس ہونا چاہیے۔ اپنی مذہبی ذہنیت کے باوجود وہ سماج کی تشکیل نو سائنس کی بنیاد پر کرنا چاہتا تھا، تاکہ مزدوروں کا معیار زندگی بہتر ہو۔ سائمن کے ان نظریات کو عملی شکل دینے کا کام لوئی بلانک نے کیا۔ وہ ریاست کو مزدوروں کا بینکر مانتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ریاست کی ذمہ داری تھی کہ وہ مزدوروں کو وسائل فراہم کرے۔ اس کے مطابق ہر صحت مند آدمی کو کام کرنے کا حق ہے اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں کام مہیا کرائے۔ جن مفکرین نے اشتراکیت کی آبیاری کی، ان میں سب سے اہم نام کارل مارکس کا ہے۔ وہ سائنسی اشتراکیت کا بانی تھا۔ اس نے بورژوا اور پرولتاری دونوں طبقوں کی واضح نشاندہی کی۔ اس کا کہنا تھا کہ مزدوروں کی محرومی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ پیداوار کے کل وسائل سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں۔ چنانچہ وہ غریبوں کے استحصال پر قادر ہیں۔ مارکس نے اپنے نظریات اپنی مشہور کتاب ''داس کیپٹل'' میں پیش کیے ہیں۔ اسے سوشلسٹوں کی بائبل کہا جاتا ہے۔ مذکورہ مفکرین نے مزدوروں کی پسماندگی دور کرنے اور طبقاتی کشمکش کو دور کرنے کے لیے جو کوششیں کیں اور جو بیداری پیدا کی، اس کے مثبت نتائج ظاہر ہوئے۔ چنانچہ سرمایہ داروں کے خلاف یورپ میں مختلف تحریکیں وجود میں آئیں۔ وہ متحد ہوئے اور اُن کی یونین بنی، جس نے اُن کی حالت کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

16.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

صنعتی انقلاب	:	دستکاری/گھریلو صنعتوں کی جگہ مشینوں کے ذریعے بڑے پیمانے پر پیداوار
بورژدا	:	مل مالکان، سرمایہ دار طبقہ
پرولتاری	:	مزدور طبقہ
طبقاتی کشمکش	:	سرمایہ داروں اور مزدوروں کا آپسی تعلق جس میں مزدور استحصال کا شکار تھا۔
بالغ حق رائے دہی	:	حکومت کے انتخاب میں بالغ افراد کا ووٹ دینے کا حق
چارٹسٹ تحریک	:	برطانیہ میں پارلیمانی نظام کی خامیوں کو دور کرنے کے لیے چلائی گئی تحریک

16.9 نمونہ امتحانی سوالات (Learning Outcomes)

16.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. لفظ ''سوشلسٹ'' سب سے پہلے کس دانشور نے استعمال کیا؟
2. رابرٹ اووین کا تعلق کس ملک سے تھا؟
3. سینٹ سائمن کہاں پیدا ہوا تھا؟
4. سینٹ سائمن کی تصنیف کا کیا نام ہے؟
5. کارل مارکس پر کس مشہور مفکر کا سب سے زیادہ اثر تھا؟
6. طبقاتی کشمکش کا نظریہ کس مفکر نے پیش کیا؟
7. ''داس کیپٹل'' کس کی تصنیف ہے؟
8. ایڈم اسمتھ کے نظریات کو کس سوشلسٹ مفکر نے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی؟
9. فرانس میں کس نے کمیونسٹ ریاست قائم کرنے کی ناکام کوشش کی؟

16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اشتراکیت کی ترویج میں رابرٹ اووین کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
2. سینٹ سائمن پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
3. اسٹیٹ اشتراکیت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
4. جرمنی میں اشتراکیت کے آغاز پر روشنی ڈالیے۔
5. ''اشتراکیت: صنعتی انقلاب کی دین ہے'' اس کی وضاحت کیجیے۔

16.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اشتراکیت کی پیدائش اور ارتقاء پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. لوئی بلانک پر ایک مفصل مضمون لکھیے۔
3. کارل مارکس کے نظریات وافکار کا جائزہ پیش کیجیے۔

16.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
2. Gray, John, *Concepts in Social Sciences*: *Liberalism*, World View, Delhi, 1998.
3. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
4. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
5. Lowe, Norman, John Traynor, *Mastering Modern World History*, Bloomsbury, New Delhi, 2023.
6. Molho, Anthony and Gordon S. Wood, *Imagined Histories*: *American Historians Interpret the Past*, Princeton University Press, Princeton, New Jersey, 1998.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.

نمونہ امتحانی پرچہ

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

Master of Arts ماسٹر آف آرٹس

Subject Code: MAHS302CCT

Paper: Modern World-I

پرچہ: جدید دنیا - I

3rd Semester Examination ، تیسرا سمسٹر امتحان

Time : 3 hours وقت : ۳ گھنٹے Marks : 70 نشانات : ۷۰

ہدایات

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30Marks)

حصہ اول

سوال : 1

i. بازنطینی سلطنت کے دارالحکومت کا نام بتائیے۔

ii. وینس کہاں واقع ہے؟

iii. بادبان کسے کہتے ہیں؟

iv. جہازراں ہنری کسے کہا گیا؟

v. تیس سالہ جنگ کن ممالک کے درمیان ہوئی؟

vi. عالمی سطح پر پہلی بار صنعتی انقلاب کہاں پر وجود میں آیا؟

vii. بھاپ کا انجن (Steam Engine) کس نے ایجاد کیا؟

viii. گلابوں کی جنگ کے دور میں برطانیہ کا بادشاہ کون تھا؟

ix. شاندار انقلاب (Glorious Revolution) کس سال رونما ہوا؟

x. کیمپو فورمیو کا معاہدہ کس کے درمیان ہوا؟

حصہ دوم

2. جاگیردارانہ نظام کی خامیاں بیان کیجیے۔
3. فن جہاز رانی کے ارتقا پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
4. ہنری ہشتم کی داخلی پالیسیوں کی وضاحت کیجیے۔
5. مطلق العنانیت کی خصوصیات بیان کیجیے۔
6. نوآبادیات کی تاریخ میں فرانس کے کردار کی وضاحت کیجیے۔
7. جان لاک کے خیالات پر ایک نوٹ لکھیے۔
8. گیری بالڈی کے روم پر حملے پر نوٹ لکھیے۔
9. جرمنی میں ریلوے لائنوں کی توسیع اور اس کے اثرات پر مختصر مضمون لکھیے۔

حصہ سوم

10. جدید عہد کی بنیادی خصوصیات پر اظہارِ خیال کیجیے۔
11. امریکہ کی دریافت کس طرح ہوئی؟ تفصیلی طور پر وضاحت کیجیے۔
12. یورپی مفکرین کے جدید سیاسی نظریات پر بحث کیجیے۔
13. انقلاب فرانس کے سماجی و معاشی اسباب کا تجزیہ کیجیے۔
14. جنوبی امریکہ میں اسپین کی نوآبادیاتی جدوجہد کا مفصل جائزہ لیجیے۔

اہم نکات